جسٹس جواد ایس خواجہ کا پہلا پہلا انٹرویو

جسٹس منیر سے جسٹس افتخار تک

عدلیہ کے عروج وزوال کی کہانی

سہیل وڑائچ

جسٹس منیر سے جسٹس افتخار تک

عدلیہ کے عروج وزوال کی کہانی

(تازہ ایڈیشن)

سہیل وڑائچ

ساگر پبلشرز

A-7، لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور

فون:۔ 042-7230423

نام کتاب	عدلیہ کے عروج وزوال کی کہانی
مصنف	سہیل وڑائچ
تاریخ اشاعت	اگست 2007ء
ناشر	ساگر پبلشرز، A-7 لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور
	فون:۔ 042-7230423
کمپیوٹر کوڈ	1S81

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247350 -7220479

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Our web:- www.zia-ul-quran.com

انتساب

اپنے نانا چودھری رحمت خان ''بو.جی'' مرحوم کے نام
جن کی آغوش محبت نے مجھے زندگی کا حوصلہ دیا
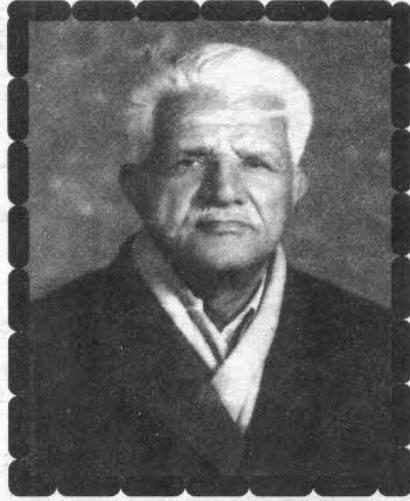
چودھری رحمت خان بی اے بی ٹی آف لکھنوال (وفات 1969ء) ضلع گجرات کے مضافاتی علاقوں کے پہلے گریجوایٹس میں سے تھے اپنے بڑے بھائیوں چودھری علی بخش اور چودھری فتح خان کی طرح انہوں نے بھی معلّمی کو زندگی کا شعار بنایا۔ انسپکٹر آف سکولز، اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز اور ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے شاہپور، خوشاب، حضرو، جہلم اور راولپنڈی میں تعینات رہے اور ہر جگہ تعلیم کے فروغ میں گہری دلچسپی لی۔ ہیڈ ماسٹر نارمل سکول شاہپور صدر کی حیثیت سے سینکڑوں اساتذہ کی تربیت کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جوہرآباد میں سکونت اختیار کی شہر کے کونسلر رہے اجتماعی کاموں میں پیش پیش رہے جوہرآباد میں ہی مدفون ہیں۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی واحد اولاد کی حیثیت سے اپنا ترکہ مصنف کے نام چھوڑا۔

فہرست مضامین

پیش لفظ

کسی بھی جمہوری معاشرے کے استحکام کے لئے عدلیہ کا کردار اہم ترین ہوتا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ عدلیہ کا اپنا کردار صحیح طرح سے ادا نہ کرنا تھا کہا جاتا ہے کہ مولوی تمیز الدین کے مقدمہ میں اگر پاکستان کی پہلی منتخب اسمبلی توڑنے کو جائز قرار نہ دیا جاتا تو شاید آج پاکستان مضبوط روایات کا جمہوری ملک ہوتا۔ جسٹس منیر کے نظریۂ ضرورت کی یہ روایت جاری رہی کئی اسمبلیاں ٹوٹیں اور کئی منتخب حکومتیں رخصت ہوئیں لیکن 60 سال تک عدلیہ جمہوریت کے حق میں بڑے فیصلے دینے میں ناکام رہی۔

کہتے ہیں سدا وقت ایک جیسا نہیں رہتا شاید اسی لئے چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف صدارتی ریفرنس کے بعد وکلاء اور ججوں میں جو ردعمل سامنے آیا ہے نظریہ ضرورت، مصلحت کے مسلسل فیصلوں اور بھٹو کی پھانسی کے بعد عدلیہ میں زوال کی جو صورتحال تھی لیکن چیف جسٹس افتخار چودھری کی بحالی اور صدارتی ریفرنس کے کالعدم ہونے سے عدلیہ کو عروج مل گیا۔

ملک کے کئی نامور دانشوروں اور قانون دانوں کی یہ رائے ہے کہ اگر صرف ملک کی عدلیہ ہی اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے لگے تو ملک کی اصلاح احوال کی طرف قدم بڑھائے جاسکتے ہیں۔ یہ بات جزوی طور پر ضرور درست ہے کہ اعلیٰ عدالتوں نے امریکہ جیسے ملک میں جمہوری اقدار کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں عدلیہ کے دامن پر تمیز الدین کیس بھٹو کیس اور اسمبلی کی برطرفی کی توثیق کے فیصلوں کے دھبے موجود تھے۔ جنرل ضیاء الحق اور بعد ازاں جنرل پرویز مشرف کے دور میں عبوری آئین کے تحت حلف اٹھانا بھی آئینی حلف کی واضح خلاف ورزی کے زمرے میں آتا تھا لیکن دونوں مارشل لاؤں کے دور میں یہ جبر سہا گیا اور اکا دکا آوازیں بلند بھی ہوئیں تو وہ حکومت کے حق میں واہ واہ کے شور میں دب کر رہ گئیں۔ البتہ جسٹس افتخار چودھری کے انکار نے کئی راہیں کھول دی تھیں اور اب ان کی بحالی نے عدلیہ کو ایک طاقتور ادارہ بنا دیا ہے۔

زیر نظر کتاب ''عدلیہ کے عروج و زوال کی کہانی، ججوں اور قانون دانوں کی زبانی'' عدلیہ کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ججوں اور قانون دانوں کے انٹرویوز پر مبنی یہ کتاب عدلیہ کے اندرونی تضادات، انتظامیہ اور عدلیہ کی کش مکش اور عوام کے عدلیہ پر بڑھتے ہوئے عدم اعتماد جیسے ایشوز

کوسامنے لاتی ہے ملک کے نامور ججوں اور قانون دانوں نے اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ انٹرویوز میں اپنا مؤقف بیان کیا ہے لیکن اگر تمام انٹرویوز کو پڑھا جائے تو سچ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔اس کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ عدلیہ کے زوال کے اصل اسباب کو تلاش کیا جائے اور پھر اصلاحِ احوال کے بارے میں سوچا جائے تاکہ مستقبل کے جمہوری معاشرے میں عدلیہ اپنا بھرپور کردار ادا کرسکے۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو عدلیہ کے زوال کی کہانی کے نام سے کافی پذیرائی ملی، عدلیہ کے حالیہ بحران کے بعد اس میں نئے اضافوں، نئے انٹرویوز اور دو اہم مضامین جسٹس منیر سے جسٹس افتخار تک عدلیہ کی کہانی اور جسٹس افتخار چودھری کے مثبت اور منفی پہلو بھی شامل اشاعت کئے گئے ہیں۔

یہ ناانصافی ہوگی اگر میں کتاب کی تکمیل میں مدد دینے والے اپنے جونیئر ساتھیوں محمد عثمان بٹ اور ماجد صدیق نظامی کا ذکر نہ کروں وہ ہر مرحلے پر میری معاونت کرتے رہے۔اس کے علاوہ میں اپنے دوستوں انجم رشید، منیر احمد خان، عامر میر، راجہ عامر اور چوہدری فواد حسین کا بھی ممنون ہوں کہ وہ ہر لمحہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔دنیائے صحافت کے اہم ستون عباس اطہر نے میری کتابوں کا نام رکھنے میں میری رہنمائی کی۔میں ان سب کا مشکور ہوں۔

سہیل وڑائچ

جولائی 2007ء

لانگ مارچ اور چیف جسٹس کی بحالی

کتاب کی اشاعت کے بعد عدلیہ کے حوالے سے کئی طوفان آئے 3 نومبر 2007ء کو جنرل مشرف نے چیف جسٹس اور اعلیٰ عدلیہ کے 60 جج صاحبان کو مارشل لاء آرڈر کے ذریعے نکال باہر کیا 18 فروری 2008ء کو الیکشن کے بعد سے میاں نواز شریف اور آصف زرداری کے درمیان عدلیہ کی بحالی کے معاملے پر مذاکرات اور معاہدے ہوئے لیکن آصف زرداری ان وعدوں کو پورا نہ کرسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا رہا بالآخر 15 مارچ 2009ء کو لانگ مارچ کا فیصلہ ہوا۔میاں نواز شریف لانگ مارچ کی قیادت کرتے ہوئے گوجرانوالہ پہنچے تھے کہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل کیانی کا فون آگیا کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ججوں کی بحالی کا اعلان کرنے والے ہیں یوں عدلیہ کے عروج کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے جو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے لیے بھی امتحان ہے اور پورے معاشرے کے لیے بھی۔

سہیل وڑائچ

اپریل 2009ء

جسٹس منیر سے جسٹس افتخار تک

عدلیہ کے عروج وزوال کی کہانی

پاکستانی عدلیہ کی 60 سالہ تاریخ قابل رشک نہیں رہی گو کہیں کہیں اندھیرے میں جگنو چمکتے رہے لیکن مجموعی طور پر اہم سیاسی فیصلوں میں مصلحت سے کام لیا گیا اور عدلیہ، اسٹیبلشمنٹ کا دست و بازو بنی رہی جس کی وجہ سے آمروں اور فوجی طالع آزماؤں کے لیے جمہوری نظام کو لپیٹنا نوالہ تر بنا رہا۔ عدلیہ کے فیصلوں کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اگر اہم ترین سیاسی فیصلوں میں مصلحت سے کام نہ لیا جاتا تو پاکستان کبھی بھی جمہوریت کی پٹڑی سے نہ اترتا۔ 60 سال جمہوریت چلتی رہتی تو ہم عالم اسلام میں پہلے جمہوری ملک کی حیثیت سے نئی روایات کی داغ بیل ڈال سکتے تھے۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا اور ہم ہر چند سال بعد جہاں کئی سیاسی آزمائشوں سے گزرتے رہے ہیں وہاں کسی نہ کسی عدالتی بحران کا شکار رہتے ہیں کبھی جسٹس سجاد علی شاہ کے زمانے میں سپریم کورٹ پر حملہ کر کے عدلیہ کے وقار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جاتا ہے اور کبھی جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس بھیج کر یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ اب بھی عدلیہ نے اگر اسٹیبلشمنٹ کے اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف اقدام اٹھایا جا سکا ہے۔

پاکستان آزاد ہوا تو عدلیہ کے حوالے سے عوامی تاثر بہت اچھا تھا برطانوی حکومت کے زمانے میں غلامی کے باوجود اس وقت کے آقا انصاف کی فراہمی کو یقینی بناتے تھے اعلیٰ عدالتوں کے جج بڑی سخت چھانٹی کے بعد ان عہدوں تک پہنچتے تھے اور وہ عدل و انصاف کا بول بالا رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت جسٹس سر عبدالرشید چیف جسٹس آف پاکستان تھے ان کی شہرت بہت اچھی تھی اور انہوں نے اپنے آپ کو انتظامیہ کی ترغیب و تحریص سے دور رکھا حتیٰ کہ ایک موقع پر انہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خان کو اپنے گھر آنے سے اس لئے منع کر دیا کیونکہ وہ حکومت کے خلاف مقدمات کی سماعت کر رہے تھے اندازہ لگائیے پہلے یہ حال تھا کہ وزیراعظم کو گھر آنے سے روکا جاتا تھا اور اب سر عام جج حکومتی عہدیداروں سے ملتے ہیں۔

قیام پاکستان کے چند سالوں بعد ہی عنان اقتدار سیاستدانوں کے ہاتھوں سے نکل کر بیوروکریٹس کے پاس آ گئی گورنر جنرل غلام محمد نے جمہوری تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسمبلی کو توڑا تو اسمبلی

کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے اسمبلی کی تحلیل کے خلاف عدالتوں میں جانے کا فیصلہ کیا اس وقت کی حکومت نے انہیں اس کوشش سے باز رکھنے کے لیے ہر ہتھکنڈہ اپنایا لیکن وہ برقع پہن کر چیف کورٹ سندھ کی عمارت میں پہنچ گئے دلچسپ بات یہ ہے کہ مولوی تمیز الدین کا دفاع کرنے والے وکلاء میں شریف الدین پیرزادہ بھی شامل تھے یہ الگ بات ہے کہ بعد میں بیشتر اوقات انہوں نے اسٹیبلشمنٹ کی حمایت میں براہ راست یا بالواسطہ وکالت یا مشاورت کے فرائض ادا کیے۔ سندھ چیف کورٹ کے چیف جسٹس کانسٹنٹائن نے اسمبلی کی تحلیل کے فیصلے کو غلط قرار دیا لیکن بعد میں جسٹس منیر کی صدارت میں فیڈرل کورٹ (اس وقت کی سپریم کورٹ) نے نظریہ ضرورت کے تحت اسمبلی کی تحلیل کو تکنیکی بنیاد پر درست قرار دیا اور یوں پاکستان میں غلط عدالتی فیصلوں کی بنیاد پڑ گئی (دیکھئے ضمیمہ)۔ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی کے مصداق اسلام آباد کی کسی شاہراہ کو اسٹیبلشمنٹ کے اس وقت کے اہم ترین ستونوں غلام محمد اور جسٹس منیر کے نام سے موسوم نہیں کیا گیا لیکن مولوی تمیز الدین کے نام سے آج بھی شاہراہ موجود ہے شاید اسٹیبلشمنٹ کو اپنی غلطیوں کا بعد میں احساس ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود غلطیوں سے سبق نہیں سیکھا جاتا بلکہ انہی غلطیوں کو بار بار دھرایا جاتا ہے۔

سکندر مرزا کی طرف سے 1956ء کے آئین کی منسوخی یا ایوب خان کے مارشل لاء کا معاملہ ہو، عدلیہ کا رویہ مصلحت پسندانہ رہا ایک طرف تو سیاسی فیصلوں میں مصلحت سے کام لیا جاتا رہا جس سے ملک کے سیاسی اندھیرے میں اضافہ ہوتا رہا اس طویل دور میں اعلیٰ عدلیہ کی مکمل خاموشی اور حالات سے سمجھوتے کے باوجود اندھیرے میں ایک جگنو نے اعلیٰ مثالیں قائم کیں میری مراد جسٹس (ر) ایم آر کیانی سے ہے۔ جنہوں نے نواب آف کالا باغ کے احکامات کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کیا اور عدلیہ کی اعلیٰ ترین روایات کو زندہ و تابندہ بنایا۔ جسٹس ایم آر کیانی جب عدلیہ سے رخصت ہوئے تو ان کے لیے بھی وکلاء کا جذبہ اور جوش دیدنی تھا ان کے اعزاز میں بھی جسٹس افتخار محمد چودھری کی طرح مختلف بار ایسوسی ایشنز نے جلسے منعقد کیے جس میں انہوں نے عدلیہ کی آزادی اور سیاست کی عدلیہ میں مداخلت کے حوالے سے پرمغز اور پرمزاح تقریریں کیں یاد رہے کہ ایوب دور میں دوسو کیس کے نام سے مشہور مقدمے میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ تختہ الٹنے کا طریقہ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے یوں آئین اور آئینی حکومت کے تختہ الٹنے کو جائز قرار دیا گیا (دیکھئے ضمیمہ) اس فیصلے کو لکھنے والوں میں بھی جسٹس منیر شامل تھے ان کے ساتھ جسٹس ایم شہاب الدین، جسٹس اے آر کارنیلیس اور جسٹس امیر الدین احمد شامل تھے دوسو کیس نے فوجی بغاوت اور آمروں کی حکومتوں پر قبضے کو جائز قرار دے دیا یوں اندھیرا طویل تر ہوتا گیا عدلیہ کا زوال کی طرف سفر بڑھتا رہا۔

ایوب خان کا طویل آمرانہ دور، مزاحمتی تحریک اور سیاسی کارکنوں کی جدوجہد سے ختم ہوا لیکن ایوب خان نے اپنی جگہ پر ایک دوسرے آمر جنرل یحییٰ خان کو بٹھا دیا اسی سیاہ دور میں مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے جدا ہو گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد جی ایچ کیو میں فوجی افسروں کی شورش کے بعد یحییٰ خان کو جبراً اقتدار سے رخصت کیا گیا۔ یحییٰ خان کی اقتدار سے رخصتی کے بعد سپریم کورٹ نے جسٹس حمودالرحمٰن کی صدارت میں مشہور مقدمہ عاصمہ جیلانی بنام حکومت پنجاب میں یہ فیصلہ دیا کہ جنرل یحییٰ خان کا فوجی راج خلاف قانون تھا۔ جسٹس حمودالرحمٰن نے جہاں یہ فیصلہ دیا وہاں ان کے کریڈٹ میں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ بھی جاتی ہے جس میں تمام تر دباؤ، ترغیب وتحریص کے باوجود انہوں نے انصاف کا دامن نہیں چھوڑا اور اصلی کرداروں کو بے نقاب کر کے ان کو سزا دینے کی سفارش کی۔ عدلیہ کے اندھیرے فیصلوں میں جسٹس حمودالرحمٰن نے روشنی کے چراغ جلائے۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں عدلیہ کے حوالے سے ترمیم پر تنقید کی جاتی ہے اسی طرح اس دور میں چیف جسٹس سردار اقبال کی علیحدگی پر بھی انگلیاں اٹھاتی جاتی ہیں لیکن بھٹو دور میں بھی چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اسلم ریاض حسین کی طرف سے جزوی مارشل لاء کو غلط قرار دینے کا فیصلہ بھی تاریخ کا حصہ ہے یہ الگ بات ہے کہ جونہی جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگایا تو جسٹس اسلم ریاض حسین سمیت سب چیف جسٹس صوبائی گورنر بن گئے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران عدلیہ نے محمد احمد خان کیس اور نصرت بھٹو کیس کے نام سے موسوم دو مقدمات کا فیصلہ کیا اور یوں اپنی تاریخ کو سیاہ تر کر لیا۔ محمد احمد خان کیس کے ذریعے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی صدارت میں ہائی کورٹ کے بنچ نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ بہت سارے قانونی ماہرین اس فیصلے کو جوڈیشل مرڈر قرار دیتے ہیں اسی طرح نصرت بھٹو کیس کے ذریعے مارشل لاء کے نفاذ کو ایک بار پھر نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا گیا (دیکھئے ضمیمہ)۔ محمد احمد خان کیس کے فیصلے میں سپریم کورٹ کے ججوں دراب پٹیل، محمد حلیم اور صفدر شاہ نے اختلاف کر کے اندھیری رات میں دیئے جلانے کی کوشش ضرور کی۔

بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے ادوار میں اسمبلیوں کی تحلیل ہوئی تو عدالتوں نے انہیں جائز قرار دیا اور جب ایک دفعہ میاں نواز شریف کی اسمبلی کو چیف جسٹس نسیم حسن شاہ ایکٹوازم اور جوڈیشل نے بحال کر دیا لیکن بے نظیر بھٹو نے اس فیصلے کو چمک قرار دیا تاہم جمہوری ادوار میں مختلف اور متنازعہ فیصلے آتے رہے کبھی دباؤ اور کبھی چمک کی بات ہوتی رہی لیکن ساتھ ہی ساتھ عدلیہ کی آزادی کی تحریک بھی بڑے زور وشور سے جاری رہا۔ ان ادوار میں ایک روشن مثال جسٹس عبدالقدیر چودھری کی تھی

جنہوں نے اپنے سینئر کی جگہ چیف جسٹس بننے سے انکار کر دیا تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے ٹیک اوور کیا تو پھر یہ سوال اٹھا کہ کیا آئینی حکومت کو فوجی ٹیک اوور کے ذریعے ختم کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ ظفر علی شاہ بنام حکومت کے نام سے موسوم یہ مقدمہ جسٹس ارشاد حسن خان کے زیر صدارت ججوں کے سامنے زیر سماعت آیا۔ ماضی کی روایات کے عین مطابق جسٹس ارشاد حسن خان اور ان کے ساتھی ججوں نے ٹیک اوور کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا اور دل چسپ بات یہ ہے کہ حکومت نے عدالت سے ترمیم کا حق نہیں مانگا تھا لیکن عدالت عظمیٰ نے حکومت کو آئینی ترامیم کا حق بھی دے دیا یوں عدلیہ نے جمہوریت کے راستے میں ایک اور رکاوٹ ڈال دی اور سیاسی اندھیروں میں اضافہ کیا عدلیہ کے زوال کی کہانی گہری ہوتی گئی۔

اندھیروں، تاریکیوں اور زوال کی داستانوں میں اچانک روشنی اس وقت دیکھنے میں آئی جب 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس افتخار چودھری، صدر اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف سے ملنے آرمی ہاؤس گئے انہیں استعفیٰ دینے کو کہا گیا انہوں نے انکار کیا تو ان کے خلاف ریفرنس دائر ہو گیا اس کے بعد سے جسٹس افتخار چودھری وکلاء کی تحریک کے قائد بن گئے۔ 9 مارچ سے 19 جولائی تک وہ قوم کے محبوب بنے رہے وہ جہاں بھی گئے لوگوں نے ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے وکلاء کے ساتھ ججوں نے بھی اپنی نوکری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور تو اور لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جواد ایس خواجہ نے نئی روایت قائم کرتے ہوئے ججی سے استعفیٰ دے دیا۔

اس داستان کا اہم موڑ، روشنیاں اور عارضی عروج لے کر آیا۔ 20 جولائی 2007ء کو عدالت عظمیٰ کے اکثریتی فیصلے نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو بحال کر دیا اور صدارتی ریفرنس کو کالعدم قرار دیا۔ جسٹس افتخار چوہدری کی بحالی، جنرل پرویز مشرف کو ہضم نہ ہوئی انہیں یہ اندیشہ تھا کہ شاید عدلیہ ان کا صدارتی انتخاب کالعدم ہی نہ قرار دے دے بہر حال عام انتخابات سے پہلے 3 نومبر 2007ء کو چیف آف آرمی سٹاف کے ایک مارشل لائی آرڈر کے ذریعے افتخار چوہدری اور عدلیہ کے 60 سے زیادہ ججوں کو نکال کر اسٹیبلشمنٹ نے تاریکی عام کر دی۔ 18 فروری 2008ء کو عام انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت بنی لیکن عدلیہ کی بحالی نہ ہو سکی کئی معاہدے بھی ہوئے بالآخر میاں نواز شریف، قاضی حسین احمد، عمران خان اور عدلیہ تحریک نے 15 مارچ کے لانگ مارچ کا اعلان کیا۔ میاں نواز شریف پابندیاں توڑ کر 15 مارچ 2009ء کے تاریخی دن ابھی گوجرانوالہ ہی پہنچے تھے کہ چیف جسٹس اور باقی ججوں کی بحالی کا اعلان کر دیا گیا۔ عدلیہ کے حوالے سے روشنیوں کی قوس قزح بکھر چکی ہے بال اب عدلیہ کے کورٹ میں ہے۔

ایک انکار نے باعث افتخار بنا دیا

جسٹس افتخار کی کہانی کے دونوں رخ

پس منظر

عدلیہ اور فوج میں پاکستان کی 60 سالہ تاریخ میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہوا۔ جسٹس افتخار کے خلاف ریفرنس کو سب سے زیادہ اہمیت باوردی چیف آف آرمی سٹاف کے سامنے استعفٰی سے انکار سے ملی اور پاکستانی تاریخ میں پہلی بار جج اور جرنیل آمنے سامنے آگئے ہیں۔ جسٹس افتخار کے عروج کی کہانی بڑی دل چسپ ہے اس میں کئی مثبت پہلو بھی ہیں اور منفی بھی۔

12 دسمبر 1948ء کو پیدا ہونے والے جسٹس افتخار محمد چودھری صوبہ بلوچستان کا ڈومیسائل رکھتے ہیں گو ان کے والد پنجاب سے ہجرت کر کے کوئٹہ میں جا آباد ہوئے تھے ریلوے پولیس میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے نوکری کرنے والے فیصل آبادی راجپوت نے اپنے بیٹے افتخار کو بلوچستان میں ہی تعلیم دلوائی۔ کوئٹہ بار کو اصول، قانون اور آئین کی بالادستی کے حوالے سے خصوصی شہرت حاصل ہے۔ 1974ء میں کوئٹہ بار میں پریکٹس شروع کرنے کے بعد وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے دور میں وزیراعلیٰ نواب اکبر بگٹی کی نامزدگی پر اس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل افتخار محمد چودھری کو 1990ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا۔

وقت کی رفتار تیز تھی اور قسمت ان پر مہربانی تھی وہ 4 فروری 2004ء کو سپریم کورٹ میں آگئے ایل ایف او منظور ہوا تو سپریم کورٹ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر 65 سال سے بڑھا کر 68 سال کر دی گئی۔ 17 ویں ترمیم منظور ہوئی تو ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر پھر 65 سال ہوگئی اس وقت جسٹس ناظم حسین صدیقی چیف جسٹس آف پاکستان تھے چنانچہ حبیب وہاب الخیری کی رٹ کے باوجود 65 سال کی عمر میں ہی ریٹائر ہونا پڑا کیونکہ حکومت پاکستان نے جسٹس ناظم صدیقی کی ریٹائرمنٹ سے ایک ماہ پہلے ہی جسٹس افتخار محمد چودھری کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا یوں جسٹس افتخار محمد چودھری 30 جون 2005ء کو چیف جسٹس بن گئے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کے چیف جسٹس بننے کے حوالے سے حکومت کو کئی تحفظات تھے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کی مدت عہدہ 2013ء تک تھی اتنی لمبی مدت کے لیے چیف جسٹس رہنے کا مطلب ایک مضبوط چیف جسٹس بھی ہو سکتا تھا اور انتظامیہ خائف تھی کہ کہیں طاقتور چیف جسٹس بڑے

بڑے فیصلے نہ دینا شروع کر دے۔

اختلاف کب شروع ہوئے

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے عہدے کا آغاز بڑے نیچے سروں میں کیا اور پہلے چند ماہ حکومت ان سے خوش رہی۔ نامور قانون دان اکرم شیخ کے مطابق جسٹس افتخار نے اپنے مدت عہدہ کے دوران کوئی بڑا سیاسی فیصلہ نہیں دیا چاہے وہ جاوید ہاشمی کی درخواست ضمانت ہو یا دوسرے گرفتار سیاستدانوں کا معاملہ ہو۔ مگر اس کے باوجود جسٹس افتخار چودھری اور حکومت کا ہنی مون زیادہ دیر نہ چل سکے۔ جسٹس افتخار چودھری نے گو حکومت سے کوئی بڑی سیاسی لڑائی مول نہ لی لیکن عوامی شکایات کے حوالے سے سوموٹو ایکشن لینے شروع کر دیئے عدلیہ کی تاریخ میں پہلی بار انہوں نے سپریم کورٹ میں ایک سیل بنا دیا جس میں میڈیا رپورٹس پر نوٹس لیا جاتا تھا۔ 21 ہزار واقعات کا سوموٹو ایکشن لیا گیا اور 6000 مقدمات کا فیصلہ کر دیا گیا سوموٹو ایکشنز نے بیوروکریسی، پولیس اور حکمرانوں میں ناراضگی پیدا کرنی شروع کر دی۔ جسٹس افتخار عوامی شکایات پر پولیس افسروں کو بلا کر جھاڑ پلاتے اور انہیں ٹارگٹ دیتے کہ یہ مسئلہ حل کرو۔ بعض افسروں کے خیال میں چیف جسٹس ان کی توہین کرتے تھے۔ سرکاری افسروں نے اپنی سیاسی حکمرانوں کو چیف جسٹس کے خلاف شکایات لگانی شروع کر دیں۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ کو ایسی شکایات لگائی گئیں تاہم انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا لیکن سندھ کے وزیراعلیٰ ارباب غلام رحیم تو چیف جسٹس کی ہدایات پر سیخ پا ہونے لگے منوں بھیل کیس میں ڈی آئی جی سلیم اللہ خان نے جسٹس افتخار چودھری کی ہدایات پر عمل کیا اور حکومت سندھ کی ہدایات کو نظر انداز کیا تو انہیں معطل کر دیا گیا۔

برادر ججوں سے اختلافات

چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف فضا بنانے میں برادر ججز کا کردار سب سے زیادہ اہم رہا۔ چیف جسٹس افتخار چودھری نے عہدہ سنبھالا تو اپنے ہم نام لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چودھری کے ساتھ انتہائی محبت اور خیر سگالی کا اظہار کیا۔ لیکن کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ یہ تعلقات سرد مہری کا شکار ہوتے گئے چیف جسٹس سپریم کورٹ کو شکایت تھی کہ لاہور کے دورے کے دوران انہیں مناسب پروٹوکول نہیں ملتا اور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ انہیں مناسب احترام نہیں دیتے۔ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کی رائے تھی کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ، ہائی کورٹ کے معاملات میں بے جا مداخلت کرتے ہیں۔ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کی طرف سے نامزد ججوں کی فہرست میں سے کئی ناموں کو رد کر دیا اور لڑائی کی انتہا اس وقت ہوئی جب چیف جسٹس سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے دو ججز، جسٹس اختر شبیر اور جسٹس شیخ رشید کو

بلا کر سرزنش کی۔ اس واقعے سے دونوں ہم نام چیف جسٹوں کے درمیان بات چیت بھی بند ہو گئی۔ چیف جسٹس بلوچستان امان اللہ یاسین زئی سے بھی جسٹس افتخار چودھری کے معاملات اچھے نہیں تھے۔ چیف جسٹس بلوچستان نے افتخار محمد چودھری کے بیٹے ارسلان افتخار کے پرچے عدالت میں طلب کیے اسی طرح پشاور ہائی کورٹ کے جج جہانزیب رحیم اوران کی والدہ کے درمیان جائیداد کے تنازعے کے حوالے سے جسٹس افتخار چودھری پر الزام لگایا کہ انہوں نے جہانزیب رحیم کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ ان تمام برادر ججوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی شکایات صدر اور وزیراعظم تک پہنچائیں جسٹس جہانزیب رحیم مقدمے کا حوالہ تو جنرل مشرف نے 9 مارچ کی ملاقات میں بھی دیا تھا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران جنرل حامد اور ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ ندیم اعجاز کی طرف سے جو حلف نامے داخل کئے گئے (دیکھیے ضمیمہ) ان میں کہا گیا کہ وہ لاہور اور سندھ ہائی کورٹس کے کئی ججز کو نکلوانا چاہتے تھے اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ انٹیلی جنس ایجنسیوں سے ججوں کے بارے میں رپورٹس لیتے رہتے تھے۔

نعیم بخاری کا خط

ایک طرف جہاں عوام چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے سوموٹو ایکشن سے بہت خوش تھے وکلاء کا ایک بڑا طبقہ بھی جوڈیشل ایکٹوازم پر مطمئن تھا لیکن چند وکلاء کو اعتراض تھا کہ چیف جسٹس کا ان سے رویہ ٹھیک نہیں تھا نعیم بخاری نے اپنے دستخطوں کے بغیر چیف جسٹس کو ایک خط لکھا (دیکھیے ضمیمہ) جس میں انہوں نے عدالت میں وکلاء کے ساتھ اچھا رویہ نہ رکھنے کے ساتھ ساتھ چیف جسٹس کے بیٹے ارسلان افتخار کے حوالے سے کئی الزام لگائے بعد میں یہی الزام چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس کی بنیاد بنے شاید یہی وجہ ہے کہ کئی لوگ الزام لگاتے ہیں کہ نعیم بخاری کو صدارتی ریفرنس کے مواد کا علم تھا اور انہوں نے اسی مواد کو بنیاد بنا کر خط لکھا۔ نعیم بخاری نے بعد ازاں وضاحت کی کہ ان کے خط اور صدارتی ریفرنس کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کئی اور وکلاء کو بھی چیف جسٹس کے رویے پر اعتراض تھا اور انہوں نے صدر اور حکومتی حلقوں سے شکایت بھی کی تھی لیکن وکلاء کی تحریک کے بعد اکثر وکلاء ان الزامات سے دستبردار ہو چکے ہیں۔

چیف جسٹس کے خلاف مہم

جسٹس افتخار چودھری کی تقرری کے دو تین ماہ بعد ہی حکومتی حلقوں میں ان کے خلاف چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا کبھی سننے میں آتا کہ وہ پروٹوکول کے شوقین ہیں اور کبھی کہا جاتا کہ وہ بڑی گاڑی میں سفر کرنا چاہتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ گزریں تو ہر ضلع کی حد پر وہاں کا ایس پی ان کا استقبال کرے۔ سپریم کورٹ میں پیش کئے گئے حلف ناموں میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ جعلی رسیدوں پر پٹرول کے پیسے

حاصل کرتے رہے اوران کے بیٹے اوروہ سرکاری گاڑیوں کا ناجائز استعمال کرتے رہے (دیکھئے ضمیمہ) پھر یہ بھی سننے میں آنے گا کہ انہوں نے اپنے بیٹے ڈاکٹر ارسلان افتخار کومحکمہ صحت سے ایف آئی اے اور پھر پولیس میں ٹرانسفر کروایا ہے تاہم ان الزامات کے باوجود حکومتی حلقے انہیں برداشت کرنے کو تیار تھے۔

سٹیل مل کیس

کہا جاتا ہے کہ چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف بہت توپیں داغی جاتی رہیں لیکن وہ فائر ضائع ہی جاتے رہے حتیٰ کہ سٹیل مل کیس کا فیصلہ آیا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ حکومتی سطح پر اس فیصلے کے بعد چیف جسٹس کی رخصتی کے طریقوں پر غور شروع ہوگیا اوران کے خلاف مختلف ذرائع سے مواد اکٹھا کیا جانا شروع کردیا گیا۔

پاکستان سٹیل مل، ملک کا اہم ترین منصوبہ ہے جو روس کی مدد سے بھٹو دور میں شروع ہوا تھا کئی سالوں کے خسارے کے بعد اب سٹیل مل منافع میں جانے لگی تھی۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ سٹیل مل ایک قومی پراجیکٹ ہے جسے پرائیوٹائز نہیں ہونا چاہیے اس تاثر کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آئی کہ شاید سٹیل ملز کو کوئی بھارتی باشندہ، ایک پاکستانی کمپنی کے نام پر خرید رہا اور سٹیل ملز کی قیمت بھی کم لگائی جا رہی ہے ان تاثرات کو سامنے رکھ کر سٹیل ملز کی پرائیوٹائزیشن کے خلاف پراپیگنڈہ ہوا۔

باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ سٹیل مل کیس کے حوالے سے جسٹس افتخار چودھری نے جنرل مشرف سے ملاقات میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کرنے کا یقین دلایا تھا جس سے پرائیویٹائزیشن کے عمل کو نقصان پہنچے۔ اس گفتگو کے بعد اٹارنی جنرل نے حکومت کی طرف سے سپریم کورٹ کے روبرو یہ یقین دہانی کروائی کہ وہ پرائیویٹائزیشن کے عمل میں عوامی تحفظات کا خیال رکھے گی۔ تاہم جب فیصلہ آیا تو وہ پرائیویٹائزیشن کے خلاف تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ شاید صدر اور فوج سٹیل مل کی نجکاری کے خلاف تھے جب کہ وزیراعظم نجکاری چاہتے تھے بعد ازاں حقائق سامنے آئے تو پتہ چلا کہ صدر کے کہنے کے باوجود یہ فیصلہ سامنے آیا۔ وزیراعظم شوکت عزیز اس فیصلے سے شدید ناراض ہوئے اور صدر مشرف نے بھی برا منایا یہیں سے حکومت نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے خلاف منصوبہ بندی کا آغاز کیا۔

فوری سبب

کہا جاتا ہے کہ گو جسٹس افتخار چودھری کے خلاف مواد اکٹھا کیا جارہا تھا لیکن فوری طور پر ریفرنس دائر کرنے کو موخر کیا جارہا تھا۔ صدر مشرف کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ہمایوں گوہر نے ایک فرضی لیکن حقیقت کے قریب جو تصویر پیش کی ہے اس کے مطابق جس طرح وزیراعظم نواز شریف کو 12

اکتوبر کو کوئی اطلاع دے کر بھڑکایا گیا اور انہوں نے فوری طور پر جنرل مشرف کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔
اسی طرح جنرل مشرف کو بھی 9 مارچ کو ایسی ہی اطلاع دی گئی شاید انہیں یہ کہا گیا کہ چیف جسٹس افتخار چودھری ایسا فیصلہ دینے والے ہیں کہ آپ دوبارہ وردی میں منتخب نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاید سٹاف کالج کے کچھ لوگ انہیں ملے اور صدر کی وردی کے بارے میں سوال کیا جس پر چیف جسٹس افتخار چودھری نے کہا کہ اگر یہ معاملہ ان کے سامنے آیا تو وہ آئین کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

دوسری طرف وزیر اعظم شوکت عزیز کو سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ نے بتایا کہ چیف جسٹس افتخار چودھری نے انہیں طلب کر کے کہا تھا کہ ان کے بیٹے ارسلان افتخار کو پولیس میں Induct کیا جائے اور جب انہیں بتایا گیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے تو انہوں نے مختلف مقدمات میں انہیں طلب کرنا شروع کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم یہ معاملہ صدر کے نوٹس میں بھی لائے ہوں۔

اسی دوران وزارت قانون کے حکام جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس بنا چکے تھے ریفرنس مختلف ایجنسیوں کی طرف سے اکٹھے کیے گئے مواد کی بنا پر بنایا گیا تھا۔

8 مارچ 2007ء

گو 8 مارچ 2007ء کے واقعات کی کہیں رپورٹنگ نہیں ہوئی سینہ گزٹ کے مطابق 8 مارچ کو پاکستان کی اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں نے چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ ذرائع کے مطابق ملاقات انتہائی خوشگوار رہی۔ چیف جسٹس نے مہمانوں کو پرتکلف چائے پلائی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے چیف جسٹس کو برادر ججز کی ناراضگی اور حکومت کے ساتھ خراب معاملات کے حوالے سے مشورہ دیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر استعفیٰ دے دیں اس ذریعے کا کہنا ہے کہ جسٹس افتخار چودھری نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو انہیں پیش کش کی گئی کہ وہ یورپ کے کسی ملک میں سفیر بن کر چلے جائیں گفتگو کے دوران یہ بھی طے کیا گیا کہ سفارت کے لیے سپین بہتر رہے گا۔ خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے اس ملاقات سے یہی نتیجہ نکالا کہ چیف جسٹس استعفیٰ دینے کو تیار ہیں اور اگر صدر مشرف انہیں بلا کر مستعفی ہونے کو کہیں گے تو وہ بلا تامل ایسا کر دیں گے صدر مشرف کو یہ رپورٹ پیش کی گئی شاید اسی وجہ سے انہوں نے چیف جسٹس کے ساتھ 9 مارچ کو ملاقات کی حامی بھر لی۔ 8 مارچ کے واقعات کی ابھی تک چیف جسٹس کے ذرائع سے تصدیق نہیں ہو سکی تاہم قرائن واقعات کی درستگی کا اشارہ دیتے ہیں۔

9مارچ2007ء

یہ دن پاکستان کی عدالتی تاریخ میں یادگار بن گیا ہے چیف جسٹس افتخار چودھری کے بیان حلفی (دیکھیے ضمیمہ) کے مطابق وہ اپنا کورٹ کا کام کر کے صدر کے کیمپ آفس راولپنڈی روانہ ہوئے جہاں تھوڑے انتظار کے بعد ان کی صدر سے ملاقات ہوئی جو اس وقت فوجی وردی میں تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس ملاقات کی کوریج کی گئی بعد میں صدر نے انہیں کہا کہ ان کے خلاف ججوں کو شکایات ہیں چیف جسٹس نے وضاحت کی تو صدر نے انہیں استعفیٰ دینے کو کہا جس کا چیف جسٹس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے خلاف الزام غلط ہیں اور وہ ریفرنس کا سامنا کریں گے۔

تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کے لیے صدر مشرف کے قریبی دوست ہمایوں گوہر کے حقیقت سے قریب تخیل کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مطابق چیف جسٹس نے اس موقع پر کہا کہ ان کے خلاف اس طرح الزام نہیں لگائے جا سکتے اور وہ اسی جگہ کو کورٹ روم بنا کر اس ریفرنس کو مسترد کر سکتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے اس بیان پر خفیہ اداروں میں کھلبلی مچ گئی اور فوری طور پر متبادل انتظامات کیے جانے لگے۔ حکومتی حلقوں نے اس حوالے سے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی صدر مشرف اور جسٹس بھگوان داس کی ملاقات ہو چکی تھی جس میں شاید جسٹس بھگوان داس نے جسٹس افتخار چودھری کو ہٹانے میں براہ راست فریق بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسی لیے جسٹس بھگوان داس کی بھارت یاترا کا انتظار کیا گیا یا پھر جسٹس سجاد علی شاہ کے بقول بھارت یاترا بھی اسی پلان کا حصہ معلوم ہوتی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حکومت پہلے سے جسٹس جاوید اقبال کو جسٹس بھگوان داس کی عدم موجودگی میں قائمقام چیف جسٹس بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور جسٹس جاوید اقبال کی رضامندی بھی لی جا چکی تھی جسٹس جاوید اقبال کے افتخار چودھری سے کئی معاملات سے اختلافات تھے حالانکہ ماضی میں وہ دوست رہ چکے تھے۔

جسٹس افتخار چودھری کے حلف نامے کے مطابق انہیں آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس کے سربراہ نے کئی گھنٹے محبوس رکھا اور بعد ازاں جب جانے دیا گیا تو تب بھی سپریم کورٹ کی طرف جانے سے روکا گیا اور جاتے ہوئے انہیں بتایا گیا کہ اب وہ چیف جسٹس نہیں رہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماضی میں افغانستان کے حوالے سے شہرت رکھنے والی خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے چیف جسٹس افتخار چودھری کو ہراساں کیا انہیں دھمکیاں بھی دیں اور یہ بھی کہا کہ ان کے پاس ان کی ایسی تصاویر ہیں جو منظر عام پر آ گئیں تو ان کی سبکی ہوگی۔

چودھری شجاعت اور صلح کی کوشش

جونہی چیف جسٹس افتخار چودھری کو غیر فعال کرنے کی خبر باہر نکلی تو ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کے چیف جسٹس افتخار چودھری سے تعلقات اتنے اچھے نہیں تھے لیکن 9 مارچ سے چند روز پہلے ان دونوں کزنز نے چیف جسٹس افتخار چودھری سے ملاقات کی اور یوں ایک طرح سے ناراضگیاں اور شکوے دور کیے۔ ان دونوں بھائیوں کے فرشتوں کو علم تک نہیں تھا کہ وہ جس چیف جسٹس سے محبت بھری گفتگو کر کے جا رہے ہیں وفاقی حکومت چند ہی دنوں میں اس کے خلاف ریفرنس داخل کرنے والی ہے۔ چیف جسٹس افتخار چودھری کو معطل کرنے کی خبر نشر ہوئی تو چودھری شجاعت کی رگ سیاست پھڑکی گو وہ اپنے علاج کے لیے امریکہ جانے والے تھے لیکن انہوں نے اسی وقت چیف جسٹس افتخار چودھری سے ملاقات کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ چودھری شجاعت اور جسٹس افتخار چودھری کے درمیان ملاقات کا ماحول دوستانہ تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی درمیانی راہ نکل سکتی ہے۔ جونہی چودھری شجاعت ملاقات کر کے باہر نکلے ایک خفیہ ایجنسی کے اہل کاروں نے چیف جسٹس کے ملازموں کو گھر سے نکال دیا اور ان کی گاڑیاں وہاں سے نکالنی شروع کر دی چودھری شجاعت کو پتہ چلا تو انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا معاملہ خراب ہو گیا اب مشکل سے ہی سنبھلے گا۔ اور دوسرے روز چپ چاپ امریکہ روانہ ہو گئے۔

وکلاء بمقابلہ حکومت

چیف جسٹس افتخار چودھری کو غیر فعال کرنے، سپریم جوڈیشل کونسل کے فوری قیام اور جسٹس جاوید اقبال کو قائمقام چیف جسٹس بنانے کی خبر نے عوام تو درکنار وزراء تک کو ششدر کر دیا۔ عوام و خواص ابتدائی جھٹکے کے بعد گہری خاموشی میں چلے گئے وکلاء کے حوالے سے یہ گہری خاموشی فوراً ہی طوفان کا پیش خیمہ بنی شروع ہو گئی اور چیف جسٹس کی سپریم جوڈیشل کونسل میں پہلی حاضری سے پہلے ہی ملک میں ایک نئی فضا پیدا ہو گئی چیف جسٹس افتخار چودھری کے گھر کے باہر پہرے تھے ان کے بچے سکول نہیں جا سکتے تھے ان پابندیوں کے خلاف آوازیں اٹھیں ایئر مارشل اصغر خان ان کے گھر پہنچے اور ان سے اظہار یکجہتی کیا۔ اس کے بعد آزاد میڈیا نے دباؤ اتنا بڑھایا کہ حکومت کی پابندیاں کمزور پڑتی گئیں دوسری طرف چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے بھی جرات مندی اور بہادری سے کام لیا اور سپریم کوڈیشل کونسل میں حاضری کے پہلے روز سرکاری گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے اپنی بیوی اور بچوں کے ہمراہ سپریم کورٹ کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا۔ خفیہ ایجنسیوں میں تشویش کی لہر دوڑی انہیں زبردستی گاڑی میں بٹھانے

کی کوشش کی گئی ان کے بال کھینچے گئے یہ سارے مناظر ٹی وی پر دیکھے گئے دیکھتے ہی دیکھتے جرأت انکار کرنے والے جسٹس افتخار باعث افتخار بنتے گئے وہ وکلاء کی تحریک کے لیے انسپائریشن بن گئے۔

سپریم جوڈیشل کونسل

کہا جاتا ہے کہ غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چودھری جب اپنے وکلاء چودھری اعتزاز احسن اور منیر اے ملک کے ساتھ سپریم جوڈیشل کونسل کے پہلے اجلاس میں پہنچے تو سوائے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے سب ججوں نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ کیا سپریم جوڈیشل کا اجلاس کسی کورٹ روم کی بجائے ایک عام کمرے میں ہوا۔ سپریم جوڈیشل کونسل کے اراکین جسٹس جاوید اقبال، جسٹس عبد الحمید ڈوگر، جسٹس افتخار چودھری اور جسٹس صبیح الدین احمد پر مشتمل تھی۔ چیف جسٹس افتخار چودھری کے وکلاء نے پہلے ہی دن سے سپریم جوڈیشل کونسل کے تین ججوں پر اظہار عدم اعتماد کر دیا چنانچہ سپریم جوڈیشل کونسل کی دوسری سماعت کے دوران چودھری اعتزاز احسن اور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تاہم بعد میں دونوں خاندانوں کے ماضی کے تعلقات کا حوالہ دے کر فضاء کو خوش گوار بنالیا گیا۔ شروع میں ایسا لگتا تھا کہ سپریم جوڈیشل کونسل چند ہی روز میں اپنی سفارشات صدر کو بھجوا دے گی لیکن دو سماعتوں میں ہی واضح ہو گیا کہ یہ معاملہ کئی ماہ تک چلے گا۔ اسی دوران لاہور ہائی کورٹ کے جج جسٹس جواد ایس خواجہ نے جسٹس افتخار کے ساتھ ہونے والے سلوک پر مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا یوں پنجاب نے عدالتی بحران میں نمایاں کردار ادا کیا اور ماضی کے برعکس رویئے کا اظہار کیا۔

جسٹس بھگوان داس کی واپسی

قائم مقام چیف جسٹس جاوید اقبال کے حوالے سے اعتراضات اٹھنے کے بعد ساری توقعات جسٹس بھگوان داس کی واپسی کے ساتھ وابستہ ہو گئیں وہ بھارت سے واپس آئے تو انہوں نے قائم مقام چیف جسٹس کا حلف اٹھایا ان کے سامنے سپریم جوڈیشل کونسل پر اعتراضات کے حوالے سے درخواست پیش کی گئی تو انہوں نے لارجر بنچ تشکیل دیا جس نے چند روز سماعت کے بعد سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے حوالے سے اعتراضات کی سماعت کے لیے معاملہ فل کورٹ کو بھیجنے کی سفارش کی۔ بعد ازاں چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کی سربراہی میں فل کورٹ تشکیل دے دی۔

5 مئی 2007ء

یہ وہ دن ہے جب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے حق میں چلائی گئی وکلاء کی تحریک عوامی رنگ اختیار کر گئی۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اسلام آباد سے لاہور تک 5 گھنٹے کا سفر 25 گھنٹے میں

طے کیا وکلاء ساری رات جسٹس افتخار چودھری کا انتظار کرتے رہے لاہور ہائیکورٹ کے 17 ججوں نے چیف جسٹس کی تقریب میں آ کر یہ عندیہ دے دیا کہ پنجابی جج اب اسٹبلشمنٹ کی ڈکٹیشن لینے کو تیار نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ایک اہم ترین عدالتی شخصیت نے استعفیٰ دے دیا لیکن صدر مشرف کی مداخلت پر استعفیٰ واپس لے لیا گیا۔

12 مئی 2007ء

چیف جسٹس کے حق میں چلنے والی تحریک کا فیصلہ کن موڑ اس روز آیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری، ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے لیے کراچی گئے تو انہیں باہر نکلنے نہ دیا گیا۔ ایک رات پہلے سے ہی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ کوئی بھی چیف جسٹس کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ نہ پہنچ سکے کہا جاتا ہے کہ اس روز رینجرز اور پولیس کہیں متحرک نظر نہ آئیں اور پھر کراچی کشت وخون میں ڈوب گیا اپوزیشن کا الزام ہے کہ متحدہ نے چیف جسٹس کے استقبال کے لیے جانے والے جلوسوں پر بے دریغ گولیاں چلائیں یوں پچاس سے زائد لوگ جانیں گنوا بیٹھے اسی روز متحدہ نے کراچی میں اور مسلم لیگ (ق) نے اسلام آباد میں ریلیاں کیں۔ صدر پاکستان نے کہا یہ ریلیاں شو آف فورس ہیں۔ 12 مئی کے واقعے نے چیف جسٹس کی تحریک کو فیصلہ کن رنگ دے دیا اور پنجاب، سرحد، اندرون سندھ اور بلوچستان میں ان کی حمایت میں اضافہ ہوا۔

26 مئی 2007ء

سپریم کورٹ کے احاطے میں 26 مئی 2007ء کو ایک سیمنار ہوا جس میں چیف جسٹس افتخار چودھری اور دوسرے وکلاء نے خطاب کیا حکومت کے بقول اس سیمینار میں فوج اور صدر کے خلاف نازیبا باتیں کی گئیں اور گالیاں نکالیں گئیں اس حوالے سے حکومت نے غداری کے مقدمات درج کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حکومت نے سیمینار کی تقاریر کے حوالے سے سپریم کورٹ میں بھی درخواست دائر کی جسے پہلے مرحلے پر نامکمل قرار دے کر واپس کر دیا گیا۔ اسی دوران چیف جسٹس نے اپنی طرف سے بیان حلفی (دیکھئے ضمیمہ) فل کورٹ میں داخل کیا جس میں 9 مارچ کے واقعات اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کے سربراہوں کے کردار کے بارے میں راز سامنے لائے گئے ہیں۔

عدالتی دھماکہ

وکلاء کی تحریک، ججوں کی ہمت اور میڈیا کے شعور نے بالآخر 20 جولائی 2007ء کو عدلیہ کو عارضی عروج بخش دیا۔ سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس یعقوب علی خان کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے

جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کی سربراہی میں قائم فل کورٹ نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا اور صدارتی ریفرنس کو کالعدم قرار دیا۔

مارشل لائی آرڈر

سپریم کورٹ نے جسٹس افتخار چوہدری کو بحال تو کر دیا لیکن جنرل مشرف کے باوردی انتخاب، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی واپسی جیسے مقدمات جاری تھے۔ 18 فروری 2008ء کے عام انتخابات ہونے والے تھے ان تمام اندیشوں کے پیش نظر صدر جنرل مشرف نے بطور چیف آف آرمی سٹاف 3 نومبر کو چیف جسٹس سمیت 60 ججوں کو بیک قلم گھر بھیج دیا اور یوں اپنے تئیں عدلیہ فتح کر لی اس آرڈر کی بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں نے مذمت کی۔

18 فروری 2008ء

طویل عرصے بعد آزادانہ ماحول میں عام انتخابات کا انعقاد ہوا بدقسمتی سے اس عمل میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو گئیں۔ عام انتخابات سے پہلے مسلم لیگ ن نے اپنے اراکین سے عدلیہ کی بحالی کا حلف لیا۔ عام انتخابات کے نتیجے میں مرکز اور تین صوبوں میں پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی مخلوط حکومت بنی لیکن عدلیہ کی بحالی کا وعدہ پورا نہ ہوا۔

معاہدے

بھوربن اور دوبئی میں عدلیہ کی بحالی کے حوالے سے آصف زرداری اور نواز شریف کے درمیان معاہدے ہوئے لیکن یہ وفا نہ ہو سکے۔

جنرل مشرف کی رخصتی

عدلیہ کی معزولی کے ذمہ دار جنرل مشرف کو بھی بالآخر رخصت ہونا پڑا ان کی جگہ آصف علی زرداری صدر منتخب ہو گئے۔

لانگ مارچ

جمہوریت کی بحالی کو سال سے زائد عرصہ گزر گیا پھر بھی جج بحال نہ ہوئے کئی ججوں کو چور دروازے سے بحال کیا گیا لیکن مسئلہ حل نہ ہوا۔ بالآخر لانگ مارچ کے ذریعے عدلیہ بحال ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سال میں فوجی قیادت کی سوچ بدل چکی ہے اور وہ بھی عدلیہ کی مکمل بحالی کے حق میں ہو گئے ہیں۔ اب اندھیرا چھٹ چکا ہے روشنیوں کی چکا چوند میں اب افتخار چوہدری کا اختیار ہے کہ وہ اندھیروں کو مکمل طور پر دور کریں ماضی میں عدلیہ کا زوال ہمیشہ اندر سے آیا ہے باہر سے نہیں عروج بھی اندر ہی سے آسکتا ہے۔

جسٹس سجاد علی شاہ

چیف جسٹس (ر) سجاد علی شاہ عدلیہ کی تاریخ میں کئی حوالوں سے یاد رکھے جائیں گے انہوں نے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی دو جمہوری حکومتوں سے ٹکراؤ لیا انہیں بے نظیر بھٹو نے آؤٹ آف ٹرن چیف جسٹس بنایا اور بعدازاں انہی سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے ان پر الزام لگا کہ انہوں نے صدر فاروق لغاری سے مل کر وزیراعظم بننے کی کوشش کی دوسری طرف انہوں نے ''ججز کیس'' کا فیصلہ لکھا جس پر بڑی واہ واہ ہوئی پھر وزیراعظم نواز کا زمانہ آیا تو نیا میدان لگ گیا جسٹس سجاد شاہ نے عدالتی اپوزیشن کا محاذ سنبھالا اور پے در پے فیصلے دیئے لیکن بالآخر برادر ججز نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ان کے خلاف ہی فل کورٹ نے فیصلہ دیا اور پھر سپریم کورٹ پر حملے کے ذریعے انہیں کام کرنے سے روک دیا گیا اور یوں ان کی سپریم کورٹ سے رخصتی عمل میں آئی۔

جسٹس سجاد علی شاہ کا دور جوڈیشل ایکٹوازم، عدلیہ اور اہل اقتدار میں کش مکش، برادر ججوں کی بغاوت، حکومت کی عدلیہ کے اندر مداخلت اور پھر سپریم کورٹ پر حملے کے افسوسناک واقعے کے حوالے سے ابھی تک ذہنوں میں تازہ ہے۔

گزشتہ دنوں جسٹس سجاد علی شاہ سے کراچی میں ان کے گھر میں تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں عدلیہ کے حالیہ بحران، ان کی تقرری، ان کے فیصلے اور ان کی جج کی حیثیت سے برخاستگی کے علاوہ سیاست ان کی نجی زندگی اور ان کے خاندان کے حالات زیر بحث آئے چیف جسٹس کے عہدے سے ہٹنے کے بعد ان کے بے شمار انٹرویو ہو چکے ہیں ان کی اپنی کتاب بھی منظر عام پر آ چکی ہے وہ بے شمار سیمینارز میں خطاب کر چکے ہیں عام طور پر اتنی تقریروں اور انٹرویوز کے بعد کوئی نئی چیز سامنے نہیں آتی۔ اس حقیقت کے باوجود ان کے تازہ ترین انٹرویو میں بہت سی نئی انکشاف انگیز باتیں سامنے آئی ہیں۔

اہم نکات

☆ سپریم کورٹ پر حملے کی سازش میں جج خود شامل تھے انہیں سب پہلے سے علم تھا۔
☆ جسٹس جاوید اقبال کو قائمقام بننے سے پہلے پوچھنا چاہئے تھا جسٹس افتخار کدھر ہیں؟
☆ یہ ایک بنی بنائی گیم ہے سب ججوں کو پہلے سے علم تھا کیا ہونے والا ہے؟
☆ یہ سب کہانی ہے۔ کیا جسٹس بھگوان داس کسی غار میں تھے جو مل نہیں رہے تھے۔
☆ چیف جسٹس کا مواخذہ، سپریم جوڈیشل کونسل نہیں صرف سپریم کورٹ خود کرسکتی ہے۔
☆ چیف جسٹس افتخار نے ٹھیک کیا، جج کو جارحانہ انداز میں انصاف دینا چاہئے۔
☆ جسٹس افتخار کو باہر کرنے کے حوالے سے خودساختہ کہانی باہر آجائے گی۔
☆ میرے خلاف سارے جج پنجاب ہاؤس میں جمع ہوئے تھے، سیف الرحمٰن میریٹ سے کھانا منگواتے تھے۔
☆ سپریم کورٹ کے جج اب بھی تقسیم ہیں یہ معاملہ میرے دور سے شروع ہوا۔
☆ کیپٹن صفدر ججوں کے گھروں میں بریف کیس لے کر جاتا تھا۔
☆ سعید الزمان صدیقی حکومت کے خلاف فیصلہ دینے والے تھے اسی لئے پی سی او پر حلف لیا گیا۔
☆ جسٹس ارشاد خان نے ججوں کی اندرونی خبر حکومت کو دے دی اور خود چیف جسٹس بن گئے۔
☆ سعید الزمان صدیقی اور ساتھی ججوں کو حلف دیا ہی نہیں گیا انہوں نے حلف لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔
☆ میں اتنا ہی گستاخ تھا تو جسٹس خلیل الرحمٰن اور ناصر اسلم زاہد کو سپریم کورٹ کیوں لایا تھا۔
☆ نواز شریف نے ایم ایس ظفر کو اقوام متحدہ بھیجا، مارشل لاء لگا تو انہوں نے صدر مشرف کی تعریفیں شروع کردیں۔
☆ نواز شریف نے مجھے صدر پاکستان بنانے کی پیش کش کی تھی میں نے انکار کردیا، مجید نظامی گواہ ہیں۔
☆ مجھ پر تنقید کیوں؟ منظور قادر اور طفیل علی عبدالرحمٰن بھی آؤٹ آف ٹرن چیف جسٹس بنے تھے۔
☆ جج مقدموں میں پیسے لیتے ہیں لاہور ہائی کورٹ میں جتنی کرپشن ہے کہیں نہیں ہے۔

☆ حلفیہ کہتا ہوں مجھے کہا گیا جو بھی خدمت ہو شہباز شریف سے کہہ دیا کریں۔
☆ بے نظیر بھٹو نے مجھ پر مہربانی کی، ان سے لڑائی ضرور تھی لیکن میں نے غصے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا۔
☆ ججز کیس میری تخلیق تھا، جسٹس اجمل میاں کو میں نے ساتھ بٹھایا وہ اس کا کریڈٹ نہیں لے سکتے۔
☆ نظریہ ضرورت کینسر کی بیماری ہے یہ آئین کے خلاف ہے۔
☆ ہمارے پاس کوئی عدالتی آرمی نہیں اس لئے ایسے فیصلے نہیں دیتے جو ہوا میں اڑیں۔
☆ ''برادر'' جج چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لئے چیف جسٹس کے خلاف کام کرتے ہیں۔
☆ کیا واقعی شریف الدین پیرزادہ کا اس معاملہ میں کردار نہیں ہے۔
☆ جمہوری حکومتیں آپ کے فائدے میں ہیں تو پھر عدلیہ ہونی ہی نہیں چاہئے۔
☆ صدر پاکستان کے پاس اختیارات ہونے چاہئیں ورنہ ''مجھے کور ہا کرو'' لکھا جاتا رہے گا۔
☆ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ججوں کو پنجروں میں بند کر دیا جائے؟
☆ آدمی اعلیٰ پوزیشن پر ہو تو تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔
☆ سپریم کورٹ میں کرپشن ہوتی ہے جج فرشتے نہیں ہوتے۔

انٹرویو

سوال: خاندانی پس منظر کیا ہے آپ کہاں پیدا ہوئے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: ہمارے دادا اور پردادا یعنی دو نسلیں سندھ کے علاقے لکیاری، دادو سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ ہم لکھیاری سید ہیں تو لک شریف وہاں ایک جگہ کا نام ہے۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں کی (شاہ صدر) درگاہ دادو میں ہے۔ وہ درگاہ قلندر شہباز کے قریب ہی ہے۔ لکھیاری سیدوں کا تعلق شاہ صدر سے ہے۔ بعدازاں پھر ہمارے والد اور چچا کراچی آئے۔ میرے والد کا نام روشن علی شاہ تھا۔

سوال: والد اور چچا کیا کرتے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: والد اور چچا نے کراچی آ کر پڑھائی کی اور پڑھائی کے بعد سروس میں آئے، اس کے بعد ہماری کراچی کی شہریت کا آغاز ہوا۔ پھر انہوں نے شادیاں کیں۔ کراچی میں رہائش اختیار کی۔ اس طرح میری پیدائش بھی کراچی کی ہے۔

سوال: والد صاحب کیا کرتے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: والد صاحب سندھ ہائی کورٹ میں ڈپٹی رجسٹرار تھے، پھر رجسٹرار بنے۔ بعد میں انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس طرح میرے چچا بھی گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ابھی بھی جام گوٹھ، ملیر میں ہمارے باقی رشتہ دار رہائش پذیر ہیں۔ سکینڈ کزنز وہیں رہائش پذیر ہیں لیکن ہم کراچی کے ہو گئے۔

سوال: پیری، مریدی کا بھی کوئی سلسلہ تھا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: بالکل! پیری، مریدی بہت تھی۔ ہماری دادی کو بہت سے لوگ مانتے تھے، وہ ایک نیک بزرگ خاتون تھیں۔ لوگ ان کے پاس تعویذ وغیرہ بھی لینے آتے تھے۔

سوال: آپ سے کسی نے کبھی تعویذ نہیں مانگا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: (ہنستے ہوئے) نہیں نہیں! ہم نے جب پڑھنا لکھنا شروع کیا تو ایک تبدیلی آ گئی۔ ابھی بھی خاندان کے کچھ لوگ اس طرف مائل ہیں۔ ابھی تک پیری، مریدی ہمارے خاندان میں ہے۔ پھر جو لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ ان باتوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ ورنہ

ہماری فیملی کے اندر روحانیت اور پیری، مریدی پائی جاتی تھی۔ ہمارے والد کی دادی کا نام ''مصری بی بی'' تھا۔ وہ کراچی کے بعد ملیر کے علاقے میں بہت مشہور تھیں۔ ان کے باقاعدہ مرید تھے۔ انہوں نے کچھ کرشمات بھی دکھائے۔ جسے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملیر میں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں ملیر میں باغات وغیرہ بہت زیادہ تھے۔ آج کل تو نہیں ہیں۔ جہاں ندی وغیرہ بہتی تھی لوگوں نے وہاں سے ریت نکال کر ویران کر دیا ہے ورنہ کسی زمانے میں ملیر کراچی سے بہت دور تھا اور ہم ملیر سے کراچی بذریعہ ٹرین جایا کرتے تھے۔ کراچی ریلوے اسٹیشن سے اتر کر ہم ملیر ریلوے اسٹیشن جا کر اترا کرتے تھے۔ پھر ملیر ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک مندر تھا جو اب بھی موجود ہے۔ اس مندر کے پیچھے اونٹ کھڑے ہوتے تھے۔ پھر وہ اونٹ کرائے پر لے کر ہم اپنے گاؤں تک جایا کرتے تھے۔ جام گوٹھ ملیر سے تقریباً دو میل دور تھا۔ اس زمانے میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور لوگ اعتراض کیا کرتے تھے۔ یہاں ویسے بھی مسلمان آباد تھے اور سید خاندان کا تو ویسے بھی اسلام سے گہرا تعلق تھا وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی زبان کافر کی زبان ہے اس لیے یہ نہیں سیکھنی چاہیے۔ آپ نے بھی تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ مسلمانوں نے باقاعدہ ترقی اس لیے نہیں کی کہ ہم نے جلدی انگریزی زبان نہیں سیکھی اور ہندوؤں نے جلدی انگریزی سیکھ لی تو اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کو نوکریاں دیں۔ ان کو سروسز میں لائے تو وہ انگریزوں کے قریب ہو گئے۔ ہم انگریزوں سے نفرت کرتے رہے۔ عورتوں کو تو بالکل بھی نہیں پڑھاتے تھے۔ سید فیملی کی خواتین تو باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بڑی سخت قسم کا پردہ تھا۔ کراچی میں اس زمانے میں ہماری خواتین اگر باہر جایا کرتی تھیں تو گھوڑا گاڑی کے اوپر چادر لگی ہوتی تھی اور وہ پردے میں باہر جایا کرتی تھیں تاکہ لوگ نہ دیکھ لیں۔

سوال: والد صاحب کا رویہ کیسا تھا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: وہ بھی نوجوان تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں اپنے دادا سے اجازت لی کہ آپ ہمیں چھوڑیں۔ اس زمانے میں کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام بنایا گیا تھا تو اس دور میں سندھ سے کافی لڑکے یہاں آکر پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہاں بورڈنگ ہاؤس بھی تھا اور یہ سہولت ان لڑکوں کے لیے تھی جو دور دراز سے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اس زمانے میں کراچی کی آبادی بہت کم تھی۔ صرف لاکھ کے قریب آبادی تھی۔ جو لوگ مستقل رہائش پذیر تھے، وہ تو رہتے ہی تھے مگر سندھ سے آنے والے طلباء کے لیے ہاسٹل وغیرہ کا کوئی بندوبست نہ تھا تو سندھ مدرسہ کے اندر اسی لیے بورڈنگ ہاؤس کی سہولت مہیا کی گئی تھی۔ تو اس دور میں والد صاحب یہاں آئے تھے۔ قائداعظم میرے والد، میرے چچا سمیت کئی دوسرے لڑکے اس مدرسے سے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں

نے بھی اسی مدرسے سے تعلیم حاصل کی۔ اس وقت تعلیم کو آہستہ آہستہ اہمیت مل رہی تھی۔ ہمارے زمانے میں پہلی جماعت کو فرسٹ سٹینڈرڈ کہتے تھے اور ساتویں کلاس کو میٹرک کہتے تھے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نے فرسٹ سے لے کر ساتویں کلاس تک اسی استاد سے تعلیم حاصل کی جو میرے والد صاحب کے استاد تھے۔ ان کا نام مسٹر محمد حسن سولنگی تھا اس زمانے میں وہ کافی بوڑھے تھے۔ مہندی لگے بال اور ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔

سوال: بچپن میں آپ نے کبھی سوچا تھا کہ چیف جسٹس بن جائیں گے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: میں اس بارے میں Ambitious تو بہت تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں قائداعظم ہمارے آئیڈیل تھے۔ انہوں نے پاکستان بنایا تھا تو ہم بھی قائداعظم کی طرح پڑھنا چاہتے تھے اور محنت کرنا چاہتے تھے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ مجھے ساری باتیں یاد ہیں۔ جب میں بچہ تھا تو میں نے باقاعدہ تحریک پاکستان میں اسی طرح حصہ لیا جس طرح بچے لیتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ اونٹ گاڑی میں بیٹھ کر نعرے بازی کرنا۔ ''پاکستان بنائیں گے، پاکستان بنائیں گے''۔ ہندو کو سمجھائیں گے، انگریز کو منائیں گے''۔ اس قسم کے نعرے لگاتے تھے۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک بنے گا جس میں صرف مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ جہاں تک چیف جسٹس بننے کی بات ہے تو ایک تو یہ کہ ہمارے والد صاحب ہائی کورٹ میں کام کرتے تھے۔ کبھی وہ کیسز وغیرہ کی فائل گھر بھی لاتے تھے۔ پھر وہ اس کو رات کو گھر پر بیٹھ کر دیکھتے تھے۔ پٹیشن کا جو پہلا صفحہ ہوتا تھا اس کو الٹا کر کے فولڈ کرتے تھے۔ پھر اس کے ایک حصے میں اعتراضات لکھتے تھے، چونکہ میں چھوٹا بچہ تھا، اس وقت ان کے پاس بیٹھ کر دیکھا کرتا تھا کہ یہ کیا کرتے ہیں تو اس وقت پٹیشن کو غور سے وہ اس لیے دیکھا کرتے تھے کہ اس پر سٹیمپ کم لگی ہوئی ہیں، پولیس اسٹیشن کا نام لکھا ہوا ہے یا نہیں اس طرح وہ Objection نمبر ون، ٹو، تھری لکھ کر اپنے دستخط کیا کرتے تھے اور اس کے بعد وہ دفتر بھیج دیا کرتے تھے، اس زمانے میں میں وہ Objections بھی پڑھا کرتا تھا۔ یہ رٹ پٹیشن ہوتی تھیں۔ جب میں نے تھوڑا بہت پڑھنا شروع کیا تو میں پڑھا کرتا تھا کہ کیا لکھا ہے۔ کس طرح لوگوں کی شکائیتیں درج ہوتی ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ عدلیہ اور قانون کا شوق مجھے ہونے لگا۔ کہ آگے چل کر مجھے عدلیہ کے لیے ہی کام کرنا ہے، میرے والد روشن علی شاہ کے زمانے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے۔ قائداعظم کے بعد مولوی تمیزالدین قانون ساز اسمبلی کے صدر بن گئے قانون ساز اسمبلی نے طے کیا کہ خود مختار ملک کے گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کر دینا چاہیے۔ یہ بات گورنر جنرل غلام محمد کو پتہ چل گئی۔ میں تاریخ پڑھ کر بڑا حیران ہوں۔ کہ

جب یہ ڈرافٹ تیار ہو گیا تھا تو اس کی منظوری میں سات، آٹھ ماہ کا انتظار کیا گیا حالانکہ اگر اسی وقت ڈرافٹ کو اگر یہ فائنل کرا دیتے تو اتنی بات نہ بڑھتی۔ لیکن وہ جان بوجھ کر 25 دسمبر کا انتظار کر رہے تھے کہ 25 دسمبر کو قائداعظم کی سالگرہ ہے تو ہم یہ تحفہ عین ان کی سالگرہ والے دن قوم کو دیں گے۔ غلام محمد کو جب یہ پتہ چل گیا تو انہوں نے 25 دسمبر سے پہلے قانون ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو بھی رخصت کر دیا، پھر مولوی تمیزالدین نے پٹیشن فائل کی تھی، وہ پٹیشن سندھ ہائی کورٹ میں آئی تھی (اس وقت اسے چیف کورٹ آف سندھ کہتے تھے) اس وقت اس کا سٹیٹس ہائی کورٹ سے تھوڑا کم تھا۔ تو اس دور میں مولوی تمیزالدین خان کو چیف کورٹ آف سندھ میں گورنر جنرل کے خلاف رٹ پٹیشن دائر کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ اتنی ان کو تکلیف دی کہ سید شریف الدین پیرزادہ اس زمانے میں تمیزالدین خان کے وکیل تھے۔ پیرزادہ کی گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ بھی کروادیا گیا تھا اس لیے وہ وقت پر پہنچ نہ سکے۔ اس وقت وہ بہت جونیئر تھے۔ ان سب کو پتہ تھا کہ گورنمنٹ سب کچھ کر رہی ہے۔ اپنا پریشر استعمال کر رہی ہے اور مولوی تمیزالدین خان کو کورٹ میں آنے نہیں دے رہے تھے۔ اس زمانے میں سائیکل رکشہ بہت زیادہ تھا تو مولوی تمیزالدین رکشہ میں برقع پہن کر کسی کے ساتھ آئے تھے اور وہاں سے اتر کر وہ ہمارے والد کے دفتر آئے اور ایڈووکیٹ منظر عالم نے اس وقت ساری ڈرافٹنگ وغیرہ کی تھی۔ وہ پھر ان کو ہائی کورٹ Premises میں ملے اور ان کو دفتر لے آئے۔ انہوں نے پھر اپنا برقع اوپر کیا اور پٹیشن دائر کی۔ اس وقت کراچی کی ایڈمنسٹریشن چیف کمشنر کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں آ رہا (کہ ہاشم رضا تھے یا اے ٹی نقوی تھے) انہوں نے ہمارے والد کو فون کیا کہ آپ یہ پٹیشن نہ لیں، بلکہ واپس کر دیں۔ انہوں نے کہا میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ میری ڈیوٹی ہے کہ جو پٹیشن آئے اسے ہم وصول کریں، اس کا تو باقاعدہ رجسٹر میں اندراج ہوتا ہے۔ کمشنر نے کہا کہ نہیں وہ لے کر آپ ہمارے پاس آئیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ہم کیوں آپ کے پاس آئیں۔ ہم تو نہیں آئیں گے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے آپ جا کر کریں۔ میرے والد نے فوراً چیف جسٹس کانسٹنٹائن کو مطلع کیا کہ وہ حکومت کی مداخلت پر بہت ناراض ہوئے بعد ازاں 5 ججوں کے بنچ نے غلام محمد کے فیصلے کو مسترد کر دیا لیکن بعد ازاں فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس منیر نے اس فیصلے کو Set Aside کر دیا یہ فیصلہ غلط تھا اور اس کی بنیاد تکنیکی گراؤنڈ پر رکھی۔

سوال: عدلیہ اور حکمرانوں کا گٹھ جوڑ کیا جسٹس منیر سے شروع ہوا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: وہ اس لیے کہ جو سب سے پہلے حکمران ہو خواہ وہ گورنر جنرل ہو یا وزیراعظم ہو یا ملٹری ہو۔ میں زیادہ تر ملٹری پر بات کروں گا کیونکہ مارشل لاء بھی تو بہت لگے ہیں۔ ایک

کہتے ہیں گناہ صغیرہ اور ایک کہتے ہیں گناہ کبیرہ۔ جو منتخب حکمران ہوتے ہیں اور الیکشن کے ذریعے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی عدلیہ کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تو میں اس کو گناہ صغیرہ سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ جو آرمی والے آئے ہیں ناں۔ ان کو کوئی حق نہیں ہے اس کے ساتھ ملنا گناہ کبیرہ ہے۔ آئین میں ہمیشہ اس بات کی مخالفت ہے کہ فوج کا کردار متعین ہے کہ وہ بارڈر کی حفاظت کرے، ملک کی حفاظت کرے، ملک کی خاطر جان قربان کرے اور بوقت ضرورت آکر آپ کو سول حکومت بلاتی ہے تو وہ آپ کی صرف معاونت کریں۔

سوال: لیکن ہر دفعہ نظریہ ضرورت کے تحت مارشل لاء کو جائز قرار دینا بھی تو غلط ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: (بات کاٹتے ہوئے) میں ابھی نظریہ ضرورت کی طرف آتا ہوں۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں یہ جو نظریہ ہے ناں، یہ ایک کینسر کی بیماری ہے۔ ہم اس کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ آئین میں اس کی ممانعت ہے۔

سوال: نظریہ ضرورت کے پیچھے کون سا فلسفہ کارفرما ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: یہ سب مفادات کے لیے کیا جاتا ہے۔ میں اس پوائنٹ پر بھی آنا چاہتا ہوں کہ ادارے کا جو مفاد ہے ناں اس کو آپ اپنے ذاتی مفاد سے بلند و بالاتر کر کے رکھیں۔ دیکھیں اگر آپ کی دوستی وزیراعظم کے ساتھ ہو جائے گی۔ آپ چھوٹے چھوٹے فائدے لیں تو یہ آپ عدلیہ کے لیے نقصان کریں گے۔ عدلیہ کے لیے کوئی آپ اجتماعی فائدہ نہیں لے سکیں گے۔

سوال: کئی جج جو نظریہ ضرورت کے حق میں فیصلہ دیتے رہے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ عدلیہ کے پاس عملدرآمد کے لیے کوئی طاقت نہیں ہوتی اس لیے اگر فوج آجائے تو اسے قانونی حیثیت دینا مجبوری ہوتی ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: اس حوالے سے دوسو کیس بہت اہم ہے ایوب مارشل لاء کے خلاف کیے گئے اس مقدمے میں عدلیہ نے یہ فیصلہ دیا کہ مارشل لاء بھی حکومت کی تبدیلی کا ایک طریقہ کار ہے جو ساری دنیا میں رائج ہے جہاں سیاستدان ابھی پختہ نہیں ہیں اور جہاں معیشت کے استحکام کے لیے اس طرح کا نظام آجاتا ہے اس طرح سے مارشل لاء کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اصل میں فوج کے ٹیک اوور کے بعد جج سوچتے ہیں کہ انہیں کوئی آئینی بحران پیدا نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: اس کا مطلب ہے جج ڈرتے ہیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: جج ڈرتے نہیں ہیں۔ وہ کریں تو کیا کریں، کیا جج ایسا فیصلہ دیں جو ہوا میں اڑے اور اسے کوئی نہ مانے ہمارے پاس کوئی عدالتی آرمی نہیں ہے۔ سارے کے سارے فیصلوں

پرحکومت ہی عملدرآمد کرواتی ہے۔

سوال: فیصلہ تو سچ اور انصاف پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ اس بات پر کہ فیصلہ پر عملدرآمد ہوگا یا نہیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: بہرحال یہ تو ہسٹری کی بات ہے۔ میں تو Justify نہیں کر رہا۔ سب سے پہلے میں ہی کہتا ہوں کہ نظریہ ضرورت کو دفن کر دو، ختم کرو، نظریہ ضرورت ملک کی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ آپ کے ہاں جمہوری ادارے اور جمہوریت صرف اس لیے نہیں چل رہی کہ آپ ہر مارشل لاء حکومت کو نظریہ ضرورت کے تحت Validate کرتے ہیں۔

سوال: عدلیہ کے موجودہ بحران کو آپ کس تناظر میں دیکھتے ہیں آپ کو عدلیہ سے فارغ کرنے اور آج کے حالات میں کتنی مطابقت ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: بالکل ہے۔ میں ایک بات کہنے والا تھا وہ یہ ہے کہ عدلیہ کے ساتھ اسی قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ عدلیہ کو ہر حکومت (خواہ وہ سول ہو یا فوجی ہو) زیر بار کرنا چاہتی ہے، دباؤ میں لانا چاہتی ہے۔ عدلیہ کی آزادی انتظامیہ کو کبھی پسند نہیں آتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری بے عزتی ہے اگر عدلیہ کسی گورنمنٹ کو کوئی کام کر کے نہ دے۔ حالانکہ 73ء کے آئین میں یہ بات واضح لکھی گئی ہے کہ عدلیہ کا کام آئین کی وضاحت کرنا اور انصاف فراہم کرنا ہے۔ لیکن عدلیہ کے تشریح کرنے کا اختیار اتنا وسیع ہے کہ اس میں وہ انتظامیہ اور مقننہ کو منع کر سکتے ہیں۔ کہ دیکھیں آپ نے اپنی اتھارٹی سے تجاوز کیا ہے۔ نہ صرف انتظامیہ کو کہہ سکتی ہے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ مقننہ کو بھی کہہ سکتی ہے کہ یہ آپ نے جو لاء بنایا ہے آئین سے متصادم ہے، یہ لاء (Fundamental Rights) بنیادی حقوق سے متصادم ہے۔ یہ لاء آئین کے فلاں Provision سے متصادم ہے۔ عدلیہ اس قانون کو مسترد کر سکتی ہے دیکھیں آج وکلاء کی جو تحریک ہے یہ بالکل 1969ء جیسی ہے میں اس زمانے میں بہاولنگر میں تھا وہاں کے وکلاء نے جلوس نہ نکالا تو دوسرے شہروں کی بار ایسوسی ایشن نے وہاں چوڑیاں بھیجیں اور وہاں بھی جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔

سوال: ججوں کی اندرونی لڑائیاں بڑی اہم ہوتی ہے چیف جسٹس افتخار ہوں یا آپ ہوں ''برادر'' ججز کی ناراضگیاں ہی کام کرتی ہیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے جب ججز کو ''برادرز'' کہا جاتا ہے میں آپ کو اندرونی بات بتاتا ہوں کہ یہ برادرز ناراض کیوں ہوتے ہیں۔

سوال: آپ سے بھی ناراض تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: آپ عدلیہ کی بات کرتے ہیں، عدلیہ کا چیف جسٹس تو بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ڈرائیو کر رہا ہوتا ہے۔ ساری بس اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، جتنے اس کے پہیے ہوتے ہیں، وہ بھی ڈرائیور کے چارج میں ہوتے ہیں کہ خدانخواستہ کہیں کوئی پہیہ پھٹ نہ جائے۔ پٹرول ہے یا نہیں ہے، کم ہے یا زیادہ، کیونکہ اسے بس چلاتی ہوتی ہے، ہمارے ''برادرز'' ججز کیا کرتے تھے یہ بھی حکومت کے ساتھ علیک سلیک بناتے ہیں اور ذاتی فائدے لیتے ہیں۔ کسی کو باہر جانا ہے، تو کسی کو میڈیکل ٹریٹمنٹ کراوانی ہے، کسی کو بیٹے یا بیٹی کے داخلے کا پرابلم ہے، کسی کو بیوی کے لیے سکالرشپ چاہیے تو ظاہر ہے کہ ایسے فائدے تو گورنمنٹ دے سکتی ہے ناں، اگر آپ اس طرح انتظامیہ سے دوستی رکھیں۔ یہاں میں آپ کو ایک اچھی مثال بھی دوں گا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو ضیاء الحق نے ختم کیا تھا تو میں اس وقت سپریم کورٹ کا رجسٹرار تھا اور مجھے علم ہے گورنمنٹ کے ساتھ ذاتی تعلقات بنائے جاتے ہیں۔ اور پھر گورنمنٹ کا مفاد جب کسی کیس میں آجاتا ہے ناں تو یہ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں ناں کہ ''برادر'' ججز ناراض ہو جاتے ہیں۔ تو ''برادر'' ججز اس لیے ناراض ہو جاتے ہیں کہ وہ حکومت کا فائدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ''برادر'' ججز کہتے ہیں کہ حکومت کا یہ کام اگر غلط ہے تو آپ اسے صحیح کہہ دیں، آخر ہمیں بھی تو ان کے بہت سے فائدے ہیں، ہم بھی تو انسان ہیں، ہمیں بھی تو زندہ رہنا ہے۔ وہ جو سندھی میں کہتے ہیں ناں ''پانی میں پیر واگوں ساں ویر'' (ترجمہ: اگر آپ نے پانی میں پاؤں ڈالا تو آپ کو مگر مچھ کاٹ سکتا ہے ناں) یعنی اب آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ پانی میں پیر ڈالنا ہے یا نہیں ڈالنا۔ کیونکہ پیر ڈالیں گے تو وہ مگر مچھ گھوم رہا ہے وہ آپ کو ضرور کاٹے گا۔ اس طرح اگر آپ گورنمنٹ سے یا کسی سے بھی بنائے رکھیں گے تو میں جب آپ سے کام کہتا رہوں گا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ بھی کہیں گے کہ شاہ صاحب! ہمارا فلاں کام کریں۔ میری تو آنکھیں نیچی ہو جائیں گی اور میرے ذہن میں یہ ضرور ہو گا کہ میں نے تو فلاں فلاں فائدہ لیا ہوا ہے اس کو کہتے ہیں انفرادی مفاد، تو یہ انفرادی مفاد پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجھے آپ بتائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ موجودہ قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس ایک ماہ کی چھٹی لے کر چلے جائیں، گم ہو جائیں اور گورنمنٹ کو نہ ملیں، آپ کیا سمجھ سکتے ہیں اس بات سے! ہمیں پتہ ہے کہ جب بھی کوئی جج چھٹی پر جاتا ہے اور اول تو وہ جاتا ہی نہیں ہے، کیونکہ ہر سال دو یا ڈھائی ماہ کی چھٹیاں ملتی ہیں صرف بہت اہم میڈیکل ٹریٹمنٹ کے لیے چھٹیوں پر جاتے ہیں، یا ترا کرنے نہیں جاتے۔

سوال: تو آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: بس آپ سن لیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ جس نے جو بات کی ہے اس

میں وزن ہے یا نہیں ہے۔ جسٹس بھگوان داس ایک مہینے کی چھٹی کے لیے چلے جاتے ہیں، دوسری طرف اتنی ایمرجنسی ہوتی ہے کہ چیف جسٹس کو گرفتار کرلیا جاتا ہے، چیف جسٹس کو پانچ گھنٹے آرمی ہاؤس میں بٹھایا جاتا ہے اور قائم مقام چیف جسٹس جس کو ہونا ہے وہ موجود نہیں ہے وہ ملک سے باہر ہے۔ اس بیچارے کو پتہ ہی نہیں ہے، وہ جیسے کسی غار میں چلا گیا ہے اور اس کے اوپر مکڑی کا جالا آ گیا ہے۔ ان کو کوئی بتائے کہ ارے بھائی ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں، انڈیا کوئی اتنا دور نہیں ہے، لکھنو میں خود گیا ہوں وہ کوئی اتنا بڑا شہر نہیں ہے، وہاں پر ٹی وی ہے، اخبار ہیں، غرض ہر چیز ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ ایسے موقع پر جس کو پتہ ہے کہ ملک میں نمبر ٹو کی میری پوزیشن ہے تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جگہ موجود ہو۔

سوال: تو آپ کا خیال ہے کہ یہ سارا کچھ پہلے سے طے شدہ تھا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: اس کو ادھر ہی چھوڑیں۔ چلیں وفاقی وزیر قانون وصی ظفر کو پتہ نہیں تھا۔ کیا واقعی شریف الدین پیرزادہ کا اس میں کوئی کردار نہیں ہوگا۔ ابھی یہ ساری بات چھوڑ کر وہ وزیراعظم کے ساتھ ٹی وی میں نظر آتا ہے۔ ایسے بیٹھا ہے جیسے یہ وزیراعظم کا خاص آدمی ہے۔ حالانکہ پیرزادہ کی خاص بات تو قانون ہے نا، یہ کوئی وزیر خزانہ تو نہیں ہے کہ ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اب یہ جنرل صاحب کو کرائسسز سے نکالنے میں کیوں نہیں مدد کر رہا؟ یہ ساری ایک بنائی ہوئی گیم ہے۔ چلیں مجھے ایک بات بتائیں کہ چیف جسٹس کو بلایا وہ گیا! میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ (But what is the difference between calling on & calling by) وصی ظفر کہتے ہیں کہ انہیں ملنے کے لیے بلایا نہیں گیا بلکہ وہ خود آرمی ہاؤس ملنے کے لیے آئے تھے۔ اچھا یہ ملنے کے لیے جاتے ہیں۔ جنرل صاحب وردی پہنے بیٹھے ہیں اور یہ سارا کچھ ٹی وی پر دکھایا ہے۔ پیچھے رانا بھگوان داس کی عدم موجودگی میں جسٹس جاوید اقبال قائم مقام چیف جسٹس کا حلف اٹھا لیتے ہیں کیا جسٹس جاوید اقبال یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ آج جمعہ کا دن تھا اور چیف جسٹس دن گیارہ بجے تک کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو کیا ہو گیا ہے! کیا وہ اچانک بیمار ہو گئے ہیں، ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے یا وہ بیمار پڑے ہیں! مجھے آپ کیوں قائم مقام چیف جسٹس بنا رہے ہیں؟

سوال: ہوسکتا ہے کہ انہیں بتایا گیا ہوگا کہ جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس بھیج دیا گیا ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: اگر ان کے خلاف ریفرنس بھیجا بھی ہے تو جسٹس جاوید اقبال کو خود تو خیال کرنا چاہیے ناں کہ بھئی ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہے، رانا بھگوان داس کو واپس بلائیں ان کو حالات

بتائیں قائم مقام چیف جسٹس کے حوالے سے آرٹیکل 186 میں تو یہ لکھا ہے کہ" The acting Chief Justice will be the next most senior Judge" اگر ایمرجنسی ہے تو بلایا جا سکتا ہے ناں۔ اب یہ کیا ایمرجنسی ہے کہ آپ آئیں اور قائم مقام چیف جسٹس بنیں اور چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کر رہے ہیں، اس کو سروس سے علیحدہ کر رہے ہیں۔ اب بتائیں کہ اس سے زیادہ ایمرجنسی اور کیا ہو سکتی ہے، یہ میڈیا کا زمانہ، اکیسویں صدی، سائنس و ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ اگر بدعنوانی آپ کریں تو انڈیا تو کیا ساری دنیا میں چلی جاتی ہے۔ ای میل کے پیغام کے ذریعے بات ساری دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ آپ ہی بتائیں جو جج چھٹی پر چلا جائے کیا وہ اپنا ایڈریس پیچھے نہیں چھوڑ کر جاتا، ٹیلی فون نمبر چھوڑ کر نہیں جاتا، یہ ساری کہانیاں ایسی بنائی ہوئی ہیں اب وہ واپس آیا ہے، ہم بات کریں ناں کریں، وہ تین ججز کے خلاف اعتراض کر رہے ہیں، اب کہہ رہے ہیں کہ ان کیمرہ Proceedings ہوں، مخفی رکھیں، ان کیمرہ ہوں یا نہ ہوں، اس کا فیصلہ تو سپریم جوڈیشل کونسل ہی کرے گی۔ اب تو ساری باتیں بالکل عیاں ہو جائیں گی اور ساری خودساختہ کہانی باہر ہو جائے گی کہ کون کس سے ملا ہوا تھا۔

سوال: آپ 1977ء میں بھٹو حکومت کے خاتمے کا واقعہ سنا رہے تھے اس وقت کیا ہوا تھا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگا۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت حالات کیا تھے؟ ٹھیک ہے مارشل لاء لگ گیا اور جنرل ضیاء الحق نے صبح کو اعلان کر دیا۔ میں رجسٹرار سپریم کورٹ تھا۔ میرے نوٹس میں یہ بات آئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کس طرح تعلقات استوار کیے جاتے ہیں، تو میں نے چیف جسٹس (یعقوب علی خان) کو فون کیا کہ سر مارشل لاء لگ گیا ہے اور جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھال لی ہے اور بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھٹو اور ان کے وزراء گرفتار ہو چکے ہیں۔ تو جواباً چیف جسٹس مجھے کہتے ہیں کہ ہاں! مجھے پتہ ہے۔ مجھے لاء منسٹری اور اسٹیبلشمنٹ نے اطلاع بھیج دی ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجھے ابھی ملنے آ رہے ہیں اور میں نے انہیں گیارہ بجے کا ٹائم دیا ہے اور اب تمہیں تمام انتظامات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے کہا سر ٹھیک ہے۔ میری یہ درخواست ہے کہ آپ چیمبر میں ہی بیٹھے رہیں۔ میں ان کو ریسیو کر کے لے آؤں گا۔ یہ آپ کی شان نہیں ہے کہ آپ باہر جا کر ان کو ریسیو کریں۔ ویسے بھی یہ معاملہ عدالت میں ہی آئے گا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ جنرل ضیاء الحق آئے میں نے ان کو ریسیو کیا اور اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام سجاد علی شاہ ہے اور میں رجسٹرار سپریم کورٹ ہوں۔ میں آپ کو چیف جسٹس کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ ان کا استقبال کرنے کے بعد میں ان کو اندر لے آیا اور اندر

چیمبر میں ان کی ملاقات کرائی۔ تعارف کرایا، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاء الحق اور چیف جسٹس یعقوب علی خان آپس میں بیٹھے، دروازے بند ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے سیکرٹری قانون عبدالحئی قریشی کو بلایا، میں تو باہر چلا گیا، باہر باقی دوسرے سارے جنرل بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے ساری رات بھاگ دوڑ کی تھی۔ وہاں پر دو باتوں کا فیصلہ ہوا ایک بات تو شاید یہ تھی وہ چاہتے تھے کہ آئین کو ''منسوخ'' کرنے کے لفظ کی بجائے ''معطل'' کرنے کا لفظ استعمال کریں۔ وہاں لاء سیکرٹری بھی تھے پھر طے ہوا کہ آئین کو Held in Abeyance کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بہر حال اس سے ہمارا واسطہ نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا بات تھی، دوسری بات جو طے ہوئی تھی وہ بہت اہم تھی۔

کہ جتنے بھی چیف جسٹس تھے۔ ان کو فوراً قائم مقام گورنر بنا دیا۔ اب دیکھیں سارے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس گورنر بن گئے، سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس عبدالقادر شیخ گورنر سندھ بن گیا، لاہور ہائی کورٹ کے اسلم ریاض حسین گورنر پنجاب بن گئے سرحد ہائی کورٹ اور بلوچستان ہائی کے چیف جسٹس بھی گورنر بن گئے۔ سب بن گئے۔ فضل الٰہی چودھری کو صدر بنا رکھا تھا تو فضل الٰہی چودھری کا جب پیریڈ ختم ہو گیا تو انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے بعد بھی تقریباً دو سال تک چیف جسٹس گورنرز بنے رہے اور سارے ججز کو ایک ایک سٹیپ اوپر ترقی دے دی۔ اب آپ بتائیں کہ ایسے میں ججز پر اثر ہو گا یا نہیں ہو گا۔ یہ اب آپ بتائیں۔ کہ جب سب ججوں کو ترقی ملے گی تو وہ حکومت کی حمایت میں ہوں گے یا نہیں؟

سوال: آپ کے بارے میں بے نظیر بھٹو کہتی تھیں کہ آپ بادشاہ یا کم از کم نگران وزیر اعظم بننا چاہتے تھے یہی بات موجودہ چیف جسٹس افتخار چودھری کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ وہ بہت زیادہ اختیارات چاہتے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: وہ غلط کہتی تھیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آئین کی پابندی اور پیروی کرتے ہیں۔ ہم سپریم کورٹ میں وہی Jurisdiction استعمال کرتے ہیں جو ہمیں آئین نے دی ہیں۔ یہ آئیڈیاز کی بات ہے۔ امریکہ جس کی گورنمنٹ پیرو مرشد کی طرح پیروی کرتی ہے۔ ان کی سپریم کورٹ نے کہا کہ

Constitution is what the supreme court says it is?

یعنی ان کی ترجمانی کرنا، ہمارے ہاں کچھ ججز بہت بولڈ قسم کی آئینی تشریح کرتے ہیں۔

سوال: لیکن عملی طور پر تو یہ ہوا ہے کہ آپ کے اقدامات سے دو جمہوری حکومتیں بے نظیر بھٹو

اور نواز شریف ختم ہو گئیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: میرے دل میں بھی جمہوری حکومتوں کے لیے نرم گوشہ ہے لیکن ہمیں پتہ ہے کہ یہ جمہوری حکومتوں والے جب کرسی پر بیٹھتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ میں نے بے نظیر کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ بے نظیر نے میرے اوپر احسان کیا کہ اس نے مجھے Out of turn چیف جسٹس بنایا آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ مہربانی کی کوشش نہیں کرتا ہوں گا۔

سوال: ہر کوئی جانتا ہے کہ آپ بے نظیر بھٹو سے ناراض ہو گئے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: میں ناراض نہیں ہوا تھا۔ ان کے کام بہت غلط تھے۔ جب ان کے کام غلط تھے۔ تو وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ چیف جسٹس ان کی ہاں میں ہاں ملائے اور ہم جس طرح مرضی ہے کام کرتے جائیں۔

سوال: لیکن صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آپ اور صدر فاروق لغاری ملے ہوئے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: نہیں نہیں! فاروق لغاری سے میری بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے ان کو جا کر کہا تھا کہ فاروق لغاری صاحب آپ صدر ہیں۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب میری پوزیشن بہت مختلف ہے۔ شروع شروع میں تو یہ بات تھی کہ فاروق لغاری، وزیر اعظم سے بات نہیں کرتے تھے۔ مجھے کہتے تھے کہ شاہ صاحب! وہ نہ صرف ہماری بہن ہے بلکہ وہ ہمارے لیڈر کی بیٹی ہے۔ ہم ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ہم ان کے سامنے بول نہیں سکتے، تو یہ بولنے کا کام آپ کریں۔ میں نے کہا کہ بھئی میں تو آپ کے ساتھ ڈسکس کرتا ہوں کہ یہ آئین ہے، یہ Provision ہے، یہ کام آئینی طریقے سے ہونا چاہیے اور یہ کام غیر آئینی طریقے سے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قانون ہے۔ فاروق لغاری کہتے تھے کہ میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ متفق ہیں تو آپ وزیر اعظم کو بتاتے کیوں نہیں ہیں؟ تو مجھے فاروق لغاری نے جواب دیا کہ بولنے کا کام آپ کریں کیونکہ آپ کے پاس کوئی Stakes نہیں ہیں۔ ہماری تو وہ پارٹی لیڈر ہیں اس لیے ہم ان کے سامنے نظریں نیچے کیے کھڑے رہتے ہیں۔ اگر وہ غلط کام کہتی ہیں تو ہمیں کرنے پڑتے ہیں۔

سوال: پھر تو یہ الزام صحیح ہے کہ آپ اور فاروق لغاری آپس میں ڈسکس کر کے معاملات چلاتے تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: میں آپ کو بتاؤں کو اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، کوئی ہماری سازش نہیں تھی (غصے میں) ہم نے لغاری سے کوئی زمین نہیں لی تھی، یا کوئی سرداری نہیں لی تھی، یا ہم

نے پیسے نہیں لیے تھے، سمجھ میں آئی بات۔ میں صرف قانون کی بات کرتا تھا میں کیوں وزیراعظم سے اختلاف کرتا؟ اس کو ہم سندھی میں کہتے ہیں کہ۔ ''نانگ جے پر میں پتھ وجا''۔ترجمہ (یعنی سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہے) سب لوگ کہا کرتے تھے کہ یار! تم کیوں وزیراعظم سے جھگڑا کرتے ہو۔ وزیراعظم سے تو تم فائدے لو، تمہیں زمین مل سکتی ہے، پلاٹ مل سکتا ہے، تم جو چاہو، وزیراعظم سے لے سکتے ہو، میں صدر لغاری سے صرف یہ چاہتا تھا۔ آپ جو کہتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو تمہارے لیڈر تھے، اور تم اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ ان کے آپ کے اوپر بڑے احسان ہیں، ان کی وجہ سے آج آپ صدر پاکستان بن کر بیٹھے ہو، اب میں ساری بات کو مانتا ہوں، سارے احسانات اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب آپ کی پوزیشن بطور صدر پاکستان کی ہے۔ یعنی پاکستان کی ساری سالمیت کا انحصار آپ پر ہے۔ آپ اس ریاست کے سربراہ ہیں۔

سوال: لیکن شاہ صاحب! آخر اس کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ دو جمہوری حکومتیں چلی گئیں؟

جسٹس سجاد علی شاہ: (غصے سے) یہ تو آپ اس بات تک محدود کر رہے ہیں کہ دو جمہوری حکومتیں چلی گئیں، آدمی انتقال بھی کر جاتے ہیں، ایک شریف آدمی، پانچ منٹ پہلے ہارٹ اٹیک ہوا اور چل بسا، ہائے ہائے اس نے تو ہمیں کچھ کہا بھی نہیں۔ پھر جمہوری حکومتیں بھی ایسے ہی جمہوری حکومتیں نہیں ہیں بھائی، جمہوری حکومتیں جس طریقے سے کام کراتی ہیں، جس طریقے سے حکمت عملی بناتے ہیں سب کچھ کرتے ہیں تو

They do'nt want the court to do Justice according to law

اگر اس طرح کی جمہوری حکومت آپ کے کے فائدے میں ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر تو عدلیہ ہونی ہی نہیں چاہیے اس محکمے کو ویسے ہی سرے سے ختم کر دیں۔

سوال: کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ بے نظیر بھٹو آپ کو آوٹ آف ٹرن چیف جسٹس بنایا لیکن آپ رویہ درست نہیں تھا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: میں اس وقت بھی اس کو آوٹ آف ٹرن کہا کرتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس حوالے سے آئین کا آرٹیکل مبہم ہیں۔

سوال: جیسے کہ یہ Out of turn تقرری ہے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: دیکھیں جب آئین بناتے ہیں ناں تو ہم انگریزی میں یہ بھی کہتے ہیں

You can not question the wisdom of the constitution makers

وہ ان کا اپنا Wisdom ہوتا ہے۔ اگر ایک پارٹی یا اقتدار میں آتی ہے تو وہ کسی حکمت عملی کے تحت اپنا کام کرے گی۔ اگر انہوں نے لینڈ ریفارمز کرنے ہیں، وہ تو سب اپنی حکمت عملیاں بنا کر آئیں۔ آپ آئین بناتے ہیں تو آئین میں آپ یہ لکھتے ہیں کہ

President shall appoint the chief justice

جبکہ آپ قائم مقام چیف جسٹس کے لیے یہ آئین بناتے ہیں

In the absence of chief justice the president shall appoint the most senior judge as an acting chief justice

اب چیف جسٹس کے لیے لکھا ہوا ہے کہ صدر چیف جسٹس کا تقرر کریں گے۔ جب کہ ایکٹنگ چیف جسٹس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سینئر موسٹ جج ہو۔

سوال: اس کا مطلب ہے کہ آئین میں یہ ابہام تھا جس کی وجہ سے آپ کو آؤٹ آف ٹرن چیف جسٹس بنایا گیا؟

جسٹس سجاد علی شاہ: ہاں! ابھی بھی ہے۔ ابھی پتہ کیا ہے! میں آپ کو سپریم جوڈیشل کونسل کا بتاتا ہوں کہ اس میں کیا ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے بارے میں آئین میں لکھا ہے۔

There will be the chief justice of the supreme court of Pakistan and two senior most judges and two senior most chief justices of the high courts.

یہ "Two" کا لفظ 1956ء کے آئین سے آیا ہے جب پاکستان کے صرف دو صوبے تھے یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان۔ یہ آئین دراصل ایک دوسرے کو کاپی کرتے ہیں۔

سوال: حالانکہ صوبوں کے لحاظ سے یہاں چار چیف جسٹس ہونے چاہئیں تھے؟

جسٹس سجاد علی شاہ: چار تو اب ہیں ناں۔ اس وقت تو ون یونٹ بن گیا تھا۔

سوال: آپ کے کہنے مطلب یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اگر چار ہیں تو اب آئین میں لفظ چار ہونا چاہیے کیونکہ اب چار صوبے بن چکے ہیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: دیکھیں! ابھی تو آپ جو بھی تجویز کریں۔ لیکن قطع نظر اس کے سپریم جوڈیشل کونسل قائم کر دی گئی اب انہوں ایک Excluding کلاس بنائی، جس کی وضاحت میں Exclusion آتا ہے۔ اب exclusion میں یہ لکھا ہے۔

If for some reasons a member of the council is himself

involved before the council

اب اگرتو وہ سپریم کورٹ کے ججز میں سے ہےتو وہ جج سپریم جوڈیشل کونسل سے ہٹ جائے گااوراس کی جگہ پر نیا سینئر جج آئے گا۔ اگر چیف جسٹسز ہائی کورٹ میں سے ہے اور ریفرنس ان کے خلاف ہےتو وہ ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پر دوسرے صوبے سے چیف جسٹس آئے گا (اور ان کی سنیارٹی ایسے ہوگی کہ سارے چیف جسٹسز کی سنیارٹی کو ملاکر) پھراس کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے کہ چیف جسٹس کی سنیارٹی میں ان کا قائم مقام چیف جسٹس کا عرصہ شامل نہیں کیا جائے گا۔ پھر آئین میں یہ بھی لکھا ہے کہ (ہائی کورٹ کا) ایکٹنگ چیف جسٹس سپریم کونسل کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ اب اگر ہائی کورٹ کا ایکٹنگ چیف جسٹس سپریم جوڈیشنل کونسل کا رکن نہیں ہوسکتا تو سپریم کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس، سپریم جوڈیشنل کونسل کا رکن کیسے ہوسکتا ہے۔

ججز کیس کے فیصلے میں بھی ایکٹنگ چیف جسٹس کو بڑا ڈاون گریڈ کیا گیا ہے۔ ایکٹنگ چیف جسٹس کا مطلب ہے عارضی اور وہ صرف ایک یا دو مہینے کے لیے ہوتا ہےاوراس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ آپ روٹین کے کام کریں۔ پالیسی میٹرز میں آپ مداخلت نہ کریں جسٹس افتخار کا ہٹانا تو بہت بڑا پالیسی میٹر تھا۔ ایکٹنگ چیف جسٹس تو اس معاملہ میں Beneficiary ہے، مجھے تو آئین سے یہ تاثر ملتا ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف سپریم جوڈیشنل کونسل میں کارروائی ہو ہی نہیں سکتی۔

The supreme judicial council is complete only when it is headed by chief justice of Pakistan & according to my reading & assessment no proceeding can take against the chief justice of Pakistan, before supreme judicial council

سوال: آپ کی بات کا مطلب تو یہ ہے کہ پھر چیف جسٹس کے مواخذے کا آئین میں کوئی حل ہی نہیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: اس کا حل وکیلوں نے نکالا ہے اور وہ ابھی سپریم کورٹ کی Jurisdiction میں گئے ہیں۔ سپریم کورٹ جوڈیشنل کونسل سے ہٹ کر۔

سوال: تو کیا صرف سپریم کورٹ چیف جسٹس کے خلاف کارروائی کرسکتی ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: بالکل!! جیسا کہ انہوں نے میرے خلاف کیا تھا تو پھر سپریم جوڈیشنل کونسل میں تو نہیں گئے تھے ناں۔ کیونکہ میرے خلاف تو کوئی الزام تو تھا ہی نہیں۔ صرف ایک ہی الزام تھا کہ مجھے آؤٹ آف ٹرن چیف جسٹس مقرر کیا گیا تھا۔

سوال: آپ نے اپنی کتاب میں خود اعتراف کیا ہے کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ مقرر ہونے سے پہلے آپ کو خفیہ طور پر طیارے میں اسلام آباد لایا گیا یہ کوئی اچھا اقدام تو نہ تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: یہ بات صحیح ہے۔ جہاں تک میرے جانے کا سوال ہے تو یہ موجودہ جج بھی تو طیارے میں گئے تھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ جو ایکٹنگ چیف جسٹس رہے ہیں جسٹس جاوید اقبال۔ ان کو فون کر کے بتادیا گیا کہ آج یہ کارروائی ہونے والی ہے اور یہ جو دو جج ہیں ناں کیونکہ سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بھی تو سپریم جوڈیشل کونسل کا ممبر ہے ناں۔ کیونکہ چودھری افتخار کو 5 گھنٹے کے لیے (Detain) حراست میں رکھا ہوا تھا تاکہ اس دوران ایکٹنگ چیف جسٹس بن جائے اور سپریم جوڈیشل کونسل کا تقرر ہو جائے۔ یہ سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بھی تو صدر کے طیارے میں گیا ہے ناں اور لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بھی۔ تاکہ عام لوگ دیکھ نہ سکیں۔

سوال: دوسروں کی بات چھوڑیں آپ تو بڑے اصول پسند ہیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: Up-Right کی بات نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ اس کی گاڑی میں کیوں گیا، ویسے بھی کہتے ہیں کہ اگر میں اکانومی کلاس میں طیارے میں جاتا اور لوگ دیکھ لیتے تو خبر بن جاتی۔

سوال: آپ نے خود یہ لکھا ہے کہ آصف زرداری نے آپ کو کہا کہ آپ پہلے استعفیٰ لکھ کر دیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ہاں یہ تو صحیح بات ہے کہ زرداری نے مجھے کہا تھا۔ وہ استعفیٰ لکھ کر جیب میں لے آئے تھے اور بولے کہ سائن کر دیں اور جب بھی آپ سے اختلاف ہوگا تو بی بی اس کو ٹی وی پر اناؤنس کر دے گی۔

سوال: تو آپ نے سائن نہیں کر کے دیئے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: نہیں میں نے اسے کہا کہ میں آپ کا سیاسی ممبر تھوڑی ہوں۔ یہ تو میرا کیریئر ہے میرے کوئی ایسے سیاسی عزائم نہیں ہیں۔

سوال: جوڈیشل ایکٹوازم پر بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہے آپ نے تو اسمبلی کی منظور شدہ آئینی ترامیم کو مسترد کر کے نئی مثال کر دی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: جو لوگ کہتے ہیں کہ میں نے آئینی ترمیم کو مسترد کر دیا وہ میرے آرڈر کو پڑھیں۔

سوال: آپ نے چشم زدن ترمیم کو غیر آئینی قرار دے دیا، لوگ تو کہتے ہیں آپ فیصلہ پہلے

سے ہی لکھ کر لائے ہوئے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ایسے ہی کہتے ہیں جیسے ہمیں آرڈر لکھنا ہی نہیں آتا۔ کوئی بات نہیں ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ ہم تو اوپن کورٹ میں سارے آرڈرز لکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم سیشن جج کے دور میں بھی کھلی عدالت میں فیصلے لکھوا دیا کرتے تھے۔ یہ جوڈیشل ایکٹوازم بڑا ضروری ہے میں اب بھی اس کی حمایت میں ہوں۔ مجھے اگر دوبارہ چیف جسٹس بنائیں تب بھی یہی کروں گا اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ چیف جسٹس چودھری افتخار نے بھی صحیح کیا تھا۔ آپ کو assertive ہونا چاہیے۔ سول پروسیجر کوڈ میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ ہر سول کورٹ اپنی Jurisdiction کو Assert کرے اس وقت تک جب کہ اس کو روکا نہ جائے یعنی عدالت کا کام ہے کہ وہ جارحانہ انداز میں اپنا کام کرے یہاں تک کہ اعلیٰ عدالتیں اس پر کوئی پابندی لگائیں۔ جہاں تک آئینی ترمیم کو رد کرنے کا تعلق ہے معاملہ یہ تھا کہ پہلے آئین میں آرٹیکل 58 ٹو بی موجود تھا، اس کی موجودگی میں کم از کم مارشل کا دروازہ تو بند تھا ناں، اور ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ بھائی یہ جو آپ 8ویں ترمیم کے بارے میں کہہ رہے ہیں ناں کہ ضیاء الحق کے زمانے میں 8ویں ترمیم آئی۔ اس میں تمام قوانین کے بارے میں جس پر Blanket validation آئی تھی۔ اس میں کچھ باتیں اچھی بھی تھیں۔ ضیاء الحق نے کہا تھا میں جو یہ 58 ٹو بی لا رہا ہوں اگر یہ نہ ہو تو آپ کے آئین میں وزیر اعظم اور صدر سمیت دو ہستیاں نہیں ہونی چاہیے بلکہ ایک ہونا چاہیے۔ یا پھر آپ صدارتی نظام لے آئیں لیکن اگر آپ پارلیمانی نظام لانا چاہتے ہیں اور وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں تو چلیں ٹھیک ہے لیکن اگر یہ دونوں رکھنا ہیں تو پھر صدر کو اختیارات تو دیں ناں، صدر کو پھچہ تو نہ بنائیں ناں لوگ یہ نہ کہیں کہ ''پھچے کو رہا کرو''۔

سوال: اسمبلی توڑنے کے حوالے سے آپ نے دو متضاد فیصلے دیئے باقی ججوں نے نواز شریف کی اسمبلی بحال کی تو آپ نے اختلافی نوٹ لکھا اور کہا سندھ کیساتھ تعصب برتا جاتا رہا ہے مگر پھر 1996ء میں بے نظیر کی اسمبلی ٹوٹی تو آپ نے اسمبلی توڑنے کے حق میں فیصلہ دے دیا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میرے دونوں فیصلے صحیح تھے میرے پہلے فیصلے میں یہ تھا کہ دو وزرائے اعظم کو 58 ٹو بی کے نام پر قربان کیا گیا ہے اب پنجابی وزیر اعظم کی باری آئی ہے تو رویہ تبدیل کیوں ہو رہا ہے بعد میں بے نظیر کو ہٹایا گیا تب بھی میری رائے میں انہیں ہٹانا ٹھیک تھا۔

سوال: کیا آپ یہ تجزیہ نہیں کرتے کہ آپ بے نظیر بھٹو کے خلاف اس وقت غصے میں آ گئے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: مجھے بتائیں، مجھے کیوں غصہ آتا، She was kind to me۔

سوال: لیکن آخری دنوں میں تو لڑائی ہوگئی تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: لڑائی ہوگئی لیکن اس میں تو غصے والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ بے نظیر نے وزارت عظمیٰ کے آخری دنوں میں اٹارنی جنرل قاضی جمیل اور پھر اقبال حیدر کو بھی ہٹا دیا۔

سوال: قاضی جمیل سے بھی تو آپ کی بنتی نہیں تھی اسی لیے انہیں ہٹا دیا گیا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (ہنستے ہوئے) پتہ نہیں اب تو ساری باتیں یاد نہیں۔

سوال: یہ سب کچھ تو اخبارات میں آتا تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: خبریں بھی تو حکومت کی طرف سے شائع ہوتی ہیں سپریم کورٹ تو خبریں شائع نہیں کرواتا۔

سوال: عام تاثر جو بندہ لے گا وہ تو یہی لے گا ناں کہ آپ میں بے نظیر بھٹو کے خلاف تعصب پیدا ہو گیا تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: عام تاثر تو بندہ میڈیا سے ہی لے گا اور میڈیا تو گورنمنٹ کا ہوتا ہے۔ میں جو بات بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ میں تعصب ہے یا نہیں۔ بے نظیر نے ریفرنس دائر کیا تھا اور صدر نے بھی ریفرنس دائر کیا تھا۔ بے نظیر تو یہ کہتی ہے کہ اس دن چھٹی تھی اور عدالت کو قفل لگے ہوئے تھے، میں نے عدالت کھول کر صدر کا ریفرنس وصول کیا۔ بہر حال یہ بڑی غلط بات ہے۔ بے نظیر جب ہٹ گئی اس وقت بھی کیس چل رہا تھا۔ تو یہ عدالت میں آئی۔ اس کے وکیل اقبال حیدر تھے اور وہ اس کے Behalf پر ہی آئے تھے اس نے یہ درخواست کی کہ سابقہ وزیر اعظم پاکستان کہتی ہیں کہ مجھے اس کیس میں پرائیویٹ پارٹی رہنے دیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ویسے بھی سوال آئینی شرح کا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں صدر فاروق لغاری نے یہ سوال پوچھا تھا کہ آپ نے ججز کیس فیصلہ دیا ہے، اس میں حوالے بہت دیئے ہیں کہ آرٹیکل ٹو اے کیا کہتا ہے؟

پھر اس مقدمے میں یہ سوال زیر بحث آیا کہ ججوں کی تقرری کے معاملے میں وزیر اعظم کی رائے کو شامل نہیں کرنا چاہیے یا اسے Exclude کر دینا چاہیے اس وقت وزیر اعظم نہیں تھا سب لاء آفیسرز کہہ رہے تھے کہ وزیر اعظم سیاسی ہوتا ہے اس لیے جب وہ ججز کی تقرری کرتا ہے تو اس میں سیاسی رنگ آجاتا ہے۔ میں نے پھر بھی آئین کی روح کے مطابق فیصلہ دیا اور کہا کہ پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم کی رائے کو شامل کرنا ضروری ہے۔ بے نظیر کے خلاف ہوتا تو پھر میں یہ فیصلہ کیوں دیتا۔

سوال: دیکھیں شاہ صاحب ججز کیس کے بارے میں بھی بڑی باتیں ہوتی ہیں بہت سے ججز

کہتے ہیں کہ آپ نے اس فیصلے میں خودسنیارٹی کا رول طے کیا اور خود ہی اس پر عمل نہیں کیا، حالانکہ اس فیصلے کے تحت آپ کو چیف جسٹس کا عہدہ خالی کر دینا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ارے بھائی میں نے آپ کو اس لیے آئین پہلے دکھایا ناں، کہ آوٹ آف ٹرن اور چیف جسٹس کی تقرری میں آئین واضح ہے۔

سوال: ججز کیس کے بعد تو آپ کو قربانی دینی چاہیے تھی۔

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: چھوڑ دیں اس بات کو! اس بات پر آپ نہ جائیں تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ ان ججز کے بارے میں آپ کو میں کیا بتاؤں! پھر ذاتیات پر بات آجاتی ہے۔ جو بات میں نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے کیا فائدے لیے ہیں۔ ان ججز نے آخر میں وزیراعظم کے ساتھ مل کر کیا کیا، ججز کیس کے اندر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میں عہدے سے ہٹتا۔ نواز شریف کے دور میں جب سپریم کورٹ پر اٹیک ہوا تھا۔ نواز شریف اس وقت بار بار کہہ رہا تھا کہ میں ججوں پر کام کر رہا ہوں اور جلد ہی چیف جسٹس اکیلا رہ جائے گا اور اس کے خلاف ایکشن ہم اندر سے لیں گے کیونکہ باہر سے تو نہیں لے سکتے تھے۔ اور سینٹ میں تو خاص طور پر ان کے پاس سے 2/3 اکثریت نہیں تھی وگرنہ تو یہ سینٹ میں میرے خلاف باقاعدہ ایکشن کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے باہر کرنا چاہتے تھے کیونکہ میں نے ان کے خلاف Contempt کا کیس کیا تھا اور دوسرے بہت سے کرپشن کے مقدمات تھے۔ اس میں مواد تھا اور ڈاکومنٹس بھی تھے۔

سوال: جسٹس خلیل الرحمٰن کہتے ہیں کہ آپ بنگلہ دیش کی مثالیں دیا کرتے تھے کہ وہاں چیف جسٹس نگران وزیراعظم بن سکتا ہے تو یہاں کیوں نہیں بن سکتا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: نہیں نہیں! میں یہ کہاں کہتا تھا۔ اجمل میاں کے گھر میں کہتا تھا یا خلیل الرحمٰن کے گھر میں۔ یہ تو ہوائی باتیں ہیں ناں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ مجھے بات کوئی ریکارڈ پر بتائیں۔ آپ اور ہم بھی بیٹھ کر کتنے ملکوں کی بات کر رہے ہیں چلیں یہ ایک بات تو صحیح ہے کہ بنگلہ دیش میں ایک طریقہ کار تو موجود ہے ناں۔

سوال: ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کے اس جذبے کی ترجمانی کر کے کہہ رہے ہوں کہ آپ نگران وزیراعظم بننا چاہتے ہیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: پھر میں کیوں نہیں بنا میرے پاس تو موقع بھی تھا۔ بے نظیر کی حکومت جب ختم ہوگئی تو پھر بھی میں نے جو فیصلہ دیا تھا اس میں ججوں کی تقرری کے حوالے سے وزیراعظم کی رائے کو بحال رکھا تھا اس فیصلے کی بے نظیر بھٹو کے وکیل اقبال حیدر تک نے تعریف کی تھی۔

سوال: آپ کو ان ججز کا جواب تو دینا چاہیے جو کہتے ہیں سینارٹی اصول پر آپ کو قربانی دے دینی چاہیے تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (غصے سے، اکتائے ہوئے انداز میں) کس چیز کی قربانی یار! یہ آپ پہلے آئین کو جا کر ٹھیک کریں پھر مجھ سے قربانی مانگیں۔

سوال: جب آپ نے ججز کیس میں فیصلہ کر لیا تو پھر تو حالات بدل گئے تھے آئین کی تشریح بھی بدل گئی تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (درمیان میں تیزی سے بولے) دیکھیں میری سنیارٹی کے خلاف بے نظیر بھٹو نے پشاور ہائی کورٹ میں پٹیشن داخل کی تھی اور یہ سارا معاملہ طے ہو چکا تھا اور ایڈووکیٹ وہاب الخیری نے میرے خلاف مقدمے پر زور ہی نہیں دیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اگر عدالت میرے خلاف جا کر فیصلہ دے تو دے تو اس وجہ سے ہم نے اس معاملے کو طے نہیں کیا تھا۔ اعتراض کرنے والے جج جھوٹ بولتے ہیں۔ اب بھی آپ کو پتہ ہے کہ ہائی کورٹ کے ایکٹنگ چیف جسٹسز جو ہے ناں اس کے لیے سینئر Most کا Provision نہیں ہے۔ یہ تو ہمیشہ Debatable رہا ہے۔ اچھا دوسری بات یہ جو سپریم کورٹ کی تقرری کا 177 اور 178 آرٹیکل پڑھیں کہ سپریم کورٹ کا جج کون بن سکتا ہے؟ اس میں لکھا ہوا ہے کہ سپریم کورٹ کا جج بننے کے لیے جو شرائط ہیں وہ یہ ہیں کہ ہائی کورٹ کا جج ہو جس نے 5 سال تک سروس کی ہو وہ آسکتا ہے۔ یا وہ وکیل جس نے پندرہ سال پریکٹس کی ہو، وہ بھی آسکتا ہے۔ اگر وہ سپریم کورٹ کا جج ہو سکتا ہے تو وہ چیف جسٹس بھی ہو سکتا ہے۔ ججز کیس کا فیصلہ میں نے لکھا ہے اس فیصلے کا مصنف میں ہوں میں نے لفظ Consent یا منظوری کی تشریح کی ہے۔ یہ میری تخلیق ہے۔ یہ اجمل میاں کی نہیں ہے۔ اجمل میاں کو تو میں نے ساتھ بٹھایا تھا۔ جواب اس فیصلے کے کریڈٹ کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ناصر اسلم زاہد کو تو شریعت کورٹ میں بھیج دیا گیا تھا تو ان کو تو وہ دکھ تھا۔

سوال: ان کو کس نے شریعت کورٹ میں بھیجا تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: وہ چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ کے تھے۔ میں نے انہیں شریعت کورٹ میں نہیں بھیجا تھا۔ حکومت نے بھیجا تھا، حکومت کے پاس اتنی پاور تو ہوتی ہے۔ انڈیا میں بھی اگر آپ ایک صوبے میں کام کرتے ہیں یا آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا پریکٹس کرتا ہے۔ آپ کو ہائی کورٹ کا جج بنا کر دوسرے صوبے بھیج دیں عدلیہ چلانے کا خرچہ کون دے گا۔ عدلیہ کوئی فنڈز پیدا کرنے والا ادارہ تو نہیں ہے۔ ہم کوئی ایکسائز، کسٹمز یا ڈیوٹی تو نہیں لیتے۔ ہمارے پاس تو زیادہ سے زیادہ جو پیسے آتے ہیں وہ کورٹ فیس کے آتے ہیں اس لیے انتظامیہ کے پاس اختیارات تو ہوتے ہیں کہ وہ تبادلے

کر سکے کیونکہ فنڈز جو وہی دیتی ہے۔

سوال: یہ سارے کے سارے ججز آپ کے کیوں خلاف تھے! ایک تو آپ نے وجہ بتائی کہ یہ مفادات حاصل کرتے تھے، کیا آپ کا رویہ ان کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: پتہ نہیں! میری تو آپ سے ایک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں کہ میرا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے! یا تو آپ یہ ڈکلیر کر دیں کہ میں پاگل ہوں۔

سوال: دیکھیں، برادرز ججز آپ کے حوالے سے بار بار یہی کہتے ہیں ناں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (افسردگی سے) چھوڑیں یار ہم نے تو ان کے ساتھ وقت گزارا ہے تو ہمیں بہت اچھی طرح پتہ ہے کہ کون کیا کر رہا تھا؟

سوال: آخر ایسی کیا بات تھی کچھ دوستی تو ہونی چاہیے، کیونکہ آپ سب سے بڑے اور سینئر ادارے کے اراکین تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: انشاء اللہ! آپ کو بہت جلد پتہ چل جائے گا۔ میں ایک اور کاوش کر رہا ہوں۔ جس طرح آپ پوچھ رہے ہیں تو میں بتائے دیتا ہوں کہ یہ بڑی غلط بات ہے۔ ان لوگوں نے ساڑھے تین سال مجھے برداشت کیا، میں ان کو وفود میں ادھر ادھر لے گیا، ساری چیز ٹھیک چل رہی تھی۔ جب نواز شریف کے ساتھ تعلقات بگڑے اور جب یہ سارا کام رفیق تارڑ نے کیا، نواز شریف نے مجھے آفر کی تھی کہ آپ ہمارے خلاف کیسز نہیں کریں، مجید نظامی بھی اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ ہماری نواز شریف سے کیا بات ہوئی تھی؟ نواز شریف نے مجھے کہا تھا کہ آپ میرے سے تعاون کریں شاہ صاحب آپ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کریں گے؟ میں نے کہا کہ میری تین ماہ میں ریٹائرمنٹ ہو رہی ہے تو میں مکہ مدینہ چلا جاؤں گا۔ مجھے مدینہ بڑا پسند آتا ہے۔ میں روضۂ رسول کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میری یہ بات سن کر وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ میں بھی مدینہ آجاؤں گا۔ لیکن ہم آپ کو مدینے نہیں جانے دیں گے۔ آپ کو یہاں پر آفر کرتے ہیں کہ آپ یہ کام نہ کریں ہم آپ کو اس سے بہتر پوزیشن میں اپنے ساتھ کام کرائیں گے۔ اب آپ بتائیں۔ یہ مجھے بے نظیر نے نہیں کہا تھا، یہ مجھے نواز شریف نے کہا تھا کہ آپ کو صدر بنائیں گے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا پڑے گا کہنے لگے کہ آپ جو یہ کیسز بنا رہے ہیں ناں کرپشن کے ان کو چھوڑ دیں۔ میں نے کہا اچھا فرض کریں میں نے چھوڑ دیئے پھر بولے اور باقی ججز سے میں خود نپٹ لوں گا۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اور ججز سے نپٹ لیں گے۔

(یعنی پھر میں بھی اس Then i can become part of this unholy alliance

ناپاک اتحاد میں شامل ہو جاؤں گا)

میں تو ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بے شک آپ مجھے صدر نہ بنائیں۔ میں تو انصاف کروں گا اور اگر آپ بے گناہ ہیں اور آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے خلاف یہ کیسز غلط دائر ہوئے ہیں تو آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں آپ کو صاف شفاف سلیٹ دوں گا اور میں آپ کی تعریف کر کے آپ کو quit کروں گا کہ وزیر اعظم کے ساتھ ان لوگوں نے بے ایمانی کی ہے، انہوں نے فراڈ کیا ہے، غلط کیسز داخل کئے ہیں ہم ان کو اندر کر دیں گے۔ لیکن ان کو اعتماد نہیں تھا۔ انہیں اعتماد اس لیے نہیں تھا کہ آدمی لاء کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ میں اس بات کو بہتر اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ غلط کر رہے تھے۔ پھر پتہ ہے کیا ہوا؟ جو آفر مجھے ملی تھی یہی آفر رفیق تارڑ کو ملی، اس لیے کہ ابا جی کے ساتھ ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔

سوال: ابا جی سے ملنے تو آپ بھی رائے ونڈ گئے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ہاں میں بھی گیا تھا۔ میں اس لیے ملنے گیا تھا کہ جب یہ وزیر اعظم بنے تو نواز شریف نے مجھے خود کہا تھا کہ ابا جی آپ سے ملنے آئیں گے۔ ابا جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کو ٹائم دیں۔ میں نے کہا کہ نہیں آپ کے ابا جی سے ملنے میں ان کے گھر جاؤں گا۔ میں ملا تھا اور ابا جی مجھے بڑے پسند آئے تھے۔ اچھی باتیں کر رہے تھے۔ خاص طور پر مجھے ان کی یہ بات اتنی پسند آئی تھی کہ دونوں بچے اپنے والد کی اتنی عزت کرتے تھے، اتنی عزت کرتے تھے کہ میں حیران رہ گیا، یہ دیکھ کر کہ یہاں پر ابھی تک اس طرح کی فیمیلیز ہیں۔

سوال: ایک حاضر سروس چیف جسٹس کا وزیر اعظم کے والد سے ملنے کے لیے ان کے گھر جانا عجیب سی بات نہیں تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: بڑی عجیب سی چیز ہے (تنقیدی انداز میں) واقعی ایسے چیف جسٹس کو سزا دینی چاہیے۔ جب آدمی اس پوزیشن کو پہنچتا ہے ناں تو تھوڑے بہت تو تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔ مجھے بتائیں۔ آئین اس طرح بنائیں کہ سپریم کورٹ کے ججز کے لیے قید خانے بنائیں۔ تا کہ وہ اپنا کام کر کے ان پنجروں میں چلے جائیں، پھر بھی انصاف کر سکیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ ان کے لیے قید خانہ بنائیں اور وہ قید خانے بھی عدالتوں کے نیچے بنائیں۔

سوال: پرانے زمانے کے جج تو بالکل سوشل نہیں ہوتے تھے، اخبار تک نہیں پڑھتے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ امریکہ میں ابھی بھی جیوری جب تک کیس چلاتی ہے تو وہ اس جیوری کو بند کر دیتے ہیں، اس وقت تک جب تک کیس چلتا ہے۔ ہوٹلوں

میں ٹھہراتے ہیں۔ پھر تو یہ بات ایسے بھی ہو سکتی ہے کہ شاہ صاحب! یہ جو آپ نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں یہ بڑے خراب ہیں یہ جوتا پہنا ہے یہ بھی ٹھیک نہیں ہے (ہنستے ہوئے) پھر تو یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ ججز کو کپڑے بھی نہیں پہننے چاہیے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ ہمارے دلوں میں جو باتیں پڑی ہیں ہم تو کسی کو نہیں بتاتے کہ کس کیس میں کس جج نے کتنے پیسے لیے تھے۔

سوال: کیا ججز پیسے لیتے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: بالکل لیتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ عدلیہ کرپشن نہیں ہے۔

سوال: بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اعلیٰ عدلیہ میں کرپشن نہیں ہے۔

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (اکتائے ہوئے انداز میں طنزیہ لہجے میں) ہاں سپریم جوڈیشری میں نہیں ہے، سپریم جوڈیشری میں بڑے اچھے بندے ہیں۔ آپ اپنے لاہور ہائی کورٹ کا چکر لگائیں تو آپ کو پتہ چلے کہ پنجاب کی لاہور ہائی کورٹ میں جتنی کرپشن ہے، اتنی کہیں بھی نہیں ہے۔

سوال: سپریم کورٹ میں کیا ہوتا ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: سپریم کورٹ میں بھی ہائی کورٹ سے ہی بندے آتے ہیں، وہ کوئی فرشتے تو نہیں آتے۔ وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔

سوال: کیا چیف جسٹس کو رشوت لینے اور دینے کا پتہ نہیں چلتا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (طنزیہ لہجے میں) چیف جسٹس کو بالکل پتہ نہیں ہوتا۔ میں نے ایک کیس آپ کو دے دیا کہ اس کو چلائیں۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اس کو کس طرح چلاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت تک پتہ نہیں چلتا۔ جب تک کوئی وکیل لکھ کر نہ دے درخواست دے کہ اتنے پیسے لیے ہیں۔ پھر مجسٹریٹ سے ریڈ کرایا جائے۔ میں آپ کو ایک اور بعد بتاؤں کہ ایک تو کرپشن پیسے لینے کی ہوتی ہے، یا فائدے لینے کی ہوتی ہے، دوسری کرپشن وہ ہوتی ہے جس کو Intellectual dishonesty کہتے ہیں۔ جس میں آپ کو خود پتا ہوتا ہے کہ آپ یہ بات اپنے ضمیر کے خلاف کر رہے ہیں اور آپ گورنمنٹ کو جان بوجھ کر کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا رہے ہیں تا کہ آپ کو اس کے بدلے میں کچھ نہ کچھ ملے یا مل جائے گا۔ فی الحال کچھ نہیں تو باہمی تعلقات اچھے ہیں لیکن آگے چل کر آپ کو فائدہ مل جائے گا اور گورنمنٹ سے تو ہمیشہ فائدے ملتے ہیں۔ ہر سویلین وزیراعظم اس طرح کی پیشکش کرتا ہے کہتے ہیں کہ جناب کبھی بھی کوئی ایسی بات ہو، کوئی خدمت ہو، شہباز شریف کو کہہ دیں۔ مجھ تک آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ بات حلفیہ قرآن شریف کے اوپر ہاتھ رکھ کر کہنے کے لیے تیار ہوں۔ سب اسی طرح کہتے ہیں یعنی اپنے آپ کو اس چیز سے الگ رکھنا بڑی مشکل بات ہے۔ پھر آپ اس

وزیراعظم کے خلاف قدم اٹھائیں، یہ ہتھکڑی والا کیس ہوا تھا اس کا کیا انجام ہوا! ہماری کوئی وہ جان پہچان والے تو نہیں تھے۔ وہ بھی ایک صحافی کے کہنے پر یہ ہوا تھا۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ وہ فیصل آباد میں چودھری شیر علی کا علاقہ ہے اور وزیراعظم کا بہنوئی ہے وزیراعظم نے افسران کو ٹی وی کے سامنے ہتھکڑی لگا کر ان کو جیل بھیجا ہے۔ جس پر میں نے ایکشن لیا جو سراسر قومی مفاد میں تھا۔

سوال: شاہ صاحب! یہ فوج اور عدلیہ کیوں ملے ہوئے ہیں؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں نے پہلے بھی ایک بات کہی تھی او وہ ارادتاً کہی تھی۔ یہ کہ 1977ء میں جب مارشل لاء لگا تھا تو چیف جسٹس کو گورنر بنایا گیا تو فوج تو ہمیشہ عدلیہ کا تعاون چاہتی ہے۔

سوال: فوج نے آپ سے بھی کبھی تعاون چاہا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میرے زمانے میں تو مارشل لاء نہیں تھا۔ میرے زمانے میں تو آرٹیکل 58 ٹو بی ان ایکشن تھا۔

سوال: لیکن آپ کے بھی فوج سے رابطے تو ہوں گے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: یہ نواز شریف کے زمانے میں جو یہ باتیں وغیرہ ہوئی تھیں۔ وہ بھی اس لیے کہ انہوں نے 58 ٹو بی کو نکال دیا تھا تو پھر وزیراعظم بہت، بہت اور بہت زیادہ پاورفل ہو گیا تھا۔ تو پھر ہم نے آرٹیکل 190 جس میں یہ درج ہے کہ

All executive and administrative agencies will come to the aid of the supreme court

میں نے کہا کہ اگر 58 ٹو بی نہیں ہے تو پھر تو وزیراعظم بہت پاورفل ہے۔ وزیراعظم آگے آگے سے بڑھتے گئے ناں، انہوں نے پہلے صدارت پر، پھر عدلیہ پر حملہ کروایا۔ پھر آرمی پر حملہ کرایا۔ پھر 15 ویں ترمیم لا رہے تھے اور امیر المومنین بن رہے تھے۔

سوال: سپریم کورٹ پر حملے میں فوج نے آپ کی مدد کیوں نہیں کی تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: فوج نے ایک دفعہ مدد کی تھی۔ آرٹیکل 190 کے حوالے سے۔ وہ بھی سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اکرم شیخ نے پٹیشن دائر کی تھی جب میں سپریم کورٹ کے لیے پانچ ججز مانگ رہا تھا۔ اس وقت مدد کی تھی اور پیغام بھیجا تھا۔ یہ بڑی کھلی پیشکش تھی۔ اس وقت وزیراعظم، صدر اور چیف آف آرمی سٹاف سمیت سب بیٹھے تھے۔ جب ان کا پیغام آیا تھا، اس زمانے میں نسیم رانا ڈی جی، آئی ایس آئی تھے، انہوں نے اس بات کو مانا تھا۔ حکومت مجھے لاہور سے ججز نہیں

دے رہی تھی۔ مجھے کہا گیا شیخ ریاض احمد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں وہ ہم آپ کو نہیں دینا چاہتے۔ میں نے کہا کیوں! بولے اس کے بغیر ہماری حکومت نہیں چلے گی۔ میں نے کہا اچھا! کیا یہ اتنے مہربان ہیں۔ آپ مجھے لکھ کر دیں۔ کہ یہ جج صاحب اتنے تعاون کرنے والے ہیں کہ آپ ان کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ کیونکہ ہم نے ججز کیس میں کہا تھا کہ حکومت اگر ہماری کوئی بات کچھ وجوہات کی بنا پر نہیں مانتی تو وہ وجوہات لکھ کر دی جائیں۔ تو ہم اس کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں کیس بھیج سکتے تھے۔

سوال: اب تاریخ اتنی آگے چلی گئی ہے، وقت اتنا گزر گیا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ جو برادرز ججز نے آپ کے ساتھ سلوک کیا! ماضی کے تناظر میں آپ اس کو کس طرح دیکھتے ہیں، جج اتنے بے رحم کیوں ہو گئے تھے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) ہوں، اس پر ایک کتاب لکھوں گا میں سمجھے۔ دیکھیں میں نے جب پہلی کتاب لکھی تھی اس وقت میرا جوڈیشل کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ میرا دور 40 سال پر محیط تھا۔ اس میں زیادہ عرصہ میں نے بطور جج ہی گزارا ہے۔ 40 سال میں سے 33 سال میں جج رہا۔ تو بہت سے لوگوں نے خاص طور پر ہمارے صحافی دوست، پڑھے لکھے اور دانشور سکالرز نے جو تبصرے کیے ہیں وہ بالکل صحیح تبصرے کیے ہیں۔ نعیم بخاری نے تو مجھے یہ کہا کہ شاہ صاحب! آپ نے جو کتاب لکھی ہے۔ وہ حجاب پہن کر لکھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں صحیح ہے۔ جنگ گروپ کے ایڈیٹر محمود شام نے کہا کہ شاہ صاحب آپ آتے آتے رک جاتے ہیں، میں نے کہا یہ بھی صحیح ہے۔

سوال: مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ نے کچھ لکھ کر کاٹا ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ ایڈٹ کرنے والے بھی ایڈٹ کیا ہے۔

سوال: لوگوں کے نام کاٹے گئے ہیں۔ جہاں بھی جس نے سازش کی ہے، وہاں برادرز ججز کے نام نہیں ہیں بہت احتیاط برتی ہوئی ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: اب اگلی کتاب میں بالکل بھی احتیاط نہیں کروں گا آپ کو بھی بہت کچھ بتادیا ہے۔

سوال: شاہ صاحب! آپ کو پنشن وغیرہ ملتی ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: نہیں! مجھے چیف جسٹس کی پنشن نہیں دی جاتی۔ میں سپریم کورٹ کے جج ہونے کی حیثیت سے پنشن وصول کرتا ہوں۔ (طنزیہ لہجہ میں) بس کہتے ہیں کہ آپ نے ایسا گناہ کبیرہ کیا ہے کہ آپ آوٹ آف ٹرن چیف جسٹس مقرر ہوئے تھے۔ ورنہ باقی سارے ہو جاتے ہیں۔ منظور قادر آوٹ آف ٹرن ہو گئے۔ طفیل علی عبدالرحمٰن بھی آوٹ آف ٹرن ہو گئے۔ ایک اور بات

بتاؤں کہ سپریم کورٹ میں جتنے بھی ججز لیے جاتے ہیں وہ اسی اصول پر لیے جاتے ہیں۔ یعنی ہائی کورٹ کا کوئی جج اگر ریٹائر ہو جاتا ہے تو اس کو سپریم کورٹ میں لے لیتے ہیں جیسے صدر غلام اسحاق خان نے جسٹس ولی محمد کو سپریم کورٹ میں جج تعینات کیا تھا۔ اصل میں انہی جسٹس ولی محمد نے لاء منسٹر افتخار گیلانی کو سزا دی تھی۔ اور ان کو ڈس کوالیفائی بھی کیا تھا اس الزام کے تحت کہ انہوں نے اپنی منسٹری میں غبن کیے ہیں۔ ان کو صدر اسحاق سپریم کورٹ میں جج بنا کر لے آئے تھے۔

سوال: جن برادر ججز کی بے اصولی کی آپ بات کر رہے ہیں حقائق کچھ مختلف ہیں انہیں برادرز ججز نے پی سی او کے نفاذ پر اصولی موقف لیتے ہوئے حلف لینے سے انکار کر دیا اور یوں تاریخ میں ان کا بڑا نام بن گیا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: کس نے انکار کیا تھا۔

سوال: یہ سعید الزمان صدیقی اور اس کی ساتھی ججوں نے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میرے بھائی! یہ کوئی اصولی بات یا اصولی موقف نہیں ہے۔ پہلے تو مزیدار بات یہ ہے کہ علیحدہ ہونے کے بعد میں واحد شخص تھا جو عوام کے سامنے بول رہا تھا اور نواز شریف کی گورنمنٹ کو تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ 12 اکتوبر 1999ء کو انہوں نے مارشل لاء لگایا اور میں 16 اکتوبر کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت لاہور ہائی کورٹ بلایا گیا تھا۔ انسانی حقوق کے حوالے سے وہ سیمینار منعقد کی گئی تھی۔ جس میں مجید نظامی، حمید گل، ایس ایم ظفر اور بھی بہت سے دوسرے مقررین نے شرکت کی تھی۔ میں نے اس سیمینار کی صدارت کی تھی (ہنستے ہوئے) ایس ایم ظفر نواز شریف کی حکومت کے آخری دنوں میں اقوام متحدہ میں تھے۔ نواز شریف نے ان کے ساتھ وفد بھیجا ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں جب یہ سنا کہ مارشل لا لگ گیا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر واپس آ گئے اور یہاں آ کر مارشل لاء والوں کی اور جنرل مشرف کی تعریفیں کرنے لگ گئے۔ اس کے بعد حکومت نے پی سی او لگا دیا۔ وہ بات بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ اس وقت بھی میں واحد شخص تھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ بھئی آپ نے پی سی او لگا دیا تھا تو اب ججز سے بھی نیا حلف لیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ ججز جو سپریم کورٹ کے حملے میں ہمارے خلاف ہو کر ایک پارٹی بنے تھے اور جن کو پتہ تھا کہ سپریم کورٹ پر حملہ ہوا ہے اور اس کے بعد بھی انہوں نے ایک لفظ مذمت کا نہیں کیا تھا میں چاہتا تھا کہ ان ججز کے خلاف کارروائی ہو۔

سوال: کیا واقعی ججز کو علم تھا کہ سپریم کورٹ پر حکومت نے منصوبہ بندی سے حملہ کیا ہے۔

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں آپ کو بار بار کہہ رہا ہوں کہ اس وقت نواز شریف کہہ رہا تھا کہ

ہم چیف جسٹس کو(Isolate) تنہا کر رہے ہیں اور برادر ججز پر کام کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو چیف آف آرمی سٹاف اور صدر کے سامنے کہا تھا پرائم منسٹر صاحب آپ کا جو داماد ہے ناں کیپٹن صفدر یہ ججز کے گھروں میں رات کو بریف کیس لے کر جاتا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ یہ کس کس جج کے گھر گیا ہے اور کون آدمی ان کے ساتھ تھا! تو ان کے پاس میری اس بات کا جواب نہیں تھا، یہ ججز ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ میں تو وہاں نہیں رہتا تھا، میں تو راولپنڈی میں رہتا تھا، یہ سارے ججز پنجاب ہاؤس کے سامنے گھروں میں رہتے تھے اور سارے رات کو پنجاب ہاؤس میں جمع ہوتے تھے تو وہاں سیف الرحمٰن وغیرہ آتے تھے اور ان کے لیے کھانا میریٹ ہوٹل سے آتا تھا۔ مجھے اس لیے بھی پتہ ہے کہ کچھ ججز تو ہمارے ساتھ بھی تھے ناں۔ مجھے ساری معلومات ملتی تھیں۔ شہباز شریف لاہور کے اندر مصروف تھا، یہ جو جسٹس فضل الٰہی ہیں پشاور والے۔ ان کو کہا گیا تھا کہ آپ ہمارا ساتھ دیں ہم آپ کو چیف الیکشن کمشنر بنا دیں گے۔ اور انہوں نے یہ بھی طے کیا تھا کہ سجاد علی شاہ کو ججز خود نکالیں گے اور نکالا بھی جائے گا ایک عدالتی حکم کے ذریعے سے......

سوال: آپ چیف جسٹس تھے کیا آپ کو علم نہیں تھا کہ آپ کے خلاف عدالتی حکم آ سکتا ہے اور کیا یہ جوڈیشنل آرڈر روکا نہیں جا سکتا تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں نے روکا تھا۔ میں نے انتظامی طور پر بھی روکا اور عدالتی سطح پر بھی روکا۔ لیکن حکومت تو ان کے ساتھ تھی۔ اس زمانے میں تو جو ہماری کارروائی نواز شریف کے خلاف آتی تھی تو وہ ٹی وی پر نہیں آتی تھی۔ لیکن جسٹس ارشاد حسن خان کے کوئٹہ بنچ سے جو کارروائی آتی تھی، ان کی ہیڈ لائن لگتی تھی، وہ اخبارات کی شہ سرخی ہوتی تھی ہمیں کوئی کوریج نہیں دیتا تھا۔

سوال: آپ اگر اپنے چیمبر سے نکلنے سے انکار کر دیتے تو کیا ہوتا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: کیا انکار کر دیتے۔

سوال: آپ اگر اڑ جاتے اور کہتے کہ میں چیف جسٹس کا عہدہ نہیں چھوڑوں گا تو پھر کیا امکانات ہوتے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ سب سے زیادہ فائدہ حکومت وقت کا ہوتا ہے جب حکومت ججز کے ساتھ مل کر اپنا کام کرے تو اس میں فائدہ تو گورنمنٹ کو ہوتا ہے نا۔ کیونکہ میرے ہٹنے سے نواز شریف کے خلاف کیس تو سارے ختم ہو گئے۔ میں نے ڈٹنے کا سوچا یا نہیں سوچا۔ آپ مجھے بتائیں کہ نواز شریف کے خلاف دائر کیے گئے کیسز کہاں گئے؟

سوال: ظاہر ہے وہ تو ختم ہو گئے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ختم ہو گئے ناں تو میرے ہٹنے میں اصل فائدہ تو گورنمنٹ کو ہی ہوا ناں۔ مجھے لوگ بتاتے تھے کہ نواز شریف نے کسی جگہ کہا تھا کہ "جسٹس شجاد علی شاہ اتنے مہنگے جج ہیں کہ ان کو نکالنے کے لیے بہت پیسہ لگا"۔ یہ تو ہوائی جہاز میں پیسے لے کر گئے تھے جس میں رفیق تارڑ شامل تھا، ابا جی کا لاہور میں علاج کرنے والا ڈاکٹر شہریار شامل تھا، شریف الدین پیرزادہ بھی شامل تھے۔

سوال: لیکن پرنالہ تو وہیں پر ہے کہ آپ کے برادر ججوں نے پی سی او پر حلف کیوں نہیں اٹھایا؟ یہ تو ان کی اصول پرستی کی مثال ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میرا تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں مشرف حکومت سے کہتا رہا کہ ان ججز کے خلاف ایکشن لیں جنہوں نے سپریم کورٹ حملے میں میرے خلاف اپنا کردار ادا کیا مگر یہ خاموش تھے۔ جنرل مشرف کے آنے کے بعد رفیق تارڑ صدر تھے۔ انہوں نے حکومت کو بتایا کہ بھئی یہی ججز آپ کے کام آئیں گے۔ آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے تو علیحدہ رکھا اور حکومت والے ان ججز کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ اچانک چھ یا آٹھ مہینے کے بعد پی سی او کی بات اچانک آئی کیسے؟ یہ بات اس طرح آئی کہ کسی نے پیٹشن فائل کی تھی، جنرل پرویز مشرف کے خلاف کہ انہوں نے یہ مارشل لاء غلط لگایا ہے۔ اس کا فیصلہ ہونے والا تھا یہ پانچ جج جو نکلے ہیں، ان کے سامنے یہ پٹیشن تھی اور اس کا فیصلہ دوسرے دن آنا تھا۔ جمعرات کو باقاعدہ حکومت نے پہرہ لگا دیا اور سعید الزمان صدیقی کو گھر سے نکلنے نہ دیا۔

سوال: گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ججوں کو حلف دیا ہی نہیں گیا اور انہوں نے خود حلف لینے سے انکار نہیں کیا تھا؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: ارے بھائی! ان کو حلف دیا ہی نہیں گیا۔ میں آپ کو بتاؤں ناں کہ آپ اگر جانتے ہیں ناں۔ آخر ہم بھی تو گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور سب کو تجسس بھی ہوتا ہے کہ یار یہ کیا ہوا؟ تو سب لوگوں نے کہا کہ انہوں نے خود رضا کارانہ طور پر حلف نہیں اٹھایا۔ لیکن ہماری معلومات یہ ہیں کہ ان کو حلف دیا ہی نہیں گیا۔ ان کے پاس جنرل گئے، انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم لوگ یہ فیصلہ دے رہے ہو اور یہ کہ تم گورنمنٹ کے خلاف جا رہے ہو، آپ نہ جائیں، ہم آپ سے دوبارہ حلف لیتے ہیں۔ اور اس وقت واحد راستہ بھی یہ تھا۔ جسٹس ارشاد حسن خان دونوں طرف تھے، انہوں نے جا کر ساری خبر دے دی کہ یہ ججز کیا فیصلہ دینے والے ہیں۔ پھر حکومت نے ارشاد حسن خان کو چیف جسٹس بنا دیا اور باقی ججوں سے حلف نہیں لیا انہوں نے بڑی کوشش کی مگر ایسا نہ ہوا۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ جو شخص رضا کارانہ حلف نہ لے، وہ تو بڑے فخریہ انداز میں چلا جائے مگر یہاں

تو اسی شام کو استقبالیہ ہوتا ہے۔ اور استقبالیہ کون کرتا ہے نیا چیف جسٹس ارشاد حسن خان اور اس میں یہ سارے کے سارے پانچ ججز جاتے ہیں اور جا کر شیلڈز لیتے ہیں۔ ارے بھئی میں آپ کی جگہ پر ہوتا اور حلف نہ لیتا تو نہ وہاں جاتا اور کہتا۔

I don't want your bloody shield

اور کہتا آپ کی مہربانی ہی کافی ہے۔ پھر ایک قصہ کیا ہوا تھا کہ بی بی سی والے ٹم سیبسٹین نے ہارڈ ٹاک پر فارن منسٹر عبدالستار کا انٹرویو لیا تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کے یہاں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور دوسرے ججز نے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کر دیا ہے۔ تو عبدالستار نے ان سے کہا کہ انہوں نے انکار نہیں کیا بلکہ انہیں گورنمنٹ نے حلف دیا ہی نہیں ہے اور ان کے ہٹانے کی بنیادی وجہ کرپشن ہے۔ اس نے پھر پوچھا کس قسم کی کرپشن! تو عبدالستار کہنے لگے میں آپ کو نہیں بتا سکتا کیونکہ بی بی سی ہے، ساری دنیا سن رہی ہے تو ایسے میں میں آپ کو کیسے بتا دوں۔ پھر میرے آرٹیکل کے بعد جسٹس خلیل الرحمٰن نے بھی سات آرٹیکل لکھے اور لکھا کہ ''سپریم کورٹ پر حملہ ذمے دار کون؟''۔ اس مضمون کا مطلب تھا ''ذمے دار میں ہوں'' کہ میں اتنا گستاخ تھا، اور ان سب کو سپریم کورٹ میں لے کر آیا تھا ورنہ خلیل الرحمٰن بھی ناصر اسلم زاہد کی طرح شریعت کورٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور کوئی ان کو چیف جسٹس سپریم کورٹ میں نہیں لا رہا تھا۔

سوال: آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان پر مہربانی کی تھی؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں نے کہاں مہربانی کی؟ مہربانی تو اللہ نے کی، بندے تو ایسے ہی استعمال ہو جاتے ہیں۔

سوال: آپ نے مہربانیاں کیں پھر یہ برادر جج آپ سے ناراض کیوں ہو گئے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: بس اس طرح ناخوش رہے۔ کہ اگر ذمے دار میں ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ پر حملے میں یہ ججز شامل تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ پہلے آرڈر لیں گے، پھر اس آرڈر کو لاگو کریں گے۔ مجھے روکنے کے انہوں نے پہلے آرڈرز کرائے، پھر موٹر وے کو کھول دیا گیا کہ خوشخبری سنائیں گے، خوشخبری یہ تھی کہ چیف جسٹس بدل جائیں گے۔ اجمل میاں، آٹھ دن کی چھٹی لے کر اسلام آباد آ کر بیٹھ گئے کہ میں تناؤ ذرا کم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہ قائم مقام چیف جسٹس کا حلف اٹھانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ یہ تقسیم تو وہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اب بھی سپریم کورٹ میں وہی معاملہ چل رہا ہے جج بٹے ہوئے ہیں۔

سوال: آپ کو پنشن کتنی ملتی ہے؟

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ: میں نے حکومت سے کچھ پیسے لیے تھے کیونکہ مجھے ریٹائرمنٹ کے بعد ضرورت تھی۔ اس سے پنشن کے پیسے کچھ کم ہو گئے ہیں۔ تقریباً 40 ہزار ماہانہ رہ گئے ہیں جو ملتے ہیں۔

شاہ صاحب شکریہ بہت بہت

انٹرویو: اپریل 2007ء
مقام: ڈیفنس کراچی
غیر مطبوعہ

چیف جسٹس آف پاکستان

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی عدلیہ کے پرآشوب دور کے مرکزی کردار رہے ہیں۔ سجاد علی شاہ کے خلاف ججوں کا فیصلہ ہو یا پھر جنرل مشرف کے عبوری آئینی حکم کے حلف سے انکار کا معاملہ ہو، سعید الزمان صدیقی کا نام بار بار سامنے آتا ہے۔ عبوری حلف سے انکار کے بعد وہ بہت عرصے تک خاموش رہے لیکن اس دوران جسٹس (ر) سجاد علی شاہ نے ان پر کئی بار الزامات لگائے بالآخر میرے بار بار اصرار پر وہ عدلیہ کے اندرونی حالات اور زوال کی وجوہات پر انٹرویو دینے کو تیار ہو گئے۔

ڈیفنس کراچی کے مین روڈ پر واقع ان کے بنگلے میں چار گھنٹے تفصیلی ملاقات ہوئی ان کے گھر پہنچے تو وہ کڑھائی والے کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنے بیٹے کے ساتھ گھر میں موجود تھے جب کہ ان کی اہلیہ جو ورکنگ وومن ہیں گھر سے باہر گئی ہوئی تھیں اس لیے ہماری خاطر تواضع بھی سعید الزمان صدیقی نے خود ہی کی۔ اس ملاقات میں انہوں نے کھل کر سجاد علی شاہ سے اپنے اختلافات، جنرل پرویز مشرف سے ملاقاتوں کی کہانی، عدلیہ کی کارکردگی، اندرونی جھگڑوں، زوال کی وجوہات اور دیگر موضوعات پر پہلی بار کھل کر اظہار کیا انہوں نے شریف الدین پیرزادہ سے اپنی طویل وابستگی اور بعد کی ناراضگیوں کے واقعات بھی سنائے۔ نواز شریف کی حکومت کی بحالی کے فیصلے اور سابق چیف ججوں کے معاملات کی اندرونی کہانیاں بھی سامنے آئیں۔

سعید الزمان صدیقی خوش گفتار اور منفرد طبع کے آدمی ہیں۔ حلف نہ اٹھانے کے فیصلے پر انہیں کوئی پچھتاوا نہیں بلکہ وہ اس فیصلے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کئی معاملوں میں ان کے کردار کو متنازعہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ سجاد علی شاہ کے خلاف ان کے اقدامات پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے خیالات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عدلیہ کے زوال کے اہم ترین گواہ اور عینی شاہد رہے ہیں۔

اہم نکات

☆ عدلیہ آزاد ہو جائے تو خود بخود اچھی حکومتیں آ جائیں گی۔

☆ سپریم جوڈیشل کونسل غیر موثر ادارہ ہے، اسے براہ راست شکایات سننی چاہئیں۔

☆ فوج سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے آنے کی پابند تھی، جہانگیر کرامت نے اس موقع پر غلطی کی۔

☆ سپریم کورٹ پر حملہ کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ حکومت کے خلاف ایکشن ضروری تھا۔

☆ ہم نے سجاد شاہ کو چیف جسٹس کا عہدہ چھوڑنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ وہ آگ میں نہیں کودیں گے۔

☆ سپریم کورٹ پر حملہ کرنے والوں پر فرد جرم عائد ہو جاتی تو حکومت عمل درآمد کروانے پر مجبور ہوتی۔

☆ ''تین جرنیل ساڑھے چار گھنٹے تک سمجھاتے رہے کہ میں نیا حلف اٹھالوں''۔

☆ 25 جنوری کو جنرل مشرف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ بعض مشکلات کے باعث وہ جج صاحبان سے نیا حلف اٹھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور معذرت کر لی۔

☆ حکومت سے ہماری انڈرسٹینڈنگ تھی کہ عدلیہ کے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور وہ آئین کے مطابق کام کرے گی۔

☆ وردی پہنے صدر کے ساتھ چیف جسٹس کی تصویر سے لوگ ناراض ہوئے۔

☆ ججوں نے رویے پر نظر ثانی نہ کی تو عوام کا عدلیہ پر اعتماد اٹھ جائے گا۔

انٹرویو(I)

سوال: اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی عبوری آئین (پی سی او) کے تحت حلف اٹھانے کی روایت کافی پرانی ہے، اس مرتبہ آخر کیا تبدیلی ہوئی کہ آپ اور آپ کے ساتھی جج صاحبان نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا؟

جسٹس (ر) سعید الزماں صدیقی: اس مرتبہ یہ ہوا کہ جب 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا اور ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسی وقت ان پر واضح کر دیا تھا کہ عدلیہ صرف اور صرف پاکستان کے آئین کے تحت کام کر سکے گی اور اس کے علاوہ کوئی اور طریق کار اختیار نہیں کیا جائے گا۔ جنرل مشرف نے مجھ سے اس بات کا وعدہ کیا کہ عدلیہ کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوگی۔ اسی انڈر اسٹینڈنگ کے تحت میں کام کرتا رہا لیکن 25 جنوری کو میری چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے آخری ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہیں کام کرنے میں کچھ مشکلات پیش آ رہی ہیں اور ان مشکلات کے حل کے لیے ان کا ارادہ ہے کہ جج نئے سرے سے حلف اٹھائیں۔ حالانکہ اس سے پہلے سیکرٹری قانون، اٹارنی جنرل اور وفاقی وزیر مذہبی امور واضح طور پر بیان دے چکے تھے کہ ججوں سے نیا حلف لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی بیان کر دوں کہ دسمبر میں جب میاں اجمل کو چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ بنایا گیا تو میں نے واضح طور پر کہا تھا کہ ان سے وہی حلف لیا جائے جو آئین میں درج ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تو میں اس بات پر واضح موقف رکھتا تھا کہ ججوں کو نیا حلف نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ جب 25 جنوری کو جنرل مشرف نے مجھ سے کہا کہ ہم کل ججوں سے نیا حلف لے رہے ہیں تو میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ آپ کی اور ہماری ''انڈر سٹینڈنگ'' یہی تھی کہ عدلیہ میں مداخلت نہیں ہوگی اور عدلیہ آئین کے مطابق ہی کام کرے گی۔ اس پر جنرل پرویز مشرف نے اپنی مشکلات بیان کیں تو میں نے معذرت کر لی کہ میں تو حلف لے ہی نہیں سکتا کیونکہ میں اس حوالے سے بار بار یہ بیان دے چکا ہوں کہ نیا حلف نہیں اٹھائیں گے۔

سوال: کیا جنرل مشرف کو پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ آپ حلف نہیں اٹھائیں گے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرا خیال ہے کہ اس مسئلے پر میری واضح پوزیشن کا انہیں

پہلے سے علم تھا۔

سوال: پی سی او کے نفاذ کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا کہ سپریم کورٹ فوجی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے جواز کے بارے میں مختلف رائے دینے کا ارادہ رکھتی تھی یا پھر ٹائم لمٹ دینا چاہتی تھی، کچھ اور باتیں بھی سننے میں آ رہی تھیں۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: (قہقہہ) سپریم کورٹ نے بعد میں اپنے فیصلے میں تین سال کی حد لگائی ہے۔ فوجی حکومت کے جواز کے مقدمے کی تو ابھی سماعت ہی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں مجھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ حکومت کا خیال تھا کہ شاید میں کوئی عبوری حکم نہ جاری کر دوں، حالانکہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

سوال: یہ بھی سنا گیا کہ ججوں کے پاس سابق وزیراعظم نواز شریف کی طرف سے رقم پہنچ گئی تھی اور حکومت کو اس کی اطلاع بھی مل گئی تھی۔ ایک سابق چیف جسٹس کا نام بھی آیا تھا۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: (قہقہے) یہ سب بے ہودہ پراپیگنڈا ہے۔ اگر یہ بات سچی ہوتی تو جب میں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا تو اس رات تین جرنیلوں نے بڑی عزت اور محبت کے ساتھ مجھ سے کہا کہ آپ کو حلف لینا چاہیے کیونکہ آپ کے حلف نہ لینے سے بڑی بدنامی ہوگی۔ میں نے ان سے کہا جب 12 اکتوبر کو فوج آئی تو یہ نہیں کہا گیا کہ عدلیہ ناکام ہوگئی تھی اور صرف حکومت کے ناکام ہونے کی بات ہوئی تھی۔ اس لیے عدلیہ کے معاملات میں مداخلت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جرنیل رات 9 بجے سے ڈیڑھ بجے تک میرے پاس رہے۔ اگر میرے خلاف الزامات درست تھے تو پھر میرے پاس جرنیلوں کے آنے کا کیا جواز تھا۔

سوال: حکومت کے قانونی مشیر شریف الدین پیرزادہ سے آپ کے ذاتی اور دیرینہ تعلقات ہیں، پھر چیف جسٹس اور حکومت میں غلط فہمیاں کیوں پیدا ہو گئیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے جنرل مشرف صاحب نے یہی بتایا کہ انہیں ایڈوائس دی گئی ہے کہ پی سی او کے تحت نیا حلف لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایڈوائس شریف الدین پیرزادہ کے علاوہ کسی اور نے نہیں دی تھی۔ شریف الدین پیرزادہ سے میری ملاقات 1969ء میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت سول کی وکالت کرتا تھا۔ میں نے کراچی میں 19 سال قانون کی پریکٹس کی۔ 1969ء میں میرے پاس ایک بہت بڑا مقدمہ تھا جس میں میں نے ان کی خدمات بھی لیں۔ یہ اس وقت یحییٰ خان کی حکومت کے اٹارنی جنرل تھے۔ اس طرح سے ہمارے تعلقات بن گئے اور بعد میں کئی مقدمات میں وہ مجھے اپنی معاونت کے لیے چن لیا کرتے تھے۔ بعدازاں انہوں نے مجھے اپنے دوست معظم علی

سے دفتر لے کر دیا پھر خود شریف الدین پیرزادہ نے میرے ساتھ والا دفتر لے لیا۔ اس طرح سے ہم پیڑوسی بھی ہو گئے۔ بہت سارے مقدمات میں ہم اکٹھے پیش ہوتے تھے۔ شریف الدین پیرزادہ نے مجھے کہا ہوا تھا: اس سے پہلے کہ دوسری پارٹی تمہیں اپنا وکیل بنائے میں تمہیں اپنا وکیل بناتا ہوں۔ اس طرح وہ بہت سے مقدمات میں میری خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ میں فروری 1961ء میں بطور وکیل انرول ہوا۔ ایک سال بعد میں نے الگ دفتر بنالیا۔ جب بطور جج میرا ریفرنس ہوا تو اس وقت کے بار کے صدر نے کہا کہ آپ کے شریف الدین پیرزادہ سے بہت تعلقات ہیں، اس وجہ سے ہمارے دل میں کچھ شبہات ہیں۔ میں اس وقت خاموش رہا۔

سوال: بعد میں کیا ہوا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جج بننے کے بعد میرے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک طرف شریف الدین پیرزادہ وکیل تھے اور دوسری طرف ڈاکٹر پرویز حسن اور ذکی الدین پال وکیل تھے۔ میں نے اس مقدمے کا عبوری حکم شریف الدین پیرزادہ کے خلاف کر دیا جس پر اخبارات میں یہ تک لکھا گیا کہ اس کی تقرری تو شریف الدین پیرزادہ نے کروائی تھی لیکن اس نے فیصلہ ان کے خلاف کر دیا۔ ظاہر ہے اس فیصلے سے شریف الدین پیرزادہ ناراض ہوئے اور 1981ء میں ہمارے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔

سوال: آپ کا بطور جج تقرر تو ان ہی کی سفارش پر ہوا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل! میں توجہ پر گیا ہوا تھا۔ انہوں نے میری تقرری کروائی لیکن جب انسان جج بن جاتا ہے تو پھر اس کے پہلے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ بیس سالوں میں جب میں جج تھا کوئی مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ میں 9 سال اسلام آباد میں رہا۔ وہاں کوئی میری شکل سے واقف نہیں تھا۔ میں کبھی سماجی تقریبات میں نہیں جاتا تھا۔

سوال: کیا آپ ججوں کے سماجی تقریبات میں جانے کے خلاف ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل! میں نے تو چیف جسٹس بنتے ہی پہلا حکم یہ دیا تھا کہ جج سماجی تقریبات میں نہ جائیں۔

سوال: شروع شروع میں تو جج اخبار بھی نہیں پڑھتے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جی بالکل، پہلے جج الگ تھلگ رہتے تھے بعد میں کچھ لوگوں نے اجتماعات میں جانا اور تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ جب کوئی جج حلف اٹھالیتا ہے تو اس کو ضابطہ اخلاق کے مطابق کسی بھی متنازع بحث میں شریک نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی بیانات دینے

چاہئیں۔ میں نے اس وقت کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے ایسے ہی بیانات پر کہہ دیا تھا کہ یہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہے جس پر وہ ناراض ہو گئے تھے۔ وہ اکثر ناراض ہی رہتے تھے۔ (قہقہہ) اصل میں جب کوئی شخص جج بن جاتا ہے تو پھر اس کا اپنے عزیز یا رشتہ داروں سے بھی کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو آپ اس منصب کے اہل ہی نہیں۔

سوال: عام لوگوں میں عدلیہ کے بارے میں یہی تاثر ہے کہ جج سیاسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ تاثر موجود ہے لیکن سب ججوں کے بارے میں شاید یہ بات درست نہ ہو۔ جب میں کراچی میں جج تھا تو اس زمانے میں شاید ہی کوئی ایسے جج رہے ہوں گے جو اس طرح سے سیاست میں رنگے ہوں یا وہ کسی قسم کی سیاست میں ملوث ہوئے ہوں۔

سوال: بے نظیر بھٹو کو ماضی میں یہ شکایت رہی ہے کہ عدلیہ کا جھکاؤ پیپلز پارٹی کی مخالف قوتوں کی طرف رہا ہے، آپ کا کیا موقف ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: (ہنستے ہوئے) بالکل، انہیں مجھ سے بھی یہی شکایت رہی ہے، کیونکہ ان کے شوہر کی درخواست ضمانت میں نے بطور چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ مسترد کر دی تھی، جس پر وہ کافی ناراض ہوئیں، ان کی یہ سوچ ہے، شاید اسی وجہ سے انہوں نے ایک ساتھ 20 افراد کو جج بنا دیا تھا اور یہی واقعہ ہمارے دوست سعد سعود جان کو چیف جسٹس بننے سے روکنے کا باعث بنا اور اسی واقعے کی وجہ سے سجاد علی شاہ چیف جسٹس بنے۔ سعد سعود جان نے ان 20 افراد کو جج بنانے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان میں سے زیادہ تر افراد سیاسی وابستگیاں رکھنے والے تھے اور سجاد علی شاہ نے چیف جسٹس بنتے ہی ان سب ججوں کی تقرری کو منظور کر لیا۔ سعد سعود جان صحیح معنوں میں ایک ماڈل جج تھے۔ وہ سینئر موسٹ بھی تھے لیکن ان کی بجائے سجاد علی شاہ کو چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ بعد میں سجاد علی شاہ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تو پھر انہوں نے ججز کیس میں دوسرا موقف اختیار کر لیا۔

سوال: بات ہو رہی تھی آپ کے جج بننے کی اور آپ کے فیصلوں کی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: واقعہ یوں ہے کہ جب میں نے شریف الدین پیرزادہ کے خلاف 1981ء میں فیصلہ دیا تو چند روز ہی میں مجھے الیکشن ٹربیونل کے جج کی رکنیت سے ہٹا دیا گیا۔ بعد میں کئی سال تک کراچی میں جج رہا اور شریف الدین پیرزادہ میری عدالت میں پیش ہوتے رہے۔ میں ہمیشہ میرٹ پر ہی فیصلے کرتا رہا۔

سوال: قانون دانوں کے حلقوں میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ آمرانہ حکومتوں کو آئینی اور قانونی

مشورے دینا غلط ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: شریف الدین پیرزادہ واضح طور پر کہتے ہیں کہ وہ پروفیشنل ہیں۔ وہ کسی حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں تب بھی وہ اپنی قانونی پریکٹس جاری رکھتے ہیں۔ وہ خالصتاً پروفیشنل ہیں۔ وہ بہت ہی ذہین آدمی ہیں اور ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس لیے انہیں جدہ کے جادوگر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شریف الدین پیرزادہ جتنا وسیع علم اور تجربہ رکھنے والا کوئی بھی وکیل پاکستان میں نہیں ہے۔ پاکستان میں اب تک جتنے بھی بڑے بڑے مقدمات لڑے گئے، یہ ان میں کسی نہ کسی طرح شریک رہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ ہمیشہ حکومت کے ساتھ رہے۔ مولوی تمیز الدین کیس میں انہوں نے مولوی تمیز الدین کی طرف سے آئی آئی چندریگر کی معاونت کی اور وہ کیس جیتا۔ پھر انہوں نے عاصمہ جیلانی کیس میں جو موقف اختیار کیا وہ حکومت کے خلاف تھا اور انہوں نے ڈوسو کیس کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ کروالیا۔ پھر ضیاء الحق کے زمانے میں انہوں نے اس کی مکمل مدد کی۔ بہرحال یہ کبھی سیاست میں تو رہے نہیں، ہمیشہ پیشہ ورانہ ایڈوائس ہی دیتے رہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہر مارشل لاء میں یہ کسی نہ کسی طرح متعلق رہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مارشل لاء والوں کو ان کی قانونی ایڈوائس کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال: صدیقی صاحب! آپ نے جنرل مشرف کے پی سی او کا حلف اٹھانے سے انکار کیا لیکن اس سے پہلے جنرل ضیاء الحق کے پی سی او کا حلف اٹھانے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا یہ تو کھلا تضاد ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہماری تقرری 1981ء میں ہوئی۔ اس وقت تو ملک میں کوئی آئینی حکومت تھی ہی نہیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ میں تو خود مارشل لاء حکومت کی پیداوار تھا اور ظاہر ہے کہ میں نے جو حلف اٹھایا تھا وہ مارشل لاء کے تحت ہی اٹھایا تھا۔ بعد میں جب 1985ء میں جمہوریت بحال ہوئی تو ہم نے آئین کے تحت دوبارہ حلف اٹھایا بلکہ یوں کہیں کہ 1985ء میں ہی ہمارا آئینی حلف ہوا۔ ہم نے اس حلف کے تقدس کو برقرار رکھنا تھا۔ ہم پی سی او کے تحت حلف تو اٹھا ہی نہیں سکتے تھے۔

سوال: آپ کی بات تکنیکی حوالے سے درست سہی لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے دوران آپ جج بننا قبول کر لیتے ہیں اور پھر جنرل مشرف کی فوجی حکومت کے دوران آپ حلف اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ صدیقی صاحب! یہ بات سمجھنا عام آدمی کے لیے ذرا مشکل ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرا اس وقت بھی یہ خیال تھا کہ جن لوگوں نے 1973ء کے آئین کے تحت حلف لیا تھا انہیں جنرل ضیاء الحق کے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ چونکہ ہم نے یہ حلف اٹھایا ہی نہیں تھا اس لیے پی سی او کا حلف اٹھانا ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا۔

سوال: آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس نے ایک بار آئینی حلف اٹھا لیا اسے یہ توڑنا نہیں چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل، میں نے 1985ء میں جو آئینی حلف اٹھایا تھا میں اس کو پی سی او کے تحت حلف اٹھا کر توڑ نہیں سکتا تھا۔

سوال: کئی حلقوں میں یہ بھی کہا گیا کہ جس دن فوج نے ٹیک اوور کیا، آئین کی حکمرانی کی تشریح کرنے والی عدلیہ اسی دن ایک عبوری حکم نامہ جاری کر دیتی اور اگر کوئی بہادر چیف جسٹس ہوتے اور ان کا حکم نامہ جاری کرنے کا بس نہ چلتا تو کم از کم مستعفی ہی ہو جاتے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: پہلے دن تو یہ واضح ہی نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے اور پھر جب چیف ایگزیکٹو نے تقریر کی اور اس میں عدلیہ کے بارے میں کوئی بات نہ کی تو عبوری حکم نامہ جاری کرنے کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

سوال: ملک سے آئین ختم ہو جائے اور عدلیہ کو کچھ نہ کہا جائے تو عدلیہ خاموش رہے۔ یہ دلیل سمجھنی مشکل ہے۔ عدلیہ بھی ملکی آئین اور نظام ہی کا حصہ ہے اگر عدلیہ رد عمل ظاہر نہ کرے تو اس کا مطلب اس کی رضامندی ہے۔ آپ نے بالواسطہ طور پر فوجی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہمارے سامنے 11 ججوں کا نصرت بھٹو کیس کی شکل میں فیصلہ بھی موجود تھا، جس میں نظریہ ضرورت کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ جتنی بھی حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں، یہ ہی کہا جاتا رہا کہ سیاستدان ناکام ہو گئے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ عدلیہ ناکام ہو گئی جو چیز ناکام ہوتی ہے صرف اسی کو ہٹایا جاتا ہے۔

سوال: میرا سوال مختلف ہے۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔ میں آئین کے تحت اپنے حقوق کا تحفظ چاہتا ہوں اور اس وقت کے چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی کو آئین اور اپنے ان حقوق کا محافظ سمجھتا ہوں۔ جب کوئی بھی شخص آئین کو چھیڑتا ہے تو میری خواہش ہو گی کہ چیف جسٹس آئین اور عام آدمی کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی ایکشن لیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: عدالت خود نہیں بولتی اسے بلوایا جاتا ہے۔ آئین کے

تحفظ اور اپنے حقوق کے لیے کوئی شخص سپریم کورٹ میں نہیں آیا۔ ہم تو انتظار کرتے رہے کہ کوئی آئے (قہقہے) بڑے بڑے سیاست دان اور بڑے بڑے نام خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ پہلا مقدمہ تین چار مہینے بعد آیا۔

سوال: اگر کوئی آجاتا تو پھر......؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہاں میں ایک بات واضح کر دوں کہ میں ذاتی طور پر جوڈیشنل ایکٹوازم کے سخت خلاف ہوں۔ عدلیہ کا کام ہے قانون اور آئین کے مطابق کام کرنا۔ اس میں ایکٹوازم کہاں سے آ گیا۔ ایکٹوازم کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ عدلیہ اپنی حدود سے تجاوز کرے۔ میرے خیال میں تو ''جوڈیشنل ریسٹرینٹ'' کا لفظ استعمال ہونا چاہیے۔ کیونکہ عدلیہ ہمیشہ سمجھ کر اور رک کر فیصلہ کرتی ہے۔ جسٹس ظلہ اور جسٹس سجاد شاہ کے دور میں مفاد عامہ کے کیس براہ راست سپریم کورٹ میں سنے گئے جس سے متاثرہ فریق اپیل کے حق سے محروم ہو گیا۔

سوال: جوڈیشنل ایکٹوازم کے مقاصد کیا تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اس کا مقصد شہرت حاصل کرنا تھا۔

سوال: کیا جج کو شہرت حاصل کرنے کی خواہش کرنی چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ججوں کے ضابطۂ اخلاق میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جج کو شہرت سے احتراز کرنا چاہیے۔ جوڈیشنل ایکٹوازم کو کسی نے جوڈیشنل تخریب کاری (ٹیررازم) کا نام دیا تھا۔ واقعی اگر اس بات پر غور کیا جائے تو ان کے درمیان بہت ہی باریک سا فرق ہے۔ جسٹس سجاد علی شاہ کے زمانے میں کیا ہوا۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی خوف آتا ہے کہ سپریم کورٹ کا ایک جج آئین کی شقوں کو معطل کر سکتا ہے۔ یہ تو ناممکن سی بات تھی۔

سوال: صدیقی صاحب! معاف فرمائیں، آئین سے انحراف کے جرم میں آپ بھی شریک ہیں۔ آپ لوگوں نے ججز کیس میں مشورے (CONSULTATION) کے معنیٰ ہی بدل ڈالے۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: وہ تو آئین کی تشریح تھی۔ ہم نے آئین کی کسی شق کو نہ معطل کیا اور نہ ہی منسوخ اور نہ ہی عدلیہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔

سوال: امریکہ میں جوڈیشنل ایکٹوازم سے نظام کے اندر اصلاحات ہوئیں۔ جسٹس مارشل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کئی انتظامی فیصلوں کو معطل کیا۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بات غلط ہے امریکہ کی قانونی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں۔ بھارت میں بھی جوڈیشنل ایکٹوازم شروع ہوا لیکن بعد میں خود ہی اس بات کو محسوس کیا گیا

کہ اس طریق کار سے نقصان ہوگا چنانچہ یہ معاملہ روک دیا گیا۔

سوال: آپ اور آپ کے چند ساتھیوں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا لیکن آپ کے دیگر ساتھیوں نے حلف اٹھالیا، آپ کا ان کے فیصلے کے بارے میں کیا تاثر ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ان دوستوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ہم میدان کھلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں ان کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اگر اس وقت عدلیہ متفقہ فیصلہ کرتی تو شاید اس کے اثرات اور طرح کے ہوتے۔ ہمارے سامنے فوج کے متحدہ ایکشن کی مثال موجود ہے کہ ان کے ادارے کے لیے چیلنج سامنے آیا تو سب متحد ہو گئے۔ جنرل پرویز مشرف کو ہٹانے کا فیصلہ بھی آ گیا لیکن فوج کے اتحاد نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔

سوال: آپ کے خیال میں عدلیہ متحد ہو کر کوئی فیصلہ کرتی تو پی سی او کے نفاذ کا فیصلہ بدل بھی سکتا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل اگر سب متحد ہو کر ایک موقف اختیار کرتے تو شاید نیا حلف اٹھانے کی بات ختم ہو جاتی۔

سوال: جسٹس نسیم حسن شاہ اور کئی دوسرے ججوں نے 1981ء میں پی سی او کے تحت حلف اٹھایا جب کہ اس سے پہلے انہوں نے آئین کے تحت حلف اٹھایا تھا۔ آپ اس طرز عمل کو کیا کہیں گے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ تو سیدھا سیدھا آئین سے انحراف ہے۔ اگر کسی عدالت میں اس طرح کا مقدمہ سامنے آیا تو پھر اس حوالے سے فیصلہ آئے گا کہ یہ غداری تھی یا آئین سے انحراف تھا۔

سوال: پچھلے دنوں کچھ آڈیو ٹیپس کی بات بھی چلی جس کو سابق وزیر قانون خالد انور نے کہا کہ انہوں نے مقدمات کو تیزی سے نمٹانے کی بات کی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بات غلط ہے۔ اس طرح کے اقدام کا کوئی جواز نہیں۔

سوال: اگر کوئی جج سفارش مان لے یا فون پر وعدے وعید کرے تو......؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ کھلم کھلا جج کے حلف کی خلاف ورزی اور آئین سے انحراف ہے۔

سوال: صدیقی صاحب! جب جسٹس سجاد علی شاہ چیف جسٹس تھے، اس دوران ججوں کے اندر تقسیم ہوئی۔ کچھ جج سجاد علی شاہ کے ساتھ تھے اور کچھ ان کے خلاف تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ججوں کے اندر کوئی تقسیم نہیں ہوئی۔ اصل بات یہ تھی کہ

سجاد علی شاہ 1994ء میں چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ اس وقت سنیارٹی میں ان کا چوتھا نمبر تھا۔ سعد سعود جان، عبدالقدیر چودھری اور اجمل میاں ان سے سینئر تھے۔ حکومت ججوں کے اندر اختلافات پیدا کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے عبدالقدیر چودھری سے چیف جسٹس بنانے کے لیے بات چیت کی۔ عبدالقدیر چودھری نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے سینئر سعد سعود جان موجود ہیں۔ جب شاہ صاحب سے حکومت نے رابطہ کیا تو یہ پہلے ہی چیف جسٹس بننے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ جونہی یہ 1994ء میں چیف جسٹس بنے اسی وقت ان کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ فائل ہوا۔ یہ مقدمہ اکرم شیخ نے داخل کیا۔ بعد میں اکرم شیخ کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی شروع ہوگئی۔ اس کے بعد وہاب الخیری نے ایک مقدمہ داخل کیا۔ اس کے خلاف بھی توہین عدالت کی کارروائی شروع ہو گئی۔ اس طرح باسط کے خلاف بھی توہین عدالت کی کارروائی ہوئی اور صورت حال یہ تھی کہ یہ مقدمات چلتے نہیں تھے۔

سوال: جسٹس سجاد علی شاہ کا کہنا ہے کہ جسٹس رفیق تارڑ نے ججوں کی تقسیم میں اہم کردار ادا کیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ جسٹس (ر) رفیق تارڑ کا ججوں میں کوئی خاص اثر تھا۔ وہ میرے ساتھ بھی دو سال سپریم کورٹ کے جج رہے۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ججوں کو متاثر کر سکتے اور پھر سپریم کورٹ کے جج کی پوزیشن اس قدر بلند ہوتی ہے کہ اس کو متاثر کرنے کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

سوال: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 1993ء میں نواز شریف حکومت کی بحالی کے مقدمے کے دوران بھی ججوں میں اتفاق رائے پیدا کرنے میں جسٹس (ر) رفیق تارڑ کا بڑا اہم کردار تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ اس مقدمے میں 11 ججوں میں سے ہر ایک نے الگ الگ فیصلہ لکھا اور ہر ایک نے حکومت کی بحالی کی الگ الگ وجوہات لکھیں۔ میرے خیال میں یہ ایک عظیم فیصلہ تھا، جس میں جمہوریت کو مستحکم کرنے کی بنیاد رکھی۔ ہم نے صدر پاکستان کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کے حوالے سے کہا گیا کہ نواز شریف پنجابی تھے اس لیے وہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس بنچ میں پانچ جج تو مہاجر تھے۔ اس مقدمے کے فیصلے میں سجاد علی شاہ نے لکھا کہ نواز شریف پنجابی ہے اور سندھی وزیراعظم کو بحال نہیں کیا گیا۔ میرے خیال میں ان کا یہ فیصلہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی تھا۔ اس فیصلے میں لکھے گئے الفاظ کی وجہ سے ان کے خلاف ریفرنس داخل ہونا چاہیے تھا اور انہیں سپریم کورٹ کے جج کے عہدے سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔

سوال: لیکن اس مقدمے کے فیصلے کا اندازا تو اس وقت ہو گیا تھا جب جسٹس نسیم حسن شاہ

نے کہا تھا کہ میں جسٹس منیر نہیں بنوں گا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یقین مانیے جب نسیم حسن شاہ نے یہ بیان دیا تو تقریباً تمام ججوں نے ان سے شدید احتجاج کیا اور کہا کہ آپ کون ہوتے ہیں یہ بات کرنے والے ابھی تو مقدمہ شروع نہیں ہوا۔ آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ وہ جوش میں آکر ایسی باتیں کر دیا کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں انہوں نے سابق صدر غلام اسحاق خاں سے کہہ دیا کہ آپ ٹھیک تھے اور ہمارا فیصلہ غلط تھا۔ یہ نامعقول بات ہے۔ یہ ان کا ذاتی نقطہ نظر ہوگا۔

ہمارا تو اب بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ اس وقت اسمبلی تحلیل کرنے کا فیصلہ غلط تھا اور ہم نے حکومت بحال کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ درست تھا۔ ہم نے اس مقدمے میں اصول وضع کر دیا تھا۔

سوال: یہ کیسا اصول وضع ہوا کہ جب بے نظیر بھٹو کی حکومت 1996ء میں ختم ہوئی تو وہ 3 سال پہلے والا اصول ختم ہوگیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں اس بنچ میں نہیں تھا، جس نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کی بحالی کا مقدمہ سنا۔ ممکن ہے فل بنچ سنتا تو اور فیصلہ ہوتا۔ پہلا فیصلہ 11 ججوں نے دیا تھا، دوسرا چار ججوں نے۔ ہم نے نواز شریف کی درخواست میں قرار دیا تھا کہ کرپشن کی وجہ سے کسی حکومت اور اسمبلی کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم بے نظیر بھٹو کی حکومت کے مقدمے میں اسمبلی اور حکومت کا خاتمہ ماورائے عدالت قتل اور امن و امان کی خرابی کی وجہ سے کیا گیا اور ظاہر ہے کہ امن و امان کی بحالی حکومت کی اولین ذمے داری ہے۔

سوال: بات عدلیہ کے بحران کی ہو رہی تھی اور آپ ذکر کر رہے تھے وکلاء کے خلاف توہین عدالت کے مقدمات کی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل 1995ء میں ججز کیس چلا جس میں یہ اصول وضع ہوا کہ سینئر موسٹ جج کا چیف جسٹس بننے کا سب سے زیادہ حق ہے۔ اس فیصلے کے آنے کے بعد ٹی روم میں ہم نے شاہ صاحب سے کہا کہ اپنے فیصلے کی روشنی میں اب آپ کو اس پر خود عمل کرنا چاہیے اور چیف جسٹس سینئر موسٹ جج کو بننا چاہیے۔

سوال: کیا آپ لوگوں نے خود ان سے کہا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل، میں نے اور اجمل میاں نے ان سے کہا کہ اب آپ اس فیصلے پر عمل درآمد کریں۔ آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا جس پر شاہ صاحب نے کہا کہ میں آگ سے کیوں کھیلوں؟

سوال: یہ بات آپ نے مذاق میں کہی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں نہیں، ہم نے انتہائی سنجیدگی سے یہ بات کی، بلکہ ہم نے کہا کہ اس وقت سعد سعود جان کے پانچ ماہ باقی ہیں، لہٰذا انہیں ان کا حق ملنا چاہیے لیکن شاہ صاحب نہیں مانے۔

سوال: شاہ صاحب کا تو یہی کہنا ہے کہ ان کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ان کے خلاف کوئی سازش نہیں ہوئی۔ جسٹس خلیل الرحمٰن کوئٹہ گئے تو وہاں ان کے خلاف بھی یہ درخواستیں آنی شروع ہو گئیں کہ سینئر موسٹ جج کو چیف جسٹس ہونا چاہیے۔ کوئٹہ کی بار اور وکلاء شاید پاکستان بھر کی تمام بار ایسوسی ایشنز میں سب سے زیادہ آزاد ہیں۔ چنانچہ جب یہ مقدمہ آیا تو کوئٹہ بنچ نے صرف یہ لکھا کہ اس طرح کی درخواستیں پہلے بھی آئی ہیں اور اب پھر آئی ہے۔ اس مقدمے کے حوالے سے یہ ریفرنس دیا گیا کہ اس معاملے کے بارے میں بنچ بنانا چاہیے۔

سوال: بقول آپ کے کوئٹہ بنچ کا فیصلہ صرف ریفرنس تھا اور اس کا مقصد اس حوالے سے بنچ کی تشکیل تھا لیکن آپ نے پشاور بنچ سے جو فیصلہ بنایا وہ تو باقاعدہ انتظامی فیصلہ تھا جو کہ شاید آپ کے دائرہ کار میں ہی نہیں تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سپریم کورٹ کے سب جج برابر ہوتے ہیں۔ چیف جسٹس کو روسٹر بنانے کا اختیار ضرور ہوتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اگر یہ سمجھ لے کہ وہ خود سپریم کورٹ ہے، تو وہ غلط ہے۔ شاہ صاحب تو سیاست دانوں کی طرح روز بیانات دیتے تھے۔ ایک دن میں نے اور جسٹس منور مرزا مرحوم نے ٹی روم میں شاہ صاحب سے احتجاج کیا کہ آپ کو سیاست دانوں کی طرح بیانات نہیں دینے چاہئیں، عدالتیں سیاسی جماعتیں نہیں ہیں، یہاں تو آئین کے معاملات کی تشریح ہوتی ہے۔ ہم نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ کیوں غوث علی شاہ، جتوئی اور شہباز شریف سے مذاکرات کرتے ہیں۔ سپریم کورٹ صرف چیف جسٹس کا نام نہیں، بلکہ سپریم کورٹ چیف جسٹس اور ججوں کا نام ہے۔ ہم ججوں کو تو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ شاہ صاحب جب بھی لاہور جاتے تو نواز شریف اور شہباز شریف کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بعد میں وہ میاں شریف کی مزاج پرسی کے لیے رائے ونڈ بھی گئے۔ یہ انتہائی معیوب بات تھی۔ پہلے یہ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے بہت قریب تھے۔ میرے پاس ان کے بہت سے فوٹو ہیں جس میں وہ آصف زرداری اور آغا رفیق کے ساتھ بیٹھے ہیں۔

سوال: کوئٹہ بنچ اور پشاور بنچ کے فیصلوں سے ججوں کی تقسیم کا تاثر پختہ ہوا اور حتمی طور پر عدلیہ کی بدنامی بھی ہوئی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اصل بات یہ ہے کہ جب کوئٹہ بنچ نے ریفرنس کی بات کی تو جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنے چیمبر میں بیٹھ کر بنچ کا روسٹر ہی منسوخ کر دیا۔ اس پر کوئٹہ بنچ کے جج بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے چیف جسٹس کے کام کرنے پر پابندی کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے بعد میرے پاس پشاور میں بہرہ ور سعید نے درخواست داخل کی، جس پر میں نے کہا کہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے 14 ججوں کا ایک فل بنچ اس مقدمے کی سماعت کرے کیونکہ یہ مقدمہ سجاد علی شاہ کے خلاف تھا، اس لیے میں نے کہا کہ وہ اس بنچ میں نہ بیٹھیں۔ میرے اس آرڈر پر اجمل میاں نے کہا وہ تو خود Interested پارٹی ہیں کیونکہ وہ خود چیف جسٹس بنیں گے۔ اس پر میں نے نیا حکم جاری کیا کہ اجمل میاں کے بعد سینئر موسٹ جج، جو میں خود تھا، اس مقدمے کی سماعت کرے گا اور پھر یوں ہوا کہ ایک کورٹ میں شاہ صاحب تیرہویں اور چودہویں ترمیم کو معطل کر رہے تھے تو دوسری طرف ہم ان کے خلاف مقدمے کی سماعت کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے ترمیم کو معطل کیا، حالانکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ سماعت کے دوران مجھے اس بارے میں بتایا گیا تو میں نے شاہ صاحب کے فیصلے کو منسوخ کر کے اس کی نقل صدر کو بھجوا دی۔ یہاں میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ہم نے شاہ صاحب کو نکالا نہیں تھا۔ وہ سپریم کورٹ کے جج رہے۔ ہم نے تو انہیں صرف چیف جسٹس کے عہدے سے ہٹایا تھا۔

سوال: بظاہر تو یہ باتیں بڑی سادہ لگ رہی ہیں لیکن ان واقعات نے ملک پر بہت اثر ڈالا اور ان واقعات کے پس پردہ بہت کہانیاں مشہور ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کوئٹہ بنچ کے فیصلے کے لیے لاہور سے ایک جہاز اڑا، جس میں شہباز شریف اور جسٹس (ر) رفیق تارڑ سوار تھے اور پھر ان کی کوئٹہ آمد سے یہ فیصلہ ممکن ہو سکا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ سب افواہیں ہیں۔ کوئٹہ بنچ کا فیصلہ ارشاد حسن خان نے لکھا۔ میں آپ کو اندرونی بات بتاؤں کہ ارشاد حسن خان اور رفیق تارڑ کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔

سوال: اس سارے معاملے میں نواز شریف حکومت کی دلچسپی بھی تھی، آخر حکومت کا بھی تو کوئی کردار ہوگا؟ کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کے مخالف جج حکومت کے مشورے سے فیصلے کر رہے تھے۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل غلط۔ ہمارا حکومت کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں 9 سال تک اسلام آباد میں رہا ہوں، مجھے تو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔

سوال: سجاد علی شاہ کا یہ بھی الزام ہے کہ جسٹس اجمل میاں اپنے خرچ پر اسلام آباد آئے اور بجائے سپریم کورٹ کی پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت کرنے کے وہ وزیر اعظم ہاؤس چلے گئے اور وہاں جسٹس (ر) رفیق تارڑ اور سیاسی لوگوں سے ملتے رہے۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے اس بات کا علم نہیں اور جسٹس اجمل میاں کی رفیق تارڑ سے کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔

سوال: اور پھر عدلیہ اور پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ ہوا، جب سپریم کورٹ پر حملہ کیا گیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل، سپریم کورٹ پر حملہ کرنے والوں کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے تھی۔

سوال: سپریم کورٹ پر حملے کی وجہ بھی ججوں کی اندرونی لڑائی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں، اس کی وجہ ججوں کی تقسیم نہیں تھی۔

سوال: تو کیا اس معاملہ میں حکومت وقت کی شہ شامل نہیں تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اگر ایسا تھا تو حکومت کے خلاف سخت ایکشن لینا چاہیے تھا۔ جس طرح سے اس کیس کو چلایا گیا وہ غلط تھا۔ سب سے پہلے گواہی ریکارڈ ہونی چاہیے تھی، وہ ریکارڈ نہیں ہوئی۔ اصل میں جج کے سامنے ہونے والی توہین عدالت کا طریق کار واضح ہے۔ پانچ ججوں کو چاہیے تھا کہ توہین عدالت کرنے والوں کو اسی وقت سزا دے دیتے۔

سوال: اس وقت سجاد علی شاہ کی بات کون سنتا تھا؟ اگر وہ سزا سنا بھی دیتے تو اس پر عمل کون کرتا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی سزاؤں پر عمل درآمد نہ ہو۔

سوال: ان کے باقی فیصلوں پر کہاں عمل درآمد ہوا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: وہ فرد جرم تو عائد کر سکتے تھے وہ فیصلہ کرتے تو حکومت ہر حال میں اس پر عمل درآمد کراتی۔

سوال: چیف جسٹس نے فوج کو بلایا کہ وہ آ کر حفاظت کرے لیکن فوج کے سربراہ جہانگیر کرامت نے انکار کر دیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: فوج اس وقت تک نیوٹرل تھی۔ آئین پاکستان کا آرٹیکل 190 بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے تمام ادارے سپریم کورٹ کے فیصلوں میں اس کی امداد کے پابند ہیں۔

سوال: اگر آپ کی یہ بات مان لی جائے تو پھر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے احکامات پر فوج کو سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے آنا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل، فوج نے نہ آ کر غلطی کی۔ فوج کو سو فیصد آنا چاہیے تھا۔ انہیں سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے آنا چاہیے تھا۔ انہیں اس معاملے میں کسی سے پوچھنے کی

ضرورت نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ فوج منسٹری آف ڈیفنس کے ماتحت ہے لیکن میرے خیال میں فوج کو اصرار کرنا چاہیے تھا۔

سوال: تو جنرل جہانگیر کرامت کی غلطی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل، یہ ان کی غلطی تھی۔ انہیں اصرار کرنا چاہتے تھا کہ فوج کی یہ آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ سپریم کورٹ کی حفاظت کرے اور میرے خیال میں اگر وہ اصرار کرتے تو حکومت مان بھی جاتی۔

سوال: تو کیا آئندہ سپریم کورٹ فوج کو اپنی مدد کے لیے بلائے تو فوج کو آنا چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بالکل واضح بات ہے۔ فوج اس معاملے میں آئینی طور پر پابند ہے۔ سپریم کورٹ کے پاس اس بارے میں مکمل اختیار ہے۔

سوال: لیکن اس معاملے کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ اگر اس دن فوج سپریم کورٹ کی مدد اور حفاظت کے لیے آجاتی تو نواز شریف حکومت اسی دن ختم ہو جاتی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ختم ہوتی تو ہو جاتی۔ ہمیں ان مصلحتوں میں نہیں پڑنا چاہیے نہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس وجہ سے ہی ہمیں زوال دیکھنا پڑا ہے مولوی تمیز الدین کیس میں بھی عدلیہ نے یہی مصلحت اختیار کی اور کہا کہ اگر اسمبلی بحال ہوئی تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ بھئی جو ہوتا ہے، ہونے دو۔ جو عذاب آتا ہے، آئے۔ آئین کی پابندی ہونی چاہیے۔

سوال: آپ نے شاہ صاحب کے خلاف عدلیہ کے اندر ہی بغاوت کر دی تھی، اسی وجہ سے انہوں نے آپ کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس بھی بھیج دیا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل یہ سچ ہے۔ جب میں نے ان کے خلاف مقدمے کی سماعت کے لیے روسٹر طے کیا تو شاہ صاحب نے میرے بارے میں کہا کہ انہوں نے غداری کی ہے۔

سوال: کیا شاہ صاحب نے آپ سے یہ بات کی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں وہ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔ ہماری بول چال اس وقت سے بند تھی جب سے میں نے ان کے بیانات پر احتجاج کیا تھا۔

سوال: تو جسٹس سجاد علی شاہ نے آپ کے خلاف ریفرنس بھجوایا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جی بالکل، انہوں نے صدر کے پاس صرف میرے خلاف ریفرنس بھجوایا حالانکہ اور بھی جج اس بنچ میں شامل تھے۔ اصل میں وہ چاہتے تھے کہ میں اس بنچ کی صدارت نہ کروں، کوئی اور کرے۔

سوال: وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: انہیں علم تھا کہ میں بہت طاقت ور جج ہوں۔ میں کسی کے اثر میں نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے کراچی کے زمانے سے جانتے تھے۔ وہ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور میں دوسرے نمبر پر تھا۔ ان کے میرے بارے میں اس زمانے سے تحفظات تھے۔ اصل میں ہم نے جو ایکشن لیا اس کا مطلب یہ تھا کہ عدلیہ کے وقار کا تحفظ کیا جائے۔

سوال: معذرت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے ایکشن کا مقصد جو بھی تھا نتیجہ تو یہ نکلا کہ عدلیہ کا وقار خراب ہوا اور تاثر یہ ملا کہ کچھ جج حکومت سے ملے ہوئے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بالکل غلط تاثر ہے۔ یہ نامعقول بات ہے۔ اس معاملے کا حکومت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ سجاد علی شاہ کے خلاف مقدمات پہلے سے فائل تھے وہ انہیں چلنے نہیں دیتے تھے۔

سوال: آپ نے بھی ان مقدمات کی سماعت تب شروع کی جب جسٹس سجاد علی شاہ کا حکومت سے تنازع شروع ہو گیا۔ اگر ٹائمنگ کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ آپ حکومت کو فائدہ پہنچا رہے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بس! یہ خرابی اوقات کی وجہ سے ہوئی۔ بہر حال ٹائمنگ تو ایسے ہی تھی اور عوام کی خیال آرائی کو کس طرح روک سکتے ہیں۔ ہم سب جج روزانہ آپس میں بات کرتے تھے کہ شاہ صاحب تمام سینئر ججوں کو اسلام آباد سے باہر بھیج کر لاہور سے تازہ آنے والے دو جونیئر ججوں کے ساتھ بیٹھ کر فیصلے کر رہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلے مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔

سوال: باتیں اتنی سادہ نہیں۔ سجاد شاہ کا موقف تو یہ ہے کہ وہ بیرون ملک گئے تو ان کے خلاف سازش کرتے ہوئے بالا ہی بالا حکومت کو خط لکھ دیا گیا کہ قائم مقام چیف جسٹس بنایا جائے، جب کہ شاہ صاحب کے کہنے کے مطابق قائم مقام چیف جسٹس بنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اس سلسلے میں آئین کا آرٹیکل واضح ہے۔ ہوا یوں کہ جسٹس سجاد علی شاہ نے رجسٹرار سے کہا کہ وہ جمعرات کو بیرون ملک جا رہے ہیں وہ کسی کو اس سلسلے میں نہ بتائیں اور جمعہ ہفتہ کی ان کی غیر حاضری کو گول کر جائیں لیکن میں دوسرے دن عدالت میں گیا تو میں نے جاتے ہی رجسٹرار ذکاء کو طلب کیا اور کہا کہ مسٹر سجاد کہاں ہیں؟ پہلے تو وہ متذبذب ہوئے پھر میں نے کہا کہ میں ایکشن لوں گا، تو اس نے مجھے بتا دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کے لیے صدر کو سمری بھیجی ہے۔ آئین پر عمل کیا جائے اور فوری طور پر سمری بھیجی

جائے۔ رجسٹرار ذکاء نے کہا کہ تعطیلات آنے والی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ وزارت قانون کو ریفرنس بھیجیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ سیکرٹری وزارت قانون سے وضاحت مانگی جائے کہ کیوں قائم مقام چیف جسٹس کا تقرر نہیں کیا گیا۔ میں اس وقت تک عدالت میں نہیں بیٹھوں گا جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ میں نے رجسٹرار کو دھمکی دی کہ میں تمہارے اور سیکرٹری قانون، دونوں کے خلاف ایکشن لوں گا جس پر رجسٹرار نے سمری بنا کر صدر کو بھیجی۔ اس طرح سے میں نے ہفتہ کو قائم مقام چیف جسٹس کا حلف اٹھایا۔ اس پر شاہ صاحب فوراً ملک واپس آ گئے اور اگلے ورکنگ ڈے سے پہلے چارج سنبھال لیا۔

سوال: تو گویا آپ لوگوں کی کشمکش پہلے سے چل رہی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہم لوگوں کی کوئی ذاتی لڑائی تو تھی نہیں۔ ہماری بیگم اور ان کی بیگم کا بہت ملنا جلنا تھا، لیکن اصولوں کے معاملات پر لڑائی تھی۔ اگر وہ قانون کی حدود میں کام کرتے رہتے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ لیکن ان کا کچھ عجیب سا رویہ تھا۔ کسی بھی سینئر جج کے ساتھ ان کی بنتی ہی نہیں تھی۔

سوال: صابر شاہ کیس میں کیا ہوا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اس میں انہوں نے ایڈہاک ججوں کو بنچ میں شامل کر کے اپنے ساتھ ملا لیا اور وفاقی حکومت کے حق میں فیصلہ لے لیا۔ اس کے اگلے ہی دن انہیں مرسڈیز مل گئی۔ حالانکہ انہیں یہ گاڑی رکھنے کا استحقاق نہیں تھا۔

سوال: یہ بھی سنا گیا کہ نواز شریف دور میں ججوں کو بھی مرسڈیز گاڑیاں دی گئیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بھی غلط تھا اصل میں یہ ہوا تھا کہ جب سجاد علی شاہ کے خلاف مقدمات کی سماعت کے لیے جج اسلام آباد آئے تو ان کے لیے گاڑیاں کم تھیں، اس لیے انہیں مرسڈیز گاڑیاں دے دی گئیں۔ اصل میں جس جج کی جہاں فیملی ہوتی ہے اس کی سرکاری گاڑی بھی وہاں ہوتی ہے۔ جب وہ اسلام آباد آئے تھے تو پروٹوکول سے گاڑی منگوا کر انہیں دی جاتی تھی۔ لہٰذا اس زمانے میں ایک دو ججوں کو مرسڈیز گاڑیاں دی گئیں۔

سوال: پھر تو مرسڈیز گاڑیوں کا مقابلہ ہو گیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: (قہقہے) سجاد علی شاہ کو تو مرسڈیز ای ایل 320 خرید کر دی گئی تھی۔ بعد میں اجمل میاں نے یہ گاڑی واپس کر دی اور کہا کہ انہیں یہ گاڑی رکھنے کا استحقاق نہیں۔

سوال: فل کورٹ میٹنگ کا قصہ کیا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اصل میں لڑائی اسی میٹنگ میں شروع ہوئی۔ جسٹس سجاد علی شاہ سعودی عرب گئے ہوئے تھے اور میں بھی لندن میں تھا۔ ماضی کی روایت یہ تھی کہ کسی بھی مسئلے پر غور کے لیے فل کورٹ میٹنگ بلائی جاتی تھی۔ سجاد علی شاہ صاحب کو علم تھا کہ انہیں فل کورٹ میٹنگ میں سپورٹ نہیں ملے گی۔ اس لیے وہ اجلاس بلاتے نہیں تھے۔ دوم یہ کہ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ چیف جسٹس ہی اصل میں سپریم کورٹ ہوتا ہے۔ وہ خود کو سپریم کورٹ کا بادشاہ سمجھتے تھے۔ اجمل میاں نے یہ کیا کہ فل کورٹ میٹنگ کے لیے تاریخ طے کر دی۔

سوال: اور پھر سجاد شاہ ملک واپس آ گئے تو وہ میٹنگ معطل کر دی گئی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سجاد شاہ بغیر عمرہ کیے واپس آ گئے حالانکہ ہم نے میٹنگ میں کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرنا تھا۔ ہمیں تو صرف تاریخ طے کرنی تھی۔ اس طرح سے انہوں نے فل کورٹ میٹنگ نہیں ہونے دی۔

سوال: آپ لوگ یہ فل کورٹ میٹنگ کیوں کرنا چاہتے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہم ان کو ان کی حرکتوں سے روکنا چاہتے تھے۔ ان کی بیان بازی کو روکنا چاہتے تھے۔ بعض پریس والوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ فل کورٹ اجلاس میں اصول طے کریں۔

سوال: سجاد شاہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض جج ان کے خلاف اس لیے ہوئے کہ وہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر کام کر رہے تھے۔ جب ان کو سپریم کورٹ بلایا گیا تو وہ ناراض ہو گئے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: شیخ ریاض لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ شاہ صاحب اور شیخ صاحب کے درمیان انتظامی معاملات پر اختلاف ہوئے تو شیخ صاحب کو سپریم کورٹ میں بلا لیا گیا۔ شاہ صاحب کا رویہ کسی جج کے منصب کے مطابق نہیں ہے۔

سوال: ججوں کی تعداد کے حوالے سے بھی شاہ صاحب اور حکومت کے درمیان شدید اختلاف ہوا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اس بارے میں ہمارا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہمارا کہنا یہ تھا کہ تعداد کا معاملہ فل کورٹ میں رکھا جائے اور فل کورٹ یہ فیصلہ کرے کہ ججوں کی تعداد کتنی ہونی چاہیے؟

سوال: ججز کیس کے فیصلے کی بہت تعریف کی جاتی ہے، لیکن اس فیصلے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس فیصلے سے ججوں اور وکلاء کی اشرافیہ کو فائدہ پہنچا۔ چھوٹے شہروں کے وکلاء کو اس سے نقصان ہوا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ججز کیس میں، ہم سب سجاد شاہ صاحب کے ساتھ تھے۔ یہ

فیصلہ تو بہت اچھا ہے۔اس فیصلے کے تحت ابتدائی اختیار صوبے کے چیف جسٹس کو مل گیا ہے۔اب چیف جسٹس، باراور ججوں کے مشورے سے ججوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ ججوں کی اشرافیہ کو چننے کا تصور غلط ہے۔

سوال: ججوں میں بدعنوان افراد موجود ہیں لیکن ان کا احتساب کوئی نہیں کرتا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہر جگہ بدعنوانیاں ہیں۔ ججوں کا بھی احتساب ہونا چاہیے۔ سپریم جوڈیشل کا ادارہ اسی مقصد کے لئے قائم ہے۔

سوال: سپریم جوڈیشل کونسل غیر مؤثر ادارہ بن چکا ہے۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: آپ نے صحیح کہا۔ میرے خیال میں اس ادارے میں بہتری کی ضرورت ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ اگر اس کے پاس کوئی براہ راست شکایت آئے تو وہ جوڈیشل کونسل کے پاس بھیجے جو حتمی رپورٹ بنا کر صدر کو بھیج دے۔

سوال: عام لوگوں کا عدلیہ پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بہت سارے مقدمات کے فیصلوں کو لوگوں کی حمایت نہیں ملی۔ عدلیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے فیصلے کرے کہ عوام کا اس پر اعتماد بحال ہو۔ کسی بھی ادارے کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ لوگ اس ادارے پر اعتماد کریں۔

سوال: ججوں کی تاریخ پیدائش میں تبدیلی بھی جگ ہنسائی کا باعث بنی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اجمل میاں نے تو تاریخ پیدائش 1954ء میں اس وقت تبدیلی کروائی جب انہوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ انہیں تو اس وقت علم نہیں تھا کہ وہ چیف جسٹس بنیں گے۔ جب کہ شاہ صاحب کو 1998ء میں اپنی تاریخ پیدائش تبدیل کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔

سوال: حکومت اور عدلیہ کی محاذ آرائی کے دوران یہ بھی کہا گیا کہ پارلیمنٹ سپریم ہے اور چیف جسٹس کو گرفتار کر کے پارلیمنٹ خود ان کی جواب طلبی کر سکتی ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ تو بالکل غلط بات ہے۔اس سے تو پورے ادارے کی توہین ہوتی۔ البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ پارلیمنٹ سپریم ادارہ ہے۔

سوال: جسٹس (ر) سجاد شاہ کے ریسٹ ہاؤس کے غلط استعمال کی خبروں کی کیا حقیقت تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ خبریں بالکل درست تھیں۔ سجاد علی شاہ کے داماد، وزیر اعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ کے سیکرٹریٹ میں کلرک تھے۔انہوں نے اسے وزیر اعظم بے نظیر سے اسسٹنٹ

کمشنر بھرتی کروایا۔ جب وہ پشاور میں ٹریننگ کر رہا تھا تو اسے سپریم کورٹ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور وہ 9 مہینے تک ریسٹ ہاؤس استعمال کرتا رہا۔ اس دوران شاہ صاحب نے احتیاط یہ کی کہ پشاور میں کیسوں کی سماعت کے لیے جسٹس جہانگیری اور جسٹس فضل الٰہی خان کو بھیجتے رہے جو پشاور کے ہی رہائشی تھے۔ میں پشاور گیا تو مجھے پتا چلا کہ داماد صاحب 9 ماہ سے وہاں رہ رہے ہیں۔ پھر شاہ صاحب نے کراچی میں بھی سرکاری گھر لے رکھا تھا اور سپریم کورٹ کی پرانی عمارت کی رہائش گاہ بھی استعمال کر رہے تھے۔ اس سے پہلے نسیم حسن شاہ نے اس گھر پر زبردستی قبضہ کیا ہوا تھا اس کے بعد یہ قابض ہو گئے۔ اس گھر پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے۔ ہمارے رولز کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد جج صرف ایک ماہ تک سرکاری رہائش گاہ میں رہ سکتا ہے۔ شاہ صاحب دو سال تک سرکاری گھر میں رہے اور کہتے رہے کہ جب تک میرا عمر کا مسئلہ طے نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ ان کی اپنی قانون کی پاسداری کا یہ عالم تھا۔

سوال: آپ لوگوں نے شاہ صاحب کی ریٹائرمنٹ پر ریفرنس بھی نہیں منعقد کیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہم نے تو انہیں مدعو کیا تھا انہوں نے بطور احتجاج ریفرنس قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے رہے ہیں کہ انہیں پنشن نہیں ملی۔ انہوں نے کاغذات ہی داخل نہیں کیے، انہیں پنشن کیسے ملتی؟

سوال: عدلیہ اور سابقہ حکومت کی لڑائی تو متوازی عدالتی نظام کے قیام سے شروع ہوئی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: پاکستان میں جو بھی حکومت آتی ہے، اس کا پہلا نشانہ عدلیہ ہوتی ہے، کیونکہ عدلیہ کو حکومت اپنا حریف سمجھتی ہے۔ حالانکہ عدلیہ ''شاک ابیزاربر'' کا کام کرتی ہے۔ لیکن اگر عدلیہ کا تاثر یہ ہو کہ وہ حکومت کے زیر اثر ہے تو پھر لوگوں کو نہ تو اس سے ریلیف مل سکتا ہے اور نہ ہی لوگ اس سے انصاف کی توقع کریں گے۔ سول اور فوجی حکمراں سب عدلیہ کی آزادی ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ نواز شریف بھی فوجی عدالتیں لانا چاہتے تھے۔ اگر عدلیہ ان کو ختم نہ کرتی تو آج نواز شریف کا فوجی عدالت کے ذریعے خود کیا حشر ہوتا۔ بھٹو نے انسداد دہشت گردی کا قانون بنایا اور خود اس کا شکار ہوئے۔ نواز شریف میں بھی آمرانہ سوچ تھی۔ وہ جلد از جلد انصاف چاہتے تھے۔ ہر کوئی اس بات کا حامی ہے لیکن جلد از جلد انصاف کا مطلب بے انصافی نہیں ہونا چاہیے۔ کہیں جلد از جلد انصاف مہیا کرنے کے چکر میں انصاف کو قتل نہ کر دیا جائے۔ نواز شریف نے متوازی عدالتی نظام بنانے کی کوشش کی۔ سپریم کورٹ نے فوجی عدالتوں کے قیام کو روکا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ سجاد شاہ کو چیف جسٹس بنانے سے پہلے ان سے استعفیٰ لکھوانے کا

مطالبہ بھی کیا گیا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جب آپ سیاست دانوں کے قریب جائیں گے تو یہ تو ہوگا۔

سوال: وہ آغا رفیق کا قصہ کیا تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جب سجاد علی شاہ صاحب سکھر میں تھے تو آغا رفیق کے ساتھ اسلام آباد گئے۔ بے نظیر بھٹو سے ملے اور بعد میں انہیں سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا۔ بعد میں بے نظیر بھٹو نے کہا کہ وہ اس قابل نہیں تھے۔ لیکن میری وجہ سے وہ چیف جسٹس بن گئے۔ ہمارا شاہ صاحب سے بنیادی اختلاف یہ تھا کہ آپ سیاست دانوں کے اتنے قریب کیوں ہیں۔ آغا رفیق شاہ صاحب کے بہت قریب تھے۔ جب ان کا نام جج کے لیے سامنے آیا تو شاہ صاحب نے کہا کہ ان کا سنیارٹی کی فہرست میں 34واں نمبر ہے۔ وہ جوڈیشل سروس کے آدمی ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اوپر والے آدمی کیا کہیں گے۔ اس پر آصف زرداری نے جو آغا رفیق کے دوست تھے کہا کہ عدلیہ میں میرٹ کب سے لاگو ہوا ہے۔ یعنی آپ کونسی سنیارٹی کے میرٹ پر چیف جسٹس بنے ہیں۔ اسی بات پر سجاد علی شاہ صاحب اور بے نظیر اور آصف زرداری کے درمیان ناراضگی پیدا ہوگئی۔

سوال: بے نظیر بھٹو اور نواز شریف سے ملاقاتیں کیسی رہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں تو کبھی بے نظیر سے ملا ہی نہیں۔ سرکاری اور سماجی تقریبات میں ملاقات ضرور ہوئی ہے۔ گورنر پنجاب الطاف حسین میرے ذاتی دوست تھے۔ میں جب بھی لاہور جاتا، ان سے کھانے پر ملتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ آپ کی بے نظیر سے ملاقات کروانی ہے، میں نے انکار کر دیا۔ ایک ڈنر میں بے نظیر سے ملاقات ہوئی اس وقت آصف زرداری کا مقدمہ میرے پاس زیر سماعت تھا۔ انہوں نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔

سوال: نواز شریف سے تو ملاقاتیں ہوتی ہوں گی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: وہ تو مجھے پہچانتے ہی نہیں تھے۔ میں جب چیف جسٹس بنا تو 14 اگست کو وزیراعظم ہاؤس گیا اور وہاں اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ چودھری شجاعت میرے پرانے شناسا تھے۔ انہوں نے جا کر وزیراعظم کو بتایا تب وہ مجھ سے ملنے آئے۔ اسی طرح 1993ء میں جب نواز شریف حکومت کی بحالی کا مقدمہ چل رہا تھا تو میں جہاز کی فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ نواز شریف اور شجاعت بھی تھے۔ حسب معمولی پیسٹریاں وغیرہ کھائی جا رہی تھیں۔ شجاعت مجھ سے آکر ملے اور نواز شریف کو جا کر بتایا جس کے بعد وہ میرے پاس آئے اور گفتگو کی۔

سوال: آپ پر گورنر سندھ نے الزام لگایا تھا کہ آپ نے بچے کے داخلے کے لیے ان سے سفارش کی تھی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرا تو ایک ہی بیٹا ہے جو اب سکول سے کالج گیا ہے۔ میں تو ان کا (گورنر سندھ) کا شناسا ہی نہیں۔ یہ الزام غلط ہے۔

سوال: آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ کی ڈاکٹر بیگم صاحبہ کو آپ کے چیف جسٹس بننے کے بعد مشیر بنا دیا گیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میری بیگم لندن سے ڈرمیٹالوجی کے حوالے سے کورس کر کے آئی تھیں۔ وہ اس زمانے میں پمز اسلام آباد میں کام کرتی تھیں۔ ان کی سماجی کاموں میں دلچسپی ہے۔ اس وجہ سے ہسپتال انتظامیہ نے حکومت کو ریفرنس بھیجا کہ انہیں مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک آسامی کی ضرورت ہے۔ جس پر انہیں مشیر برائے ایگزیکٹو بنا دیا گیا لیکن نہ تو انہیں کوئی اضافی تنخواہ ملی نہ یہ کوئی اضافی ترقی تھی۔ یہ تو ایک طرح سے اضافی بوجھ تھا۔ (قہقہے)

سوال: بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کو آپ بطور قانون دان کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بھٹو کی پھانسی عدالتی طریق کار کے مطابق ہوئی۔ اس لیے میں اس پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

سوال: تو کیا جج کو فیصلہ کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس فیصلے کے نتائج کیا ہوں گے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جج فیصلہ کرتے ہوئے نتائج کے بارے میں نہیں سوچتے اور نہ سوچنا چاہیے۔ اگر سجاد علی شاہ کی طرح عوامی جج بننے کی کوشش کی جائے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ اس سے آپ دستور اور قانون کی حدود عبور کر جاتے ہیں۔

سوال: قتل یا بدعنوانی کی گواہیاں کیا ہوتی ہیں، یہ بھی عوام سے ہی آتی ہیں۔ اگر کسی ملک کے عوام کی اکثریت کسی کو قتل یا کرپٹ قرار نہ دے تو عدلیہ کیسے عوام کی رائے کے برعکس فیصلے دے سکتی ہے ایسے فیصلوں کو عوام قبول نہیں کرتے۔ عوام خود سب سے بڑی عدالت ہیں۔

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اصول یہ ہے کہ آپ ایک بے گناہ کو پھانسی دینے کی بجائے دس گناہگاروں کو چھوڑ دیں۔ اسلام کا اصول بھی یہی ہے۔ ایک عورت جس کو رجم کی سزا دی گئی، چار بار رسول اکرم ﷺ کے پاس گئی آپ ہر بار اسے واپس بھیجتے رہے۔ ایک بار وہ آئی تو حاملہ تھی، پھر آئی تو اس کا بچہ دودھ پی رہا تھا۔ اس عورت نے اصرار کیا کہ اس پر زنا کی حد صادر کی جائے۔ اس کے بعد زنا کی حد لگائی گئی اور پھر یہ کہا گیا کہ پہلا پتھر وہ مارے جس نے کوئی گناہ کبیرہ نہ کیا ہو۔ اسلام میں

سزاؤں کے بارے میں بڑی احتیاط ہے۔قصاص کے حوالے سے کسی کو بھی گواہی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کو عوامی حمایت کبھی نہیں ملی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ درست ہے، اصل میں جج نے فیصلہ تو ان شہادتوں کی بنیاد پر ہی کرنا ہوتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جائیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس فیصلے کو عوامی حمایت نہ ملے وہ لازمی طور پر غلط ہو۔ جسٹس منیر کے فیصلے کو کبھی عوامی حمایت نہیں ملی۔ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے کو بھی نہیں مانا جاتا۔

سوال: کیا پاکستان کے لیے نئے آئین کی ضرورت ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہرگز نہیں! دوبارہ متفقہ آئین نہیں بن سکتا۔ اس آئین میں ترامیم ہو سکتی ہیں۔

سوال: کیا آئین توڑنے والوں کو سزا ملنی چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ایسا مقدمہ کبھی عدالت میں آیا نہیں۔ اگر کبھی آیا تو شاید اس بارے میں فیصلہ ہو جائے۔

سوال: آپ کہاں پیدا ہوئے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں کلکتہ میں پیدا ہوا۔ لیکن ہمارے خاندان کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ پھر ہمارے آباؤ اجداد نے تجارت کے لیے ہجرت کی۔ کلکتہ میں ہمارا کاروبار تھا۔ کئی پشتوں سے ہم لوگ کلکتہ میں رہائش پذیر تھے۔ میں یکم دسمبر 1937ء کو پیدا ہوا۔ جب 1942ء میں کلکتہ پر جاپان نے بم باری کی تو پھر ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ ہمارے دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہماری زمین اور مکان کلکتہ میں تھے۔ وہاں آج بھی ہماری پھوپھی رہتی ہیں۔ میں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ہم نے پھر ہجرت کی اور ڈھاکہ چلے گئے۔ میرے پانچ بھائی اور چار بہنیں ہیں میں تیسرے نمبر پر ہوں میری بہنیں چھوٹی ہیں ہم سب چھوٹے چھوٹے تھے جب ڈھاکہ آ گئے اور انٹر میں نے ڈھاکہ سے کیا 1952ء میں جب ڈھاکہ میں زبان کے مسئلے پر اختلافات ہوئے تو میرے والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ 1956ء میں، میں ہندوستان سے ہوتا ہوا کراچی آ گیا۔ میرے والد صاحب اور بڑے دو بھائی ایک سال پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔ بی اے میں نے اسلامیہ کالج سے کیا۔ پھر ایل ایل بی کیا۔ 1961ء میں میں نے وکالت شروع کی۔ ایک سال تک میں نے یہاں کے ایک سینئر وکیل ادریس قریشی کے ساتھ کام کیا۔ ایک سال کے بعد میں نے اپنا پہلا دفتر وزیر مینشن میں بنایا۔ وہاں دو ڈھائی سال کام کیا۔ 19 سال تک میں نے قانونی

پریکٹس کی۔ پھر 5 مارچ 1980ء کو مجھے ہائی کورٹ کا جج بنایا گیا۔ 6 نومبر 1990ء کو میں سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا۔ 19 مئی 1992ء کو میں نے سپریم کورٹ کو جوائن کیا۔ 1992ء سے لے کر 1999ء تک میں سپریم کورٹ کا جج رہا۔ یکم جولائی 1999ء کو میں چیف جسٹس بنا۔

سوال: آپ کے دوسرے بھائی کیا کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرا تعلق ایک تاجروں کے خاندان سے ہے۔ کوئی بھائی بھی نوکری نہیں کرتا۔ بڑے بھائی کی ٹشو فیکٹری ہے۔ مجھ سے چھوٹا بھائی پی آئی اے میں ہے۔ تیسرے بھائی بھی بزنس کرتے ہیں۔

سوال: آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہماری عدلیہ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں۔ ان میں جسٹس کارنیلس بھی تھے۔ پھر جسٹس ایم آر کیانی صاحب مجھے بہت پسند ہیں۔

سوال: کہتے ہیں کہ عدلیہ کا زیادہ رجحان اب مذہب کی طرف ہو گیا ہے۔ پہلے زیادہ رجحان سیکولر تھا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ بات درست ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی طرف رجحان ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ اگر آپ صحیح معنوں میں مذہب کی پیروی کریں تو بہتر ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کی پیروی کرتے ہیں تو وہ خود انتہا پسندی کے خلاف تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے تو کبھی کسی کی عبادت گاہوں کو نہیں چھیڑا۔ فوجوں کو حکم یہ تھا کہ جب بھی حملہ کریں تو بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ظلم نہ کریں۔ عبادت گاہوں کو نہ چھیڑیں بلکہ ان کی حفاظت کریں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ان کے پیروکار ہیں لیکن اپنے ہم مذہبوں کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی عدالتوں کے اندر تو ایسے لوگ نہیں آئے۔

سوال: آپ نے بچپن میں کون سے کھیل کھیلے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں کرکٹ کھیلتا تھا۔

سوال: آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔

سوال: کون کون سی کتابیں پڑھیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جب تک میں وکیل نہیں بنا تھا اس وقت تک تو فکشن اور ادب پڑھتا تھا۔ جب سے پروفیشن میں قدم رکھا تو اس سے متعلق کتابیں پڑھتا ہوں۔ دوسری کتابوں

کے لیے وقت نہیں ملتا۔

سوال: پاکستان کے 53 سالوں میں کس بات پر دکھ محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر بہت دکھ ہوا۔ ہم نے اپنی آبادی کا ایک بڑا حصہ کھودیا۔ وہ بھی فوجی حکمرانوں کے دور میں۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے۔

سوال: پاکستان کا کوئی ایسا شعبہ بھی ہے جس کی کارکردگی پر آپ اطمینان محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: عدلیہ ایک ایسا شعبہ ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہیے۔ اسے مضبوط کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے آزادانہ کام کرنے دیا جائے۔ اس میں تقرریاں میرٹ پر ہونی چاہئیں۔ اگر عدالتیں آزاد نہیں ہوں گی تو اچھی حکومت نہیں بن سکتی۔ برطانوی وزیراعظم چرچل نے انگلستان پر بم باری کے دوران کہا تھا کہ اگر کورٹ کھلے ہوئے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کورٹ سے انصاف لے سکتے ہیں تو اس وقت تک یہ بم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میری لوگوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ عدلیہ کو مضبوط کریں۔ اگر عدلیہ ایک دفعہ آزاد ہو جائے تو اچھی حکومت خود بخود آجائے گی۔

سوال: آپ نے عروج اور ترقی حاصل کی ہے۔ آپ اس میں اپنی قسمت کا دخل سمجھتے ہیں یا والدین کی دعاؤں کا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جب تک خدا کی مرضی نہ ہو انسان کیا کرسکتا ہے۔ میرے خیال میں انسان کا اپنا کردار اور شخصیت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آپ کی جو ساکھ بار میں ہوتی ہے وہ سب سے اہم ہوتی ہے۔ کیونکہ بار کے لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ جج کے متعلق جو رائے آپ کو بار میں ملے گی وہ کم و بیش درست ہوتی ہے۔ اگر کسی جج کے متعلق رائے یہ ہو کہ وہ ایمان دار ہے تو وہ یقیناً درست ہوگی۔ تھوڑی بہت غلطی تو ہوسکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے اور انسان کا کردار ہی اسے عزت اور ذلت دیتا ہے۔ میں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا۔ اب میرے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے لیکن خدا نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ میرے پاس لاہور سے وکیل اور جج ملنے آتے ہیں۔ میرے خیال میں مجھے جو خدا نے عزت دی ہے اس میں خدا کی رضا کے ساتھ ساتھ میرے کردار کا بھی بڑا دخل ہے۔

سوال: سیاست میں فوج کا کردار ہونا چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرے خیال میں نہیں ہونا چاہیے۔ فوج ایک بڑا منظم ادارہ ہے۔ چھاؤنیاں شہر سے باہر کیوں بنائی جاتی ہیں۔ فوج کو سول علاقوں سے ملا دیا جائے گا تو سول

علاقوں کی برائیاں فوج میں بھی داخل ہو جائیں گی۔فوج پر پورے ملک کے دفاع کا انحصار ہے۔اس لیے اس میں ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔فوج کو سول معاملات سے دور رہنا چاہیے۔اس میں فوج کا فائدہ ہے۔

سوال: کیا پاکستان کو ایٹمی دھماکہ کرنا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل کرنا چاہیے تھا۔

سوال: کیا ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل ہونا چاہیے۔1973ء کے آئین میں جو اسلامی شقیں ہیں وہ کافی ہیں۔ان سے آگے جانے کی ضرورت نہیں۔

سوال: صوبوں کو خودمختاری ملنی چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ضرور ملنی چاہیے۔سانحہ مشرقی پاکستان صرف اسی وجہ سے ہوا۔خودمختاری نہیں دی گئی تھی۔

سوال: خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جتنی آزادی مذہب نے دی ہے اتنی آزادی کے ہم قائل ہیں۔

سوال: کیا عورت کو پردہ کرنا چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: پردے کے متعلق کوئی ایسے احکامات نہیں ہیں کہ آپ عورتوں کو شٹل کاک برقع پہنا دیں۔جتنی آزادی مذہب نے دی ہے اتنی آزادی میں رہ کر وہ کام کریں۔حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں عورتیں جنگوں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔یہ کہنا کہ اسلام عورتوں کی آزادی میں آڑے آتا ہے، غلط ہے۔ہمارے ہاں عورتیں ہر شعبے میں کام کر رہی ہیں۔

سوال: شادی گھر والوں کی مرضی سے کرنی چاہیے یا اپنی پسند سے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اسلام تو خود پسند کی شادی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔اسلام میں کہا گیا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کی مرضی معلوم کریں۔

سوال: آپ نے شادی کب کی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں نے 41 سال کی عمر میں دوسری شادی کی۔میری پہلی شادی کامیاب نہیں رہی۔پہلی اہلیہ بیمار تھیں۔پھر میں نے 1981ء میں دوسری شادی کی۔جب میں جج بن چکا تھا۔دوسری شادی کا تجربہ خوشگوار رہا۔

سوال: پہلی اہلیہ سے بھی بچے تھے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں کوئی نہیں۔

سوال: جہیز کی رسم کس حد تک ٹھیک ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: یہ رسم بالکل غلط ہے۔ اسلام میں تو اس کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

سوال: کیا لڑکی کو جائیداد میں حصہ دینا چاہیے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: حصہ نہ دینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بالکل دینا چاہیے۔ اسلام میں لڑکے کا حصہ مقرر نہیں ہے۔ لیکن لڑکی کا حصہ مقرر ہے۔ سورۃ النساء کو پڑھیں، اس میں عورتوں کے حصے مقرر ہیں، لڑکے کا کوئی حصہ مقرر نہیں۔

سوال: وہ کس طرح؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: لڑکے کے حصے کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو حصہ بچے گا وہ اسے دیا جائے گا۔ آپ سورۃ النساء پڑھیں، اس میں واضح لکھا ہے۔ اس میں بڑی حکمت ہے کہ آپ پہلے ماں، باپ اور لڑکی کا حصہ مقرر کریں گے۔ اس کے بعد جو بچے گا وہ لڑکے کو ملے گا۔

سوال: کیا آپ گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل لیتا ہوں۔ گھر کے سب کاموں میں بیگم کا ساتھ دیتا ہوں۔

سوال: عام طور پر تو آپ بہت مصروف ہوتے ہوں گے۔ تو پھر گھر کے کاموں میں ہاتھ کیسے بٹاتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مصروفیت کے باوجود ہم گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہمیشہ ایک نوکر رہا۔ حالانکہ ہم زیادہ ملازم رکھ سکتے تھے۔ وہ کھانا پکایا کرتے تھے۔ باقی سب کام ہم بیگم کے ساتھ مل کر کیا کرتے تھے۔ ہم بہت لگن اور محنت سے یہ سب کرتے رہے ہیں۔ ہماری بیگم سماجی کام کرتی تھیں۔ انہیں سماجی کام کا بہت شوق ہے۔

سوال: آپ کو شکایت نہیں پیدا ہوتی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: (قہقہے) میرے خیال میں تو ایسے کاموں میں حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ ان کے اندر اگر یہ جذبہ ہے تو انہیں یہ سب کرنا چاہیے۔

سوال: کھانا پکا لیتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: کھانا پکانا نہیں جانتا۔ انڈا بنا لیتا ہوں، چائے بنانی آتی ہے۔ یعنی ناشتا خود بنا سکتا ہوں۔

سوال: کھانا اچھا نہ ہو تو تنقید کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل نہیں،

سوال: پسندیدہ کھانا کون سا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں اور میری بیگم بہت سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے میں دال سبزی اور چاول کھاتے ہیں۔ رات کو گوشت پکا لیتے ہیں۔

سوال: بیگم سے لڑائی تو ہوتی ہوگی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل نہیں۔ اصل میں وہ بھی بہت مصروف ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہیں اور میں بطور جج بہت مصروف رہتا تھا۔ دوم یہ کہ ہم ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ انہوں نے کبھی عدالتی معاملات کے بارے میں نہیں پوچھا۔ سوائے اس کے کہ جب ہمارے دوبارہ حلف کا معاملہ چل رہا تھا تو انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

سوال: وہ کیا کہتی تھیں کہ آپ فیصلہ واپس لے لیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب ایک جج حلف اٹھاتا ہے تو پھر اس کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔ اگر میں نے فیصلہ بدلا تو یہ خودکشی کے برابر ہو گا۔ ہم اسی لیے ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ پھر جب ایک دوسرے کی کام میں مدد کریں تو لڑائی کی کہاں گنجائش ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں اگر عورت مکمل طور پر گھریلو ہو تو پھر لڑائی ہوسکتی ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ آپ کہاں گھوم رہے تھے۔ ہمارے معاملے میں وہ اپنے کام میں مصروف تھیں اور ہم اپنے کام میں، ہماری انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ویسے بھی پڑھی لکھی عورت سب باتوں کو سمجھتی ہے۔

سوال: آپ کو غصہ کس بات پر آتا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات ہو تو غصہ آتا ہے۔ مجھے کورٹ میں کبھی غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ میرا نظریہ یہ تھا کہ اگر انسان کو غصہ آجائے تو وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے اپنے کیریئر میں کبھی کسی وکیل سے بدکلامی یا غصہ نہیں کیا، البتہ بے اصول بات ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اگر کوئی وکیل قانون سے ہٹ کر کوئی بات کرتا تھا تو ہم اسے روک دیا کرتے تھے۔

سوال: کیا آپ اب سیاست میں حصہ لیں گے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں! بالکل نہیں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے سیاست کرنا موزوں نہیں ہے۔

سوال: لیکن ہمارے ہاں تو روایت یہی رہی ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، لیکن مجھے اپنے پیشے سے لگاؤ تھا۔ جج بننے کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی میں اپنے اسی پیشے سے وابستہ رہوں گا۔

سوال: کس سیاست دان سے متاثر ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: آج کل کے سیاست دانوں نے تو متاثر نہیں کیا البتہ پرانے سیاست دانوں میں قائداعظم سے متاثر ہوں۔ انہوں نے جس طرح سیاست میں اپنا کردار ادا کیا، بدقسمتی سے بعد میں آنے والے سیاست دانوں میں نظر نہیں آیا۔

سوال: پیری مریدی پر یقین رکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں جی! بالکل نہیں...... ہم تو انہیں مانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ اسلام کے منافی ہے۔

سوال: زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ کب آیا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جب میں سجاد علی شاہ کا کیس سن رہا تھا۔ وہ میری زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ ہمارے لیے یہ بڑا مشکل اور خطرناک مسئلہ تھا کہ ایک عدالت میں دو عدالتیں کام کر رہی ہیں۔

سوال: کیا اب آپ کو پچھتاوا ہوتا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں یہ فیصلہ نہ دیتا تو شاید ساری عدلیہ کا شیرازہ بکھر جاتا۔

سوال: زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا، نواز شریف حکومت ختم ہو جاتی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: حکومت ختم ہو جاتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ اصل بات عدلیہ کے وقار کی تھی، وہ خراب نہیں ہونا چاہیے تھا۔

سوال: مشکل میں کس سے مشورہ کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میرے خیال میں کتابیں سب سے بہتر مشورہ دیتی ہیں۔ میرے پاس اپ ٹو ڈیٹ ریکارڈ موجود ہے۔ میں اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ میرے خیال میں خدا اور

کتب بہترین معاون ہیں۔

سوال: آخر بار کب روئے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: والد صاحب کی وفات پر 1966ء میں رویا تھا۔

سوال: دنیا میں کون سا ملک پسند ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سنگاپور مجھے بہت پسند آیا۔ وہاں قانون کا بہت احترام ہے۔ لوگوں میں نظم وضبط ہے، صفائی بہت ہے، قانون کی بالادستی ہے جو ملک کی ترقی اور لوگوں کی بھلائی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سوال: دنیا میں سب سے خوبصورت جگہ کون سی لگی؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں نے بہت دنیا گھومی ہے مگر مجھے قاہرہ بہت پسند آیا۔ وہ ایک تاریخی مقام ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ چار ہزار سال پرانی تہذیب وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

سوال: کبھی مصلحتاً جھوٹ بولا؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: زندگی میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا۔ میں تو کڑوا انسان مشہور ہوں۔ آپ سچ بولنے سے وقتی طور پر تو نقصان اٹھا سکتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

سوال: آپ کے پسندیدہ گلوکار کون ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے مہدی حسن بہت پسند ہیں۔ پاپ میوزک کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔

سوال: تنہائی کے لمحات میں کیا کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ جس زمانے میں میری بیگم ایک سال کے لیے لندن چلی گئی تھیں اس زمانے میں، میں نے کتابیں پڑھ کر وقت گزارا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ جب میں پانچویں میں تھا تو میں نے بچوں کی کتابوں کی لائبریری بنائی ہوئی تھی۔ جب بھی مجھے فارغ وقت ملتا میں کتابیں نکال کر پڑھتا تھا۔ مجھے بڑا شوق ہے کہ کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہوں۔ کبھی کبھی میرا چھوٹا بیٹا آتا ہے تو کتابیں لے کر ادھر ادھر رکھ دیتا ہے، مجھے اس سے بہت الجھن ہوتی ہے۔ میں اکثر اس سے کہتا ہوں کہ جہاں سے کتاب لو وہیں پر واپس رکھو۔

سوال: آپ کی پسندیدہ کتاب کون سی ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میں نے بے شمار کتابیں پڑھیں۔ لیکن مجھے مولانا مودودی کی ''تفہیم القرآن'' نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اور بھی تفسیریں پڑھی ہیں لیکن جس سادگی سے مولانا مودودی نے مفہوم کو بیان کیا ہے وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ان کی تفسیر کو بار بار پڑھا ہے۔

سوال: آپ کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سفید رنگ مجھے بہت پسند ہے،

سوال: کس قسم کی فلمیں پسند ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: 20 سال سے تو کوئی فلم نہیں دیکھی۔ ویسے میں اردو فلم نہیں دیکھتا۔ انگریزی فلم دیکھ لیتا ہوں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی فلم پوری دیکھی ہو۔

سوال: پسندیدہ کھلاڑی کون سے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: مجھے کرکٹ میں انضمام الحق بہت پسند ہیں۔

سوال: کیا انسان فطرتاً خودغرض ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل ہے...... قرآن میں ذکر ہے کہ انسان جھگڑالو ہے، خودغرض ہے۔ یہ تو خدا نے اس کی فطرت میں رکھا ہے۔

سوال: کبھی کسی سے زیادتی کی ہو اور بعد میں ندامت محسوس کی ہو؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اپنے سارے کیریئر میں میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی...... نہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسا فیصلہ کیا جس سے میں ندامت محسوس کروں۔

سوال: پاکستانی لوگ مایوس کیوں ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: رہنمائی کے فقدان کی وجہ سے مایوسی ہے۔ بدقسمتی سے قائداعظم کے بعد ہمیں کوئی معیاری رہنما نہیں ملا۔ لیاقت علی خان بہت تھوڑا عرصہ رہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رہنمائی کا ہی رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے کوئی اچھا رہنما پیدا نہیں کیا جس پر لوگوں کو اعتماد ہو۔ ہمارے لوگ تو بہت سادہ ہیں۔ وہ تو ہر ایک پر اعتماد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سارے رہنماؤں نے ان سادہ لوگوں کے دلوں کو ہمیشہ ٹھیس ہی پہنچائی ہے۔

سوال: کوئی ایسا خواب جو سچ ثابت ہوا ہو؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: خواب تو خواب ہی ہوتا ہے۔ بات اتنی ہے کہ بعض اوقات کسی خواب کی تعبیر اچھی نکلتی ہے اور بعض اوقات بری۔ میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا خواب نہیں دیکھا جس کی تعبیر مجھے چاہیے تھی۔ میں تو ایک چیز کا قائل ہوں کہ انسان کو اپنی صلاحیتوں کو بہتر

طریقے سے استعمال کرنا چاہیے۔ نتائج خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔

سوال: ستاروں پر یقین رکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: بالکل نہیں۔

سوال: کبھی استخارہ کیا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: نہیں......کبھی نہیں۔

سوال: استخارہ تو غیر اسلامی نہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: استخارہ تو غیر اسلامی نہیں ہے۔ استخارہ تو وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اس کا طریقہ آتا ہے۔ مجھے اس کا طریقہ نہیں آتا۔ اس لیے میں نے کبھی استخارہ نہیں کیا۔

سوال: کیا آپ کو اب بھی عدلیہ کے ساتھ توقعات ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: میری دعائیں عدلیہ کے ساتھ ہیں۔ اچھا وقت آ سکتا ہے۔ حالات کے تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ میرے خیال میں اگر عدلیہ کا نظام بہتر ہو جائے تو پاکستان کے مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔

انٹرویو، اپریل، 2001ء

مقام: ڈیفنس، کراچی

حوالۂ اشاعت: 20 مئی، 2001ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

انٹرویو(II)

سوال: چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف صدارتی ریفرنس عدلیہ کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ بن چکا ہے بطور سابق چیف جسٹس آپ اس ریفرنس کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: جہاں تک صدر کی طرف سے چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کرنے کا معاملہ ہے قانونی طور پر ریفرنس دائر ہوسکتا ہے اور اس ریفرنس کی سماعت سپریم جوڈیشل کونسل میں ہی ہوگی لیکن جب آرٹیکل 209 کے تحت کیے گئے اس ریفرنس کے حوالے سے وردی پہنے ہوئے صدر کی چیف جسٹس کے ساتھ تصویر شائع ہوگی تو اس سے لوگوں میں ناراضگی اور احتجاج کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔

سوال: آپ کے زمانے میں بھی حکومت سے عدلیہ کے اختلاف ہوئے آپ اور آپ کے کئی ساتھی ججوں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا لیکن آپ کے حق میں کوئی نمایاں آوازیں بلند نہ ہوئیں، وجہ کیا سمجھتے ہیں؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: ہمارے زمانے کے حالات مختلف تھے لوگوں میں اسی وقت لاوا پکتا رہا ہے یہ اسی کا اظہار ہے یہ صرف افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس کا معاملہ نہیں عدلیہ کے کردار کا معاملہ ہے لوگ اب یہ بھی طے کرنا چاہتے ہیں کہ حق حکمرانی کس کو ہے فوج کو ہے یا عوامی نمائندوں کو۔

سوال: عدلیہ پر جب بھی آزمائش کا وقت آیا ہے۔ ججوں نے نظریہ ضرورت اور مصلحت سے کام لیا ہے کیا اب بھی ایسا ہی ہوگا آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: اب ججوں کے رویے میں تبدیلی ہے اور اگر انہوں نے نظرثانی نہ کی تو عوام کا عدلیہ پر اعتماد بالکل اٹھ جائے گا۔

سوال: کئی لوگ جسٹس افتخار چودھری اور سجاد علی شاہ کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دونوں جوڈیشل ایکٹوازم کے قائل تھے اور دونوں کے حکومتوں سے اختلافات ہوئے آپ کا تقابل کس طرح کریں گے؟

جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی: سجاد علی شاہ کے ساتھ تو میں نے کام کیا ہے اور ان کے

رویے سے مجھے اور ساتھی ججوں کو شکایات تھیں جسٹس افتخار کے ساتھ میں نے کام نہیں کیا، اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جون 2007ء
غیر مطبوعہ

چیف جسٹس آف پاکستان

جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ

سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ اپنی ظاہری شخصیت کی طرح گفتگو میں بھی کھلے ڈلے اور متنوع انسان ہیں ان سے انٹرویو کا تجربہ بہت تلخ مگر یادگار رہا اس انٹرویو میں انہوں نے کھل کر متنازعہ باتیں کہہ ڈالیں۔ انٹرویو شائع ہوا تو جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ نے اخبار میں یہ بیان دے دیا کہ انہوں نے سرے سے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں جس پر دوسرے روز ''جنگ'' نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس انٹرویو کی مکمل ریکارڈنگ موجود ہے اگر جسٹس نسیم حسن شاہ یا کسی اور کو شک ہے تو وہ آ کر اس کو سن سکتا ہے۔ اس پر جسٹس نسیم حسین شاہ نے صلح کی پالیسی اختیار کی اور بعض جملے جو نواز شریف کے خلاف تھے وہ کاٹنے کی درخواست کی لیکن اس انٹرویو نے ان کے خیالات کو عام کر دیا اور ان کی تردیدوں کے باوجود ان کے چند جملے وہ کام کر گئے جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ جسٹس نسیم حسن شاہ سے اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک میرے اس انٹرویو کے سچ پر ناراض ہیں۔ شاید ان کا خیال یہ تھا کہ انٹرویو شائع کرنے سے پہلے نرم ہو جائے گا یا پھر انہیں اپنے خیالات کی شدت کا احساس ہی اس کے ردعمل کے بعد ہوا۔

یہ انٹرویو، ایک تاریخی انٹرویو ہے کہ اس میں پہلی بار جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ نے بھٹو کی سپریم کورٹ میں اپیل پر اپنی رائے ظاہر کی جس پر کئی قانون دانوں نے ان سے اختلاف کیا اور پھر لمبی بحث چلتی رہی انہوں نے اس انٹرویو میں بھٹو کی پھانسی پر افسوس کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ بھٹو نے ایٹمی پروگرام کی تیاری میں بہت بہادری کا ثبوت دیا۔ غرضیکہ اس طرح کی بہت سے حیران کن باتیں ان کے ارشادات میں شامل تھیں۔

جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ ریٹائرڈ ججوں میں سب سے زیادہ متحرک سماجی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ جس محفل میں بھی جاتے ہیں اسے اپنی مزاحیہ گفتگو سے کشت زعفران بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق طالب علموں کا اجلاس ہو یا پھر انجمن حمایت اسلام کا جلسہ یا پھر یتیم خانہ کی لڑکیوں کی شادی، ہر جگہ موجود ہوتے ہیں لیکن یہ انٹرویو ان کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا اور شاید یہی انٹرویو ہی ان کے اصل خیالات کا ترجمان بھی ہے۔ آیئے ان کے خیالات میں اصل جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

اہم نکات

☆ ضیاءالحق مجھے نوکری سے نکالنا چاہتے تھے لیکن ''بھٹومہربان تھے''۔

☆ ایٹمی پروگرام میں بھٹو نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔

☆ نوازشریف جیسے لوگوں کو صرف کام سے غرض ہوتی ہے۔

☆ بھٹو کو سزائے موت دینے کا افسوس ہے لیکن جو کرنا تھا وہ کرنا ہی پڑا۔

☆ سزائے موت میں کمی کے لیے بھٹو کا کیس مضبوط تھا لیکن ان کے وکیل نے کہا کہ وہ سزا میں کمی کی وکالت نہیں کریں گے، عدالت خود بخود سزا کم نہیں کرسکتی تھی۔

☆ مقدمے کے دوران بہت دباؤ تھا جسٹس حلیم کو کہا گیا کہ ان کا اکیلا بیٹا کراچی میں رہتا ہے۔ جسٹس حلیم نے کہا یہ بڑے بدمعاش ہیں۔ میرے بیٹے کی جان خطرے میں ہے لیکن بعد میں وہ سوفیصد پی پی کے ساتھ ہو گئے۔

☆ غلام اسحاق سے اچھے تعلقات تھے۔ بےنظیر کے پہلے دور حکومت میں ان کی بڑی مدد کی۔

☆ نوازشریف اسمبلی کی بحالی کے بعد صدر اسحاق میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔

☆ بےنظیر بھٹو مجھ سے خفا ہیں وہ مجھے اپنے والد کا قاتل سمجھتی ہیں۔

☆ ایک بار دعوت میں بےنظیر نے بدتمیزی کی اور میری کرسی اٹھوا کر پیچھے لگوادی۔

☆ نوازشریف کیس میں میرا فیصلہ جسٹس سجاد کے فیصلے سے بڑا ہے۔

☆ نوازشریف سے جب وہ وزیراعظم تھے اور اب جب وہ مارے مارے پھر رہے ہیں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

☆ مقدمے کے دوران ان کی خواہش تھی کہ ملاقات ہو جائے اور انہیں فیصلے کا پتہ چل جائے۔

انٹرویو

سوال: شروع میں آپ یہ بتائیں کہ آپ جج کیسے منتخب ہوئے، سفارش سے یا میرٹ پر؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: اپنے بارے میں کہنا بڑا عجیب سا لگتا ہے لیکن میں بہت کم عمری میں ایک نامور وکیل بن گیا تھا اور میری عمر جب 36 سال تھی تو اس وقت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے میرا نام جج کے طور پر تجویز کیا تھا انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ سپریم کورٹ میں سب سے زیادہ مقدمات میں نے لڑے ہیں۔ میں نے کبھی پیسے کے معاملے میں لالچ نہیں کیا جو بھی کوئی میرے پاس مقدمہ لے کر آتا تھا میں نے کبھی پیسوں کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ کوئی جتنی بھی فیس دیتا میں رکھ لیا کرتا تھا اور اپنی توفیق کے مطابق اس کی مدد کر دیتا تھا۔ اس طرح میرے پاس مقدمات کی بھرمار تھی۔ تین چار جونیئر تھے ان میں سے دو بعد میں ہائی کورٹ کے جج بھی بنے۔

سوال: وہ کون تھے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جسٹس چودھری خلیل الرحمٰن اور جسٹس منظور حسن سیال ہمارا چیمبر بہت اچھا تھا اور سب وکیل بہت محنتی تھے ہم سارا دن پاگلوں کی طرح مقدمات کے لیے بھاگ دوڑ کیا کرتے تھے اور اللہ کے فضل سے ہائی کورٹ میں روزانہ میرے پانچ چھ مقدمے ہوتے تھے اور میں ان مقدمات کو بھگتا لیا کرتا تھا۔ اچھا مقرر ہونے کے ناطے ''اچھا بول لیتا'' تھا اس لیے ان مقدمات کو بہتر طور پر نمٹا لیا کرتے تھے۔ ڈراموں میں بھی کام کرتا تھا اس لیے مذاق وغیرہ کی بھی عادت تھی اس لیے کلائنٹس اور وکیلوں میں کافی مقبول تھا۔ اس زمانے میں جو چیف جسٹس صاحبان ہوتے تھے انہی پر ججوں کی تقرری کا انحصار ہوتا تھا۔ پھر جس طرح میں نے کہا کہ 65ء میں جب قاضی گل اور افضل چیمہ وغیرہ جج مقرر ہوئے تو اس وقت چیف جسٹس آف سپریم کورٹ نے میرا نام بھی تجویز کیا تھا۔ لیکن ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا کہ ان کی عمر بہت کم ہے۔ پھر 68ء میں جب وحید الدین چیف جسٹس بنے تو پھر انہوں نے میرا نام جج کے طور پر تجویز کیا۔ پھر جب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایس اے رحمان بنے تو انہوں نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور میں جج بن گیا۔

سوال: جج صاحبان کے ساتھ تو آپ کے ذاتی تعلقات بھی تھے جس کی وجہ سے انہوں نے آپ کو جج کے طور پر چنا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جی ہاں میرے ہر ایک کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ کیونکہ میں بات چیت میں ذرا زیادہ ہی آگے تھا۔ پھر بار کونسل کے الیکشن میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا جس طرح آج میری دوسری غیر نصابی سرگرمیاں ہیں اس وجہ سے سب لوگ مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ یہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ (قہقہہ)

سوال: آپ کے اوپر الزام ہے کہ اسمبلی کی برطرفی کے حوالے سے جو غلام محمد والا کیس تھا اس میں آپ گورنمنٹ کے دفاع میں پیش ہوئے تھے اس لیے آپ کو جج بنایا گیا تھا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: یہ الزام بالکل غلط ہے۔ یہ فروری یا مارچ 1955ء کی بات ہے جب میں پیرس سے ڈاکٹریٹ کر کے آیا اس وقت گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کی اپیل فیڈرل کورٹ میں چل رہی تھی۔ حکومت نے دو انگریز وکیل بھی مقرر کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس وقت اسی مضمون میں فرانس کی ہسٹری کا حوالہ دیا تھا کہ بادشاہ نے آئین کو منسوخ کیا تو وہاں کے جج صاحبان کانپ رہے تھے۔ پھر بادشاہ نے کوئی نیا قانون دیا تو جج صاحبان نے اس قانون کو منظور کیا میرے اس مضمون کے حوالے سے سرکاری وکلاء نے سمجھا کہ شاید یہ ہمیں کچھ مفاد دے سکے اس لیے انہوں نے مجھے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا۔ اس وقت تو میں فیڈرل کورٹ کا وکیل بھی نہیں بنا تھا۔ میں اس وقت باقاعدہ طور پر وکیل بھی نہیں بنا تھا۔ میں صرف ان کی ٹیم میں شامل تھا جب کہ میں تیرہ سال بعد 1968ء میں جج بنا۔

سوال: کیا آپ کی سیاست میں شروع سے دلچسپی رہی ہے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میرے والد سید محسن شاہ خود ایک سماجی کارکن تھے اور مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے بلکہ 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے لکھنؤ پیکٹ میں وہ لاہور سے مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے وہاں گئے تھے۔ ان کا شروع سے مسلم لیگ سے تعلق تھا۔ ساتھ ساتھ سیاست سے منسلک رہے۔ 1909ء میں ان پر مقدمہ چلا اور قید بھی ہوئے اس کے بعد ان کا سیاست سے منسلک رہے۔ 1909ء میں ان پر مقدمہ چلا تھا اور قید بھی ہوئے اس کے بعد ان کا سیاست سے تعلق ذرا کم ہو گیا لیکن وہ سوشل ورکر کی حیثیت سے آگے آئے۔ انجمن حمایت اسلام، انجمن اسلامیہ پنجاب مسلمانوں کی تعلیم، خاص طور پر خواتین کی تعلیم، سب سماجی کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اسی طرح مسجدوں کی تعمیر کے حوالے سے بھی وہ پیش پیش ہوتے تھے بلکہ بادشاہی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں جو کمیٹی بنی تھی وہ اس کے سیکرٹری تھے۔

میرے والد صاحب کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ 1940ء میں ایک جلسے میں، میں اور میرا چھوٹا بھائی اپنے والد صاحب کو جلسے میں لے کر آئے اس جلسے میں میرے والد کا

سگریٹ رکھنے والا سونے کا سگریٹ پیکٹ گم ہو گیا میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ پاکستان کے لیے آپ کی سب سے پہلی قربانی ہے لیکن میرے والد صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی حد تک ہم نے سیاست میں حصہ لیا لیکن مسلم لیگ کا باقاعدہ ممبر نہیں بنا لیکن جب وکیل بن گیا تو سیاست سے کسی حد تک تعلق رہا لیکن حصہ نہیں لیا۔

سوال: سیاست سے دلچسپی کے دوران آپ کس پارٹی کے زیادہ حمایتی تھے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: زیادہ حمایتی تو مسلم لیگ ہی کا تھا۔

سوال: ایک الزام اور بھی ہے کہ مسلم لیگ کے حامی ججوں کی بھی ایک لابی تھی اور وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے تھے۔ خاص کر ججوں کی تقرری میں یہ لابی خاصی سرگرم رہی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: یہ بالکل غلط ہے شروع میں تو سارے مسلم لیگی ہی تھے 1947ء کے بعد جتنی جماعتیں بنی یہ سب مسلم لیگی ہی تھے۔ بھٹو صاحب بھی مسلم لیگ سے آئے۔ صرف اے این پی کے علاوہ سب جماعتیں مسلم لیگ سے آئی تھیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلم لیگی ایک دوسرے کی حمایت کرتے تھے صرف کہنے کی حد تک درست ہے حقیقت میں ایسا نہیں تھا پھر اس وقت جو جج صاحبان تھے ان میں بہت سے ایسے تھے جو قیام پاکستان سے پہلے کے تھے اس لیے ان کا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور میں نے پہلی دفعہ آپ سے یہ بات سنی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جسٹس شمیم حسین قادری مسلم لیگ کی طرف سے 1958ء تک ایم پی اے رہے بعد میں وہ جج بھی بنے بعد میں وہ کسی حکومت کے وزیر بھی بنے ان کی وکالت میں اتنی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس طرح جسٹس افضل چیمہ بھی مسلم لیگی ہی تھے وہ قومی اسمبلی سے ادھر آ گئے۔ میرے خیال میں 70ء سے پہلے جتنے جج بنے ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سب مسلم لیگی اور پاکستان کے سپورٹر تھے اور پاکستان کے لیے ہی انہوں نے کام کیا تھا۔ اس لیے میرے خیال میں یہ بالکل غلط ہے کہ مسلم لیگ کے ناطے ہی جج بنے باقی چار پانچ لوگ ایسے تھے کہ ان کی پریکٹس اور تجربہ کی بنا پر ہر کوئی سمجھتا تھا کہ یہ جج بن جائیں گے۔ یعنی پریکٹس اور شہرت کی وجہ ہی میرٹ تھی اور اسی وجہ سے وہ جج بنے اس میں مسلم لیگی ہونے کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

سوال: آپ تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے ان کی تفصیل بتائیے گا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میں تقریری مقابلوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ میں 33ء سے 41ء تک کیتھڈرل سکول سے پڑھا تھا۔ 41ء میں سینٹرل ماڈل سکول چلا گیا اس زمانے میں سارے

مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ میں چونکہ انگریزی سکول سے آیا تھا اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ وہاں جایا جائے اس کے بعد دو دفعہ سینٹرل ماڈل سکول کی طرف سے دو مختلف مقابلوں میں شیلڈ جیتی عام طور پر تو سکول سے ایک طالبعلم اس مقابلے میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن میں نویں کلاس اور دسویں کلاس دو دفعہ سکول کی طرف سے گیا۔ دونوں دفعہ انعام حاصل کیا۔ پھر میں ڈرامیٹک کلب کا سیکرٹری بھی بنا۔ میں نے دو ڈراموں میں حصہ لیا پہلے ڈرامے میں تو اتنا اہم رول نہیں ملا تھا لیکن دوسرے ڈرامے میں مجھے اہم رول ملا اور جب انعامی تقریب میں سینٹرل ماڈل سکول کا نام پکارا گیا تو میرے استاد نے مجھے دھکا دیا اور میں وہ انعام لے کر آیا اس طرح پہلی دفعہ 1942ء ٹریبون اخبار میں میری یہ تصویر چھپی کہ میں ڈرامے میں بہتر کردار ادا کرنے پر ٹرافی لے رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کے بچوں کے پروگرام میں جایا کرتا تھا۔ پھر ریڈیو کے مختلف ڈراموں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ ہمارا قہقہہ (لافٹر) بہت مشہور ہوا اس کے بعد میں جب قہقہہ لگاتا تو لوگ سمجھتے تھے کہ وہ آ گیا ہے۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اس بارے میں لوگ جاننا چاہتے ہیں؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: وہ مقدمہ تو پہلے ہائیکورٹ میں چلا وہاں پانچ جج صاحبان نے وہ مقدمہ سنا اس وقت مقدمے کے حوالے سے چھوٹے موٹے واقعات بھی ہوتے رہے۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ شاید مجھے پوری سہولیات نہیں دی جا رہیں جسٹس مولوی مشتاق صاحب جو اس وقت چیف جسٹس تھے ان کی اور بھٹو صاحب کی آپس میں تھوڑی بہت ناراضگی تھی اور مشتاق صاحب بھٹو صاحب سے خوش نہیں تھے کیونکہ بھٹو صاحب نے 8 سینئر ججوں کو چھوڑ کر جسٹس اسلم ریاض کو چیف جسٹس بنا دیا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی آپس میں ٹینشن ضرور تھی لیکن اس میں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ بنچ پانچ ججوں کا تھا اس میں مشتاق صاحب چیف جسٹس کی حیثیت سے لیڈ تو کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ 4 دوسرے جج صاحبان بھی تھے بہر حال بھٹو صاحب اکثر ناراض ہو جایا کرتے تھے ایک دفعہ انہوں نے بائیکاٹ بھی کر دیا لیکن اپنے دفاع میں بھی کچھ نہیں کہا یعنی اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاتے تھے مجموعی طور پر بھٹو صاحب نے اپنے کیس کی بہتر طور پر پیروی نہیں کی پھر بھٹو صاحب کے وکلاء بھی فوجداری ٹرائلز کریمنل لاء اور سوال و جواب میں ماہر نہیں تھے۔

پھر لمبے چوڑے ٹرائل کے بعد کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ بھٹو نے یہ جرم کیا ہے لہٰذا اسے پھانسی دی جائے پھر بھٹو صاحب کی اپیل پر وہ کیس سپریم کورٹ میں آیا اس زمانے میں میں نے سپریم کورٹ کو جوائن کر لیا تھا اس وقت اس مقدمے کے لیے 9 ججوں کا بنچ بنایا گیا کیس کافی طویل رہا اس میں بھی بہت سے واقعات ہوتے رہے بھٹو صاحب نے درخواست دی تھی کہ اس بنچ میں جسٹس

انوارالحق کونہیں بیٹھنا چاہیے لہٰذا شروع شروع میں بنچ کے بارے میں کافی جھگڑا چلتا رہا لیکن جب بعد میں بنچ کا معاملہ طے پا گیا تو اس کے بعد بڑے اچھے انداز میں اس مقدمہ کی کارروائی ہوتی رہی بھٹو صاحب کے وکلاء کیس کو بہت طول دیتے رہے اور اسی دوران جسٹس قیصر بھی دو تین ماہ کیس چلنے کے دوران ریٹائرڈ ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ انہیں عدالت سے انصاف نہیں ملے گا ان کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیرونی دباؤ سے رہائی مل سکتی ہے پھر بین الاقوامی طور پر بہت سے لیڈروں کی طرف سے پیغامات آتے تھے کہ بھٹو صاحب سے نرمی کرنی چاہیے پھر ان دنوں ستمبر میں اقوام متحدہ کا اجلاس شروع ہو رہا تھا اور ان کا خیال تھا کہ وہاں سے بھی نرمی کے لیے دباؤ ڈالا جائے گا اس کیس کی جلد سماعت مکمل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی پھر ان دنوں جسٹس وحیدالدین بہت بیمار ہو گئے اور کیس مزید رک گیا لیکن ڈاکٹروں کے مطابق جسٹس وحیدالدین کی صحت یابی فوری طور پر ممکن نہیں تھی لہٰذا 9 میں سے 7 جج صاحبان باقی رہ گئے ان میں سے 4 جج صاحبان نے فیصلہ دیا کہ ہائیکورٹ نے جو فیصلہ سنایا تھا وہ بالکل درست تھا لیکن 3 جج صاحبان نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔

سوال: بھٹو کی پھانسی جوڈیشنل مرڈر تھا، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میرا نہیں خیال کہ ایسی بات ہے صرف سیاسی طور پر ایسا کہا جاتا ہے۔

سوال: کیا پاکستان کی عدالتی تاریخ میں کوئی ایسی مثال ہے کہ مشورے کی بنیاد پر کسی کو پھانسی دی گئی ہو؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جی بالکل ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا بہت سے لوگوں نے پہلے ایسے کیا ہوگا کئی سیاستدانوں نے بھی یہ کام کیا ہوگا لیکن ان کے اقتدار میں موجود دوستوں نے انہیں بچا لیا ہوگا۔ اس مقدمے کے دوران ایک رائے یہ تھی کہ بھٹو نے خود قتل میں حصہ نہیں لیا بلکہ ایف ایس ایف نے اس کی ہدایت پر حصہ لیا اس کیس کی سماعت کے دوران میں نے یحییٰ بختیار سے پوچھا کیا وہ موت کی سزا میں کمی کے بارے میں دلائل دینا چاہتے ہیں تو انہوں نے انکار کر دیا بعدً میں یہ مسئلہ نظر ثانی کی درخواست کا اہم ایشو بن گیا میری ذاتی رائے تھی کہ بھٹو کی سزا میں کمی ہو سکتی تھی مگر ان کے وکیل نے کہا کہ وہ گناہگار نہیں ہیں اس لیے وہ دفاع نہیں کریں گے میری ذاتی رائے تھی کہ سزا میں کمی کے لیے ان کا مقدمہ بڑا مضبوط تھا۔

سوال: ایک طرف مارشل لاء لگا ہوا ہے پھر بھٹو کی حکومت کو ہٹایا گیا ہے اور اس کے بعد ان کے خلاف فیصلہ سنا دیا گیا ہے اس سے لوگوں کے ذہنوں میں کئی شبہات جنم لیتے ہیں؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: دیکھیں جی لوگوں کے ذہنوں کا تو حل ہمارے پاس نہیں ہے، ہم نے ججوں

کواوپر بٹھایا ہوا ہے اور انہیں یہ کہتے ہیں کہ جی یہ کیس ہے مسعود محمود جو ان کا رائٹ ہینڈ ہے وہ کہہ رہا ہے کہ اس نے یہ کہا اور پھر جوڈی آئی جی تھا وہ یہ کہے کہ جو اسلحہ استعمال ہوا وہ سرکاری تھا یہ سب چیزیں ثبوت کے طور پر پیش بھی ہو جائیں اور اس کے بعد کہیں کہ جی مارشل لاء ہے اس بیچارے کو کیوں پھانسی لگا رہے ہیں۔

سوال: لیکن بالآخر بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے نتائج کیا نکلے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: حامد محمود جسٹس انوار الحق کے دوست تھے وہ ہمیں کہتے تھے اور ہم پریشان ہوتے تھے کہ ایک طرف ہے کہ گولی ماری ہے بابا مارا گیا ہے دوسری طرف یہ ہوگا ہمیں احساس تھا کہ اس فیصلے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں لیکن ہمارا فرض ہے کہ الزام ثابت ہو جائے تو پھر سزا دی جائے۔

سوال: کیا عدالت خود سزا میں کمی نہیں کر سکتی تھی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: اس طرح مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہوتا کیونکہ وہ خود تو اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

سوال: کیا ججوں پر دباؤ تھا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جسٹس حلیم صاحب پر دباؤ تھا ہم پر مختلف طرح کے دباؤ تھے ان کا اکیلا بیٹا ہے جو کراچی میں رہتا تھا وہ کہتے تھے اس کی جان کو خطرہ تھا جسٹس حلیم بڑے سخت ڈرے ہوئے تھے بعد میں وہ اس طرح ہو گئے بھٹو کا اپنا ذہن ہے مارشل لاء لگا ہوا ہے جج وہی کریں گے جو فوجی کہیں گے اس لیے بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ مجھے سزا نہ دے سکیں اس لیے ساری دنیا سے دباؤ ڈلوایا سعودی عرب سے لیبیا تک، ایک دفعہ سزا معاف ہو جائے پھر دیکھا جائے گا بھٹو نے عدالتی کارروائی میں واجبی سی دلچسپی لی بنیادی بات یہ تھی جج بیچارے کیا کرتے ان کے سامنے گواہی پر گواہی آ رہی تھی۔

سوال: لیکن جسٹس مشتاق کے بھٹو سے اختلافات تھے کیا اس صورت میں انہیں سماعت کرنی چاہیے تھی پھر جسٹس انوار الحق پر بھی بھٹو نے اعتراضات کیے تھے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: مولوی مشتاق صاحب نے بہت ذاتی باتیں کی کچھ واقعات بھی رونما ہوئے اگر وہ مقدمے کی سماعت نہ کرتے تو بہتر تھا مگر جسٹس انوار الحق نے بڑے مناسب دلائل کے ساتھ بھٹو صاحب کے اعتراضات کا جواب دیا یہ بھی بڑی نازک بات ہے کہ ملزم اپنی مرضی کا بنچ تو نہیں بنوا سکتا اسے کسی پر شک ہو تو اسے ہٹوا دے تو پھر تو عدالتی نظام نہیں چل سکتا بڑی مناسب وجوہات ہونی چاہئیں یہ درخواست کرنے کے لیے کہ یہ جج میرے کیس کی سماعت نہ کرے۔

سوال: جنرل ضیاء کے ججوں سے ذاتی تعلقات تھے سنا ہے لاہور ہائیکورٹ میں تو ہاٹ لائن بھی تھی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: مجھے ہائی کورٹ کے متعلق علم نہیں ذاتی تعلق تو ہوتا ہے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مولوی مشتاق بھٹو سے ناراض تھے کیونکہ آٹھویں نمبر کے ایک جج کو چیف جج بنا دیا گیا حالانکہ مولوی مشتاق نے بھٹو کو رہا کیا تھا مولوی مشتاق نے بڑی دلیری کے ساتھ اس درخواست کی سماعت کروائی یہاں تک کہ بھٹو نے کہا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرے جہاز کو بم سے اڑا دیا جائے گا تو انہوں نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گا مولوی مشتاق کے خیال میں انہوں نے بڑی مہربانی کی تھی حالانکہ وہ صرف ڈیوٹی کر رہے تھے لیکن بڑی طاقت سے جنرل ضیاء اور مولوی مشتاق کا تعلق یہ تھا کہ دونوں بھٹو سے خوفزدہ تھے کہ اگر یہ آ گیا تو ایک جائے گا اور دوسرے سے بھٹو پوچھے گا کہ بیٹا! میرے ساتھ تم نے یہ کیا تھا اب تیار ہو جاؤ۔

سوال: کیا بھٹو آپ کے دوست تھے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: بھٹو صاحب میرے دوست تو نہیں تھے مگر وہ مجھ پر مہربان تھے انہوں نے مجھے دو تین مرتبہ عالمی دوروں پر بھیجا میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ماسوائے ججوں کے ساتھ سماجی ملاقات کے، علاوہ ذاتی یا علیحدہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔

سوال: بھٹو کیس کے فیصلے کے دوران آپ کے ذہن میں نہیں آیا کہ مجھے کچھ رحم دلی دکھانی چاہیے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: بس جی ایک طرف تو اس وقت اپنے جذبات ہوتے ہیں اور ایک وہ ہوتا ہے جو آپ کو کرنا ہی ہوتا ہے۔ بھٹو نے مجھے سپریم کورٹ کے لیے مئی 1977ء میں جج کے طور پر چنا میرے دل میں بھٹو کے خلاف کوئی بات نہیں ہے میں ان کا ممنون تھا میں نے منصفانہ فیصلہ کیا جب اکتوبر 1977ء میں بھٹو نے کاغذات جمع کروائے تو چوہدری ظہور الٰہی نے مقدمہ دائر کیا کہ یہ انڈین نیشنل ہیں اور انہوں نے میٹریل بھی پیش کیا میں اس الیکشن کمیشن کا ممبر تھا میں نے یہ اپیل مسترد کر دی اور کہا کہ وہ پرائم منسٹر رہے ہیں وہ پاکستانی نیشنل ہیں اس کیس کی سماعت تک نہ میں بھٹو کے خلاف تھا اور نہ یہ کہ بھٹو مجھے پسند نہیں کرتے تھے اس کے علاوہ اس کیس کے شروع ہونے تک میں ایڈہاک جج تھا اس زمانے میں ایڈہاک جج چھ ماہ کے لیے مقرر ہوتے تھے میرے پاس ابھی بھی کاپی ہے جس میں بھٹو نے کہا کہ چیف جسٹس کو اس مقدمے کی سماعت تک ایڈہاک ججوں بشمول میرے اور جسٹس وحید الدین کے ان کی تعیناتی جاری رکھی جائے۔

ان کا خیال تھا کہ میں غیر جانبدار رہوں گا اور میں نے غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ کیا کہ استغاثہ کا کیس درست ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ آپ کے احساسات اور تھے اور ڈیوٹی اور؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: مجھے بہت افسوس تھا کہ مجھے موت کی سزا سنانے کا فیصلہ کرنا پڑا لیکن جو کرنا تھا وہ کرنا ہی پڑا کیونکہ یہ فرض کا تقاضا تھا۔

سوال: کیا بھٹو محبِ وطن تھا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: اس مقدمے میں یہ بات نہیں آئی بھٹو نے 1971ء میں ملک کو اکٹھا رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اس وقت ملک بحران کا شکار تھا میرا بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہ خیال بھی ہے کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موقع پر اچھا رول ادا نہیں کیا لیکن نئے پاکستان میں مورال کو بلند رکھنے کے لیے اہم کردار ادا کیا اس طرح انہوں نے ملک کے لیے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے میں بڑی جرأت مندی اور بہادری کا ثبوت دیا۔ 1971ء کے واقعات میں میں ان کے کردار کو پسند نہیں کرتا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کے ساتھ آپ کے کیسے تعلقات تھے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میں 5 جولائی 1977 سے 17 اگست 1988 تک کے دوران ایک بار بھی جنرل ضیاء الحق سے نہیں ملا جب وہ کریش میں ہلاک ہو گئے ماسوائے کبھی کسی فنکشن میں ملاقات ہوئی اور نہ میں ایک دفعہ بھی علیحدہ ضیاء الحق سے ملا بلکہ ضیاء الحق تو ایک دفعہ مجھے نکالنے پر تل گئے تھے لیکن چیف جسٹس حلیم نے مجھے بچا لیا میں ان کا بہت ممنون ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے لاہور سے ٹرانسفر کر کے اسلام آباد بھیج دیا گیا جسٹس حلیم نے ضیاء الحق کو یقین دہانی کروائی کہ یہ میرے کنٹرول میں رہے گا۔

سوال: ضیاء الحق کے ساتھ آپ کے ذاتی مراسم ہوں گے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جنرل ضیاء الحق کو میں پسند نہیں کرتا تھا میں جونیجو کو پسند کرتا تھا میری ضیاء کو ناپسندیدگی کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

سوال: لگتا ہے آپ نے آخری وقت صدر غلام اسحاق خان کو اندھیرے میں رکھا اور اپنے رشتہ دار منظور سیال کی سپریم کورٹ میں تعیناتی کروائی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: یہ تو ان کی خوش فہمی تھی میں یہ اعتراف کرتا ہوں میرے صدر غلام اسحاق کے ساتھ اچھے تعلقات تھے بے نظیر بھٹو کے دور میں صدر اسحاق کے بارے میں دو مقدمات تھے ایک

میں انہوں نے پرائم منسٹر مقرر نہیں کیا تھا وہ کافی مشکل میں تھے میں نے اس بحران کو ختم کرنے میں مثبت کردارادا کیا غلام اسحاق کے ساتھ میرے تعلقات میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

سوال: کیا یہ فیصلہ صدر اسحاق کے لیے غیر متوقع تھا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میرا نہیں خیال کہ یہ فیصلہ غیر متوقع تھا کیونکہ شریف الدین پیرزادہ وغیرہ کو پتا چل گیا تھا کہ کس سمت میں ہوا چل رہی ہے لیکن صدر اسحاق کو شاید گمان تھا کہ نسیم حسن شاہ ہمیں ذلیل نہیں ہونے دیں گے اور آخری وقت میں جادو کی چھڑی سے کوئی حل نکال لیں گے۔

سوال: آپ پر الزام ہے کہ آپ نے نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ خالد انور کو وکیل کرو اور براہ راست سپریم کورٹ میں مقدمہ لاؤ؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: بالکل غلط ہے نواز شریف بے چارے نے تو سو دفعہ کوشش کی کہ ملاقات ہو جائے یا کچھ ہو جائے ہرگز نہیں ہرگز نہیں کیونکہ نواز شریف چاہتے تھے کہ انہیں پہلے پتا چل جائے کہ کیا فیصلہ ہونے والا ہے یہ لوگ جو ہوتے ہیں انہیں صرف اپنے کام سے غرض ہوتی ہے۔ منظور سیال والی بات اس حد تک درست ہے کہ ان کی تقرری کی سفارش بطور چیف جسٹس میں نے کی تھی۔ صدر اسحاق کا خیال تھا کہ ان کی سپریم کورٹ میں تقرری کے بعد نسیم حسن شاہ ہمارا خیال کرے گا۔

16 اپریل کو جسٹس افضل ظلہ سنٹرل ایشیا کی کسی سٹیٹ کے دورے پر گئے 19 اپریل کو غالباً انہوں نے ریٹائرڈ ہونا تھا 17 اپریل کو انہوں نے مجھے قائم مقام چیف جسٹس بنا دیا اس کے بعد 25 اپریل کو نواز شریف کی درخواست آ گئی تو 26 اپریل کو ہم نے اسے منظور کر لیا اور کہا کہ تمیز الدین والی مثال پر عمل نہیں کریں گے انہوں نے کہا کہ یہ تو بڑا گرم ہو گیا ہے اسے ٹھنڈا کرو۔ صدر اسحاق کی خواہش تھی کہ سینئر موسٹ کو چیف جسٹس مقرر کیا جائے اور میں کوئی اینٹی اسحاق نہیں بلکہ ان کے ساتھ نرم رویہ رکھتا تھا صدر اسحاق چاہتے تھے کہ ان کا بھی کچھ کام ہو جائے وہ سمجھتے تھے کہ آدمی سمجھ دار ہے۔

سوال: آپ نے پلاٹ کے حصول کے لیے جھوٹا حلف نامہ جمع کروایا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: حلف نامہ جو میں نے داخل کیا جھوٹ نہیں تھا کہ میرے پاس کوئی پلاٹ نہیں ہے۔ یہ الزام ہوتا ہے کہ نسیم شاہ بڑے پارسا بنتے ہیں پھر بھی پلاٹ لیا ہے تو کوئی بات نہیں۔

سوال: بے نظیر بھٹو سے کیا آپ کی کوئی ناراضگی تھی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: بے نظیر سے میری مخالفت نہیں وہ مجھ سے بڑی خفا ہیں وہ مجھے اپنے والد کا قاتل سمجھتی ہیں۔ ان کو اصل خفگی والد والے کیس کی ہے میں نے ان کے سامنے کبھی وضاحت نہیں کی ہم نے اپنا فرض ادا کیا انہوں نے ایک دعوت میں میری کرسی اٹھوا کر پیچھے لگوا دی میں نے کہا کہ والد کے غم

میں غیر مناسب بات بھی ہو جاتی ہے۔

سوال: جسٹس رفیق تارڑ نے کہا کہ جسٹس سجاد شاہ کو میرٹ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مستعفی ہو جانا چاہیے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جسٹس شاہ کے سنیارٹی کے اصول کی پابندی کرنے کی دلیل میں بڑا وزن ہے لیکن دوسری طرف انہوں نے حکومت کے خلاف زبردست جہاد شروع کیا ہوا ہے اور کوئی آدمی اس بہادری کے ساتھ فیصلے پر عمل درآمد نہیں کروا سکتا۔

سوال: نواز شریف حکومت کی بحالی والا فیصلہ بڑا ہے یا جسٹس سجاد شاہ کا حالیہ فیصلہ؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: سجاد شاہ کا فیصلہ مستقبل کی تقرریوں کے بارے میں ہے دونوں کا دائرہ کار الگ ہے اور جرأت مندانہ فیصلہ اقتدار پر براجمان حکومت اور صدر کے فیصلے کو مسترد کر کے سڑک پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اقتدار پر بٹھانا تھا سجاد شاہ کے فیصلے کے دور رس اثرات ہیں۔

سوال: آپ کو کرکٹ کنٹرول بورڈ کا صدر نواز شریف نے بنایا؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: صدر اسحاق نے بنایا تھا یہ استحقاق ہے اس لیے تو وہ سمجھتے تھے کہ نسیم شاہ ہمارے حق میں بھی فیصلہ کرے گا میں نے بڑا سوچا بالآخر ضمیر کا فیصلہ سنایا نواز شریف جب وزیراعظم تھے، اور اب مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نواز شریف جب سے حکومت میں نہیں ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ماسوائے سماجی ملاقات کے۔

سوال: کیا آپ جماعت اسلامی جوائن کریں گے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: میں جماعت اسلامی کبھی جوائن نہیں کروں گا لیکن میں ان کے خلاف نہیں ہوں۔

سوال: آپ بے نظیر بھٹو سے ملاقات کیوں نہیں کر لیتے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: مجھے بے نظیر بھٹو سے ملاقات پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوگی جب وہ میرا نام سنتی ہیں تو میرا خیال ہے خوش نہیں ہوتی ہوں گی۔

سوال: آپ کے فیصلے سے وزیراعظم کو چیف آف آرمی سٹاف کی تقرری کا اختیار بھی حاصل ہو گیا ہے؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: جسٹس شفیع الرحمٰن نے اس نقطے کی تائید کی تھی اور کسی نے اختلاف نہیں کیا تھا اس لیے اس پوائنٹ میں بڑا وزن ہے۔

سوال: بھٹو کی پھانسی سے حالات میں خرابی ہوئی؟

ڈاکٹر نسیم حسن شاہ: کیا کیا جائے یعنی اگر وہ اپنے سیاسی مخالفین کے والد کو مروائیں تو ہم کیا کریں۔ عدالت فقط شواہد کی بنا پر ہی فیصلہ کرتی ہے۔

انٹرویو: جولائی، 1996ء

مقام: گلبرگ، لاہور

حوالۂ اشاعت: 23 اگست، 1996ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان

جسٹس (ر) محمد افضل ظلہ

سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جسٹس (ر) محمد افضل ظلہ بڑے دھڑلے کے جج تھے۔ ان کی وجہ سے صدر غلام اسحاق خان کو نواز شریف کی اسمبلی توڑنے کی تاریخ میں تاخیر کرنی پڑی جس دن وہ سپریم کورٹ سے ریٹائر ہوئے اس سے ایک دو روز بعد ہی نواز شریف حکومت توڑی گئی کیونکہ عمومی خیال یہ تھا کہ اگر ان کی چیف ججی میں اسمبلی ٹوٹی تو وہ اسی وقت اسمبلی کی بحالی کا آرڈر جاری کر سکتے ہیں۔ افضل ظلہ سے انٹرویو زندگی کا مشکل اور صبر آزما ترین مرحلہ تھا۔ کافی مشکل سے وہ انٹرویو دینے کو تیار ہوئے تو پہلے انہوں نے سوالات مانگے پھر ان سوالات کے جوابات لکھنے کے لیے وقت مانگا پھر بار بار ان جوابات میں اصلاح کرواتے رہے غرضیکہ ایک ملاقات میں مکمل ہونے والا انٹرویو کئی ملاقاتوں پر محیط ہو گیا۔ بہت سی شرائط کے ساتھ یہ انٹرویو بالآخر شائع ہو ہی گیا۔ افضل ظلہ انٹرویو کے دوران علامہ اقبال ٹاؤن میں اپنی صاحبزادی کے گھر مقیم تھے۔ ان کی ذہانت بھری آنکھیں اس بڑھاپے میں بھی ان کے بھرپور زندگی گزارنے کی گواہی دیتی ہیں۔ وہ اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں اور جس بات کو درست سمجھتے ہیں اس پر اڑ جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے وقت اپنے ساتھی ججوں سے تعلقات میں سرد مہری پائی جاتی تھی اس وجہ سے شاید وہ جسٹس سجاد علی شاہ کے علاوہ دوسرے جج تھے جن کی ریٹائرمنٹ پر ان کا الوداعی ریفرنس بھی نہ ہو سکا۔

افضل ظلہ ایک گاؤں کے باسی سے عدلیہ کے اعلیٰ ترین عہدیدار تک پہنچے جس میں یقیناً ان کی محنت اور عقل کا ہاتھ ہے تاہم اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بچپن میں تحریک پاکستان میں شرکت کی وجہ سے ملک سے ان کی محبت عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔ پاکستان کو جب بھی بحران میں دیکھتے ہیں تو کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ شاید اسی جذبے کے تحت ہی پاکستان میں جوڈیشنل ایکٹوازم (عدالتی تحرک) کا کریڈٹ یا ڈس کریڈٹ انہی کو جاتا ہے۔ اس انٹرویو میں جسٹس افضل ظلہ نے اپنی زندگی کے واقعات اور ملک کے تیسرے اہم ترین اور سب سے بڑے عدالتی عہدے کے حوالے سے کئی کہانیاں سنائیں۔

اہم نکات

☆ فوج کا سیاسی کردار اگلے 50 برسوں تک ختم ہونے کا امکان نہیں۔
☆ صنعت کار اور سرمایہ دار بھی جاگیردانہ سوچ اختیار کر چکے ہیں۔
☆ آزادی کے بعد نصف عرصہ مارشل لاء کے ساتھ گزرا، اس لیے ملک دولخت ہو گیا۔
☆ 90 فیصد مسلمانوں میں فرقہ واریت بالکل موجود نہیں۔
☆ ہم ساتویں ایٹمی طاقت ہیں، ہماری فوج صف اول کی فوج ہے۔
☆ میرے آباؤاجداد نے جنگ آزادی لڑی، ان کا مقابلہ ایوب خان کے آباؤاجداد سے تھا۔
☆ بچپن میں سنجیدگی اور شرارت دونوں میں ''پیش پیش'' تھا۔
☆ آزادی کا نعرہ لگانے پر ہندوؤں نے بڑے بھائی کو گھیرے میں لے لیا۔
☆ تمام التواء شدہ مقدمات کو نمٹانے کا اعزاز حاصل ہے۔
☆ سماجی مسائل کے حل کے لیے عدلیہ کے تحرک کا قائل ہوں۔
☆ دھمکیاں ملیں تو پولیس کا حفاظتی دستہ ساتھ رکھنا پڑا۔
☆ نفسیات اور صحافت بھی پڑھی، فیض احمد فیض میرے استاد تھے۔
☆ نور جہاں پاکستان کے ترانے گا کر جنتی ہو گئی ہیں۔
☆ غریب رشتہ دار کو امیر سے امداد حاصل کرنے کا قانونی حق ہے۔
☆ میں نے اپنے فیصلوں میں ہمیشہ زندگی بچانے کی کوشش کی ہے۔

انٹرویو

سوال: جسٹس ظلہ صاحب! آپ پاکستان کے تیسرے اہم ترین عہدے تک پہنچے، آپ کے خاندان کے کون سے بزرگ مرد یا خواتین نامور تھے، کہاں کے رہنے والے تھے، کیا کرتے تھے، کچھ ان کے بارے میں بتائیں؟

جسٹس ظلہ: میرے خاندان نے پچھلی صدیوں میں تین ہجرتیں کی ہیں، پہلی ہجرت کی کوئی سائنسی توجیہ اور تائید نہیں ملتی مگر یہ بڑی مضبوط روایت ہے کہ ہمارے علاقے کے لوگ مصری نسل سے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سامری کی بغاوت اور حضرت ہارون علیہ السلام کی متنازع پوزیشن جس کے بارے میں مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں بھائیوں کا کوئی اختلاف نہیں تھا تاہم یہ ضرور نظر آتا ہے کہ کئی قبائل اس تاریخی واقعہ کی زد میں آئے جن میں حضرت یوسف اور حضرت بنیامین علیہما السلام کے قبائل بھی تھے، سامری اپنے کفر کے باعث انجام کو پہنچا تو سامری کے اتحادی شرمندہ قبائل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے شمال کی طرف ہجرت کی، فلسطین اور موجودہ لبنان سے گزرتے ہوئے ترکی کے انتہائی جنوبی علاقے انطالیہ میں صدیوں مقیم رہے پھر ترکی، آذر بائیجان اور دوسرے ہجرتی ریلوں میں گھومتے گھامتے وسطی ایشیا میں کہیں گم ہو گئے کون سا خاص علاقہ تھا، علم نہیں البتہ ازبکستان تاجکستان کا ایک علاقہ پنجاب کہلاتا ہے۔

دوسری ہجرت وسط ایشیا سے موجودہ پاکستان کی طرف ہوئی جس کو بے شک آپ آریائی یا دوسری ہجرت تصور کرلیں، تیسری ہجرت میرے اپنے خاص قبیلے بھٹی راجپوتوں نے دہلی کے مضافات سے موجودہ وسطی علاقہ پوٹھوہار کی طرف کی جہاں ازل سے غربت چھائی ہوئی ہے، میرے والد صاحب جو ایک ریونیو ایکسپرٹ تھے، کا خیال تھا کہ مغلوں کی ہندوستان میں آبادکاری کے درمیان راجپوتوں کی سرکوبی کے علاوہ ہر فاتح کی طرح انہوں نے بھی راجپوتوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کیا۔ جس کے خلاف مقامی آبادی کی ناراضگی ظاہر ہونے لگی اور امن وامان کا مسئلہ پیدا ہو گیا، اس کے خاتمے کے لیے ان قبائل کو بطور سزا پوٹھوہار اور دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا تاکہ دہلی سے دور رہیں اور پٹھانوں کی دہلی کو واپس لینے کی خواہش کو راستے میں روکنے کے لیے معاون بنیں۔

پہلی ہجرت کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کا ایک فرقہ براہمی اور لفظ برہمن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسلک کرتے ہیں ادارہ ہمدرد نے قرآن کی جو تفسیر لکھی ہے اس میں سورہَ بقرہ کی کچھ آیات کا تجزیہ کرتے ہوئے مفسر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں گائے کی پرستش سامری سے منسلک ہوتی ہے اور سامری کا کردار مصر میں گائے کی پرستش سے منسلک ہے۔ ہم میاں بیوی ایک دفعہ مشہد کے ایئر پورٹ پر جہاز کا انتظار کر رہے تھے کہ وہاں ہمیں ایک آذر بائیجان کے پروفیسر ملے جو انتھروپولوجی پڑھاتے تھے، انہوں نے ہمارا اچھا خاصا انٹرویو لیا اور ہم سے پوچھا کہ ہم کس علاقے سے ہیں اور ہماری لوک داستانیں کیا ہیں جب سیف الملوک کا ذکر آیا تو مجھے یونیورسٹی آنے کی دعوت دی لیکن ہم وہاں جا نہیں سکے۔ اسی طرح ترکی کے شہر الطالیہ کے عجائب گھر اور وہاں کی نمائش دیکھنے کے بعد کہ دیہاتی عورتوں کے چولہے پر بیٹھنے کے انداز سے ایسا لگا جیسے وہ سب پوٹھوہاری ہیں اس سلسلے میں میرے دوست موجودہ صدر رفیق تارڑ نے ایک کتاب دکھائی جس میں ہندوستانی مصنف نے ظلہ کو راجپوتوں کی ایک گوت لکھی ہے، صدر صاحب کا خیال تھا کہ ظلہ راجپوتوں کی گوت ہے لیکن حقیقت میں راجپوتوں کی کوئی گوت ظلہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مصنف نے عدالتی حلقوں میں میرے ظلہ راجپوت ہونے کا سن کر اپنی کتاب میں ظلہ کا اضافہ کر دیا ہو۔ البتہ میں ایک کتاب کنٹری آف سندھ کا حوالہ ضرور دوں گا جو اس وقت سندھ اور آج کے پاکستان کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب آزادی کے قرب و جوار میں لکھی گئی۔ دریائے سواں میں جو پتھر پہاڑوں سے گرتے ہیں، ان پر اسکینڈرے نیونی ڈرائنگز ہیں۔

سوال: پھر ظلہ کا نام کہاں سے آیا؟

جسٹس ظلہ: میری والدہ ان پڑھ تھیں، وہ میرے نام افضل کو ظلہ کہہ کر پکارتی تھیں، وہ ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی تعلیم کے سلسلے میں بہت سخت تھیں، کبھی کبھی ظلم کی حد تک سزا دیتی تھیں، وہ رات کو ہمارے پڑھنے کے وقت کے ساتھ خود بھی جاگتی تھیں۔ میں نیند کا رسیا تھا، مجھے بہت دفعہ اونگھ آتی تھی، ایک دفعہ تو مجھے سرزنش کے لیے میرے بالوں کو رسی سے باندھ دیا تا کہ میں اونگھ نہ سکوں۔

ہمارے کالج اور تحریک پاکستان کے زمانے میں والدہ بیمار ہوگئیں، ہم دو بھائیوں نے ان کے مرض الموت کے زمانے میں گریجویشن کی، انہیں خوشی تو بہت ہوئی لیکن وہ میری عملی زندگی کو نہ دیکھ سکیں لیکن میں نے اسی وقت فیصلہ کیا اور والدہ کے احسان کے طور پر والدہ کا بگاڑا ہوا نام ظلہ ہمیشہ کے لیے اپنے نام کے ساتھ لگا لیا۔ میرے اس نام کی مخالفت ہوئی بلکہ ایک جج تو اس وقت تک میرا کیس نہیں سنتے تھے جب تک اپنے ہاتھ سے ظلہ کا نام کاٹ نہیں دیتے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قرآن

پاک میں دو دفعہ ظلہ کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب سائبان ہے۔

سوال: اپنے خاندان کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

جسٹس ظلہ: میں پوٹھوہار کے ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ البتہ میرے دادا طاقت میں بہت مشہور تھے اور ان کی زمینداری کا بھی شہرہ تھا، انہوں نے اکیلے ایک چیتا مارا تھا اس کے بعد ان کا چودھری چترا خان پڑ گیا، میرے نانا غالباً پچھلی صدی کے پہلے تعلیم یافتہ نوجوان تھے مگر وہ جواں عمری میں انتقال کر گئے، انہوں نے اس دیہاتی ماحول میں بزنس میں شراکت کی، ان کا نام چودھری حسین علی تھا، انہوں نے لاہور سے پشاور جانے والی ریلوے لائن کے بطور ٹھیکیدار کچھ حصے تعمیر کیے، پنڈی کی جامع مسجد کی تعمیر میں بھی ان کی معاونت تھی، وہ بطور سخی علاقے میں مشہور تھے، انہوں نے ایک فلاحی ادارہ انجمن تہذیب الاسلام ایک دور افتادہ دیہاتی علاقے میں قائم کیا۔ یہ لوگ اپنے علاقے میں نامور تھے تاہم دوسرے علاقے کے لوگ انہیں نہیں جانتے تھے۔ ججی کے انٹرویو کے دوران صدر ایوب سے میرا دلچسپ مکالمہ ہوا، اس انٹرویو کے دوران جنرل موسیٰ خان اور ایس ایم ظفر بھی موجود تھے۔ میرے گاؤں اور خاندان کا پتہ لگنے پر انہوں نے کہا کہ آپ تو تاریخی لوگ ہیں، ان کے کسی بزرگ فوجی کمانڈر نے اپنی کسی تحریر میں ہمارے آباؤ اجداد کا ذکر کیا، اس سلسلے میں 1857ء کی جنگ میں اس علاقے میں جو بغاوت ہوئی اس کو صدر ایوب کے ایک مورث اعلیٰ نے فرو کیا جب کہ ہمارا قبیلہ اس بغاوت میں شریک تھا۔ جب صدر ایوب نے واقعہ سنایا تو میں نے پہلو بدلا تو ایس ایم ظفر نے میری مدد کی اور یوں جنگ آزادی میں اپنے قبیلے کی تعریف کی جس پر صدر ایوب نے بھی کہا کہ ہاں یہ لوگ بڑے بہادر ہیں، ہمارے آباؤ اجداد مغلوں کے زمانے میں مسلمان ہوئے اس سے پہلے ہندوانہ رسوم کے تحت ہمارے گاؤں میں مرگھٹ موجود تھے، یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں زوال کا شکار ہو گیا۔ میرے والد ایک عام سول سرونٹ تھے، ہمیں ہمیشہ کہتے تھے انگریز کی نوکری نہیں کرنی، تقسیم کے وقت انبالہ ڈویژن کے اشتمال میں خصوصی افسر تعینات ہوئے تھے، وہاں سے سیدھے پنجاب کی باؤنڈری کمیشن کے مسلم لیگ سیل جو پارٹیشن کیس تیار کر رہا تھا کے ریونیو کے شعبے کے سربراہ بن گئے اس سارے سیل کے سربراہ مسٹر ظفر اللہ خان تھے، میرے والد نے اتنا کام کیا کہ وہ بیمار ہو گئے۔

سوال: اپنے والد اور والدہ کے انتقال کے وقت آپ کے کیا احساسات تھے، آپ کی عمر کیا تھی، آپ کو کن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑا، کن لوگوں سے مدد ملی اور کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

جسٹس ظلہ: والدہ کے انتقال کے وقت عمر 20 سال تھی، والد صاحب بہت بعد میں فوت

ہوئے، بیماریوں کے متوقع نتائج کا علم تھا اس لے کوئی خاص احساسات یادنہیں میرے تین بڑے بھائی تھے اس لیے بوجھ نہیں پڑا نہ کسی کی مدد کا سوال پیدا ہوا، مشترکہ خاندان کی وجہ سے مشکلات نہیں آئیں۔ البتہ والدہ صاحب کی مسلسل راہبری سے محروم ہو گیا۔

سوال: والد یا والدہ کس کی جدائی کا صدمہ بڑا تھا اور کیوں؟

جسٹس ظلہ: دونوں کا تقریباً برابر تھا، دونوں کا اپنے اپنے شعبے میں کام تھا۔

سوال: ہر بچہ اپنی ماں سے لپٹتا ہے اور اس کی گود میں جا بیٹھتا ہے، آپ کو یاد ہے کہ آپ والدہ سے لاڈ میں ایسا کرتے تھے؟

جسٹس ظلہ: کوئی ایسی بات یاد نہیں، ہم ان سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ تعلیم کے معاملے میں بہت سخت تھیں۔

سوال: آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟

جسٹس ظلہ: بھائی تھے تو زیادہ لیکن چار جوان ہوئے، دو بہنیں ہم سے چھوٹی تھیں، اس وقت ہمارے چھ خاندان ہیں۔

سوال: آپ کے بھائی اور دوسرے قریبی رشتہ دار سیاست اور دوسرے شعبوں میں کہاں کہاں کیا کر رہے ہیں؟

جسٹس ظلہ: میں اور میرے بڑے بھائی چودھری محمد اشرف مرحوم نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اسی تسلسل میں میرے بڑے بھائی نے باقاعدہ مسلم لیگ ضلع ساہیوال میں کام کیا اور 1970ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر رینالہ خورد کے علاقے سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا، ہار گئے اور پھر سیاست چھوڑ دی۔

سوال: آپ نے کن سکولوں اور کالجوں میں کن شہروں میں تعلیم حاصل کی؟

جسٹس ظلہ: پرائمری سکولنگ تہذیب الاسلام بجنیال کے اسکول میں حاصل کی، یہ تقریباً مسجد مدرسہ بھی تھا۔ ہمارے محترم استاد قاضی غلام سرور انجمن کے معتمد اسکول کے استاد اور دینی اتالیق بھی تھے اس کے بعد جہلم، جھنگ اور ضلع ساہیوال کے اسکولوں میں والد صاحب کی ملازمت کے حوالے سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی، ساہیوال کے گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا تحریک میں کام کرنے والے افراد کو ایف اے اور بی اے کی ڈگریاں دی گئیں، میرے بڑے بھائی اور ہمارے فیڈریشن کے صدر نے دو ڈگریاں لے لیں، میں نے اپنے فلاسفی کے پروفیسر میاں اصغر علی کے اصرار پر امتحان دیا اور صرف تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوسکا، بی اے میں میرے مضامین میں ملٹری سائنس کا

مضمون بھی شامل تھا۔ جس میں کالج کلر ملا، پولیٹیکل سائنس اور فارسی تھی۔ بعد میں لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا، اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم کا ڈپلومہ بھی کیا، اس زمانے میں فیض احمد فیض ہمیں انگریزی صحافت پڑھایا کرتے تھے اس کے علاوہ کلینیکل سائیکالوجی میں بھی ڈپلوما کیا۔

سوال: بچپن کی پہلی یاد جو آپ کے ذہن میں ابھرتی ہے؟

جسٹس ظلہ: جب میرے تین بڑے بھائی اسکول گئے، دن بھر کھیلتے رہے، شام کو واپس آئے تو ظاہر کیا کہ اسکول سے آئے ہیں لیکن ہیڈ ماسٹر گوکل سنگھ نے چودھرائن کو اطلاع دے دی تھی کہ بچے اسکول نہیں آئے بچوں کے گھر آنے پر جب انہوں نے جھوٹ بولا، مجھ سے پوچھا گیا، میں نے بھی جھوٹ بولا، ٹرائل میں رات کا وقت ہو گیا تھا، ہمارا گھر ویرانے میں دریا کے کنارے پر ہے مجھے چھوٹا ہونے کے ناتے معافی ملی لیکن تینوں بڑے بھائیوں کو بغیر کھانے کے حویلی سے باہر رکھا جب کہ والدہ نے ساری رات چھت پر بیٹھ کر پہرہ دیا کہ کوئی جانور حملہ آور نہ ہو جائے اس سے زیادہ خوفناک اور سبق آموز کوئی واقعہ یاد نہیں آتا۔

سوال: قرآن مجید کی تعلیم کب حاصل کی؟

جسٹس ظلہ: بچپن میں اسکول کے زمانے سے ہی قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔

سوال: لڑکپن کے کون سے واقعات آپ کو سب سے زیادہ یاد آتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: تحریک پاکستان کے دور میں ادنیٰ ورکر اور بعد میں ادنیٰ عہدیدار کے طور پر جو کام کیے وہ یاد آتے ہیں ایک نئے گریجوایٹ نواز اولکھ جو نئے نئے اے ایس آئی پولیس بھرتی ہوئے تھے ان کے ساتھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا تعلق بن گیا اور وہ خود بچتے اور قابل مواخذہ حرکات میں ہمیں بھی بچاتے تھے اس سلسلے میں مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن تفریح کے دوران کچھ پتلے نوجوان اچکنیں پہنے اور ڈبے رکھے گراؤنڈ میں بیٹھے تھے۔

زمیندارہ کالج گجرات میں لڑائی ہو چکی تھی۔ ہم علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کی پنجاب آمد کا سن چکے تھے۔ اس لیے طلبہ کے پاس گئے تو اس کے بعد نعرے لگے اور پنجابی جاگ گئے۔ خٹک کا پٹھان گل رحمان فوراً لیڈر بن گیا فوراً جھنڈا بن گیا۔ گل رحمان اور ان کے ساتھی چھت پر چڑھے اور جھنڈا لہرا دیا۔ سیڑھیاں لڑکیوں کے کامن روم کے سامنے سے چڑھتی تھیں لڑکیاں اکثر غیر مسلم تھیں گو انہوں نے نہ اعتراض کیا نہ شور مچایا اس کے باوجود میرے بڑے بھائی چوہدری محمد اشرف جو سیکرٹری جنرل ایم ایس ایف تھے، ہندوؤں کے چنگل میں آ گئے۔

سوال: بچپن میں آپ کا آئیڈیل کون تھا؟

جسٹس ظلہ: میرے نانا چوہدری حسین علی جو میرے پیدا ہونے سے پہلے فوت ہو گئے تھے، ان کے بعد میرے والد اور پھر کالج کی لائف سے آج تک قائداعظم۔

سوال: اس زمانے میں سب سے زیادہ کون سا کھیل پسند رہا اور یہ رجحان کیسے پیدا ہوا؟

جسٹس ظلہ: کھیل کا کم شوق رہا۔ ہاکی کی بی ٹیم میں آیا تاہم ہائیکنگ کا سرگرم رکن تھا۔

سوال: اپنی کوئی شرارت جو آپ کو یاد ہو؟

جسٹس ظلہ: شرارتی تو میں تھا۔ اب یاد نہیں۔ جھنگ کا ایک واقعہ یاد ہے کہ بڑے بھائیوں نے میرے لیے پتلون سلوائی جو مجھے سخت ناپسند تھی۔ میں چھت پر چڑھ گیا اور کودنے کی دھمکی دے دی لیکن پھر بعدازاں ساری زندگی سوٹ پہنتا رہا۔

سوال: لڑکپن میں پسندیدہ کتاب، آئیڈیل فنکار، کھلاڑی، گلوکارہ، استاد، سیاستدان، شاعر، ادیب اور کیوں؟

جسٹس ظلہ: BRAVE NEW WORLD یہ پچاس سال پہلے میں نے پڑھی تھی۔ یہ سائنس فکشن تھی۔ یہ انسانوں کو جینیس بنانے کی فیکٹری کے بارے میں تھی۔ یہ انسان بنانے والی فیکٹری تھی۔ آج کلوننگ کے حوالے سے یہ کتاب اب بھی یاد آتی ہے۔

آئیڈیل فنکار انتھونی کوئین تھے۔ شاید حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے کردار یا پھر انسانیت کے حوالے سے انہوں نے ہنچ مین آف ناٹرے ڈیمس میں کام کیا تھا۔ آئیڈیل فنکارہ نسیم بانو تھیں جنہوں نے فلم پکار میں نور جہاں کا کردار ادا کیا تھا۔ بچپن میں دھیان چند کو ہاکی کھیلتے دیکھا، پسند آیا پاکستان کے دور میں کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

گلوکارہ کے طور پر نور جہاں ہمیشہ پسندیدہ رہیں جس لگن سے نور جہاں نے پاکستان کے لیے ترانے گائے وہ جنتی ہو گئی ہیں۔ پٹھانے خان اور عابدہ پروین بھی پسند ہیں۔ استاد قاضی غلام سرور پسندیدہ استاد رہے ان کے بڑے بیٹے قاضی عزیز الرحمٰن سے اب بھی ملاقات رہتی ہے۔ انہوں نے میرے بچپن میں مجھے انگریزی میں تفسیر حقانی تحفے میں دے دی۔

پسندیدہ سیاستدان قائداعظم اور پسندیدہ شاعر جمیل الدین عالی ہیں پسندیدہ ادیب نور الہدیٰ شاہ ہیں۔

سوال: لڑکپن میں پسندیدہ مشغلہ کیا تھا؟

جسٹس ظلہ: مذہبی رسائل کو پڑھنا اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنا بڑے تیکنیکی کام، پلمبنگ اور جوتے مرمت کرنے تک سارے کام کرتا تھا۔

سوال: بچپن میں آپ کیا بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے؟

جسٹس ظلہ: کوئی خواب نہیں دیکھا۔ بچپن میں ہی صحت مند مسابقت کا جذبہ تھا اور آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔

سوال: بچپن میں کون سا دوست سب سے عزیز تھا، کیا اس سے اب تک مراسم ہیں؟

جسٹس ظلہ: نام یاد ہیں، لڑکپن کے زمانے میں گل رحمان خان خٹک موضع تخت ضلع کوہاٹ میرا گہرا دوست تھا۔ غالباً تحریک پاکستان میں اس کے جنونی کردار کی وجہ سے دوستی ہے۔ گل رحمان تو فوت ہو چکے ہیں البتہ ان کے خاندان سے مراسم ہیں۔

سوال: طالب علمی کے زمانے میں کتنا جیب خرچ ملتا تھا؟

جسٹس ظلہ: دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم۔

سوال: کیا بچپن میں آپ کو امیر اور غریب کا فرق محسوس ہوتا تھا؟

جسٹس ظلہ: بہت زیادہ، بے چینی کی حد تک۔ اس سلسلے میں، میں نے حاجی نظام کیس میں رولنگ دی ایک غریب رشتہ دار کو حق ہے کہ وہ امیر رشتہ دار سے عدلیہ کے ذریعے اپنے گزارہ کے لیے دادرسی کی اپیل کر سکے۔

سوال: جاگیردارانہ اور قبائلی نظام کے بارے میں آپ کے کیا تصورات تھے، غریب بچوں سے کس حد تک میل جول تھا؟

جسٹس ظلہ: میں جاگیردارانہ اور قبائلی نظام کو کلئے کے طور پر دیکھتا ہوں۔ حقائق خلط ملط ہو چکے ہیں۔ جاگیردار کی تعریف بدل چکی ہے۔ بڑا تاجر، صنعت کار اور سیاستدان اس میں شامل ہو چکا ہے۔ غریب بچوں کے ساتھ میل جول تھا۔

سوال: والد یا والدہ کس سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں اور کیا بے تکلفی سے گفتگو کر سکتے تھے؟

جسٹس ظلہ: دونوں سے ڈرتے تھے۔ والد خاموش طبیعت کے تھے اور والدہ سخت جان تھیں۔

سوال: ماں باپ سے کس قسم کی فرمائش کرتے تھے؟

جسٹس ظلہ: ایک زمانے میں فلیکس کے بوٹ کی فرمائش والد سے کی تو انہوں نے مجھے وہ بوٹ منگوا دیا اور ایک دفعہ کالج کے زمانے میں سوٹ کا شوق کا پتا چلا تو انبالے سے واپس آتے ہوئے سوٹ کا ایک پیس لائے۔

سوال: پسندیدہ مضمون کون سا تھا اور کون سا مضمون بور کرتا تھا، کس مضمون میں زیادہ اور کس

میں کم نمبر آتے تھے؟

جسٹس ظلہ: پسندیدہ مضمون فلسفہ تھا۔ معاشیات چھوڑ کر فلسفہ لیا تھا۔ کسی مضمون میں بھی کمزور نہیں تھا۔ اچھی پوزیشن لیتا تھا۔ سب سے زیادہ نمبر لاء اور فلسفہ میں لیے۔

سوال: آپ کی تربیت میں زیادہ کردار کس نے ادا کیا؟

جسٹس ظلہ: والدین کے علاوہ اساتذہ، خاص طور پر قاضی غلام سرور نے۔

سوال: بچپن میں آپ سنجیدہ تھے یا شرارتی؟

جسٹس ظلہ: دونوں میں کافی آگے تھا۔ بچپن میں والدہ سے پلاؤ کی فرمائش کی، ابھی پکا نہیں تھا کہ بار بار ضد کی تو والدہ نے گرم چاول ہاتھ پر رکھ دیئے۔ میں نے انگریزی نئی سیکھی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کہا TAKE کرو۔

سوال: کیا آپ کے اساتذہ میں سے کوئی حیات ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں؟

جسٹس ظلہ: پچھلے سال میں نے انگریزی کے استاد صدیق کلیم کو پہچانا ان سے ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔

سوال: طالب علمی کے زمانے میں ڈرامیٹک کلب کی سرگرمیوں میں حصہ لیا؟

جسٹس ظلہ: نہیں۔

سوال: بچپن کے دوست اور ان کی باتیں یاد آتی ہیں؟

جسٹس ظلہ: ہاں! باتیں یاد نہیں۔

سوال: بچپن کا کوئی یادگار قصہ؟

جسٹس ظلہ: جنگ میں اسکول کے گیٹ پر سائیکل سے اترا۔ بستہ سنبھال رہا تھا کہ بجلی کی تار پر ایک فاختہ آ کر بیٹھی۔ کرنٹ لگا تھوڑا سا شعلہ نکلا اور فاختہ لٹک گئی۔ لحمہ بعد ایک دوسری فاختہ آئی اس نے پہلی فاختہ کی ٹانگوں پر سر رکھا اور پھر وہ بھی موت سے ہمکنار ہو گئی۔ یہ فاختائیں مجھ کو محبت کی یاد دلاتی ہیں۔ میں کسی انسان سے نفرت نہیں کر سکتا۔ لڑائی کر سکتا ہوں لیکن نفرت سے مار نہیں سکتا۔

سوال: بچپن کا کون سا واقعہ یاد آتا ہے؟

جسٹس ظلہ: تحریک کے پہلے دن جب ہندوؤں نے میرے بھائی کو گھیرے میں لیا، میں بے بس تھا۔

سوال: کیا کبھی اساتذہ سے مار پڑی؟

جسٹس ظلہ: کبھی نہیں۔

سوال: ہاسٹل لائف کیسی لگی، کوئی یادگار واقعہ؟

جسٹس ظلہ: شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی ہاسٹل لائف کا تجربہ کیا۔ میرے ایک انتہائی قریبی دوست پر میری قیمتی گھڑی چرانے کا الزام لگ گیا۔ ریت پھنکوائی گئی گھڑی نہ ملی۔ ساری زندگی اس بات کا قلق رہا کہ ریت پھنکوانے سے پہلے کیوں نہ میں نے کہہ دیا کہ گھڑی مل گئی ہے۔ حالانکہ ملی نہیں تھی تا کہ دوست کو اس آزمائش میں نہ ڈالتا۔

سوال: تحریک پاکستان کے دوران آپ کا یا آپ کے بزرگوں کا قائداعظم سے کوئی رابطہ یا ملاقات ہوئی؟

جسٹس ظلہ: والد صاحب کا بطور ریونیو ایکسپرٹ لاہور میں رہائش کے دوران اگر ہوا تو علم نہیں۔ خود میں نے انہیں دور سے دیکھا۔ لاہور میں ایم ایس ایف کے بڑے لوگ ہم دیہاتوں سے آنے والوں کو چھوٹا سمجھتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے دفتر میں ان تک رسائی کے لیے گھنٹوں لگتے تھے لیکن جہاں انہوں نے ماشاء اللہ بڑے کام کیے وہاں ہم چھوٹے ورکروں نے بھی ماشاء اللہ بہت بڑے بڑے کام کیے۔ جب سیکرٹریٹ پر پاکستانی پرچم لہرانے کی ہماری بہنیں کوشش کر رہی تھیں تو ہم ''سوٹیاں'' (ڈنڈے) پکڑ کر ان کو سیکرٹریٹ میں داخل کرنے کے بعد کئی دفعہ گیٹ کے سامنے جمع ہوئے تھے اور نفل پڑھے تھے۔ مجھے چہرے پر چوٹ بھی انہی دنوں میں آئی۔ میں سلام نہیں پھیر رہا تھا۔ دو سکھ سپاہی بے چین تھے کہ یہ سلام پھیرے تو اسے اٹھا کر ٹرک میں ڈال دیں۔ اور بھی سب نماز لمبی کر رہے تھے۔ سکھوں نے گالی نکالی کہ اس مسلے کو نماز نہیں آتی۔ مجھے زبردستی اٹھانے کی کوشش کی میں لڑ پڑا۔ انگریز ڈی آئی جی دوڑے ہوئے آئے، ان کے چھڑانے کی کوشش میں ان کی چھڑی لگ گئی اور خون آنا شروع ہو گیا۔

سوال: سب سے خوبصورت عورت کب دیکھی؟

جسٹس ظلہ: غالباً 1956ء میں راولپنڈی میں۔

سوال: محبت ایک فطری عمل ہے اور ہر نوجوان اس فطری عمل سے گزرتا ہے، آپ نے اس زمانے میں یہ کشش محسوس کی؟

جسٹس ظلہ: میں اصولی طور پر شدت سے اس اصول کا حامی ہوں کہ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے بلکہ انسان اس کی خوبصورت ترین تخلیق ہے اور عورت کائنات کا حسن ہے۔ جس کو ایسی کشش محسوس نہیں ہوتی وہ فطرت سے عاری ہے۔

سوال: دوستوں کے درمیان کس قسم کے مشاغل رہتے تھے؟

جسٹس ظلہ: تاش کم کھیلی، شطرنج نسبتاً زیادہ کھیلا۔

سوال: بچپن میں فلمیں دیکھنے اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا؟

جسٹس ظلہ: بہت زیادہ نہیں تھا۔

سوال: دوستوں سے اختلاف یا جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا؟

جسٹس ظلہ: بہت کم، معمولی باتوں پر ہوتا تھا۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں گل رحمان سے سنجیدہ جھگڑا ہوا کیونکہ وہ مجھے ریفرنڈم کے لیے سرحد نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

سوال: کیا نوجوانی میں آپ بھی تنہائی پسند تھے؟

جسٹس ظلہ: بالکل درست ہے۔

سوال: پہلی بار مغرب گئے تو آپ کے تاثرات کیا تھے؟

جسٹس ظلہ: مسابقت اور تہذیبی ٹکراؤ کے خیالات محسوس کیے۔

سوال: نوعمری کے زمانے میں کس کھیل میں حصہ لیا؟

جسٹس ظلہ: کبڈی کی حد تک، لیکن وہ بھی کم کم۔

سوال: ہمارے معاشرے میں ارینجڈ شادی کامیاب ہوتی ہے یا اپنی پسند کی؟

جسٹس ظلہ: ارینجڈ اور پسند کی شادی میں دونوں عمل شامل ہونا چاہیے۔ فقہی لحاظ سے بھی شادی عورت اور مرد کا ایسا معاہدہ ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کو ایجاب و قبول کے مرحلے کے لیے پسند کریں اور فطری طور پر الہڑ اور نوخیز جذبات کا معاملہ ہوتا ہے اس لیے بڑوں کا نہ صرف مشورہ بلکہ شمولیت بھی ضروری ہے۔ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی ارینجڈ شادی کی لیکن تب جب متعلقہ فریقین کو آپس میں خوب باتیں کرنے کا موقع دیا۔ میری ایک بیٹی گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن ہم نے مجبوراً اسے ایسا کرنے کو کہا اور پھر اس گفتگو کے کافی دنوں بعد اس نے اقرار کیا۔

سوال: کیا اسلام کے تحت خواتین کو صرف نظر کا پردہ رکھنا چاہیے یا مکمل پردہ؟

جسٹس ظلہ: مکمل پردہ سے مراد برقعہ ہے تو وہ ضروری نہیں البتہ زینت ستر سے نظر کا پردہ ہمارے معاشرتی نظام کا ایک ستون ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ مرد اور عورت جب ملیں تو نظریں جھکا لیں۔

سوال: بچوں کی تعلیم و تربیت میں بیگم کا کس حد تک ہاتھ بٹاتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: بہت بٹا تا رہا ہوں غالباً اسی وجہ سے چھوٹی بیٹی نے تو ایم ایس سی میں گولڈ میڈل لے کر ریکارڈ بھی قائم کیا بڑی بیٹی بھی اپنی کلاس میں فرسٹ آئی۔

سوال: آپ بچوں کو کس حد تک پابند اور کس حد تک آزادی دینا پسند کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: پہلی ضرورت معقول پابندیاں اور پھران کے اندر رہ کر کافی آزادی۔

سوال: بیگم صاحبہ سے کن امور پر مشورہ کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: ریٹائرمنٹ کے بعد کافی وقت ملتا ہے البتہ سیاسی اور ہر معاملہ میں گفتگو رہتی ہے عدالتی معاملہ میں باہمی مشورہ نہیں کیا ماسوائے جب کبھی جان سے مارنے کی دھمکی لی۔

سوال: بیگم صاحبہ کے ہاتھ کا کھانا پسند ہے؟

جسٹس ظلہ: جی ہاں کبھی کبھی فرمائش بھی کرتا ہوں عموماً جو سامنے آئے شوق سے کھاتا ہوں کبھی تنقید نہیں کی۔

سوال: کیا خود کبھی کھانا پکایا؟

جسٹس ظلہ: کسی زمانے میں پکا لیتا تھا ہائیکنگ گروپ کے اندر مرغی پکایا کرتا تھا اب بیگم کو مذاقاً کہتا ہوں کہ آپ سے اچھا کھانا پکا سکتا ہوں لیکن کبھی پکایا نہیں بہت اچھی چائے ضرور بنا لیتا ہوں چائے میری کمزوری ہے۔

سوال: ایک خاوند اپنی بیگم میں کیا خوبیاں دیکھنا پسند کرتا ہے، خواتین کو کون سی باتوں سے گریز کرنا چاہیے؟

جسٹس ظلہ: اسلامی معیار عین فطرت کے مطابق ہے۔

سوال: آپ کا ستارہ کون سا ہے، آپ کی بیگم کا ستارہ؟

جسٹس ظلہ: ستاروں کے حساب اور ناموں کا مجھے پتہ نہیں میری تاریخ پیدائش 19 اپریل اور میری بیوی کی 17 جنوری ہے قسمت کا حال پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے قسمت کے بارے میں پیش گوئیاں پڑھ کر یہ نوٹ کرتا ہوں کہ اس میں کس قدر سچائی ہے لیکن شریک حیات اس کو اچھا نہیں سمجھتی اس لیے کبھی سنجیدہ نہیں ہوئے۔

سوال: مشہور ہے کہ جہاں دو برتن ہوتے ہیں کھڑکھڑاتے ضرور ہیں کیا گھر میں کبھی اس کی نوبت آئی آپ دونوں کے درمیان عام طور کن باتوں پر اختلاف رائے ہوتا ہے۔

جسٹس ظلہ: برتنوں کی رگڑ کی حد تک تو درست ہے لیکن کھڑکھڑانے کی نوبت نہیں آئی بالکل معمولی باتوں میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بیگم مجھ سے بہت کم اختلاف کرتی ہے۔

سوال: بیگم صاحبہ اکثر فرمائش کرتی ہیں، عام طور پر کن چیزوں کی فرمائش کرتی ہیں، شادی کی تاریخ یاد رہتی ہے؟

جسٹس ظلہ: بہت کم فرمائش کرتی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے گھر کے سارے معاملات ان کے پاس ہیں یہاں تک کہ اگر مجھے پیسے کی ضرورت ہوتو میں ان سے لیتا ہوں خود اپنے پاس کبھی پیسے نہیں رکھتا۔

سوال: اس کی کیا وجہ ہے، شادی کی تاریخ بھی بتائیں؟

جسٹس ظلہ: جس طرح میں اپنے معاملات میں مصروف رہتا ہوں تو میں گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتا یہاں تک کہ میرے کپڑے بھی وہی بنواتی ہیں شادی کی تاریخ بہت اچھی طرح یاد ہے جو 23 مارچ 1957ء ہے۔

سوال: آپ کی بیگم کا تعارف آج تک نہیں ہوا لوگ جاننا چاہتے ہیں بیگم صاحبہ کون ہیں، ان کا کہاں سے تعلق ہے، کب شادی ہوئی، آپ کی عمر کیا تھی، ان کی تعلیم کتنی ہے، آپ کے بچے کتنے ہیں؟

جسٹس ظلہ: میری بیوی شادی سے پہلے ایک تعلیمی ادارے کی سربراہ تھیں۔ ڈبل ایم اے کیا ہوا ہے ایک علی گڑھ اور دوسرا پنجاب سے، ماڈرن ایجوکیشن کے ایک شعبہ کی ماہر ہیں۔ لندن اسکول آف ایجوکیشن سے تعلیم حاصل کی ان کا آبائی وطن امرتسر ہے وہ مہاجر ہیں اور میں ضلع راولپنڈی کا دیہاتی ہوں، شادی کے وقت میری عمر 29 سال تھی ہماری دو بیٹیاں ہیں اور دونوں شادی شدہ ہیں بڑی باوجود ایم ایس سی کرنے کے گھر داری اور خاتون خانہ کا کردار ادا کرتی ہیں چھوٹی بیٹی ایک کالج میں ایم ایس سی کے لیول کی معلمہ ہیں یہ بات غلط ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو اس سینس میں پردہ کروایا ہے جس کا سوال میں اشارہ ہے یعنی برقعہ، البتہ شادی سے پہلے وہ برقعہ گھر سے باہر نکلتے وقت پہنتی تھیں بعد میں نسوانی پردہ جس کا پہلے ذکر آچکا ہے جاری رہا چادر کے بغیر باہر نہیں نکلتی لیکن برقعہ اتر گیا علاوہ میرے گھر کے سربراہ ہونے کے مجھے اعتراف ہے کہ نماز کا پابند مجھے انہوں نے کیا۔

سوال: حسن کے بارے میں آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟

جسٹس ظلہ: میرے نقطہ ہائے تخلیق میں ہر انسان میں کردار اور صورت کی کئی خوبیاں ہیں جب آدمی انسان سے نفرت کرنا چھوڑ دے تو اسے ہر شخص میں کوئی خوبصورتی نظر آئے گی۔

سوال: آپ مشترکہ خاندانی نظام کے حامی ہیں؟

جسٹس ظلہ: ہاں مگر اب مغربی اثرات کے باعث یہ نظام ہمارے معاشرے میں بھی بگڑ رہا ہے۔

سوال: آپ کو کبھی بیٹے کی کمی محسوس ہوئی؟

جسٹس ظلہ: خاندانی روایات کو مدنظر رکھا جائے تو جواب ہاں میں ہونا چاہیے لیکن میرے گھر

کا ماحول ایسا تھا کہ بیٹیوں کو صحیح سنت کے مطابق ایک نعمت جانا اور فلاح کا ذریعہ پایا۔

سوال: اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ماں اور باپ کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟

جسٹس ظلہ: والدین کو اپنی اولاد کی خاطر ان کی تربیت کے دوان آئیڈیلزم کا سہارا لے کر خواہ ان میں کوتاہیاں بھی ہوں، تربیت کے معیار کو اونچا رکھنا چاہیے۔

سوال: انسان کا موڈ کبھی یکساں نہیں رہتا کیا کبھی گھر میں غصہ آتا ہے، تو کسی بات پر؟

جسٹس ظلہ: غصہ دھیما ہوتا ہے اور اظہار بھی خاموشی سے کبھی سالوں میں ایک دفعہ "لاوڈ" اظہار ہوتا ہے اکثر غصے کی وجہ کسی کام میں تاخیر یا ناکامی ہوتی ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں عورت کی جگہ گھر میں ہے یا اسے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے؟

جسٹس ظلہ: دونوں جگہ پر جیسے مرد کی بھی دونوں جگہ پر عورت کی گھر میں زیادہ، مرد کی باہر زیادہ، باہر کی جگہ پر اختلاط کی صورت میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے اسلام میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے اگر اس کی پابندی نہ کی گئی تو کلنٹن کے واقعے کی طرح سب ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ عورت کے گھر سے باہر آنے کے سلسلے میں جو چیز مجھے متاثر کرتی ہے وہ دنیائے اسلام میں ساری دنیا میں عورتوں کی اکثریت باہر بھی کام کرتی ہے جہاں تک اختلاط کا تعلق ہے تو وہاں مغرب کی اندھا دھند تقلید ہمیں تو تباہی کے راستے پر ڈال دے گی اور اس وقت تک مغرب خود سیدھے راستے پر آچکا ہوگا میرے سامنے اس وقت مغرب میں رونما ہونے والے دو واقعات ہیں ایک تو کلنٹن کا واقعہ ہے دنیا کی واحد سپر پاور کے واحد سپر مین کے دفتر میں اختلاط کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ تو صرف ایک دفتر ہے اگر ساری دنیا کے دفاتر اور ان میں کام کرنے والی لڑکیوں کی تعداد سامنے رکھی جائے تو عقل مندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

سوال: ہر باپ کی طرح اپنے بچوں کے لیے آپ نے جو خواب دیکھے تھے، کیا وہ پورے ہوئے؟

جسٹس ظلہ: آدھے سے زیاد پورے ہوئے۔

سوال: ہماری سیاست میں جاگیرداروں اور سرداروں کے بارے میں ایک منفی تاثر ہے بعض سیاستدان بھی یہ کہتے ہیں، کیا آپ اس منفی تاثر سے متفق ہیں؟

جسٹس ظلہ: ہمیں معاشرے میں نئے جاگیردار طبقہ کو پہچاننا ہوگا اب میڈیا اور سرمایہ دار بھی جاگیرداری کا رویہ اپنا چکے ہیں۔

سوال: پاکستان کی موجودہ صورتحال کی ذمہ داری سیاستدانوں کے ساتھ سرکاری افسروں پر کس حد تک عائد ہوتی ہے؟

جسٹس ظلہ: جس صورتحال کا آپ نے ذکر کیا ہے میں اس سے مایوس نہیں ہوں تربیت اور جستجو کے مراحل ابھی ختم نہیں ہوئے سیاستدان بھی ہم میں سے ہی ہیں دونوں طبقوں میں اب بھی بے شمار ''رند'' موجود ہیں؟

سوال: کون سا بیوروکریٹ آپ کا آئیڈیل رہا؟

جسٹس ظلہ: چوہدری رشید احمد فیڈرل ایڈیشنل سیکرٹری پاپولیشن ڈویژن ابھی بقید حیات ہیں اور فلاح عامہ کے کام کر رہے ہیں۔ آریوں اور راجپوتوں کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

سوال: سیاست میں شمولیت کا خیال خاندانی دباؤ کی وجہ سے ہوا یا حالات کو تبدیل کرنے کے احساس رکھتے تھے؟

جسٹس ظلہ: جتنا تھوڑا عرصہ سیاست کی، اس کی وجہ خاندانی نہیں تھی اس کی وجہ تحریک پاکستان میں ڈوب کر کام کرنے کا تسلسل تھا۔ میں نے مسلم لیگی امیدواروں کے الیکشن کے دوران کام کیا تھا ان الیکشنوں میں میاں عبدالحق اور رانا عبدالمجید کی طرف میری ڈیوٹی تھی دیہاتی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھا تو سیاست میں آنے کی تحریک ہوئی تاکہ ان کی زندگی میں بہتری لائی جا سکے۔

سوال: کیا آپ کو بھٹو صاحب کے قریب آنے کا اتفاق ہوا؟

جسٹس ظلہ: میں بطور ایک جونیئر جج کے (40 سال کی عمر میں جج بن گیا تھا) ایک بڑے کیس اور دو چھوٹے کیسوں کی وجہ سے بدقسمتی سے بھٹو صاحب کے نوٹس میں آ گیا ضیاء الرحمٰن، ظہور الٰہی بینک کیس اور عاصمہ جہانگیر (ملک جیلانی) کیس کی وجہ سے یہ معاملہ ہوا۔

سوال: سقوط مشرقی پاکستان کی خبر آپ نے کب اور کہاں سنی اور اس وقت آپ کے کیا احساسات تھے؟

جسٹس ظلہ: لاہور میں خبر سنی، 67 سے 70 فیصد تک کے واقعات سے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا پھر بھی اس دن دھاڑے مار کر رویا اب اس واقعہ پر اتنا افسوس نہیں ہوتا کیونکہ بنگلہ دیش کے لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور خود بھی ایک طاقت بن چکے ہیں شاید دو آزاد ریاستوں کے درمیان تعلقات زیادہ دیرپا ہوں گے۔

سوال: کیا فوج کا سیاسی کردار ہونا چاہیے؟

جسٹس ظلہ: نصف صدی سے مجبوری میں فوج کا کردار رہا ہے آئندہ نصف صدی میں بھی اس کا امکان ہے لیکن خواہش یہ ہے کہ فوج کا سیاسی کردار ختم ہونا چاہیے۔ جب کسی معاملہ پر دو رائے نہ رہیں اور یہ معاملہ آ جائے کہ مملکت کے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں رہا تو پھر فوج کا کردار نظر آتا ہے یہ

صرف پاکستان میں ہی نہیں دنیا کے کسی بھی مضبوط ترین ملک میں یہ صورتحال پیدا ہوسکتی ہے۔

سوال: آپ کو دنیا کے کن سیاست دانوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیا خوبیاں آپ کو ان کے اندر نظر آئیں؟

جسٹس خلہ: قائداعظم اور چرچل۔

سوال: کوئی ایسا لمحہ آیا جب پروٹوکول کی پابندیوں سے اکتاہٹ محسوس ہوئی؟

جسٹس خلہ: اکثر لیکن جب مجھے موت کی دھمکیاں دی گئیں تو وزیر داخلہ چوہدری شجاعت کے کہنے پر مجبوراً حفاظتی دستہ ساتھ رکھنا پڑا۔

سوال: تہجد گزاری کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟

جسٹس خلہ: یہ تاثر غلط ہے کہ میں تہجد گزار ہوں۔ میں دیر سے سونے کا عادی ہوں صبح کی نماز کے لیے اٹھوں تو کبھی کبھار نماز سے پہلے تہجد پڑھ لیتا ہوں۔

سوال: کیا آپ پیری مریدی پر اعتبار رکھتے ہیں، آپ کا مرشد کون ہے؟

جسٹس خلہ: ہاں! میں عقیدتاً پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف کا قائل ہوں لیکن بیعت کی تو وہ انتقال فرما چکے تھے اس لیے ان کے فرزند حضرت بابو جی سے بیعت کی اس وقت میری عمر 20 سال کے قریب تھی بعد میں بابو جی سے دوستی ہوگئی تھی۔

سوال: اسلامی تاریخ کے کن تین واقعات نے آپ کو متاثر کیا؟

جسٹس خلہ: (۱) خاتون سے بدسلوکی پر اسلامی حکومت کا محمد بن قاسم کی صورت میں حرکت میں آنا (۲) اندلس میں نئی تہذیب کا احیاء (۳) مغرب اور امریکہ میں اس زمانے میں مسلمانوں کا اپنے تشخص کا دفاع۔

سوال: استخارہ سنت نبوی ہے اکثر مسلمان آزمائش کے وقت اس پر عمل کرتے ہیں اس سلسلہ میں اپنا کوئی تجربہ بتائیں؟

جسٹس خلہ: میں نے کبھی استخارہ نہیں کیا البتہ آزمائش کے وقت غار کی دعا کے ساتھ خاص دعا اور کبھی سجدے میں دعا مانگ لیتا ہوں آنکھیں بند کر کے بھی دعا کرتا ہوں۔

سوال: آپ کی نظر میں اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ کیا ہے؟

جسٹس خلہ: سماجی انصاف میں ایکٹوازم (تحرک)۔

سوال: ہم نے سنا ہے کہ آپ بیرونی دوروں پر کھانا کھاتے ہوئے حرام اور حلال گوشت کا خاص خیال رکھتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: ہاں لیکن کبھی کبھی ناکامی کی صورت میں جز بز بھی نہیں ہوا۔

سوال: نماز پڑھتے ہوئے سب سے زیادہ سکون کہاں اور کیوں محسوس ہوا؟

جسٹس ظلہ: نماز کے اندر اور نماز کے اختتام پر سجدے پر سکون محسوس کرتا ہوں اور مسجد نبوی میں استون حنانہ کی جگہ پر نفل کی ادائیگی میں، یہ جگہ حضرت بابو جی پیر صاحب آف گولڑہ شریف کے ساتھ پہلے حج کے دوران، انہوں نے ہاتھ لگا کر بتائی تھی۔

سوال: صبح نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

جسٹس ظلہ: نماز کے بعد دیر تک سونا۔

سوال: کسی برائی کو روکنے کی کوشش میں ناکام رہنا بہتر ہے یا ناکامی سے مایوس ہو کر اس برائی میں شامل ہونا؟

جسٹس ظلہ: انسان کو برائی روکنے کی بھر پور کوشش کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ اس کا بھرم ضرور رکھ لیتا ہے۔

سوال: اقتدار ذمہ داری ہے، نعمت ہے یا امتحان ہے؟

جسٹس ظلہ: اقتدار پہلے نعمت ہوا کرتا تھا اب امتحان ہے جب تقلید اور تنقید کرنے والے شرمندگی اور خوف محسوس نہ کرے اور انسان خود بخود اقتدار سے علیحدگی کے لیے تیار نہ ہو جائے۔

سوال: آپ کن لمحات میں سب سے زیادہ آسودگی یا اطمینان محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: سجدہ اور گہری نیند میں۔

سوال: زندگی کا سب سے مشکل اور صبر آزما واقعہ؟

جسٹس ظلہ: جب چیف جسٹس بن گیا تو پہلے سے سوچے ہوئے تین مراحلی پروگرام پر عمل کی ناکامی کا خوف، پہلا سپریم کورٹ میں التواء شدہ کاموں کو نمٹانا جون 1991ء تک، باقی ڈیڑھ سال میں انسانی حقوق بذریعہ عوامی مفاد کی کونسل کے ذریعے رواج دینا اور آخری تین ہفتوں میں ملک کو الجھائے ہوئے سیاسی مقدمات سے نجات دلوانا۔

سوال: مشکل میں آپ کس سے مشورے کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: گھریلو معاملات میں بیوی اور عدالتی کاموں میں رفقائے کار سے۔

سوال: زندگی میں سب سے زیادہ خوف کب کیا؟

جسٹس ظلہ: حادثاتی موت کا خوف لیکن عمومی طور پر موت سے لگاؤ ہے۔

سوال: آپ آخری بار کب روئے، کتنی دیر روئے؟ کیا موقع تھا؟

جسٹس ظلہ: میں رقیق القلب ہوں اور جذباتی ہوں اس لیے ہر جذباتی موقع پر رونا آ جاتا ہے۔اسی سال کسی چھوٹے معاملے پر (نہ بتانے کی معذرت) بڑا رونا آیا۔

سوال: کس قسم کے واقعات خوشی کا باعث بنتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: جو امن کی طرف ہوں۔

سوال: ندامت اور پشیمانی کب محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: جب بھی ناکامی ہو لیکن زیادہ دیر نہیں؟ پھر کوشش میں لگ جاتا ہوں۔

سوال: زندگی کا سب سے غم ناک لمحہ کون سا تھا؟

جسٹس ظلہ: جب مشرقی پاکستان الگ ہوا۔

سوال: بھاری ذمہ داریوں کے دباؤ میں کبھی آپ کے دل میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے جائیں جہاں یہ سب مصروفیات اور پریشر نہ ہوں، کیا ایسی کوئی جگہ ہے؟

جسٹس ظلہ: کبھی نہیں، بلکہ مقناطیس کی طرح ذمہ داریوں کو اپنی طرف کھینچتا ہوں اور دوسروں کے معاملات بھی اپنے گلے ڈال لیتا ہوں۔

سوال: کامیابی میں قسمت کے قائل ہیں؟

جسٹس ظلہ: عجب فلسفہ زندگی بن گیا ہے کہ کام کرنا کسی کامیابی کے پیش خیمہ کے طور پر بھی قسمت کا حصہ سمجھتا ہوں اکثر روزمرہ کی زندگی میں جب ہر طرح کے مشکل کاموں کو گلے لگاتا ہوں تو لاشعوری طور پر اس کو اپنی قسمت سمجھتا ہوں اور شاید دوسروں کے لیے بھی مسئلہ تقدیر کا یہی حل ہو۔

سوال: دن میں کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں، باقی وقت میں کیا مشاغل رہتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: آج کل تو میں چونکہ فارغ رہتا ہوں اس لیے روزانہ کے مشاغل میں ٹی وی دیکھنا اور پڑھنا شامل ہے۔

سوال: اخبار بینی کی عادت کب سے ہوئی، کتنے اخبار پڑھتے ہیں اور کتنی دیر تک؟

جسٹس ظلہ: تحریک پاکستان کے دنوں میں لیکن عادت وکالت کے دنوں میں پڑی، بطور چیف جسٹس اخبارات کے تراشے دیکھتا تھا۔

سوال: کون سے صفحات زیادہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: صرف ملکی خبریں نہ کہ مقامی خبریں۔

سوال: ٹیلویژن میں ڈرامہ یا میوزک کے پروگرام دیکھتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: دونوں۔

سوال: کوئی خواہش جو وسائل کی کمی کے باعث پوری نہ ہوئی ہو۔

جسٹس ظلہ: اب تک میں نے اور میری بیوی نے تین چار فلاحی ادارے بنائے ہیں لیکن ایک بڑا فلاحی ادارہ بنانے کی خواہش ہے۔

سوال: پاکستان میں کون ساخطہ سب سے زیادہ پسند ہے؟

جسٹس ظلہ: مانسہرہ سے کاغان تک کا علاقہ۔

سوال: بیرون ملک آپ کی نظر میں کون ساخطہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے؟

جسٹس ظلہ: کشمیر جو دیکھا نہیں لیکن شریک حیات کی زبانی جو پتا چلا ہے کشمیر زیادہ خوبصورت ہے۔

سوال: کسی شخص سے ملتے وقت اس کی شخصیت اور کردار کو جانچنے کے لیے اس کی باتیں نوٹ کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: حرکات، چہرہ، خاص طور پر آنکھیں اور جسم کی حرکات، ان سب کا تجزیہ کرتا ہوں۔

سوال: بعض لوگ گفتگو کرتے ہوئے کوئی دلچسپ عادت اختیار کر لیتے ہیں کیا آپ کی بھی کوئی عادت ہے؟

جسٹس ظلہ: پہلے ٹانگ ہلانے کی عادت تھی لیکن تھوڑے عرصے کے بعد چھوڑ دی۔

سوال: آپ کی نظر میں انسانی زندگی کا اس کائنات میں سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟

جسٹس ظلہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کو خوش کرنا۔

سوال: کوئی واقعہ؟ جب آپ کو اپنے عمل پر پچھتاوا ہوا ہو۔

جسٹس ظلہ: کوئی ایسا واقعہ نہیں۔

سوال: کبھی ایسا بھی ہوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اصولوں پر کسی مصلحت کے باعث سمجھوتا کرنا پڑا؟

جسٹس ظلہ: شاید ہی عدالتی انتظامی معاملات میں کبھی ایسا ہوا ہو کیونکہ میں نے اپنے اہداف بہت اونچے رکھے تھے۔

سوال: زندگی میں کبھی بھوکا رہنے کا اتفاق ہوا؟

جسٹس ظلہ: روزے کے علاوہ کئی دفعہ کام میں مصروفیت پر کھانے کے بارے میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض ہوتا ہے؟

جسٹس ظلہ: اسلامی نقطہ نظر سے یہ غلط ہے اور ایک فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی غلط ہے۔

سوال: بعض لوگ ایسے مکروہ اور خوفناک فعل کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ انہیں ختم کر دیا جائے آپ کبھی اس تجربے سے گزرے ہیں؟

جسٹس ظلہ: عدالتی فیصلوں میں ایسا کرتا رہا ہوں لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ میں عدالتی عمل میں زندگی بچانے کی لاشعوری طور پر کوشش کرتا ہوں ایسا کیوں ہے مجھے خود علم نہیں۔

سوال: کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ آپ کے الفاظ سے کسی کی دل آزاری ہوئی اور آپ اپنے الفاظ پر بہت زیادہ نادم ہوئے ہوں؟

جسٹس ظلہ: میں فطرتاً برائی کرنے والے کو اس کے منہ پر برائی کا طعنہ دیتا ہوں غالباً اس کی غیر موجودگی میں اس عمل سے اجتناب غیبت سے بچاؤ کے لیے کرتا ہوں لیکن اس عمل میں کوتاہی ہو جائے تو اس پر بعد میں جان نکلتی ہے۔

سوال: اکتاہٹ اور بوریت کے لمحات کب آتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: جب کام منصوبہ کے مطابق ختم نہ ہو۔

سوال: آپ کے پاس کتنی بندوقیں ہیں؟

جسٹس ظلہ: دو، ان میں سے ایک Antique ہے۔ کافی عرصہ سے بیچنا چاہتا ہوں کوئی گاہک نہیں ملتا۔

سوال: سب سے لمبا شکار کب اور کہاں کھیلا؟

جسٹس ظلہ: ناکام شکار کھیلا۔

سوال: شکار کا سب سے دلچسپ واقعہ؟

جسٹس ظلہ: لاء کالج میں پڑھانے کے دوران اساتذہ کے گروپ کے درمیان دو دن اور دس بندوقوں کے ساتھ ایک خنزیر کا شکار کر سکے۔

سوال: کون سا جانور پسند ہے؟

جسٹس ظلہ: فاختہ اور گھوڑا۔

سوال: پسندیدہ موسم؟

جسٹس ظلہ: بہار سے دو تین ہفتے قبل۔

سوال: کون سا پرفیوم استعمال کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: پرفیوم پسند ہے جو مل جائے البتہ لیمن کی خوشبو ہو، وہ اچھا لگتا ہے۔

سوال: پھول؟

جسٹس ظلہ: گلاب کا پھول۔

سوال: مناظر قدرت...... پہاڑ، دریا، سمندر، جنگل، صحرا میں آپ کو کون سا منظر زیادہ حسین لگتا ہے؟

جسٹس ظلہ: سارے مناظر پسند ہیں۔

سوال: خوش لباسی کو قائم رکھنے میں آپ کی مدد کون سا درزی کرتا ہے؟

جسٹس ظلہ: پنڈی پرانا قلعہ میں ایک حاجی صاحب تھے صرف انہی سے سلواتا تھا اب فوت ہو چکے ہیں۔ ساری عمر انہی سے کپڑے سلوائے اور ایک حجام سے حجامت کروائی حجام فوت ہوئے تو ان کے شاگرد سے حجامت کروائی تو سر میں درد ہو گیا اور اب گزارا کر لیتا ہوں۔

سوال: پسندیدہ رنگ؟

جسٹس ظلہ: نیلا۔

سوال: کس قسم کی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: آج کل نہیں، کیونکہ سینما نہیں جاتا البتہ ٹی وی پر دیکھ لیتا ہوں ٹریجڈی پسند نہیں۔

سوال: جدید پاپ میوزک کیسی لگتی ہے؟

جسٹس ظلہ: نہیں سوائے چند ترانوں کے۔ ابھی وحید کا ایک ترانہ رات کو سنایا گیا بڑا پسند آیا عدنان سمیع کا دعائیہ ترانہ بھی پسند ہے۔

سوال: پسندیدہ موسیقار؟

جسٹس ظلہ: جس نے 65ء کے ترانوں کی دھنیں دیں۔

سوال: کوئی شعر یاد ہے؟

جسٹس ظلہ: مجھے شعر یاد ہے۔ اقبال کا جمہوریت پر شعر ۔

جموریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

سوال: ہنسی کن مواقع پر آتی ہے؟

جسٹس ظلہ: اچھے لطیفوں پر لیکن گندے لطیفوں پر چہرہ سخت کر لیتا ہوں۔

سوال: ریٹائرمنٹ کے بعد روزی کا کیا وسیلہ ہے، کیا ریٹائرمنٹ کے بعد سرکار نے مصلحت یا مشورہ کی فیس دی؟ سنا ہے آپ بڑے زمیندار ہیں کیا پنشن پر گزارا ہے یا کوئی اور ذریعہ معاش بھی ہے؟

جسٹس ظلہ: جج سے پہلے زمیندار تھا جج کے دوران تقریباً ساری زمین بیچ دی کچھ حصہ بہنوں کو دے دیا وکالت کے زمانے کے پیسے ختم ہو گئے ریٹائرمنٹ کے بعد چھوٹی سے کنسلٹنسی شروع کی جو جلد ہی ناکام ہو گئی فیوڈل لارڈ نہ کبھی تھا اور نہ اب ہوں، پنشن کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ حکومتی اداروں نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔ میں نے جتوئی، بے نظیر اور نواز شریف کے ساتھ کام کیا ان میں سے کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا کبھی انہوں نے میری آواز بھی نہیں سنی۔ سنا ہے اس وقت بھی احترام کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں آج کل میں اپنی لائبریری بیچ رہا ہوں اس میں کافی چیزیں بیچ چکا ہوں۔

سوال: ناول، جس سے آپ سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جسٹس ظلہ: فکشن پسند نہیں، البتہ مصری سوسائٹی کے حوالے سے ''رزپا'' ناول پسند آیا۔

سوال: آپ کی نظر میں دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت عمارت کون سی ہے؟

جسٹس ظلہ: ساری خوبصورت عمارتیں نہیں دیکھیں لیکن مسجد نبوی موجودہ شکل میں بہت خوبصورت ہے۔

سوال: پسندیدہ مصور؟

جسٹس ظلہ:: صادقین۔

سوال: قیام پاکستان کو 50 سال ہو چکے ہیں کیا ہم ایک کامیاب ملک ثابت ہوئے ہیں؟ ہمارا مستقبل کیا ہمارے ماضی اور حال سے مختلف ہو سکتا ہے؟ آپ کیا جانتے ہیں؟

جسٹس ظلہ: یہ سوال مفروضے پر مبنی ہے پچاس سال نئی قوموں کی زندگی میں ترقی کا عرصہ تصور ہوتا ہے اور یہ عرصہ کامیابی کے لیے کافی نہیں ہوتا بالخصوص خواندگی کے سلسلے میں، خاص کر جب اس ملک میں چار مارشل لاء لگ چکے ہیں اور چار جنگیں ہو چکی ہیں۔ چوتھی جنگ آج کل سیاچن اور لائن آف کنٹرول پر لڑی جا رہی ہے۔ اس ملک کی آدھی زندگی مارشل لاء میں گزری اور اسی لیے آدھا ملک ہم سے الگ ہوا۔ ازلی دشمن ہمیشہ تاک میں رہا۔ روس امریکہ یورپ ہمیشہ مخالف رہے۔ اس کے علاوہ ساری دنیا میں بحران رہے سب ممالک مسائل کا شکار رہے اس دوران ثقافتی تنازعات ابھرے تہذیبوں کے ٹکراؤ کی بات ہوئی ایسی صورتوں میں قوم کتنی مضبوط بھی ہو اس میں کمزوری آئے گی۔ روس جیسا ملک بھی 1917ء کی شکست کے بعد اتنی مایوسی کا شکار ہوا کہ انقلاب آ گیا ہمیں اس سوال میں مفروضوں کو اچھالنا فائدہ مند نہیں اس سے انارکی پھیل سکتی ہے جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے پنجابی ضرب المثل ہے گرے بیروں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میڈیا کے لیے خدا کے واسطے ایک ٹیسٹ کا مشورہ دیتا ہوں واقعات کو میگا کمپیوٹر میں ڈالیں اور اس سے جواب پوچھیں کہ ایسے ملک کے استحکام اور معیشت کی

کیا کیفیت ہے تو جواب ملے گا کہ ملک غائب ہو چکا ہوگا۔ ہمارا ملک ابھی بھی قائم ہے اور ہم اس وقت دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت ہیں ہماری فوج دنیا میں اول نمبر کی افواج میں آج بھی گنی جاتی ہے بھارت میں آج بھی ہماری فوج کا خوف پایا جاتا ہے۔

انٹرویو: اگست، 1998ء

مقام: علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

حوالۂ اشاعت: 13 ستمبر، 1998ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان
جسٹس (ر) محمد حلیم

سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جسٹس (ر) محمد حلیم پاکستان کی عدالتی تاریخ کے مشہور ترین مقدمے ''بھٹو کیس'' کے فیصلے سے اختلاف کرنے والے ججوں میں شامل تھے۔ بعدازاں وہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہی چیف جسٹس آف پاکستان بھی بنے۔ پی سی او کے تحت حلف بھی اٹھایا اور فوجی حکومت کے خلاف فیصلے دیتے رہے۔ جسٹس (ر) حلیم ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں روز و شب کے ہنگاموں سے دور خاموش زندگی گزار رہے ہیں اور کراچی کی شاہراہ فیصل سے ایک فرلانگ دور وہ اپنے اکلوتے بیٹے اوران کے خاندان کے ساتھ بیتے دنوں کی یاد میں زندگی گزار رہے ہیں۔

جسٹس (ر) حلیم برصغیر پاک وہند کی تین نسلوں کی روایات کے امین ہیں ان کا خاندان تین نسلوں سے ہی پیشہ وکالت سے منسلک ہے۔ ان کے دادا محمد نسیم لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے اوران کی وسیع وعریض محل نمار ہائش گاہ ''ڈلی باغ'' کا ذکر کئی انگریز مصنفین نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ جسٹس (ر) حلیم کے والد محمد نسیم بھی لکھنؤ کے نامور وکلاء میں سے تھے۔ وہ قائداعظم کے ساتھ کئی مقدمات میں عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے رہے۔ شاید اسی قربت اور ان کی قابلیت کی وجہ سے قائداعظم نے انہیں پاکستان کا پہلا اٹارنی جنرل بنادیا لیکن وہ جوانی میں ہی وفات پاگئے اور جسٹس (ر) حلیم کی تعلیم وتربیت اپنے دادا کی زیر پرستی ہی ہوئی۔

جسٹس (ر) حلیم نے بھٹو کیس میں اختلافی فیصلہ لکھا اور وہ اب بھی اپنے اس فیصلے کو درست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھٹو کے خلاف مقدمے میں شہادت ناکافی تھی مگر دوسری طرف وہ بھٹو کی پھانسی کو ''عدالتی قتل'' قرار دینے سے بھی کتراتے ہیں۔ جسٹس حلیم محتاط گفتگو اور لکھنوی رکھ کھاؤ کے مالک ہیں۔ ان سے ملاقات میں بھٹو کیس کے علاوہ، عدلیہ کا کردار، پاکستان کے حالات اور دیگر امور زیر بحث آئے، آیئے اُن سے ملاقات کریں۔

اہم نکات

☆ بھٹو کی پھانسی سے مطمئن نہیں تھا۔ ان کے خلاف شہادت نہیں تھی۔
☆ اللہ ہی چاہے تو جج سیاست سے الگ رہ سکتا ہے۔
☆ سابق وزیراعظم بےنظیر نے بیرون ملک چلنے کے لیے کہا تو انکار کرتے ہوئے اچھا نہ لگا۔
☆ جج کی سوشل لائف نہیں ہونی چاہیے، انہیں شادیوں میں بھی نہیں جانا چاہیے۔
☆ چیف جسٹس کے بیٹے کی مداخلت بند کرانے پر میرے والد کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ درج ہوا۔
☆ میرے دادا جج بننا چاہتے تھے۔ جوڈیشل کمشنر کی روکھی باتوں کے بعد وکالت شروع کر دی۔
☆ ہمارے ہاں کون سی آزادی ہے، کون سے بنیادی حقوق محفوظ ہیں؟ انگریز کا دور بہتر تھا، ہر کوئی اپنے گھر میں محفوظ تھا۔
☆ جو آرام اور سکون لکھنؤ میں تھا، یہاں نہیں ملا۔ بھارت میں جو کچھ چھوڑا، اس کا کبھی کلیم داخل نہیں کیا۔
☆ والد کا بہت ادب کرتا تھا، ان کے سامنے سگریٹ پینے کی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔
☆ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا دادا کے اصرار پر وکالت پڑھی۔ بیگم نے مجھ سے کبھی تکرار نہیں کی۔
☆ میرے والد قائداعظم کے حکم پر پاکستان کے پہلے اٹارنی جنرل بنے۔
☆ ضیاء الحق بہت عزت کرتے تھے، انہوں نے میرٹ پر میری تقرری کی۔
☆ تحریک پاکستان کے دوران پاکستان آنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔
☆ میرے دادا نے کھمبے کی روشنی میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کی۔
☆ میرے آئیڈل جج جسٹس حمودالرحمٰن ہیں، شریعت کے بہت بڑے عالم تھے۔
☆ میں نے ضیاء الحق کا دباؤ بھی قبول نہیں کیا۔

انٹرویو

سوال: اپنے دادا اور والد کے متعلق ہمیں تفصیلاً بتائیں کہ وہ کون تھے اور کیا کرتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے دادا محمد نسیم پیشہ قانون سے وابستہ تھے انہوں نے بہت سخت زندگی گزاری کیونکہ ان کی ذاتی جائیداد ختم ہو چکی تھی ان کے بڑے بھائی چودھری محمد یوسف نے انہیں تعلیم دلوائی۔ انہوں نے جتنی محنت اور مشکل سے انہیں تعلیم دلوائی اس کا اندازہ آج نہیں کر سکتے۔ بجلی نہ ہونے کے باعث انہوں نے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر رات کو پڑھائی کی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو آگے لانا چاہتا ہے اس کے لیے موافق حالات بھی خود پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ میرے دادا نے 1890ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا جس کے بعد انہوں نے جوڈیشل کمشنر سے بات کی وہ جج بننا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے میرے دادا سے ایسی روکھی باتیں کیں کہ ان کا دل ہٹ گیا پھر انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ وکالت کریں گے۔

سوال: اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دادا نے اس وقت پریکٹس کا فیصلہ کیا مگر اس وقت جو وکیل پریکٹس کر رہے تھے وہ معمولی نہیں تھے۔ اپنی محنت سے میرے دادا بھی اپنے لیے راستے بناتے ہوئے لکھنؤ کے بہت بڑے وکیل بن گئے ان کے پاس بہت کام ہوتا تھا۔ لیکن وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ انہیں مذہب سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ انہوں نے ہم سب کو تربیت دی۔ وہ میرے والد کے بعد فوت ہوئے۔ میرے والد 1904ء میں علی گڑھ سے بی کرنے کے بعد لندن گئے وہاں سے انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ 1908ء میں واپس آ کر 1909ء میں وکالت شروع کر دی میرے دادا تو چار برس میں ہی صف اول کے وکلاء میں شمار ہونے لگے تھے۔ لیکن والد نے وہ مقام حاصل کرنے کے لیے 8 برس لگائے۔ جب میرے والد نے وکالت میں نام بنا لیا تو پھر میرے دادا نے پریکٹس چھوڑ دی۔

سوال: آپ کو اپنے والد صاحب کے دور کا کوئی مشہور مقدمہ یاد ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے والد کے دور میں تو بہت مقدمے ہوئے لیکن ان کے خلاف سب سے بڑا مقدمہ توہین عدالت کا چلا تھا۔

سوال: کس بات پر توہین عدالت کا مقدمہ چلا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: میں اس بات کو بیان تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب چونکہ یہ تاریخ کا حصہ ہے اس لیے بتا دیتا ہوں۔ یہ 1932ء کی بات ہے ایک چیف جسٹس صاحب کے صاحبزادے مقدموں کے فیصلوں میں مداخلت کرتے تھے۔ کچھ وکیلوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ غلط کام ہو رہا ہے۔ اس پر ایک میٹنگ بھی ہوئی جس کے بعد لکھنؤ شہر میں یہ قصہ مشہور ہو گیا۔ بار کی میٹنگ میں میرے والد صاحب نے اس پر احتجاج کیا جس کی بنا پر ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ درج کیا گیا شوکاز نوٹس جاری ہوا۔ بعد میں چیف جسٹس سے تعلق کی ہی وجہ سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اتنی بڑی بات تھی اور زبردست تھی کہ اس دن سے ایسی چیز وہاں پر دکھائی نہیں دی۔ یہ خود ایک بڑا واقعہ ہے۔

سوال: آپ قائداعظم کے ساتھ اپنے والد کی پریکٹس کا ذکر کر رہے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: وہاں پر تعلقہ کے متعلق مقدمات ہوا کرتے تھے جس کی بہت زیادہ فیس لی جاتی تھی۔

سوال: تعلقہ کے مقدمات سے کیا مراد ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: جب اودھ میں زمین کی آبادکاری کا آغاز ہوا تو وہاں لوگوں (خصوصاً زمینداروں) کو بڑی بڑی زمینیں ملیں اس وقت اودھ سیٹل منٹ ایکٹ بنا تھا۔ اس میں تعلق دار کو سند ملا کرتی تھی اس سند میں لاء اینڈ آرڈر کو قائم رکھنے کے علاوہ اسے کئی دوسری ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں امن کے قیام کی ذمہ داری انہی لوگوں پر ڈالی گئی تھی۔ ہر وقت ان پر دباؤ رہتا تھا اسی وجہ سے وہاں کہیں بھی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ بڑی ریاستوں کو مال گزاری ملتی تھی۔ جو اس کے بدلے میں ان سے یہ کام لیا کرتی تھیں۔ جب تعلق داروں کے متعلق کیس ہوتا تھا تو اس میں بڑے بڑے وکیل پیش ہوتے تھے۔ یعنی موتی لعل نہرو اور جناح صاحب بھی پیش ہوتے تھے۔ میرے والد اور دادا نے بھی یہ مقدمے لڑے ہیں۔ 1942ء یا 1943ء میں نواب آف بھوپال کے وقت کے ایک کیس میں قائداعظم اور میرے والد تین چار ماہ ساتھ رہے تو ان کے آپس میں دوستانہ تعلقات تھے۔

سوال: قائداعظم آپ کے گھر بھی آتے رہے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: قائداعظم ہمارے گھر میسوری میں تو آئے تھے لیکن لکھنؤ میں نہیں۔

سوال: لکھنؤ کے حوالے سے یہ مشہور ہے کہ وہاں ایک خاص کلچر ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: جی ہاں وہاں پر واقعی بہت اچھا کلچر تھا جو کچھ یہاں ہوتا ہے یہ سب وہاں نہیں تھا۔

سوال: تقسیم ہند سے لکھنؤ کے کلچر پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

جسٹس (ر) حلیم: تقسیم سے سب کچھ بگڑ گیا اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

سوال: آپ لوگ بھی متاثر ہوئے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہمارا تو خاندان ہی ختم ہو گیا۔ ہمارے والد صاحب اور ہم لوگ یہاں آئے تھے باقی سب لوگ وہیں رہ گئے۔

سوال: کبھی اپنے خاندان کے لوگوں سے ملاقات ہوئی؟

جسٹس (ر) حلیم: جی ہاں میں کئی دفعہ گیا ہوں۔

سوال: ان کے مالی حالات اب کیسے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: پروفیسر عرفان حبیب جو کہ وہاں بہت مشہور شخصیت ہیں وہ میرے چچا حبیب صاحب کے لڑکے ہیں اس حوالے سے ان کے مالی حالات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

سوال: بعد میں ان سے آپ نے رشتے داریاں بھی کیں؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں ہمارا خاندان بہت چھوٹا ہے میرا ابھی ایک بیٹا ہے اور اس کا بھی ایک ہی بیٹا ہے۔

سوال: آپ کے کتنے بہن بھائی تھے کیا وہ پاکستان نہیں آئے؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں میرے سب سے بڑے بھائی نے 1938ء میں آکسفورڈ سے بی سی ایل کیا تھا اس وقت ہندوستان میں صرف سات بی سی ایل تھے۔ وہ آٹھویں بی سی ایل تھے بعد میں انہوں نے وکالت تو نہیں کی البتہ یونیورسٹی میں پڑھایا مجھے بھی انہوں نے پڑھایا۔ ان کا نام محمد شمیم ہے۔ ان سے چھوٹے بھائی کمانڈر فہیم 1939ء میں نیوی کے ٹرائل میں منتخب ہوئے تھے۔ وہ برٹش نیوی میں کیڈٹ رہے بعد میں وہاں ان کا کمیشن ہوا۔ تقسیم کے بعد وہ یہاں آ گئے بعد ازاں وہ ریٹائر ہو گئے۔ میرے تیسرے بھائی امین ہیں جن کے ساتھ میرا بڑا ملنا جلنا رہا ان کی اور میری عمر میں ایک سال دس ماہ کا فرق تھا ہم ایک ہی سکول میں پڑھے ان کے انتقال کا غم جتنا مجھے ہے شاید کوئی دوسرا اس کا اندازہ نہ لگا سکے۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا میں نے بی ایس سی کیا۔

سوال: آپ پاکستان کب آئے؟

جسٹس (ر) حلیم: پاکستان بننے کے بعد اپنے والد کے ساتھ 1947ء میں آیا۔

سوال: اس وقت کا کوئی واقعہ یاد ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے والد صاحب صبح کورٹ گئے شام کو جہاز میں پاکستان آ گئے۔ انہوں نے ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ میرے والد قائداعظم کے حکم پر پاکستان کے پہلے اٹارنی جنرل بنے اور اپنی وفات یعنی 1950ء تک اس عہدے پر رہے۔

سوال: کبھی یہ احساس تو نہیں ہوتا کہ پاکستان آ کر غلطی کی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر نظام کو بدلتا ہے یہ بھی اس کی رضا سے ہوا۔

سوال: یہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہاں آپ اچھے طریقے سے بسے ہوئے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: انگریز کے جانے کے بعد اس زمانے کی بات ہی کرنا بیکار ہے لیکن جو آرام اور سکون وہاں تھا وہ کہیں نہیں ملا۔

سوال: انگریز کا دور بہتر تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل بہتر تھا ہر کوئی اپنے گھر میں محفوظ تھا۔

سوال: کیا امن و امان آزادی کا نعم البدل ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: جناب کون سی آزادی ہے کون سے ہمارے بنیادی حقوق محفوظ ہیں۔

سوال: جب آپ انڈیا میں تھے اور پاکستان کے لیے تحریک چل رہی تھی اس وقت تو آپ نوجوان ہوں گے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں نوجوان تو تھا لیکن سیاست میں حصہ نہیں لیتا تھا۔

سوال: کبھی یہ خیال آیا؟ کہ پاکستان بن جائے تو ہم آپ پاکستان چلے جائیں گے۔

جسٹس (ر) حلیم: نہیں مجھے کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ والد صاحب سے بھی کبھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان کے ساتھ بے تکلفی تھی لیکن اس قسم کے سوال نہیں کرتا تھا کہ اب آپ کیا کریں گے۔ میں ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ ان کے سامنے سگریٹ پیتا تھا نہ ان کے پاس جاتا تھا۔

سوال: جب آپ پاکستان آئے تو اس وقت آپ کی کیا عمر ہوگی؟

جسٹس (ر) حلیم: 23 سال کے قریب ہوگی۔

سوال: بی ایس سی کے بعد آپ نے لاء کیسے کیا؟

جسٹس (ر) حلیم: میں پہلے میڈیکل میں جانے والا تھا میری سلیکشن نہ ہوئی تو میں نے سوچا کہ زوالوجی میں ڈاکٹریٹ کروں میں نے بی ایس سی کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا تھا مگر میرے دادا کا اصرار تھا کہ اس گھر میں قانون کا پیشہ اپنانا چاہیے اس لیے میں نے ایل ایل بی کیا۔

سوال: آپ کو کس مضمون سے زیادہ دلچسپی تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: زوالوجی سے۔

سوال: سائنس چھوڑ کر وکالت شروع کرنے پر آپ کو افسوس نہیں ہوا؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں دیکھیں جس کام میں اللہ کی مرضی ہوتی ہے، ہوتا تو وہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پیشے میں جتنا نوازا شاید میں کسی اور پیشے میں ہوتا تو یہ عزت مجھے نہ ملتی میں یہ بھی واضح کر دوں کہ مجھے صرف اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے ورنہ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا میں نے کراچی میں 23 سال پریکٹس کی۔

سوال: آپ نے کوئی کلیم داخل نہیں کیا؟

جسٹس (ر) حلیم: بھائی! کلیم بات نہ کریں۔ گورنمنٹ نے نقد رقم تو دی تھی جو خرچ ہو گئی۔

سوال: آخری بار آپ کب انڈیا گئے؟

جسٹس (ر) حلیم: 1987ء میں آخری بار گیا تھا۔ وہاں پر میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں گیا تھا۔ میں نے لکھنؤ میں دیکھا کہ سارا نظام ہی بدلا ہوا ہے نہ سڑکیں صحیح تھیں اور نہ جگہ کا پتہ چلتا تھا لوگوں کی بھیڑ اور گندگی اتنی زیادہ تھی کہ خدا کی پناہ وہاں میں تین دن رہا پھر میں واپس چلا آیا۔

سوال: اپنے خاندان کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے والد کے دو بھائی تھے پروفیسر حبیب، پروفیسر مجیب، میری والدہ کے پانچ بھائی تھے جمیل الزماں، خلیق الزماں، صبیح الزماں، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، سعید الزماں، معشوق الزماں میری والدہ کی ایک بہن تھی۔ میری والدہ کی والدہ میرے دادا کی سگی بہن تھی۔ میرے چچا کی اولاد وہیں رہ گئی۔ کمال حبیب صرف یہاں آئے تھے جو کہ بعد میں فوت ہو گئے عرفان حبیب وہاں کے بہت مشہور رائٹر ہیں میرے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں دو بھائی اور ایک بہن انتقال کر چکے ہیں۔

سوال: والدہ اور والد کے انتقال کے وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: اس وقت میرے احساسات ایسے ہی تھے جیسے کوئی انسان جنگل میں ہو اس کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ میری جائیداد تھی نہ بنک بیلنس۔ میں نے محنت کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے نوازا۔

سوال: اتنے جج پاکستان میں رہے ہیں کون سا جج آپ کا آئیڈیل تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: جسٹس حمودالرحمٰن صاحب میرے آئیڈیل ہیں۔

سوال: وہ کون سی خوبی تھی جس کی وجہ سے حمودالرحمٰن آپ کے آئیڈیل ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: ان کو شریعت کے بارے میں جتنا علم تھا کسی اور کو نہیں ہے۔ ان کے آرٹیکلز میرے پاس رکھے ہوئے ہیں آپ کو دکھاؤں تو آنکھیں کھل جائیں پھر ان کی قابلیت بھی قابل

رشک تھی میں نے تو ان کے سامنے پریکٹس کر کے دیکھا ہے اور میں نے انہی کو تو کاپی کیا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ بھٹو کے مقدمے میں آپ پر دباؤ پڑا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے اوپر کسی کا دباؤ نہیں تھا۔ یہ بالکل غلط ہے میں نے ضیاء الحق کا دباؤ قبول نہیں کیا اور کسی کا دباؤ مجھ پر کیا ہوتا۔ جب تک شہادت نہیں ہوگی اس وقت تک میں کسی کو پھانسی نہیں دوں گا۔ گواہی ہوگی تو میں چھوڑوں گا نہیں۔

سوال: کیا بھٹو کے مقدمے میں مؤثر شہادت نہیں تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں۔

سوال: آپ مطمئن تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں مطمئن نہیں تھا۔

سوال: تو پھر پھانسی کیوں دی گئی؟

جسٹس (ر) حلیم: میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

سوال: سیاسی وجوہات تھیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میں اس پر بات نہیں کروں گا۔

سوال: اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جوڈیشنل مرڈر تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا عدالت کا فیصلہ ہے میں کچھ نہیں کہوں گا۔

سوال: آپ کے مخالف کہتے ہیں کہ آپ نے صوبہ سندھ سے تعلق کی وجہ سے ایسا فیصلہ لکھا؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں میرا تعلق کسی سے نہیں تھا میری سوشل زندگی ہے نہ کسی سے کوئی تعلق۔

سوال: آپ کے خیال میں جج کی سوشل لائف نہیں ہونی چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں ہونی چاہیے۔

سوال: جج کو شادیوں میں نہیں جانا چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: کبھی نہیں جانا چاہیے۔

سوال: آپ بے نظیر بھٹو کے ساتھ امریکہ گئے کیا ایسا کرنا مناسب تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: یہ سوشل لائف کی بات نہیں ایسے تو میں دنیا بھر میں جاتا تھا لوگ اعتراض کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔

سوال: جج کو اخبار بھی پڑھنا چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: اخبار پڑھے کیوں نہ پڑھے اخبار۔

سوال: پہلے جج اخبار بھی نہیں پڑھتے تھے۔

جسٹس (ر) حلیم: اگر جج کا دماغ صحیح ہے تو پھر اخبار پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، جج کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔

سوال: جج سیاست سے کیسے دور رہ سکتا ہے کیا طریقہ ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: طریقہ کیا ہو سکتا ہے بس اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ہو سکتا ہے۔

سوال: جب آپ نے ضیاء الحق کا دباؤ قبول نہ کیا تو وہ ناراض نہ ہوئے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں ضیاء الحق مجھ سے ناراض نہیں تھے وہ میری بہت عزت کرتے تھے میں نے کسی کا دباؤ نہیں لیا۔ یہ سب بکواس ہے جو لوگ کر رہے ہیں یہاں کی سیاست بالکل بدل چکی ہے۔

سوال: ہر بچے کو اپنی ماں سے محبت ہوتی ہے سنا ہے پہلے زمانے میں بچوں کو اپنی ماؤں سے زیادہ محبت ہوتی تھی آپ کا کیا خیال ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میرے دادا کے زمانے میں ایسی تربیت ہوتی تھی کہ جس بچی کے سر پر دوپٹہ نہیں ہوتا تھا وہ اسے خود اوڑھا دیتے تھے اس کے علاوہ کوئی اور بات میں نہیں کروں گا۔ ہمارا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے میرے دادا اور والد نے کبھی نماز قضا نہ کی لیکن ہم بہت ادنی ہیں لیکن یہ کہ نماز اور کلام پاک پر ہمیں مکمل یقین ہے کہ اس کے بغیر ہم آگے نہیں جا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا مجھے نوازا ہے میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اللہ اس کو اتنا نہ نوازتا میں باہر کے ممالک میں جاتا تھا تو ایک سوٹ کیس لے کر جاتا تھا اور واپسی پر وہی سوٹ کیس ساتھ ہوتا تھا مجھ پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ ضیاء الحق نے میرٹ پر میری تقرری کی میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ میرے دادا نے 1944ء میں نصیحت کی کہ بیٹا! دنیا میں کسی کو کچھ بھی حاصل ہو جائے لیکن تمہارے خاندان میں اگر تم نماز نہیں پڑھو گے تو تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا میرے والد نے وفات سے ایک ہفتہ پہلے وصیت کی کہ بیٹا کلام پاک پڑھا کرو خواہ ایک سورت پڑھو لیکن روز پڑھو میں نے ان کے انتقال کے بعد شروع کیا اور اس کا جو مجھے پھل ملا یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اللہ نے مجھے کیا نعمتیں عطا کیں۔

سوال: قرآن کریم کی تعلیم آپ نے کب حاصل کی؟

جسٹس (ر) حلیم: بچپن میں۔

سوال: بچپن کی پہلی یاد آپ کے ذہن میں کیا ابھرتی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: بہت خوش و خرم فیملی تھی سائیکلوں پر اسکول جاتے تھے بارش ہو آندھی ہو

لیکن سائیکلوں پر گھومتے تھے چار چار میل کے فاصلے پر ہمارے امتحانی سینٹر ہوا کرتے تھے سائیکلوں پر امتحان دینے جاتے تھے ہمارے گھر میں تین تین موٹر کاریں تھیں لیکن اس کے باوجود ہمیں سائیکل پر اسکول جانا پڑتا تھا موٹریں لڑکیوں کے لیے تھیں۔

سوال: آپ کے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دلوائی جاتی تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: جی بالکل میری بہن لندن سکول آف اکنامکس کی پڑھی ہوئی ہیں۔

سوال: بچپن میں آپ کا آئیڈیل کون تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: دادا کا کردار میں نے زندگی میں دیکھا ہے جس سے میں متاثر ہوا ہوں۔

سوال: بچپن کی کوئی یاد؟

جسٹس (ر) حلیم: (مسکراتے ہوئے) نہیں بھئی وہ نہ پوچھیں۔

سوال: یادوں میں لوگوں کی بڑی دلچسپی ہوتی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں بچپن میں شرارتی تو تھا لیکن میں بچ جاتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کو پٹوا دیتا تھا۔

سوال: آپ کی شرارتوں میں بغاوت تو نہیں ہوتی تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل نہیں صرف شرارت کی حد تک تھا۔ میں اپنے والد کا قصہ بتاتا ہوں کہ جس وقت میرے والد بیرون ملک سے گھر آئے تو چھ مہینے میرے دادا نے ان کو سپورٹ کیا یعنی 100 روپے ماہوار ان کو دیتے تھے میری والدہ کہتی ہیں کہ میرا وقت بہت مشکل سے گزرتا تھا چھ مہینے بعد انہوں نے اپنے مینجر سے کہا کہ اب ان کو جو پیسے دو تو قرض کی صورت میں دو لیکن میرے والد نے کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی وہ اپنے باپ کو بے انتہا چاہتے تھے جس کی کوئی حد نہیں، یہ تھا ہمارے گھر کا ڈسپلن اور یہ وکالت کی خاص چیز تھی جس سے انسان میں آزادی پیدا ہوتی تھی۔

سوال: پھر تو آپ کو والد کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا؟

جسٹس (ر) حلیم: جو مشکلات میں نے دیکھی ہیں وہ میں ہی جانتا ہوں میں اب اس کا کیا ذکر کروں۔

سوال: بچپن میں آپ کا پسندیدہ مشغلہ کیا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم لوگ فٹ بال، ٹینس، کرکٹ، گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلتے تھے۔

سوال: اس زمانے میں آپ کی کوئی پسندیدہ کتاب تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: پڑھی بہت ہیں لیکن اب یاد نہیں۔

سوال: کوئی آئیڈیل فنکار ہو؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم لوگ گانے والے کے قریب بھی نہیں جانتے تھے۔

سوال: کھلاڑی؟

جسٹس (ر) حلیم: بریڈمین۔

سوال: کوئی پسندیدہ شاعر یا ادیب؟

جسٹس (ر) حلیم: غالب۔

سوال: بچپن میں کیا بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: ڈاکٹر بننے کا۔

سوال: آپ نے اپنے بچے کو اس کی مرضی کا شعبہ منتخب کرنے دیا کہ اس پر دباؤ ڈالا کہ وکالت کرو؟

جسٹس (ر) حلیم: میں نے اس کو کھلی آزادی دی لیکن یہ ضرور بتایا کہ وکالت ہمارا خاندانی شعبہ ہے اب کیا اس کا مستقبل ہوگا یہ تو مجھے نہیں پتا؟

سوال: آپ اپنے بچے کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: بچہ تو بہت قابل ہے لیکن میری وجہ سے اس کو دھکے لگ رہے ہیں اس لیے کہ میں چیف جسٹس رہا ہوں تو اس کے اثرات تو آپ لوگ سمجھتے ہیں۔

سوال: اس کے فوائد بھی تو ہوتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ نقصان ضرور ہوا ہے۔

سوال: بچپن میں کتنے دوست تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: کافی تھے لیکن اب ان سے کوئی مراسم نہیں۔

سوال: طالب علمی کے زمانے میں آپ کو کتنا جیب خرچ ملتا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: پانچ روپے۔

سوال: گزارا ہو جاتا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: (ہنستے ہوئے) اس وقت تین آنے میں سگریٹ کا پیکٹ ملتا تھا۔

سوال: سگریٹ اس زمانے میں بھی پیتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں سگریٹ میٹرک سے پیتا ہوں لیکن باپ کے سامنے نہیں پیتا تھا معلوم نہیں کہ ان کو پتہ تھا یا نہیں؟

سوال: تمام انسان برابر تو نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی کو امیر بنایا کسی کو غریب بنایا اس بارے میں آپ کے کیا احساسات ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: دیکھیے ایک چیز میرے والد نے مجھے بتائی کہ کسی کے سامنے ہاتھ مت پھیلاؤ۔

سوال: امیر غریب کے فرق میں آپ کیا محسوس کرتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہمارے ہاں اس قسم کی چیزیں اس زمانے میں نہیں تھیں ایک دوسرے کو سپورٹ کرتے تھے۔ میرے والد نے کئی آئی سی ایس کے لوگوں کو سپورٹ کیا۔

سوال: آپ والدہ سے زیادہ قربت محسوس کرتے تھے یا والد سے؟

جسٹس (ر) حلیم: والدہ نے مجھے پڑھایا والدہ ہی نے میری تربیت کی ہے والد کو تو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا دن بھر اتنا مصروف رہتے تھے۔

سوال: بھائی بہنوں میں اکثر نوک جھونک چلتی رہتی ہے آپ کی کس بات پر ہوتی تھی؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم میں بہت لڑائیاں ہوتی تھیں چھوٹی موٹی باتوں پر ہوا کرتی تھیں۔

سوال: پسندیدہ مضمون لاء ہی رہا؟

جسٹس (ر) حلیم: جی ہاں۔

سوال: بچپن کے کوئی استاد یاد ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: جی ہاں ایک استاد جو مجھ سے بہت محبت کیا کرتے تھے وہ جسٹس نصرت کے سسر پروفیسر رسول احمد دہلوی تھے۔

سوال: کالج میں کبھی کسی ڈرامے یا اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں...... بالکل نہیں۔

سوال: کبھی ماں باپ اور استاد سے مار بھی پڑی؟

جسٹس (ر) حلیم: مار اتنی پڑی جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ مولوی صاحب آتے تھے مرغا بنا دیتے تھے پیشاب تک نکل جاتا تھا۔

سوال: ہاسٹل میں بھی کبھی رہے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہاسٹل میں رہا ہوں وہاں بہت عمدہ کھانا کھایا اچھا ماحول ملا اور اچھی زندگی گزاری۔

سوال: آپ کبھی قائد اعظم سے ملے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

سوال: سب سے خوبصورت عورت آپ نے کب دیکھی؟

جسٹس (ر) حلیم: بچپن میں اپنی خالہ کی لڑکی کو، جو میری بیوی ہے۔

سوال: محبت بڑا فطری سا عمل ہے آپ کبھی اس سے گزرے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میں ان عادتوں سے بچا ہوا ہوں۔

سوال: دوستوں کو کس معیار پر پرکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: جس سے اپنی عادت ملتی ہو۔

سوال: فلمیں دیکھتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہاں ہاں دیکھتا تھا۔

سوال: کس قسم کی فلمیں دیکھنا پسند کرتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: انگلش فلمیں دیکھتا تھا۔

سوال: دوستوں میں اکثر اختلاف ہو جاتا ہے آپ کا کس بات پر اختلاف ہوتا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: ہمارا کسی سے کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔

سوال: آپ تنہائی پسند تھے یا رونق پسند؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل تنہائی پسند۔

سوال: مخلوط تعلیم تو حاصل نہیں کی؟

جسٹس (ر) حلیم: لکھنؤ یونیورسٹی میں مخلوط نظام تعلیم تھا۔

سوال: مخلوط تعلیم ہونی چاہیے یہاں؟

جسٹس (ر) حلیم: مخلوط تعلیم ہونی چاہیے یا نہیں یہ تو دینی مسئلہ ہے لیکن میں نے وہاں اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔

سوال: جب آپ پہلی دفعہ مغرب گئے تو پاکستان اور وہاں کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟

جسٹس (ر) حلیم: بہت فرق محسوس ہوا جب پاکستان آئے تو بہت خیال آتا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کا خیال نہیں اور ہم ترقی پذیر ہیں۔

سوال: مغرب میں اخلاقیات ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: مغرب میں ہے یہاں تو ایک کے پیچھے ایک لگا ہوا ہے یہاں تو لوگ دیوار پھاند کر گھر میں گھس جاتے ہیں۔

سوال: ہمارے ہاں اتنی تعلیم ہے اس کے باوجود ایسا کیوں ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ گھر میں ماں باپ اپنی اولاد کو صحیح تعلیم نہیں دیتے عزت کرنا نہیں سکھاتے۔

سوال: عورت کو نظر کا پردہ کرنا چاہیے یا مکمل؟

جسٹس (ر) حلیم: انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کو اپنی نظر نیچی رکھنی چاہیے۔

سوال: شادی ماں باپ کی مرضی سے ہونی چاہیے یا پسند کی؟

جسٹس (ر) حلیم: یہ چیز لڑکی کے اوپر ہے میری شادی والدین کی پسند سے ہوئی تھی البتہ مجھ سے پوچھا گیا تھا۔

سوال: جہیز کی رسم ہونی چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں لیکن والدین اپنی لڑکی کو جو کچھ دینا چاہیں وہ دے دیں جائیداد میں شرع کے مطابق لڑکی کو حصہ دینا چاہیے۔

سوال: بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر مشاغل میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹاتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: بیگم صاحبہ نے جو کچھ میرے ساتھ رہ کر جھیلا ہے وہ کوئی اور نہیں برداشت کرسکتا میں زندگی کے متعلق کچھ واقعات بتاتا ہوں کہ جس وقت میں نے پریکٹس کا آغاز کیا تھا تو اس وقت گھر میں پیسے نہیں ہوتے تھے تب بھی گھر کا خرچ چل رہا تھا انہوں نے مجھے زندگی میں بہت سپورٹ کیا کبھی مجھ سے کسی بات پر تکرار نہیں کی۔

سوال: بیٹا جوان ہوگیا اکثر بیٹوں کو آزادی کے سوال پر والدین سے اختلاف رہتا ہے کبھی آپ کا بیٹے سے اس بات پر جھگڑا ہوا؟

جسٹس (ر) حلیم: اپنے بیٹے سے میرا تعلق دوستانہ ہے۔ میرے دو بیٹے تھے ایک فوت ہوگیا جس کا مجھے آج تک دکھ ہے وہ بہت حسین بچہ تھا دوسرے بیٹے کو مکمل آزادی دی کبھی بچپن میں پیسے نہیں مانگے ایک دفعہ جب یہ سکول میں پڑھتا تھا تو دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے کا پروگرام بنالیا میں جج تھا اور کسی کام سے کوئٹہ جارہا تھا جانے سے پہلے میں نے اس کی جیب میں دس روپے رکھ دیئے اس کو نہیں پتہ تھا جب یہ لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو بل زیادہ آیا کسی کے پاس نہیں تھے تو ہوٹل والا ان سب سے برتن صاف کروانے والا تھا اتفاق سے اس کی جیب سے وہ دس روپے نکلے تب وہ بل پورا ہوا۔

سوال: کھانا بیگم صاحب کے ہاتھ کا پسند ہے؟ کسی خاص کھانے کی فرمائش کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: بیگم صاحبہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں لیکن صحت کی وجہ سے پکا نہیں سکتیں

کھانوں کی فرمائش نہیں کرتا سب کچھ کھالیتا ہوں۔

سوال: کبھی خود بھی کھانا پکایا؟

جسٹس (ر) حلیم: قیمہ اور سالن پکا لیتا ہوں۔

سوال: علم نجوم سے دلچسپی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: یہ سب شرع کے خلاف باتیں ہیں۔

سوال: کبھی کسی نے آپ کی قسمت کا حال بتایا ہو یا کسی نے آپ کا سٹار معلوم کیا ہو؟

جسٹس (ر) حلیم: میں چھٹیوں میں میسوری جایا کرتا تھا بھارتی پنجاب سے سکھ بھی وہاں جاتے تھے جو کہ وہاں پر ہاتھ وغیرہ دیکھتے تھے اور بہت کم پیسوں میں دیکھتے تھے ایک صاحب نے دیکھ کر بتایا کہ آپ سفر بہت کریں گے تب میں سوچنے لگا کہ میں رہتا یہاں ہوں سفر کہاں کروں گا اس وقت مجھے اس کی بات کی سمجھ نہ آئی یہاں آ کر واقعی میں نے بہت سفر کیا تاہم مجھے میرا اسٹار معلوم نہیں۔

سوال: میاں بیوی میں لڑائی تو ہوتی ہے آپ کی کس بات پر لڑائی ہوتی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: بغیر لڑائی کے محبت نہیں ہوتی البتہ کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا ہوگا وگرنہ ہم نہیں لڑتے۔

سوال: بیگم صاحبہ عام طور پر فرمائشیں کرتی ہوں گی؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں بالکل نہیں۔

سوال: شادی کی تاریخ یاد ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: 11 جون 1955ء

سوال: آپ کو مغربی کھانے پسند ہیں یا دیسی؟

جسٹس (ر) حلیم: مجھے مغربی کھانے پسند ہیں لیکن سب نہیں چند ایک مثلاً فلو اینڈ فش وغیرہ۔

سوال: آپ کی بیگم صاحبہ کی تعلیم کیا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: میٹرک۔

سوال: آپ کے ہاں پردہ ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہمارے گھر میں لڑکی ہی نہیں تو پردہ کیسا البتہ اس کے بارے میں قرآن کریم کی سورہ نور میں پردہ کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کا قائل ہوں۔

سوال: برقعے کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ ایک علاقائی پردہ ہے نہ کہ اسلامی پردہ، یہ ترکوں کے زمانے میں بنا انہوں نے چھوڑ دیا اور ہمارے ہاں ابھی تک چل رہا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم سمجھتے ہیں کہ جو برقعہ پہننا چاہتی ہیں وہ پہنیں جونہیں پہننا چاہتیں وہ نہ پہنیں۔

سوال: حسن کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: خدا کا عطیہ ہے جس کو ہر کوئی سراہتا ہے۔

سوال: آپ مشترکہ خاندانی نظام کے حامی ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل۔

سوال: اس میں کیا فائدہ ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: اس سے بچوں کو زیادہ ڈسپلن آجاتا ہے آج کے والدین بچوں کو گھر چھوڑ کر نکل جاتے ہیں بچے گھر پر کیا کر رہے ہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

سوال: آپ کو گھر پر کس بات پر غصہ آتا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: اپنی ناکامیوں اور نااہلیوں پر غصہ آتا ہے۔

سوال: عورت کو گھر سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: آج کل اگر کام نہیں کریں گی تو کھائیں گی کہاں سے۔

سوال: فیوڈل ازم کے بارے میں منفی تاثر ہے آپ اس سے متفق ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: فیوڈل ازم بہت ہی خراب چیز ہے اس سے معاشرہ تباہ ہوتا ہے، ہمارا کلچر اسی وجہ سے ختم ہوگیا۔

سوال: ہمارا فیوڈل ازم لکھنؤ کے معاشرے سے کس طرح مختلف ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: بہت مختلف ہے وہاں کے لوگ ٹھیک تھے سارے زمیندار لکھنؤ یونیورسٹی چلا رہے تھے وہاں کے زمینداروں نے کافی مثبت کردار ادا کیا۔

سوال: فوج کا سیاسی کردار ہونا چاہیے؟

جسٹس (ر) حلیم: میں فوج کے بارے میں بات نہیں کروں گا۔

سوال: آپ پیری مریدی پر یقین رکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں میں تو اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔

سوال: کبھی استخارہ کیا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں۔

سوال: آپ کی نظر میں اسلامی تعلیمات کا نچوڑ کیا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: اسلامی تعلیمات کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

سوال: ہمارے ہاں فرقہ واریت ہے یہ کس کی ناکامی ہے سوسائٹی کی، حکومت کی یا کسی اور کی؟

جسٹس (ر) حلیم: فرقہ واریت پھیلانے والے شروع سے ہی آگے بڑھ گئے ہیں۔

سوال: سکون کب محسوس ہوتا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: نماز میں سکون ملتا ہے کلام پاک کے پڑھنے میں بھی سکون ملتا ہے۔

سوال: اقتدار ذمہ داری ہے، نعمت ہے یا امتحان؟

جسٹس (ر) حلیم: امتحان ہے۔

سوال: اس میں کامیاب کس کو سمجھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: اللہ تعالیٰ جس کو کامیاب بنادے۔

سوال: زندگی کا سب سے مشکل ترین واقعہ کب پیش آیا؟

جسٹس (ر) حلیم: ہمارے ساتھ وکالت میں تو روز آتا تھا روز پیرزادہ ستار وغیرہ کے خلاف مقدمہ لڑتے تھے ہمارا تو روز ہی امتحان ہوتا تھا۔

سوال: کبھی ان سے جیتے؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل جیتا تھا۔

سوال: وہ کیا کرتے شاباش دیتے تھے؟

جسٹس (ر) حلیم: مجھے ان سے شاباش لینے کی ضرورت ہی کیا تھی بحیثیت قانون دان یہ میری ڈیوٹی تھی۔

سوال: مشکل وقت میں آپ کس سے مشورہ کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: کسی سے بھی نہیں اللہ تعالیٰ مجھے خود بخود فیصلے کی قوت بخش دیتا ہے۔

سوال: زندگی میں آخری بار کب روئے؟ اور کتنی دیر تک؟

جسٹس (ر) حلیم: ابھی ایک سال پہلے جب میرے بھائی کا انتقال ہوا تھوڑی دیر رویا اس عمر میں اب کوئی زیادہ تو نہیں روسکتا۔

سوال: بعض اوقات انسان مصلحتاً جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہ تجربہ کبھی آپ کو بھی ہوا؟

جسٹس (ر) حلیم: میں جھوٹ نہیں بولتا اللہ نے جس چیز سے منع کیا وہ میں نہیں کرتا۔

سوال: خوش کس بات پر ہوتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: جب اللہ کا رزق ملتا ہے تو خوش ہو جاتا ہوں یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔

سوال: ندامت اور پریشانی کب محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: جب سمجھتا ہوں کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی نہ ہی کسی کا رزق لیا۔

سوال: زندگی کا سب سے غمناک لمحہ کون سا تھا؟

جسٹس (ر) حلیم: جب ماں باپ کا انتقال ہوا۔

سوال: کبھی زندگی میں خیال آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی پرسکون جگہ پر چلے جائیں؟

جسٹس (ر) حلیم: انسان کو دنیا میں محبت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے سب کچھ چھوڑ کر پرسکون جگہ پر جانے کے لیے نہیں۔

سوال: کیا آپ کامیابی میں قسمت کے قائل ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: اللہ تعالیٰ نے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ملتا ہے میری کامیابی اسی کی رضا سے ہوتی ہے۔

سوال: اگر آپ کو بیرون ملک ایک ماہ چھٹیاں گزارنے کا موقع ملے تو آپ کہاں جائیں گے؟

جسٹس (ر) حلیم: فن لینڈ۔

سوال: اخبار بینی کب سے کر رہے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: بچپن سے لیکن اب میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے اب قتل و غارت گری کی بے کار خبریں چھپتی ہیں۔

سوال: کون سے صفحات زیادہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: صرف سرخیاں دیکھ لیتا ہوں۔

سوال: ٹی وی میں میوزک کے پروگرام دیکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: کبھی کبھی۔

سوال: کوئی خواہش؟ جو وسائل کی کمی کے باعث پوری نہ ہوئی ہو۔

جسٹس (ر) حلیم: میری طبیعت ایسی ہے کہ جو انسان کو ملا وہ ہے جو نہیں ملا وہ نہیں ہے۔

سوال: پاکستان کا کون سا علاقہ آپ کو زیادہ پسند ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: سوات۔

سوال: جب کسی سے ملا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں یہ خوبی ہے یا پھر یہ خرابی ہے آپ انسان کو کس طرح جانچتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میں شکل سے پہچان لیتا ہوں۔

سوال: آپ کی نظر میں انسانی زندگی کا کائنات میں سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: انسانیت انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے حضور اقدس ﷺ کی ساری زندگی انسان کو انسان بنانے میں گزری۔

سوال: عام آدمی کی طرح گھومنے پھرنے کا موقع ملے تو بازار میں کون سی ڈش کھائیں گے؟

جسٹس (ر) حلیم: مچھلی پسند ہے لیکن سر بازار نہیں کھاتا۔

سوال: کیا یہ نظریہ درست ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: جی ہاں۔

سوال: زندگی میں کبھی روزے کے علاوہ بھوکا رہنے کا اتفاق ہوا۔

جسٹس (ر) حلیم: جب شکار کھیلنے جاتا تھا تب یہ احساس ہوا۔

سوال: کیا دولت مسرت کا باعث ہوتی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل نہیں جب دولت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ زیادہ امتحان لے رہا ہوتا ہے۔

سوال: تنہائی کے لمحات میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میں سوچتا رہتا ہوں کہ مغفرت ہوگی یا نہیں۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: خود غرض تو کہہ سکتے ہیں لیکن انسان کی قربانی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

سوال: بسا اوقات جب کوئی گھناؤنا جرم کرتا ہے تو سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے کیا آپ بھی ایسا سوچتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں ایسا خیال کبھی نہیں آیا۔

سوال: کبھی ایسا ہوا؟ کہ آپ کے لفظوں سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو، جس پر آپ کو بعد میں ندامت ہوئی ہو۔

جسٹس (ر) حلیم: انسان کے ساتھ زندگی میں کبھی ایسا ہو جاتا ہے لیکن بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے یہ سب غصے کے عالم میں ہوتا ہے۔

سوال: زندگی میں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی؟

جسٹس (ر) حلیم: زندگی میں ہر چیز کی کمی انسان کو محسوس ہوتی ہے اصل بات یہ ہے کہ اس کمی سے آدمی پر کیا اثر ہوتا ہے۔

سوال: آپ اپنی باتوں کو اپنے تک محدود رکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: میں کسی سے اپنے مسئلے کا ذکر نہیں کرتا۔

سوال: آپ کو کوئی لطیفہ یاد ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: بالکل یاد ہے میرے والد اور دادا کے زمانے میں ایک وکیل وکالت کرتے تھے ان کی اپیلیں لگی ہوئی تھیں ایک اپیل انہوں نے کسی اور وکیل کو دے دی (مصروفیت کی باعث) چنانچہ جوڈیشل کمشنر انگریز تھا وہ بہت مصروف تھا وہ کیس دوسرے کاؤنٹ میں چلا گیا وکیل صاحب کھڑے ہو گئے پیچھے ایک دیہاتی جس کا کیس تھا وہ بیٹھا ہوا تھا اس نے ہاتھ جوڑے اور اپنی دیہاتی زبان میں کہا کہ صاحب! ہم نے گھوڑے کے پیسے دیئے ہیں گدھے پر سواری نہ کریں۔ جوڈیشل کمشنر اردو بھی سمجھتا تھا وہ ہنسنے لگا۔

سوال: آپ کے پاس بندوقیں کتنی ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: مجھے بندوق کا شوق نہیں۔

سوال: تو شکار کب کھیلا؟

جسٹس (ر) حلیم: پاکستان میں کبھی نہیں کھیلا لکھنؤ میں کھیلا کرتے تھے۔

سوال: شکار کھیلتے ہوئے ناکامی کا احساس ہوا؟

جسٹس (ر) حلیم: ہم لوگوں کو شکار تو کم ملتا تھا دوڑ زیادہ لگتی تھی۔

سوال: شکار کا کوئی یادگار واقعہ؟

جسٹس (ر) حلیم: کھانا اور پانی نہیں ملتا تھا کھیتوں اور پگڈنڈیوں میں میلوں دوڑے جا رہے ہوتے۔

سوال: جانور پر کبھی رحم آیا؟

جسٹس (ر) حلیم: جانور نہیں دیکھے وہ ہمیں دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔

سوال: کون سا جانور زیادہ پسند ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: گھوڑے سے بہتر کون سی چیز ہو سکتی ہے۔

سوال: پسندیدہ موسم؟

جسٹس (ر) حلیم: سردی۔

سوال: پسندیدہ پرفیوم؟

جسٹس (ر) حلیم: میں کوئی پرفیوم استعمال نہیں کرتا۔

سوال: پھول کون سا پسند ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: گلاب۔

سوال: مناظر قدرت میں کون سی چیز آپ کو زیادہ پسند ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: پہاڑوں اور چشموں کی خوبصورتی۔

سوال: کپڑے سلوانے کے لیے آپ کا کوئی خاص درزی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: نہیں ریڈی میڈ پہنتا ہوں۔

سوال: پسندیدہ رنگ کون سا ہے آپ کا؟

جسٹس (ر) حلیم: میرون۔

سوال: پسندیدہ مصنف؟

جسٹس (ر) حلیم: مصنف تو بہت ہیں لیکن زندگی لاء پڑھ پڑھ کر گزری۔

سوال: آپ کی نظر میں دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت کون سی ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: تاج محل جو کہ صرف تصویروں میں دیکھا ہے۔

سوال: پاکستان کے قیام کو 50 سال ہو چکے ہیں کیا ہم کامیاب ثابت ہوئے ہیں عام تاثر یہ ہے کہ ہم ہر شعبے میں ناکام رہے ہیں؟ کیا ہمارا مستقبل ماضی سے بہتر ہوگا؟

جسٹس (ر) حلیم: آج کے دور میں معاشی طاقت ہی اصلی سیاسی طاقت ہے اگر معیشت صحیح نہیں ہے تو سیاسی طاقت کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے سو روپے میں تو کچھ بھی نہیں خریدا جا سکتا سو روپے کی بینک پاور ہی ختم ہو گئی ہے۔

سوال: آپ کو یہاں 50 سال ہو چکے ہیں؟ پچاس سال پہلے کے کراچی اور آج کے کراچی میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) حلیم: 50 اور 60 کے عشرے کو دیکھا جائے تو وہ کراچی کے لیے بہت خوشگوار تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا کراچی میں خاندان ہی تباہ ہو چکے ہیں والدین کا بچوں پر کنٹرول نہیں رہا۔ یہاں پر تعلیم ہے کہ نقل کرو اور پاس ہو جاؤ 5 یا 10 فیصد لوگ ہیں جو اپنی محنت سے پاس ہوتے ہیں۔

سوال: کراچی کی بگڑی ہوئی صورتحال کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

جسٹس (ر) حلیم: ہماری سمجھ میں اس کا علاج نہیں ہر شخص جو جرم کرتا ہے وہ چھوڑ دیا جاتا ہے

اس طرح قیام امن کیسے ہوگا۔ ملزم کے خلاف شہادت ہو تو کورٹ اس کو نہیں چھوڑتا۔ جب گواہی نہیں تو پھر سزا کیسی۔

انٹرویو: اگست، 1998ء

مقام: کراچی

حوالۂ اشاعت: 27 ستمبر، 1998ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

چیف جسٹس آف پاکستان
جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین

سابق گورنر پنجاب و سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ بڑے پر آشوب دور میں عدلیہ کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز رہے ہیں۔ وہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے آخری دنوں میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور بھٹو کی طرف سے جزوی مارشل لاء لگانے کو غیر قانونی قرار دینے کا فیصلہ انہوں نے ہی دیا تھا۔ اسلم ریاض حسین، وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کے کلاس فیلو اور دوست بھی ہیں اور ان کی بطور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ تقرری میں اس دوستی کا بھی دخل تھا۔ اسلم ریاض حسین کی تقرری سے جسٹس مولوی مشتاق شدید ناراض ہو گئے اور بھٹو کے جانی دشمن بن گئے اور بعدازاں اسی دشمنی میں پھانسی کی سزا سنا دی۔

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد پہلے گورنر پنجاب بنے اور بعدازاں سپریم کورٹ کے جج بھی رہے انہیں بھٹو کے خلاف مقدمہ کے پینل میں شریک نہیں کیا گیا لیکن وہ بھٹو کے خلاف مقدمے کے بہت سے واقعات کے عینی شاہد بھی ہیں اور اس مقدمے کے بہت سے کرداروں کو ذاتی طور پر جانتے بھی ہیں۔

جسٹس اسلم ریاض اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے ہمیشہ پس پردہ رہے یہ انٹرویو ان کی زندگی کا پہلا اور شاید آخری انٹرویو ہے۔ اسلم ریاض حسین نے انٹرویو دے تو دیا لیکن بعد میں کئی دوستوں کے مشوروں کے زیر اثر اس انٹرویو کی اشاعت رک گئی اور اس طرح سے یہ انٹرویو پہلی بار اس کتاب میں شائع ہو رہا ہے۔

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین کا تعلق مشہور مسلم لیگی گھرانے سے ہے ان کی والدہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین تحریک پاکستان کی صف اول کی رہنما تھیں۔ اسلم ریاض نے اس حوالے سے بھی کئی واقعات سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس انٹرویو میں پہلی بار انہوں نے اپنے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بننے سے لے کر عدلیہ میں کیریئر کے اختتام تک پیش آنے والے واقعات سے پردہ اٹھایا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے پی سی او کے نفاذ، گورنر پنجاب بننے کی داستان اور بھٹو کیس کے اندرونی واقعات بھی پہلی بار ان ہی کی زبانی منظر عام پر آ رہے ہیں۔

اہم نکات

☆ بھٹو کو عدالت میں بلانے پر جنرل ضیاء نے سپریم کورٹ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
☆ بھٹو قتل کے مقدمے میں بری ہوجاتے تو مشرقی پاکستان والا مقدمہ چلتا۔
☆ جنرل ضیاء کو قانون کا بہت علم تھا وہ زیرک آدمی تھے۔
☆ مولوی مشتاق چیف جسٹس نہ بننے پر بھٹو کے خلاف ہوگئے۔ مسعود اچھا آدمی نہ تھا۔
☆ مولوی مشتاق میرے نیچے کام نہیں کرنا چاہتے تھے مگر سپریم کورٹ میں کرنا پڑا۔
☆ کوئی جج راضی نہ تھا جنرل ضیاء نے دباؤ کے تحت گورنر بنائے۔
☆ ضیاء کے پی سی او کا حلف نہ لینے والے ہیرو نہیں زیرو تھے وہ عدلیہ میں ڈٹے رہنے کا وقت تھا۔
☆ لوگ بھٹو کا آدمی سمجھتے تھے میرا ہر فیصلہ بھٹو حکومت کے خلاف آیا۔
☆ بھٹو کے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود نے ڈھاکہ میں گولی کا حکم دیا۔
☆ حلف نہ اٹھاتے تو جنرل ضیاء بریگیڈئروں کو جج بنادیتے۔
☆ قائداعظم مذہبی ریاست نہیں سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔
☆ قیام پاکستان کا مقصد اسلام کا نفاذ نہیں مسلمانوں کی معاشی آزادی تھا۔
☆ جسٹس یعقوب علی خان مولوی مشتاق کو اور یحییٰ بختیار ڈاکٹر جاوید اقبال کو لاہور ہائیکورٹ کا چیف جسٹس بنانا چاہتے تھے۔
☆ جزوی مارشل لاء کے خلاف فیصلے سے بھٹو کو بہت نقصان ہوا۔
☆ میں نے ٹیلی ویژن پر اپوزیشن کی تقریریں سنوانے کا حکم دیا۔
☆ مارشل لاء میں قانون بندوق کی نالی سے حکم منواتا ہے۔
☆ فوجی سیاستدانوں سے زیادہ قابل ہوتے ہیں۔

انٹرویو

سوال: آپ نے پریکٹس کب شروع کی اور جج کب اور کیسے بنے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میں ولایت سے پڑھ کر آیا اور پہلے دن پریکٹس کی غرض سے ڈسٹرکٹ کورٹس گیا تو حالات سے پریشان ہو گیا۔ گرد و غبار اڑ رہی تھی میں ولایت سے کپڑے سلوا کر لایا تھا اور یہاں خام چینی کے برتنوں میں چائے پی جا رہی تھی وہاں مجھے شیخ خورشید، نسیم حسن شاہ اور گورنمنٹ کالج کے دوسرے دوست نظر آئے لیکن دل نہ لگا میرے والد کریمنل لاء کے وکیل تھے انہوں نے ایک تھانیدار کو بلایا اور مجھے کہا کہ جا کر چار ماہ تھانے میں بیٹھو اور دیکھو کس طرح جھوٹے کیس تیار ہوتے ہیں پھر میں، میں نے چار سال ڈسٹرکٹ کورٹس میں پریکٹس کی میں چونکہ بیرسٹر تھا اس سے میری ہائیکورٹ میں بڑی جلدی انرولمنٹ ہو گئی اس طرح سے میں اپنے سب ساتھیوں سے سینئر ہو گیا بعد میں جو لوگ کہتے رہے کہ میں سینئر نہیں ہوں تو میں ان سب سے سینئر تھا۔ اصل میں میں جنگ کے بعد پاکستان آنے والا پہلا بیرسٹر تھا۔ اس دوران میں کچھ عرصہ بیمار بھی رہا اس کے بعد پھر کریمنل لاء کی پریکٹس شروع کی۔ پھر 1954ء میں سب سے پہلے جسٹس ایم آر کیانی نے میرا نام اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے طور پر پیش کیا اس وقت میرا نام منظور نہ ہو سکا لیکن پھر جلد ہی نواب آف کالا باغ کے دور میں، میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل ہو گیا۔ 1969ء میں مجھے ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا میں ہسپتال گیا ہوا تھا کہ گھر لاء سیکرٹری کا فون آیا کہ انہیں جج بنا دیا گیا ہے کچھ وقت گزرا میں پھر بیمار تھا کہ فون آیا کراچی میں چیف جسٹس یعقوب علی خان، وزیر قانون ملک اختر اور اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کی میٹنگ ہوئی ہے جس میں آپ کو چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ بنا دیا گیا ہے۔

سوال: آپ کے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ بننے کی اندرونی کہانی کیا تھی، کہتے ہیں آپ کا نام آپ کے کلاس فیلو یحییٰ بختیار نے منظور کروایا تھا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: اصل میں بھٹو تو لاہور کے وکلاء سے اتنے واقف نہیں تھے۔ چیف جسٹس یعقوب علی خان، مولوی مشتاق کو چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ بنانا چاہتے تھے یحییٰ بختیار اپنے دوسرے کلاس فیلو ڈاکٹر جاوید اقبال کو چیف جسٹس بنانے کے حامی تھے جب کہ وزیر قانون ملک اختر ڈاکٹر جاوید اقبال کو چیف جسٹس بننے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ملک اختر بھاٹی دروازہ کے رہنے والے

تھے اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے بہنوئی میاں صلاح الدین صلی کے سیاسی مخالف تھے۔ اس لیے وہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی میاں صلی سے رشتہ داری کی وجہ سے انہیں نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ اس طرح سے قرعہ فال مجھ پر پڑا اور مجھے چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ بنا دیا گیا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آٹھ جج آپ سے سینئر تھے آپ کو چیف جسٹس بنانے سے مولوی مشتاق بھٹو کے خلاف ہو گئے اور بالآخر جو کچھ ہوا وہ سامنے ہے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یہ بات صحیح ہے کہ مولوی مشتاق اسی وجہ سے بھٹو کے مخالف بن گئے تھے باقی باتیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ مولوی مشتاق بہت کینہ پرور آدمی تھے اسی وجہ سے انہوں نے بھٹو کو پھانسی دے دی۔

سوال: آپ کی تقرری کے بعد مولوی مشتاق بیرون ملک چلے گئے تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: ہاں جی وہ لندن چلے گئے تھے کیونکہ وہ میرے نیچے کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ مارشل لاء کے بعد وطن واپس آ گئے اور جب وہ سپریم کورٹ میں آئے تو انہیں میرے جونیئر کی حیثیت سے ہی کام کرنا پڑا۔ مولوی مشتاق کو بھی بھٹو کی پھانسی کے بعد سپریم کورٹ بھیج دیا گیا تھا۔ اے کے بروہی کہا کرتے تھے کہ مولوی مشتاق کے ہاتھ سے بٹیرا (یعنی بھٹو کیس) نکل جانے دو پھر دیکھیں گے اس کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے۔

سوال: آپ کو بھٹو کیس کی سماعت کرنے والے بنچ میں کیوں شامل نہیں کیا گیا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میں نہ تو سپریم کورٹ میں اس بنچ میں بیٹھا جس کے پاس بھٹو کا کیس تھا۔ میں واحد جج تھا جو اس بنچ سے باہر رکھا گیا۔ اصل میں یہ گورنر ہاؤس لاہور کا واقعہ ہے کہ میں اور جنرل ضیاء لان میں ٹہل رہے تھے کہ جنرل ضیاء نے مجھ سے پوچھا آپ جج کیسے بناتے ہیں میں نے کہا پہلے نمبر پر جج کو جینٹل مین ہونا چاہیے دوسرے نمبر پر بھی جج کو جینٹل مین ہونا چاہیے اور تیسرے نمبر پر بھی جج کو جینٹل مین ہونا چاہیے اگر خدانخواستہ آپ پر مقدمہ بنے تو آپ کو علم ہو کہ یہ جج بک نہیں سکتا اس کے بعد جنرل ضیاء نے دل میں یہ بات بٹھا لی کہ اگر بھٹو کے خلاف بنچ بنتا ہے تو اس میں اس شخص کو تو کسی صورت نہیں رکھنا چنانچہ سارے جج سپریم کورٹ میں بھٹو کیس سن رہے تھے۔ میں اکیلا دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔

سوال: بھٹو دور میں جب لاہور میں جزوی مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو آپ نے اس مارشل لاء کے خلاف فیصلہ دیا جس سے لگا کہ آپ کو آئندہ مارشل لاء لگنے کا پہلے سے علم تھا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: اصل میں جب مجھے چیف جسٹس بنایا گیا تو لوگوں نے اندازا

لگایا کہ یہ تو اب بھٹو کا خاص آدمی بن کر رہے گا اور بھٹو کے حق میں فیصلے کرے گا لیکن میرا جو بھی فیصلہ آیا بھٹو کے خلاف آیا بھٹو جس شخص کو بھی گرفتار کرتے میں اسے دوسرے روز رہا کر دیتا۔

سوال: تو اس بات پر بھٹو ناراض نہیں ہوئے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میں نے پرواہی نہیں کی میں نے کہا کہ جب مجھے یہ اختیار ملا ہے تو میں انصاف تو کروں گا مجھے کہا گیا کہ آپ کا گھر برباد کر دیا جائے گا میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ یہ تنخواہ کی نوکری نہیں یہ عبادت ہے انصاف کرنا خدا کا کام ہے یہ فرض چند دنوں کے لیے اس غریب کو سونپا گیا ہے اس لیے اس فرض کو نبھانا پڑے گا۔

سوال: بھٹو دور میں کون دھمکیاں دیتا تھا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: مجھے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے کبھی دھمکی نہیں دی بالواسطہ طور پر دھمکیاں ملتی تھیں کہ مع خاندان اڑا دیا جائے گا۔

سوال: جزوی مارشل لاء کے خلاف فیصلے کی توقع نہیں کی جارہی تھی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: بالکل، یہ فیصلہ میں نے 3 بجے کے قریب سنایا شام چھ بجے جب میں دفتر سے گھر جا رہا تھا تو فوج بھی شہر سے واپس جا رہی تھی اس فیصلے نے بھٹو کو بہت نقصان پہنچایا۔

سوال: اس زمانے میں آپ نے کوئی اور مشہور فیصلہ دیا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: بالکل، اس زمانے میں ایک مقدمہ آیا کہ انتخابی مہم کے دوران پاکستان ٹیلی ویژن پر بھٹو کی تقریر تو سنوائی جاتی ہے لیکن جب اپوزیشن کی تصویر دکھائی جاتی ہے تو آواز خاموش ہو جاتی ہے حکومت نے موقف اختیار کیا کہ پاکستان ٹیلی ویژن خودمختار ادارہ ہے میں نے فیصلہ دیا کہ نہیں پی ٹی وی حکومت کے زیر اختیار نہیں ہے اور اپوزیشن کی تقریریں بھی سنوائی جائیں چنانچہ دوسرے ہی روز سے اپوزیشن کی تقریریں بھی مع آواز سنوائی جانے لگیں۔

سوال: جج صاحب! اب بھی پریکٹس تو وہی جاری ہے پی ٹی وی کی اپوزیشن کوریج پر تو کوئی فرق نہیں پڑا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: نہیں اس وقت تو فرق پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ فیصلے دیئے تھے۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہائیکورٹس کے چیف ججوں نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد گورنر بن کر آئین کی دھجیاں بکھیر دیں اور انصاف کا خون ہو کر رہ گیا۔ آپ بھی فوجی حکومت کے گورنر

بن گئے اور یوں آئین سے غداری کی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: واقعہ یوں ہے کہ رات 4 بجے گھر پر فون آیا کہ بھٹو حکومت ختم کر دی گئی ہے۔ سیکرٹری قانون نے فون پر کہا کہ آپ کو گورنر مقرر کر دیا گیا ہے آپ اسلام آباد تشریف لائیں دوسرے دن ہم اسلام آباد پہنچے ہمیں پورا پروٹوکول دیا گیا ہماری پہلی ملاقات چیف جسٹس یعقوب علی خان سے ہوئی لگتا یوں ہے کہ یعقوب علی خان سے جنرل ضیاء نے اپنے ایکشن کی بات کی ہوئی تھی یعقوب علی خان نے میرے مارشل لاء کے فیصلے کو بھی (Stay) سٹے نہیں دیا تھا کیونکہ میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا خیر جنرل ضیاء سے بات ہوئی تو ایک طرح سے میں نے ہی عدلیہ کا ترجمان بن کر بات شروع کی اور کہا کہ ہم گورنری قبول نہیں کر سکتے کیونکہ آئین کا آرٹیکل (6) واضح طور پر کہتا ہے کہ آئین کو سبوتاژ کرنے والے بغاوت کے مرتکب ہوں گے اور بغاوت کی سزا موت ہے، ہم نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ بھی پھنسیں گے اور ہمیں بھی پھنسوائیں گے۔ اس پر جنرل ضیاء نے کہا کہ قوم کا مطالبہ تھا کہ فوج اور عدلیہ انتخاب کروائیں اور اب اسی طرح ہو رہا ہے سویلین حکومت قائم ہے فضل الٰہی صدر ہیں۔ جنرل ضیاء نے کہا اگر میں نے تین ماہ میں انتخابات نہ کروائے تو پھر سزا دے دیں تاہم اس کے باوجود ہم نے گورنر بننے سے انکار کر دیا جنرل صاحب نے کہا کہ اچھا آپ شام کو میرے ساتھ چائے پئیں۔ چائے کا انتظام ہو چکا ہے اس لیے شام کو ضرور آ جائیں۔ شام کو ہم وہاں چائے پینے پہنچے تو وہاں حلف برداری کا انتظام تھا صدر فضل الٰہی چودھری بھی موجود تھے اسی اثناء میں جنرل ضیاء میری طرف آئے اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہا ”مناسب یہی ہوگا کہ آپ حلف لے کر جائیں“۔

سوال: تو گویا آپ کو دھمکی دی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: جنرل ضیاء بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے لیکن میں سمجھ گیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے میں سمجھ گیا کہ اب جنرل ضیاء ہی آئین ہے وہ آپ کو ڈسمس بھی کر سکتا ہے چنانچہ اس طرح سے ہم نے حلف لیا اور گورنر بن گئے۔

سوال: آپ نے دباؤ کے تحت حلف لیا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: تقریباً دباؤ کے تحت ہی حلف لیا گیا۔ مارشل لاء کے دوران تو قانون بندوق کی نالی سے اپنا حکم منواتا ہے۔

سوال: کیا یہ ممکن نہیں تھا؟ کہ جج صاحبان ڈٹ جاتے اور آئین کی پاسداری کے لیے گورنری قبول نہ کرتے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: اس طرح تو جنرل ضیاء سب کو ڈسمس کر دیتے اور ساری

عدلیہ ہی ختم ہو جاتی۔ اگر بھٹو نواب محمد احمد کیس میں بری بھی ہو جاتے تو ان کے خلاف مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا کیس چلا کر سزا دلوادی جاتی جنرل ضیاء الحق کو علم تھا کہ بھٹو کی موت ضیاء کی زندگی تھی اور بھٹو کی زندگی ضیاء کی موت تھی۔ چنانچہ اس وقت ہم سمجھ گئے کہ جنرل ضیاء ہی قانون اور خود ہی آئین ہے اس لیے کوئی بھی کوشش بے سود تھی۔

سوال: آپ کے خیال میں انکار کی صورت میں جنرل ضیاء کیا کر سکتے تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: وہ عدلیہ کو فارغ کر کے بریگیڈیئروں کو جج بنادیتے یا پھر بہت سے اور لوگ تیار ہوتے جو ہماری جگہ لے لیتے ہم نے عدلیہ کی روایات پر عمل کرتے ہوئے اسے نقصان سے بچانے کی کوشش کی اس سلسلے میں گھپلا صرف بھٹو کیس میں ہوا باقی عدلیہ اسی طرح چلتی رہی۔

سوال: آپ کی جگہ پر مولوی مشتاق کو کس طرح چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ بنایا گیا اس کی کیا تفصیلات ہیں؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: مولوی مشتاق کا اصرار تھا کہ اسلم ریاض کو سپریم کورٹ بھیجیں اور مجھے پکا چیف جسٹس بنائیں مجھے علم ہوا کہ مولوی مشتاق جنرل ضیاء سے میرا تبادلہ کروا آئے ہیں میں جنرل ضیاء الحق سے ملا اور کہا کہ سنا ہے کہ آپ نے میری ٹرانسفر کی ہے میں نے جنرل ضیاء کو کہا کہ میں اپنی والدہ کا اکلوتا بیٹا ہوں جو ضعیف بھی ہیں آپ مجھے واپس میرے نمبر پر بھیج دیں۔ میں مولوی مشتاق کے نیچے بھی کام کرنے کو تیار ہوں میں لاہور نہیں چھوڑ سکتا اس پر جنرل ضیاء نے کہا کہ آپ کو سپریم کورٹ تب بھیجیں گے جب آپ جائیں گے اور پھر انہوں نے سپریم کورٹ کا لاہور میں بنچ بنا دیا۔ میں جب راولپنڈی جاتا تو وہ دورہ کلیم کرتا تھا۔ جنرل ضیاء میری والدہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین کا بہت احترام کرتے تھے انہیں سلام کرنے بھی آتے تھے چنانچہ ضیاء الحق نے مجھے لاہور میں ہی رکھا۔

مجھے سپریم کورٹ میں مستقل جج کے طور پر لیا گیا جب کہ مجھ سے پہلے سپریم کورٹ جانے والے ابھی تک کئی ایڈہاک جج یا ایکٹنگ جج تھے اس طرح سے مجھے پھر سنیارٹی مل گئی میں نے سپریم کورٹ میں گیارہ سال گزارے اس دوران جسٹس انوار الحق کے جانے کے بعد جنرل ضیاء نے مجھے چیف جسٹس سپریم کورٹ بننے کی پیش کش کی میں نے کہا کہ نہ یہ آپ کے لیے اچھا ہوگا اور نہ میرے لیے۔ میں چونکہ چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ رہ چکا تھا اور مجھے علم تھا کہ یہ کتنی مشکل جاب ہے اور اس پر کتنی تنقید ہوتی ہے۔ چیف جسٹس کی صرف 500 روپے تنخواہ زیادہ ہوتی ہے لیکن سارا الزام اس پر آتا ہے۔ جب جسٹس حلیم باہر جاتے تھے تو میں قائم مقام چیف جسٹس بن جاتا تھا۔ جب واپس آتے تھے تو میں اپنی جگہ پر واپس آجاتا تھا اس طرح سے میں نے اپنا وقت خاموشی سے گزار لیا نہ کوئی الزام لگا نہ

کوئی ہنگامہ ہوالیکن اس دوران بھی میں نے کوئی فیصلہ ضیاء الحق کے حق میں نہیں کیا۔

سوال: پی سی او کے تحت حلف اٹھا کر جنرل ضیاء کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ججوں کو پی سی او کے تحت کسی صورت میں حلف نہیں اٹھانا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: اس وقت ملک میں کوئی آئین نہیں تھا جنرل ضیاء الحق ہی آئین تھا اس وقت دو ہی راستے تھے یا آپ رہیں یا پھر نکل جائیں اگر ہم چھوڑ جاتے تو جنرل ضیاء نے جرنیل اور بریگیڈئیر تیار کیے ہوئے تھے۔ وہ حلف لے لیتے اور عدلیہ کی ساری روایات ختم ہو جاتیں ہم کہتے کہ جن لوگوں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا وہ ہیرو نہیں زیرو ہو گئے انہیں چاہیے تھا کہ وہ کام جاری رکھتے اور بنچ میں رہتے ہوئے حکومت کے خلاف فیصلے کرتے انوار الحق کو کہا گیا کہ بھاگنا مسئلے کا حل نہیں ہے آپ کام جاری رکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

سوال: لیکن شاید حکومت جسٹس انوار الحق کو رکھنے میں دلچسپی ہی نہیں رکھتی تھی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یہ ٹھیک ہی ہوگا لیکن جسٹس انوار الحق کے بارے میں حکومت نے نہیں کہا تھا کہ ان سے حلف نہیں لیا جائے گا۔

سوال: آپ نے ذکر کیا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ ہی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا یہ کب کا واقعہ ہے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یہ جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی دنوں کی بات ہے نصرت بھٹو کیس میں جسٹس یعقوب علی خان نے حکم لکھ دیا کہ سیاسی نظر بند یعنی بھٹو کو بھی عدالت میں پیش کیا جائے اس پر جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا مجھے پتہ چلا تو میں جنرل ضیاء کے پاس گیا وہاں پراے کے بروہی، شریف الدین پیرزادہ اور جنرل کے ایم عارف موجود تھے میں جنرل ضیاء کو الگ لے گیا اور بتایا کہ میں نے یہ بات سنی ہے آپ یہ نہ کیجئے گا آپ کا تاریخ میں یہ نام نہیں آنا چاہیے کہ آپ نے سپریم کورٹ کو ختم کیا تھا۔ جس پر جنرل ضیاء الحق نے پوچھا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے تو تجویز دی کہ آپ نظر ثانی کی درخواست دائر کر دیں کہ یہاں پر شور شرابا ہوگا اس لیے بھٹو کو عدالت میں نہ بلایا جائے چنانچہ پھر اسی طرح ہوا اور حکومت نے نظر ثانی کی درخواست دائر کر دی یوں سپریم کورٹ کو ڈسمس کرنے کا معاملہ ختم ہوا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کی شخصیت کے بارے میں آپ کا کیا تجزیہ ہے

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: جنرل ضیاء الحق بڑے ہی زیرک انسان تھے۔ وہ قانون کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے فوجی سیاستدانوں سے زیادہ لائق ہوتے ہیں جنرل ضیاء الحق سے جب کوئی

قانونی یا آئینی نکتہ زیر بحث آتا تو میں دو کتابیں لے کر جاتا تھا کہ وہ خود بھی پڑھ سکیں لیکن جنرل ضیاء کہتے کہ نہیں آپ پڑھیں اور وہ معاملے کو فوراً سمجھ جاتے۔

سوال: آپ نے جزوی مارشل لاء کے نفاذ کا جو فیصلہ دیا اس کے بارے میں بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ اس فیصلے میں آنے والے مارشل لاء کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میرے سامنے زیر بحث نقطہ یہ تھا کہ کیا جزوی مارشل لاء دستور کے مطابق ہے جسے میں نے اپنے فیصلے میں غیر آئینی قرار دیا لیکن بعد میں جنرل ضیاء نے جو مارشل لاء لگایا وہ کیس میرے پاس نہیں آیا جسٹس انوار الحق نے نظریہ ضرورت کے تحت اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ میں نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ مارشل لاء لگانے والوں کو تو آئندہ حکومت ہی سزا دے سکتی ہے۔

سوال: کیا آپ کی نظر میں نظریہ ضرورت جائز تھا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یہ نظریہ ضرورت بھی نہیں ہے۔ مارشل لاء میں قانون بندوق کی نالی سے اپنے احکامات نافذ کرواتا ہے۔ فرض کریں کہ رات کو بلڈوزروں کی مدد سے ہائیکورٹ کو گرا دیا جاتا ہے تو آپ کیا کریں گے سویلین کچھ نہیں کر سکتے۔

سوال: آپ حیدرآباد کورٹ کے بھی سربراہ رہے جہاں پر ولی خان اور دیگر سیاستدانوں کے خلاف غداری کے مقدمات چلائے جانے تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: مجھے اس عدالت کا سربراہ بنایا گیا تھا اس عدالت میں تینوں صوبوں کے جج صاحبان کو شامل کیا گیا ملزمان میں ولی خان، غوث بخش بزنجو، شیر محمد مری، خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل شامل تھے۔ اس مقدمے میں 17 پنجابی لڑکے بھی ملزم تھے جن میں جسٹس ایس اے رحمٰن کے بیٹے راشد رحمٰن، اسد رحمٰن اور نجم سیٹھی وغیرہ شامل تھے یہ فی الواقع بلوچستان کو آزاد کرانے کا منصوبہ تھا پہلے چار دن انہوں نے بہت شور کیا کہ شاید بھٹو نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا ہے لیکن پھر یہ مطمئن ہو گئے کہ یہ بالکل آزاد رائے رکھنے والا جج ہے۔ ہوا یوں کہ ایک یورپی عورت عدالت کی سماعت دیکھنا چاہتی تھی بھٹو کے وکیل نے کہا کہ بھٹو نے اس عورت کو کورٹ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی میں نے سوچا کہ آج ہی فیصلہ ہو جائے یہ عدالت بھٹو کی ہے یا میری اور میں نے اس یورپی عورت کو عدالت میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اسی دوران مجھے لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا شاید مجھے چیف جسٹس بنایا ہی اس لیے گیا ہو کہ یہ یہاں سے ہٹے کیونکہ یہ تو آزاد رائے رکھنے والا جج ہے میرے بعد ایک اچھے انسان جسٹس سردار عبدالجبار کو وہاں بھیجا گیا۔

سوال: پھر اس عدالت کا حتمی فیصلہ کیا ہوا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: جنرل ضیاء نے مجھ سے یہ مقدمہ ڈسکس کیا ابھی عدالت نے فیصلہ نہیں دیا تھا جنرل ضیاء الحق وردی میں حیدر آباد گئے اور ملزمان کو سیلوٹ کیا اور کہا کہ آپ محبّ وطن ہیں اصل میں جنرل ضیاء کو اینٹی بھٹو لوگوں کی ضرورت تھی اس لیے اس نے ان کو رہا کروا دیا۔

سوال: سقوط مشرقی پاکستان کے وقت آپ کہاں پر تھے اور آپ کے اس وقت کیا تاثرات تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: بنگلہ دیش کے پہلے صدر ابو سعید چودھری لندن میں میرے ہم جماعت تھے وہ بڑے خاموش طبع تھے وہ مجھے ٹیگور کے شعر سنایا کرتے تھے ایک بار لاہور آ کر انہوں نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ ایڈووکیٹ جنرل ہو چکے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا مسئلہ کیا ہے اس نے کہا کہ آپ لوگ ہمیں سیکنڈ کلاس شہری سمجھتے ہیں یہاں سے جو لوگ وہاں حکومت کرنے جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں ابو سعید نے کہا کہ چیف سیکرٹری عزیز احمد اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے میں نے کہا وہ تو یہاں بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ ابو سعید نے دوسرا نام بھٹو کے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کا لیا جو وہاں پر ایس پی تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا مغربی پاکستان کے لوگ بنگالیوں کے انگریزی تلفظ کا مذاق اڑاتے تھے یہاں تک کہ کچھ حکمرانوں کا خیال تھا کہ ہمارا تمام پیسہ بنگال میں غرق ہوتا ہے اور شاید ان کا خیال یہ تھا کہ یہ الگ ہی ہو جائیں تو بہتر ہے۔ مجیب الرحمٰن کو 164 سیٹیں ملی تھیں اگر اس کو وزیر اعظم بنا دیا جاتا تو اس نے کہاں پاکستان توڑنا تھا اصل میں ہم نے مشرقی پاکستانیوں سے اچھا سلوک نہیں کیا ہم انہیں حقیر سمجھتے تھے ان کا تمسخر اڑاتے تھے۔ ڈھاکہ میں اردو زبان کے مسئلے پر طالب علموں کو گولی مارنے کا حکم بھٹو کیس کے وعدہ معاف گواہ مسعود محمود نے دیا تھا۔ مسعود محمود کو سنٹرل ماڈل سکول میں ساتویں جماعت سے جانتا ہوں یہ اچھرہ میں رہتا تھا بہت غریب تھا لیکن جب میں ولایت سے 1944ء میں آیا تو میں نے مسعود محمود کو دیکھا کہ وہ ٹائی اور بو لگائے ہوئے تھا اس نے مجھے کہا کہ ڈھاکہ میں ہم ٹائی اور بو لگا کر ڈنر کرتے ہیں وہ بنگال میں جا کر انگریز بن جاتے تھے۔ مسعود محمود بڑا محنتی طالب علم تھا پھر ایئر فورس میں چھ سال رہا اور اسی وجہ سے اسے سنیارٹی مل گئی لیکن بطور انسان اس کے اوصاف اور عادات اچھی نہیں تھیں۔ بنگالیوں کو ہم نے خود کھویا ہے ان کی عزت نہ کر کے ان کی عزت نفس کو مجروح کر کے اور پھر کچھ اوپر والوں کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ علیحدہ ہی ہو جائیں تو اچھا ہے ان کے بغیر ہم بہتر چل سکتے ہیں۔

سوال: آپ تحریک پاکستان میں بھی شریک رہے آپ کو پاکستان کے حوالے سے سب سے زیادہ دکھ کس بات کا ہوتا ہے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: فیض احمد فیض کا یہ شعر حسب حال ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
ہمیں تلاش تھی جس کی یہ وہ سحر تو نہیں

افسوس تو یہ ہے کہ یحییٰ بختیار اور میں جس پاکستان کے بارے میں رات بھر باتیں کیا کرتے تھے وہ نہیں بنا۔

سوال: اپنے بچپن کے حالات کے بارے میں بتائیں اس وقت معاشرتی حالات کیا تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میرے والد صاحب پہلے سول سروس میں تھے پھر انہوں نے 1936ء میں بیرسٹری کی اور لاہور کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔ 1937ء میں انہوں نے گارڈن ٹاؤن کے علاقہ میں 30 کنال اراضی پر مشتمل ایک کوٹھی بنائی اس زمانے میں گارڈن ٹاؤن کا علاقہ ایک ویران جگہ تھی میں اس گھر سے سینٹرل ماڈل سکول تک چھ میل سائیکل چلا کر جایا کرتا تھا اور چھ میل سائیکل چلا کر واپس آیا کرتا تھا۔

سوال: تو کیا آپ کار میں نہیں جایا کرتے تھے جب کہ آپ کے والد کے پاس تو کار تھی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میرے والد تو کار میں کورٹس جاتے تھے لیکن میں سائیکل پر جاتا تھا سردیوں میں آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو جاتا لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں بچوں کو کاروں پر سکول بھیجنے کا رواج نہ تھا میں شام کو گیم کے لیے گورنمنٹ کالج دوبارہ جاتا تھا اس طرح سے بہت سائیکلنگ کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں لیکن میری پرورش میں کافی سختی برتی گئی میں ٹاٹ سکولوں میں پڑھتا رہا ڈیرہ غازی خان میں میرے والد افسر تھے میں وہاں سکول گیا تو اساتذہ نے میرے لیے موڑھے کا انتظام کر دیا لیکن والد نے وہ موڑھا اٹھوا دیا۔

سوال: آپ اپنی والدہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین کی وجہ سے بچپن میں ہی سیاست میں حصہ لیتے ہوں گے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: گارڈن ٹاؤن کے بعد 1940ء میں والد صاحب نے ایمپریس روڈ پر کوٹھی لے لی اور وہیں پر زیادہ وقت گزرا اسی کوٹھی میں قائداعظم، لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین کئی دفعہ تشریف لائے ان رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ایک دفعہ نواب ممدوٹ کے گھر فرش پر نشست ہوئی جس میں جداگانہ انتخابات پر بات ہوتی رہی میں بھی وہاں اس محفل میں شریک ہوا اور بات چیت کی۔

سوال: کالج لائف میں پڑھائی کے علاوہ آپ کی کیا سرگرمیاں تھیں؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میں بظاہر کھلاڑی نہیں لگتا لیکن میں کالج میں اتھلیٹ تھا۔ پول واٹ کا چیمپئن تھا اور کالج کا کلر ہولڈر تھا۔

سوال: آپ والدین کی اکلوتی اولاد ہیں عام طور پر ایسے بچے بزدل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: نہ تو میرا اتنا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور نہ میں بزدل اور خوفزدہ تھا میرے کوئی لاڈ پیار نہیں ہوئے کبھی پاکٹ منی نہیں ملی کبھی بچپن میں کھلونا نہیں ملا ٹاٹ سکولوں میں پڑھا بائیسکل پر سکول اور کالج جاتا رہا۔

سوال: کیا قائداعظم سے براہ راست ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یہ 1943ء کی بات ہے کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تھا میں اور میری والدہ عبداللہ ہارون مرحوم کے گھر ٹھہرے جہاں لیڈی عبداللہ ہارون ہماری میزبان تھیں ساتھ والا گھر وزیراعلیٰ سندھ غلام حسین ہدایت اللہ کا تھا سامنے والے گھر میں قائداعظم ٹھہرے ہوئے تھے سعید ہارون اور یوسف ہارون اس وقت نوجوان تھے وہ تلواریں لگا کر قائداعظم کی سیکورٹی اور حفاظتی دستے کا کام کیا کرتے تھے۔

ہم ہر روز صبح قائداعظم کے گھر جا کر مسلم لیگ کا پرچم بلند کرتے اور غروب آفتاب کے وقت پرچم اتارتے ایک روز سعید ہارون نے شرارتاً قائداعظم کی ڈائننگ ٹیبل سے سیب اٹھا کر ہوا میں پھنکا تو نوکر نے آواز دی کہ ''صاحب گنیلا'' یعنی سیب مت لینا صاحب نے گن کر رکھے ہوتے ہیں۔ ہم حیران ہوئے کہ قائداعظم اس قدر تفصیل میں جاتے ہیں اور سیب تک گن کر رکھتے ہیں۔ اسی طرح میرا ایک دوست مظہر قائداعظم کا اے ڈی سی تھا اس نے بتایا کہ ایک دن گورنمنٹ ہاؤس میں گزرتے گزرتے انہوں نے کہا کہ یہاں پر کرسی پڑی تھی وہ کہاں گئی یعنی وہ ہر چیز کا خیال رکھتے تھے۔

قائداعظم سے لیڈی ہارون کے گھر پر دو تین دفعہ ملاقات ہوئی پھر میں نے قائداعظم کو خط بھیجا کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں مجھے جواب آیا کہ آپ کل دس بجے آجائیں میں دوسرے دن پہنچا اور اپنی باری پر ملاقات کے لیے گیا تو قائداعظم نے کمرے کے دروازے پر میرا استقبال کیا پہلے مجھے بٹھایا پھر خود بیٹھے اور گفتگو کے دوران وہ ہر فقرے پر مجھے سر کہہ کر بلاتے رہے میں حیران تھا کہ ہم تو اپنے پرنسپل کو سر کہنے پر سبکی محسوس کرتے ہیں اور اپنا بڑا لیڈر ایک نوجوان سے کس طرح مخاطب ہے اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ دوسروں کی عزت کرنا کتنا اہم ہوتا ہے۔

سوال: قائداعظم سے ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میری یہ حیثیت تو نہیں تھی کہ میں قائداعظم کو کوئی نیا آئیڈیا دیتا یا مشورہ دیتا لیکن پاکستان کے موضوع پر گفتگو ہوئی قائداعظم نے کہا کہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے سارے مسلمان پاکستان آ جائیں گے لیکن جس قدر بھی مسلمانوں کا معاشی مستقبل بچایا جا سکتا ہے اسے بچا لیا جائے قائداعظم کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسلامی ریاست قائم کی جائے کیونکہ اس تصور کے مطابق تو پنجاب کی سرحد دہلی تک تھی جس میں ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب 48 فیصد تک تھا لہٰذا یہاں پر اسلامی نظام کا نفاذ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ تقریباً آدھی آبادی تو سکھوں اور ہندوؤں کی تھی اور قائداعظم نے ہرگز اس چیز کا کہیں ذکر نہیں کیا ان کے ذہن میں سیکولر پاکستان کا تصور تھا اور ان کے ذہن میں لاہور تک کے پنجاب کا نہیں بلکہ دہلی تک کے پنجاب کا تصور تھا وہ برطانوی آئین سے قانون کے مطابق سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے تاہم وہ مسلمانوں کو معاشی غلامی سے نکالنا چاہتے تھے۔

سوال: عمومی تصور تو یہی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنانا چاہتے تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میری ان سے جو بات ہوئی اس میں تو انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی قائداعظم کا یہ کہنا تھا کہ جتنا بچ سکتا ہے اتنا بچا لیں میں نے یہی اخذ کیا کہ وہ مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے۔

سوال: تو گویا ممتاز دولتانہ یا سردار شوکت حیات کا جو خیال تھا کہ قیام پاکستان کا بنیادی مقصد معاشی آزادی تھا، آپ بھی اس سے متفق ہیں؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: بے شک، بچانے سے مراد یہی تھی آپ کو اندازا نہیں کہ یہاں مسلمانوں میں کس قدر غربت تھی۔ جس کے گھر نواری پلنگ ہو وہ امیر تصور ہوتا تھا جس کے گھر اینٹوں کی بجائے سیمنٹ لگ جائے وہ امیر تصور ہوتا تھا انگریزوں کے گھروں میں بھی بڑی سادگی ہوتی تھی وال ٹو وال قالین کا تصور تک نہیں تھا زیادہ سے زیادہ دری یا غلیچہ بچھا لیا جاتا تھا۔ جسے دو وقت کی روٹی مل جاتی وہ امیر ہوتا تھا تمام ہسپتال ہندوؤں کے تھے تمام بینک ہندوؤں کے تھے سارا مال روڈ خان بہادر نقی کی بلڈنگ کے سوا ہندوؤں کا تھا گنگا رام ہسپتال میرے سامنے بنا سارا عملہ ہندو تھا صرف ایک وارڈ میں مسلمان داخل ہو سکتے تھے انار کلی میں صرف تین دکانیں مسلمانوں کی تھیں مسلمان تو کوئی چیز ہی نہیں تھے لیکن پاٹے خان بنے ہوئے تھے۔ ہم زیادہ سے زیادہ کسی وکیل کے منشی ہوتے ہندو وکیل کے ٹانگے میں اس کی کتابیں اٹھا کر ساتھ جا رہے ہوتے۔ سارے لاہور ہائیکورٹ میں صرف تین مسلمان وکیلوں کے پاس کاریں تھیں جن میں سے ایک میرے والد تھے اب دیکھیں ہائیکورٹ میں موٹریں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ہے یہ امارت پاکستان کی بدولت ہے یہ سب کچھ اس دبلے پتلے شخص

قائداعظم کی وجہ سے ہے ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم ہضم نہیں کر سکتے اور ہم بدہضمی کا شکار ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں ایک ہندو بلاقی مل تھا سب بڑے مسلمانوں کی جائیدادیں بلاقی مل کے پاس گروی ہوتی تھیں بلاقی مل قرضے دے کر بعد میں قرقیاں کرواتا تھا۔

سوال: ایوب مارشل لاء سے پہلے کی مسلم لیگی قیادت کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: ایوب خان کے مارشل لاء نے جن لوگوں کو نکالا تھا وہ لوگ ہمیں دوبارہ نہیں مل سکتے۔ سہروردی، خواجہ ناظم الدین اور ممدوٹ وغیرہ وہ لوگ تھے جو بے غرض اور بےلوث سیاست کرتے تھے اپنی جائیدادیں بیچتے تھے اور سیاست کرتے تھے۔

سوال: قیام پاکستان سے پہلے آپ کے پاکستان کے بارے میں کیا خواب تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: یحیٰی بختیار قائداعظم کے قریبی ساتھی تھے قائداعظم کوئٹہ جاتے تو یحیٰی بختیار ہی سے مشورے کرتے محترمہ فاطمہ جناح بھی سب سے ملاقات کے بعد یحیٰی بختیار سے حتمی مشورہ کرتی تھیں۔ یحیٰی بختیار لندن میں میرے ہم جماعت تھے ہم ساری ساری رات پاکستان کے بارے میں باتیں کرتے کہ یہ کیسا ہونا چاہیے۔ یحیٰی بختیار قائداعظم کا شیدائی تھا لیکن پاکستان کی گندی سیاست میں اسے بھی جیل کھانی پڑی اور پھر یحیٰی بختیار کے خون آلود کپڑے اس کے گھر بھیجے گئے۔

یحیٰی بختیار کو اپنے بدلے چکانے کے لیے قید کروایا گیا اس قید میں جنرل ضیاءالحق کا کوئی دخل نہ تھا جنرل ضیاءالحق نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی یحیٰی بختیار سے ملاقات کروائی جائے لیکن یحیٰی بختیار نے انکار کردیا۔

سوال: یحیٰی بختیار کے مقدمے کی سماعت آپ نے ہی کی تھی؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: ضیاء کے مارشل لاء کے دوران اس کا مقدمہ میرے پاس آیا وہ دل کے مریض تھے اور علاج کے لیے باہر جانا چاہتے تھے اٹارنی جنرل نے کہا کہ وہ ضمانت دیں کہ بیرون ملک فرار نہ ہو جائیں جس پر میں نے اٹارنی جنرل کو کہا کہ میں اور تم تو پاکستان سے فرار ہو سکتے ہیں یحیٰی بختیار نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے پاکستان کے ساتھ ان کی محبت دیکھی ہوئی ہے وہ ضرور پاکستان واپس آئے گا اور اس طرح میں نے یحیٰی بختیار کو بیرون ملک جانے کی اجازت دے دی۔

یحیٰی بختیار ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے قابل اعتماد ساتھی تھے اور اس نے کوئی دولت نہیں بنائی۔ جاوید اقبال بھی لندن میں ہمارے کلاس فیلو تھے۔ جاوید اقبال اور میں علامہ اقبال کے سامنے کھیلا کرتے تھے اور شرارتیں کیا کرتے تھے۔

سوال: سیاست میں آپ کی والدہ حصہ لیتی تھیں کیا والد صاحب سیاست میں زیادہ سرگرم نہیں تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: میرے والد تصدق حسین وکالت کرتے تھے اس زمانے میں دولت حکومت سے لینے کا رواج نہ تھا الیکشن میں پیسے پانی کی طرح بہانے پڑتے تھے اور والد صاحب والدہ صاحبہ کا الیکشن کا سارا خرچ برداشت کیا کرتے تھے۔ 1946ء کا الیکشن بڑا سخت تھا والدہ اندرون شہر کے حلقے سے امیدوار تھیں دن رات انتخابی مہم جاری رہتی تھی والدہ صبح وشام ہر گھر اور گلی محلوں کا چکر لگاتی تھیں، ہم لوگ سائیکلوں پر لاؤڈ سپیکر لگا کر اعلانات کرتے کہ مسلم لیگ کو ووٹ دو اس زمانے میں سیاسی رہنماؤں کی عزت ہوتی تھی۔ والدہ صاحبہ شہر جاتی تھیں تو سڑکیں اور بازار بند ہو جاتے تھے۔ عورتیں گھروں سے باہر نکل آتی تھیں یہ قابل دید منظر ہوتا تھا بہر حال یہ الیکشن ہم جیت گئے۔

پاکستان بننے کے بعد والدہ نے لٹے پٹے مہاجرین کی آباد کاری کے لیے بھی بڑا کام کیا وہ خود مشرقی پنجاب جا کر مہاجر خواتین کو لاتی رہیں کئی ہزار عورتوں کو انہوں نے صرف پٹیالے سے سکھوں کے چنگل سے آزاد کروایا۔

سوال: بیرون ملک تعلیم کے تجربے سے آپ کو کس حد تک فائدہ ہوا، کیا آپ اپنے معاشرے سے وہاں کے معاشرے کا تقابل کرتے تھے؟

جسٹس (ر) اسلم ریاض حسین: بہت فائدہ ہوا، انسان کا تناظر وسیع ہوتا ہے اگر آپ صرف ہندوستان کا دورہ بھی کرلیں تو آپ کو ذہنی وسعت ملے گی۔ باہر جانے کا لازم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وسعت نظر پیدا ہوتی ہے۔ میں جب برطانیہ میں زیر تعلیم تھا تو میرے والد صاحب پیسے بھیج کر مجھے تاکید کرتے کہ چھٹیوں میں ضرور یورپ جایا کرو اس لیے میں کبھی سپین جاتا اور کبھی جرمنی۔

انٹرویو: جولائی، 1998ء
مقام: گلبرگ، لاہور
غیر مطبوعہ

چیف جسٹس آف پاکستان

جسٹس (ر) محبوب احمد

چیف جسٹس (ر) محبوب احمد ٹھہری ہوئی شخصیت کے مالک ہیں مذہبی رجحانات کے حامل محبوب احمد ججوں کے روایتی تصور کے حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں سے فاصلہ رکھتے ہیں۔ بطور چیف جسٹس انہوں نے پنجاب اسمبلی کی بحالی کو کالعدم دینے والے سیاسی طور پر متنازعہ فیصلے دیئے۔ انہیں بطور جج مولوی مشتاق حسین نے حلف دیا اور بعد ازاں انہوں نے نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ادوار دیکھے۔ جسٹس محبوب احمد کو بے نظیر بھٹو کے دور میں شریعت کورٹ بھیجا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا بعد ازاں انہیں چیف جسٹس شریعت کورٹ بنایا گیا تو اس عہدے پر انہوں نے کام کیا انشورنس اور بینکاری کے مختلف شعبوں کی اسلامی تشریح کے حوالے سے انہوں نے کافی کام کیا۔

جسٹس محبوب احمد سے حالیہ عدالتی بحران پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی ان کا کہنا ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے حق میں وکلاء برادری کا کھڑا ہونا ان کی ذمہ داری ہے انہوں نے یہ مقدمہ زیر سماعت ہونے کی وجہ سے اس پر براہ راست تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ جسٹس محبوب کو روحانیت سے بھی دل چسپی ہے اور وہ سائپرس کے رہنے والے شیخ ناظم سے بیعت ہیں ان سے دو تفصیلی انٹرویوز کیئے گئے جن کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

اہم نکات

☆ چیف جسٹس کے خلاف بھیجا گیا ریفرنس میرٹ کے حوالے سے غلط ہے۔
☆ قائمقام چیف جسٹس جاوید اقبال کا حلف غلط تھا۔
☆ جوڈیشل ایکٹوازم کو صرف عوامی مفاد میں استعمال کرنا چاہئے۔
☆ نظریہ ضرورت غلط ہے یہ نتائج سے بچنے کے لئے دریافت کیا گیا۔
☆ عدلیہ کے 100 ججوں کے احتساب کے لئے سپریم جوڈیشل کونسل کافی ہے نئے ادارے کی ضرورت نہیں۔
☆ سپریم جوڈیشل کونسل کی شکایات ججوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔
☆ جس بندے میں توکل نہ ہو اسے جج نہیں بننا چاہئے، ججوں کو فیصلوں میں بہادری دکھانی چاہئے۔
☆ بھٹو کے خلاف فیصلے میں انصاف ہوتا نظر نہیں آیا، بے نظیر کے خلاف جسٹس قیوم کا فیصلہ درست تھا۔
☆ جب جج اقتدار کی خواہش کرنے لگیں تو وہ حکمرانوں کے زیر اثر فیصلے کرتے ہیں۔
☆ سیاسی فیصلوں میں نتائج کو دیکھنا ججوں کا کام نہیں۔
☆ بعض جج افسروں کے تبادلوں کے چکروں میں پڑ جاتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔
☆ ہوسکتا ہے مولوی مشتاق میں انتقام کا جذبہ ہو، آخری وقت تک انہیں سلام کرنے جاتا رہا۔
☆ جج کو لوگوں سے فاصلہ رکھنا چاہئے تاکہ اس تک رسائی میں مشکل محسوس کریں۔
☆ بے نظیر بھٹو کو ریلیف دیتا رہا، ان کی مرضی کے جج بنانے سے انکار پر فیڈرل شریعت کورٹ بھیج دیا گیا۔
☆ جج معاشرے سے کٹ نہیں سکتے حالات حاضرہ سے باخبر رہنا چاہئے۔
☆ کسی بھی عدالت میں جج کے خلاف رٹ کی جاسکتی ہے، سپریم جوڈیشل کونسل کے علاوہ یہ راستہ بھی کھلا ہے۔
☆ طبقاتی تضاد ہوگا تو کرپشن بڑھے گی، بڑے افسروں کے لئے کاریں آتی ہیں تو دوسروں کے لئے بسیں ہی منگوالیں۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کوئی کام نہیں کرسکی اس کے پاس عمل درآمد کا اختیار نہیں۔
☆ جہاں باپ جج ہو اس ہائیکورٹ میں بیٹے کو پریکٹس نہیں کرنی چاہئے۔
☆ میں نے اپنے بیٹے کو وکالت سے منع کر دیا تھا۔
☆ دو قومی نظریہ ہی نظریہ پاکستان ہے نظریہ پاکستان پر عمل نہ کرنے کا دکھ ہے۔
☆ جسٹس انوار الحق بہت اچھے جج تھے لیکن بھٹو کیس کی وجہ سے متنازعہ ہو گئے۔
☆ سپریم کورٹ کے ججوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد پریکٹس نہیں کرنی چاہئے۔
☆ انگریزی فلمیں پسند ہیں دیسی فلمیں لمبی ہونے کے باعث دیکھ نہیں سکتا۔
☆ میری ہر جائیداد کا ریکارڈ موجود ہے کہ یہ کیسے حاصل کی گئی ہے۔
☆ خانقاہی نظام آئیڈیل تھا اس کے ذریعے بہت اچھی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔
☆ اگر بھٹو کو عمر قید ہو سکتی تھی تو سزائے موت کیوں دی گئی۔
☆ مولوی مشتاق سے جب بھی ملنے جاتا تھا وہ اکیلے ہوتے تھے۔

انٹرویو

سوال: چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف جو صدارتی ریفرنس بھیجا گیا ہے آپ اس حوالے سے کیا رائے رکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب: جس طرح میرٹ سے ہٹ کر یہ ریفرنس بھیجا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے آئین کے تحت ہر ادارے کو اپنی حدود کے اندر رہ کر کام کرنا چاہیے جو ادارہ بھی اپنی حدود سے باہر نکل کر کام کرے گا وہ معاملات کو خراب ہی کرے گا۔

سوال: صدر کی طرف سے ریفرنس، سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیجنا تو غیر آئینی نہیں ہے؟

جسٹس (ر) محبوب: بالکل آئین میں ریفرنس بھیجنے کی گنجائش موجود ہے لیکن جس طرح صدر نے وردی پہن کر اور باوردی فوجیوں کے درمیان چیف جسٹس کو بلا کر انہیں ریفرنس کے بارے میں بتایا یہ عدلیہ کو دبانے کی کوشش کے زمرے میں آتا ہے۔

سوال: وکلاء کی حالیہ تحریک، ماضی کے حوالے سے ایک نیا واقعہ ہے؟

جسٹس (ر) محبوب: میں سمجھتا ہوں کہ وکلاء برادری کا کھڑا ہونا ان کی ذمہ داری میں شامل ہے اگر وہ کھڑے نہ ہوتے تو عدالتی نظام ہی ختم ہو جاتا۔ وکلاء عدالتی نظام کا اہم حصہ ہیں اس لیے انہوں نے نظام کے تحفظ کے لیے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

سوال: آپ کی رائے میں جب صدر کسی بھی جج کے خلاف ریفرنس بھیجنے کا اختیار رکھتے ہیں تو پھر غلطیاں کہاں ہوئیں؟

جسٹس (ر) محبوب: چیف جسٹس کو غیر فعال کرنا غلط تھا اسی طرح سپریم جوڈیشل کونسل تو ٹھیک ہے لیکن اس کی تشکیل غلط تھی میری رائے میں جب چیف جسٹس موجود تھا تو پھر قائم مقام چیف جسٹس کے طور پر جسٹس جاوید اقبال کا حلف بھی غلط تھا۔

سوال: کئی لوگ جسٹس افتخار چودھری اور جسٹس سجاد علی شاہ میں جوڈیشل ایکٹوازم اور برادر ججوں سے تعلقات کے حوالے سے مماثلت تلاش کرتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟

جسٹس (ر) محبوب: جوڈیشل ایکٹوازم کو صرف اور صرف عوامی مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہیے جسٹس افضل ظلہ بھی جوڈیشل ایکٹوازم کرتے تھے لیکن کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا جج جب

ذاتی مفاد سے کام لیتے ہیں تو پھر اعتراضات ہوتے ہیں جج کو سر نیچا کر کے کام کرنا چاہیے اور صرف خدا سے ڈرنا چاہیے۔

سوال: کیا جج کے لیے حالات حاضرہ اور دنیا کے معاملات سے باخبر رہنا ضروری ہے؟

جسٹس محبوب احمد: حالات حاضرہ کے بارے میں علم تو ہونا چاہیے لیکن اس کو حالات سے اثر قبول نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: وہ کیوں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آپ کوئی فیصلے کرنے کے لئے کئی ایسے علوم کی ضرورت ہوتی ہے جو آپ کے قانونی علم سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ جن کا تعلق پولیٹیکل ایشوز، آئینی یا قانونی ایشوز سے ہوتا ہے۔ جج کو دوسرے ملکوں کے قوانین، رہن سہن یعنی ہر قسم کی چیز سے متعلق علم ہونا چاہیے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جج کو صرف قانون ہی نہیں بلکہ حالات حاضرہ سے بھی آگاہی ہونی چاہیے مثلاً اگر وہ جج ہے تو اسے کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی پڑھنی آنی چاہیے۔ اسے معیشت کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ علم ہونا چاہیے اگر آپ کے پاس کسی کمپنی کا مقدمہ آجائے اور آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم بھی نہ ہو تو پھر آپ وکلا اور پارٹنرز کے رحم و کرم پر ہوں گے لیکن اس کے بارے میں اگر آپ کو خود کچھ علم ہو گا تو پھر ہی آپ کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

سوال: لیکن برطانوی دور حکومت میں تو ججوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ نہ تو سماجی تقریبات میں جائیں اور نہ ہی اخبار پڑھیں۔ لیکن اب ان روایات کو چھوڑ دیا گیا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ بات کچھ حد تک تو درست ہے کہ انہیں سماجی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے اور نہ ہی کمیونٹی کی مجلسوں میں جانا چاہیے لیکن پھر بھی جج اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے اپنے تعلقات بھی ہوتے ہیں اور آپ ان تعلقات سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی جج علیحدہ اور کٹ کر بھی نہیں رہ سکتے لیکن اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک مناسب فاصلہ رکھیں۔ یعنی دوسرے لوگ آپ کو اتنا آسان بھی نہ سمجھیں کہ ان کی آپ تک رسائی ممکن ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہر وقت آپ کے پاس آسکتے ہوں اور بات چیت کر سکتے ہوں کیونکہ فاصلے پیدا کرنے سے ایک طرح کی جھجک آجاتی ہے۔ میں آپ سے روز ملوں تو بے تکلفی پیدا ہو جائے گی لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ آپ بالکل ہی کنارہ کش ہو جائیں۔ اگر آپ کو زمینی حقائق کے بارے میں نہیں پتا تو آپ اچھے منصف نہیں بن سکتے یہ تصور تو انگریز کا تھا کہ لوگوں سے فاصلہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ رولنگ کلاس سے تعلق رکھتے تھے اور عام آبادی کے ساتھ مکس ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

سوال: کئی لوگ کہتے ہیں کہ جو انگریز کا دور تھا اس میں آج کے پاکستان یا آج کے ہندوستان کی نسبت زیادہ انصاف موجود تھا۔

جسٹس محبوب احمد: نہیں جب بھی کراؤن یا تاج برطانیہ کے خلاف کوئی مقدمہ آتا تھا فیصلہ حکومت ہی کے حق میں ہوا تھا چاہے وہ عدالت کتنی ہی درست کیوں نہ ہو۔

سوال: مشہور تو یہ ہے کہ تاج برطانیہ کے خلاف فیصلے بھی عدالتوں کے ہوتے تھے مثلاً والیان ریاست کے کئی مقدمات میں تاج برطانیہ کے خلاف فیصلے دیئے گئے۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھیں وہ پرنس یا والیان ریاست تو ان کے اپنے لوگ تھے لیکن پرنس کے جھگڑے یا تو انٹر سٹیٹ ہوتے تھے یا فیملی کے اندر کے وہ حکومت کے خلاف نہیں ہوتے تھے۔

سوال: آپ کا خیال ہے کہ وہ والیان کے اپنے معاملات تھے یعنی وہ حکومتی معاملات نہیں تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جہاں تک برطانوی حکومت یا برطانوی سامراج کا تعلق ہے تو جہاں ان کا اپنا معاملہ ہوتا تھا وہاں ان کا انصاف وہ انصاف نہیں ہوتا تھا جو عام طور پر جانا جاتا ہے۔

سوال: لیکن ہمارا جو ستاون سالہ پاکستانی انصاف ہے اس کو عالمی سطح پر آپ کیا مقام دیں گے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرا تعلق شعبہ وکالت سے رہا میں طویل عرصہ تک جج بھی رہا اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدلیہ میں زوال ضرور آیا ہے۔

سوال: کیا پورے عدالتی نظام میں زوال آیا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جی! لیکن اس کی وجوہات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس میں صرف عدلیہ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کام کی زیادتی اور زیر التواء کام کے بڑھنے سے عدلیہ میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ کسی حکومت نے ججوں کی تعداد بڑھانے پر توجہ نہیں دی اگر کسی مجرم کو چار پانچ یا دس سال تک سزا ہی نہ ملے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور پھر یہ بھی ہوا ہے کہ جب منصف انصاف کرنے بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یار یہ واقعہ دس سال پہلے ہوا تھا اور کوئی بات کریں یعنی اس کا رویہ وہ نہیں ہوتا اگر وقوعہ کے وقت ٹرائل ہوا ہوتا تو اس کا رویہ اور ہوتا۔

سوال: عام طور پر عدلیہ پر دو حوالوں سے تنقید ہوتی ہے ایک تو سیاسی حوالہ ہے مولوی تمیز الدین کیس سے لے کر آخری سیاسی فیصلے تک ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ عدلیہ دباؤ میں رہی اور دوسرا ہے عدلیہ کی کرپشن، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں پر بات کی جائے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آئین کی تشریح وہی ہونی چاہیے جو آئین کہتا ہے لیکن کئی اور چیزیں بھی فیصلہ پر اثر کرتی ہیں میرے خیال میں انصاف کے معاملے میں نتائج سمیت کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ اگر آئین میں کوئی خامی پائی جاتی ہے اسے ٹھیک کرنا متعلقہ ادارے کی ہی ذمہ داری ہے ججوں کو نتائج سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

سوال: بھٹو کو سزائے موت دینے کے فیصلے پر کافی تنقید ہوتی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں نے یہ فیصلہ پڑھا نہیں ہے۔

سوال: آپ تو پوری دنیا کے حالات حاضرہ کے بارے میں جانتے ہیں تو آپ جیسے جج اور طویل عدالتی کیریئر والے شخص سے یہ سوال کیا جانا تو ایک لازمی امر ہے کیونکہ بھٹو کیس پاکستانی عدلیہ کے اہم ترین مقدمات میں سے ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں! میں آپ سے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ حالات حاضرہ پر نظر رکھنا ایک اور بات ہے اور خاص قسم کے مقدمات پر تبصرہ کرنا ایک اور بات ہے اس پر کسی بھی جج کو ''کومنٹ''، نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ وہ اس مقدمے کی فائل کا پوری طرح مطالعہ نہ کرے اور جس جج کا فیصلہ اپنا ہوا سے تو کسی صورت بھی بعد میں اپنے اس فیصلے پر ایک بھی لفظ کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔

سوال: کیا آپ کا اشارہ جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ صاحب کے اپنے ہی فیصلوں پر تبصروں کی طرف ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں میں نام لے کر کسی سے متعلق کچھ نہیں کہہ رہا اور بھی بہت سے جج ہیں۔

سوال: میرے ساتھ ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر بھٹو کے وکیل مطالبہ کرتے کہ پھانسی کی سزا کی بجائے عمر قید دے دیں تو ایسا ممکن تھا۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں تو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ جج جس نے کسی مقدمے کا فیصلہ کیا ہوا ہے میرے خیال وہ واحد شخص اس فیصلے کے بارے میں تبصرہ کرنے کا اہل ہی نہیں ہے۔

سوال: ایسا کیوں؟ کیا اسے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے یا خیالات بدلنے کا حق نہیں ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جج اگر اپنے فیصلے کے حق میں بات کرتا ہے تو ٹھیک لیکن اگر وہ اپنے ہی فیصلے کے خلاف تبصرہ کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا فیصلہ دیا ہی کیوں گیا تھا اور پھر ایسا تبصرہ عدالتی روایت اور انصاف کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے۔

سوال: ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ شخصیت کو بعد میں اصلاح کا خیال پیدا ہو یا ندامت محسوس ہو؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ندامت ہو تو اللہ سے معافی مانگے اسے پبلک ایشو نہ بنائے۔

سوال: کیا بھٹو کیس کی از سر نو سماعت نہیں ہونی چاہیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھنا یہ ہے کہ اس مقدمے کی از سر نو سماعت کی افادیت کیا ہوگی۔ میں نے ابھی تک وہ فیصلہ پوری طرح نہیں پڑھا۔

سوال: کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ آپ نے اتنا اہم فیصلہ نہیں پڑھا شاید کہا جاتا ہے کہ یہ اتنا برا فیصلہ ہے کہ اس کا عدالتوں میں حوالہ بھی نہیں دیا جاتا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں یہ تو درست نہیں اس مقدمے کا حوالہ تو دیا جاتا ہے۔ جج کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس کے فیصلے کو عوامی قبولیت ہوگی یا نہیں یہ درست ہے کہ عدلیہ اور جج کے لئے عوامی حمایت ضروری ہے لیکن فیصلوں میں عوامی قبولیت حاصل کرنا ضروری نہیں۔

سوال: دنیا میں جمہوریت، سیاست یا انصاف کی بات ہو تو یہ صرف تجریدی چیزیں نہیں ہیں انصاف عوام کے لئے ہے اسے عوامی حمایت ہی حاصل نہ ہو تو انصاف کی کیا حیثیت ہوگی اسی طرح عدلیہ کے جس فیصلے کو عوامی قبولیت نہیں وہ فیصلے کیسے درست ہوسکتا ہے؟ آپ سے یہ سوال عدلیہ اور سیاست کے طالب علم کے طور پر کر رہا ہوں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھیں دنیا میں ایسے بہت سے فیصلے ہوئے ہیں جن کو اس وقت کے عوام نے قبول نہیں کیا لیکن بعد میں ان فیصلوں کو درست تسلیم کرلیا گیا تاریخ کا دور بہت طویل ہوتا ہے تاریخ صرف ایک دہائی کا نام نہیں ہے دیکھیں اس مقدمے کے بارے میں تاریخ کیا فیصلہ دیتی ہے لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ کسی بھی مقدمے میں صرف یہی نہیں کہ ہر صورت میں انصاف ہونا چاہیے بلکہ انصاف ہوتا ہوا بھی نظر آنا چاہیے۔ بھٹو کے مقدمے کے حوالے سے بیانات پڑھ کر لگتا ہے بھٹو کے خلاف فیصلے میں انصاف ہوتا ہوا نظر نہیں آیا اس فیصلے کے حوالے سے بعد میں جو بیانات دیئے گئے ہیں اس کے بعد میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اگر بھٹو کو عمر قید کی سزا ہوسکتی تھی تو پھر سزائے موت کیوں دی گئی۔

سوال: چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ مولوی مشتاق صاحب اور باقی ججز کا جو رویہ تھا اس کے بارے میں اکثر لوگ اعتراضات کرتے ہیں آپ نے بھی اسی ہائیکورٹ میں کام کیا ہے کیا ان جج صاحبان کا رویہ انصاف کے تقاضوں میں آتا تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے رویہ اور برداشت ایک طرح سے

مختلف ہوتی ہے ایک دفعہ بہت بڑے وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ یار تمہاری عدالت میں سناٹا رہتا ہے اور چیختے چلاتے بھی نہیں ہو نہ ہی کبھی غصہ دکھایا ہے اس کی کیا وجہ ہے تو میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کسی کی عزت نفس مجروح نہیں کرتا جب میں دیکھوں کہ واقعی کوئی غلط بات ہے تو پھر میں اسے جانے نہیں دیتا میں نے توہین عدالت میں زندگی میں ایک ہی بار سزا دی ہے۔ عدالت میں شور شرابا کرنے والے کے ساتھ بھی میرے تعلقات نارمل اور ٹھیک ٹھاک تھے کیونکہ میں کسی کو ریلیف دینے سے ہچکچاتا نہیں تھا اور غلط ریلیف دیتا نہیں تھا صرف ایک دفعہ ایک وکیل نے ایک کیس کے دوران ایک جج صاحب کے بارے میں ناجائز بات کی تھی جو بینچ میں بیٹھے تھے جب کہ پانچ جج صاحبان سن رہے تھے میں نے اسے پہلی مرتبہ وارننگ دی کہ ایسا نہ کرو وہ فوراً بولا کہ جی میں آپ کے خلاف یوں نہیں کہتا میں نے کہا یہ میرے لئے کوئی دلاسے یا اطمینان والی بات نہیں کہ تم میرے خلاف کچھ نہیں کہتے وہ غرور اور تکبر سے بات کر رہا تھا میں نے پھر اسے توہین عدالت کا نوٹس دیا۔

سوال: کیا بھٹو کیس حکومت کے دباؤ میں آ کر فیصلہ دیا گیا یا یہ فیصلہ ججوں کی ذاتی سوچ تھی یا پھر کیا وہ واقعی سمجھتے تھے کہ بھٹو نے قتل کیا ہوگا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بات انسانی سوچ کی ہے کئی دفعہ انسان اپنی سوچ اور نقطہ نظر کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور دوسرے کی رائے کو اہمیت دیتا ہے ظاہر ہے اس طرز عمل کو دوسروں کے اثر میں آنے کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے تو آپ اسے کسی کے زیر اثر آنا نہیں کہہ سکتے بلکہ آپ اسے دوسروں کے نظریات کا خیال رکھنا کہہ سکتے ہیں۔

سوال، پاکستانی عدلیہ کے متنازعہ سیاسی فیصلوں نے ملک کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا مولوی تمیز الدین کیس کا فیصلہ ہو یا کچھ اور آپ ان کے نظریات کا خیال رکھنا کہیں گے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ہوسکتا ہے کہ بعض فیصلوں کی وجہ ججوں اور حکمرانوں میں تعلق ہو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جج اپنے فیصلے کے ملک پر پڑنے والے نتائج کو سامنے رکھے یعنی جج یہ سوچ لے کہ اگر میں نے حکومت کے خلاف فیصلہ کر دیا تو ملک تباہ ہو جائے گا بعض فیصلے تعلقات نبھانے کے لئے بھی کر دیئے جاتے ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستانی جج اچھے سیاسی فیصلے کیوں نہ کر سکے ان کے راستے میں کیا چیز حائل تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے خیال جب کوئی جج اقتدار اور حکمرانی کی خواہش کرنے لگے تو پھر وہ انتظامیہ اور حکمرانوں کے زیر اثر فیصلے کرنا شروع کر دیتا ہے۔

سوال: جج کی اقتدار اور حکمرانی کی خواہش سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: مثلاً یہ کہ ہر کوئی میرا حکم ماننے میں جو کام کہوں ہو جائے یعنی کسی افسر کا تقرر یا تبادلہ کروالیا۔

سوال: تو کیا اعلیٰ عدلیہ کے جج بھی پوسٹنگ اور ٹرانسفر کے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اس طرح کے کام کروائے جاتے ہیں تو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں ججوں کے ان کاموں کی وجہ سے کافی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اگر جج صاحبان حکمرانوں کے قریب نہ جائیں تو وہ ان کے اثر میں نہیں آئیں گے۔

سوال: عدلیہ میں ججوں کی تقرری تو ہوتی ہی حکمرانوں کے ذریعے ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حکمرانوں سے رابطہ نہ رکھیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بات پھر سوچ کی آجاتی ہے میں اپنے دینی پس منظر کی وجہ سے کہتا ہوں کہ آدمی میں توکل اور حوصلہ نہ ہو اسے خود ہی سوچنا چاہیے کہ اگر اس میں کوئی کمزوری یا خامی ہے تو پھر وہ عدلیہ میں نہ ہی آئے تو بہتر ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ جو حکمران کسی جج کی تقرری کرتے ہیں لوگ ان کے زیر اثر آجاتے ہیں کئی لوگوں کا خیال ہے پاکستان میں پارلیمان کی کمیٹی کو ججوں کی تقرری کرنی چاہیے بظاہر تو یہ بہت خوبصورت بات ہے لیکن جیسا معاشرہ ہوگا ویسے لوگ ہوں گے ایک جج کی تقرری صوبے کا چیف جسٹس صوبے کا گورنر، چیف جسٹس پاکستان، وزیر اعظم اور صدر پاکستان کرتے ہیں اگر یہ پانچ اعلیٰ ترین عہدیداران بھی جج کا انتخاب صحیح طریقے سے نہیں کر سکتے تو پھر بے شک پچاس لوگوں کی کمیٹی بٹھا دیں سارا معاملہ اسی طرح ہی چلے گا میرے خیال میں ججوں کی تقرری کا موجودہ طریقہ ہی درست ہے۔

سوال: عدلیہ میں کرپشن کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کیا واقعی ایسا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: عدلیہ کی کرپشن کی وجہ زیادہ ورک لوڈ ہے، جس کے باعث چیک اینڈ بیلنس ختم ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے خود رولز اور قوانین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

سوال: کیا موجودہ دور میں عدلیہ کی ساکھ مزید متاثر ہوئی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پورے معاشرے کا تجزیہ کریں تو ابھی بھی عدلیہ میں بہت سے بہتر لوگ موجود ہیں لیکن بات پھر وہی آجاتی ہے کہ آپ آخر کب تک معاشرے سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ معاشرے کے مختلف لوگوں کا آپس میں باہمی میل جول ضروری ہے۔ آپ دیکھیں کہ گھروں میں خواتین ایک دوسرے کو ملتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں کہ کہاں ایک آسمان پر اور دوسری

زمین پر۔ اس سے بڑی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں کرپشن پیدا ہوتی ہے جہاں بھی معاشرے کے طبقات میں اتنا واضح فرق ہوگا وہاں کرپشن تو جنم لے گی۔

سوال: تقریباً ہر معاشرے میں معاشی تفاوت تو ہوتا ہے لیکن صرف اس بات سے تو کرپشن نہیں آسکتی، آپ کے خیال میں کرپشن کیسے ختم ہوسکتی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: حکومت کو چاہیے کہ وہ اس واضح فرق کو ختم کرے گریڈیشن کو ٹھیک کریں۔ جہاں کہیں بھی زیادہ فرق ہے اسے کم کریں اور جہاں کم ہے اسے زیادہ کرے۔ ان گریڈز کے درمیان جو مختلف مراحل ہیں ان کو بالکل کاٹ دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کو بالکل ایک جیسا کرسکتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی معاشی ہمواری یا مساوات تو ہونی چاہیے۔ پاکستان میں تو یہ حالت ہے کہ جو جتنا بڑا اور جتنا امیر ہے اسے اتنی ہی سہولیات حاصل ہیں لیکن غریب آدمی کو کوئی سہولت نہیں ملتی۔ اگر آپ افسروں کو سرکاری کار دیتے ہیں تو کم از کم نچلے گریڈ کے لوگوں کو پک اینڈ ڈراپ سروس ہی دے دیں۔ آپ ہر بار موٹریں ہی کیوں منگواتے ہیں بسیں کیوں نہیں خریدتے۔

سوال: ریٹائرمنٹ کے بعد آپ گنگارام اور فاطمہ جناح ہسپتال کو چلانے والے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین رہے ہیں کہاں عدلیہ اور کہاں طب کا شعبہ؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پاکستان میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی بھی شعبے میں سوچ بچار اور ٹھوس تحقیق کے لئے کوئی خاص سیل نہیں ہے میں انشورنس اصلاحات کمشن کا چیئرمین بھی رہا ہوں اس رپورٹ میں، میں نے ہیلتھ انشورنس شروع کرنے کی تجویز بھی دی تھی۔ اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے یہ سکیم متعارف کروائی جاسکتی ہے۔ مثلاً سوشل سیکورٹی ہسپتال صرف صنعتی ملازمین تک محدود ہیں انہیں عام لوگوں کے لئے بھی کھول دینا چاہیے۔

سوال: آپ عدلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے عام تاثر ہے کہ عدلیہ کے اندر احتساب کا مناسب انتظام نہیں ہے۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: کیوں نہیں ہے؟ سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں عوام میں شعور اور آگاہی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اگر آپ عوام کی شکایت پر ججوں کے خلاف ریفرنس بھیج دیں تو پھر سپریم جوڈیشل کونسل کا بھی وہی حال ہوگا جو معاشرے کا ہوا ہے (ہنستے ہوئے) پتہ نہیں یہ لطیفہ ہے یا حقیقت کہ ایک آدمی خط لکھ رہا تھا دوسرے نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو اس نے کہاں کہ فلاں کو خط لکھ رہا ہوں تو اس نے کہا میں ایک شکایت کر رہا ہوں دوسرے نے کہا میرا بھی نام لکھ دینا۔ تو جہاں ایسے حالات ہوں وہاں براہ راست شکایت کرنا کوئی مناسب بات نہیں۔

سوال: لیکن ججوں کے احتساب کے حوالے سے نرمی کا تاثر ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعے ججوں کے احتساب کی ایک یا دو مثالیں ملتی ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: سپریم جوڈیشل کونسل کے قوانین کے تحت کسی بھی جج کے خلاف ریفرنس بھجوانے کا اختیار صدر کے پاس ہے لیکن عام آدمی صدر پاکستان سے التجا تو کر سکتا ہے اس سلسلے میں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا جائے جو ججوں کے خلاف عوامی شکایات کی سکروٹنی کرے اور اس کے بعد صدر مناسب سمجھیں تو ریفرنس بھیج دیں۔ دیکھیں سپریم جوڈیشل کونسل تو اعلیٰ ترین عدلیہ کا احتساب کرتی ہے۔ ماتحت عدالتوں کے احتساب کے لئے دوسرے ادارے موجود ہیں لیکن ان کا استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔

سوال: تو کیا آپ کے خیال میں سپریم جوڈیشل کونسل عدلیہ کے احتساب کے لئے کافی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: کافی ہے آپ یہ بھی دیکھیں کہ اعلیٰ عدلیہ کے سو کے قریب جج ہیں۔ تو سو آمیوں کے لئے یہ ادارہ ہر لحاظ سے کافی ہے۔

سوال: یعنی کسی بھی جج کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کی جاسکتی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جیسے آپ رٹ کرتے ہو کہ فلاں افسر نے ناجائز بات کی ہے۔ جس طرح عام افسر کے خلاف رٹ ہوسکتی ہے جج کے خلاف بھی ہوسکتی ہے اور رٹ کے ذریعے صدر پاکستان سے بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ فلاں جج کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں کارروائی کریں۔ لیکن یہاں تو عجیب معاملہ ہے کہ سپریم جوڈیشل کونسل کی شکایات کو بھی ججوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اصل بات یہ ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے گراس روٹ لیول پر جانا پڑے گا ان مسائل کو سلپ شاٹ طریقے سے حل نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستان کے حوالے سے سب سے افسوس ناک بات کیا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پاکستان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام اور حکمران ہر دور میں نظریہ پاکستان سے غافل رہے۔

سوال: نظریہ پاکستان ہے کیا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دوقومی نظریہ ہی نظریہ پاکستان ہے۔

سوال: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد تو اب دوقومیں نہیں رہیں اب دوقومی نظریہ کی ضرورت ہی نہیں ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: کیوں ضرورت نہیں ہے۔

سوال: اس لیے کہ اب یہاں ہندو نہیں ہیں اب تو صرف ایک قوم ہے اور وہ ہے پاکستانی قوم؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ ہندو کا مسئلہ نہیں ہے مسئلہ بالکل سیدھا سادا ہے اور وہ یہ کہ آپ ایک نظریے کی بنیاد پر ایک ملک حاصل کرتے ہیں اور نظریہ درست بھی ثابت ہوتا ہے تو آپ اس کامیاب تصور یا نظریہ کو چھوڑ کر کیا حاصل کریں گے۔

سوال: اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے تمام قوانین کو اسلامی بنانے کی کوشش کی ہے کیا اسی طریقہ کار کو جاری رکھنا چاہیے یا پھر آپ کے خیال میں اسلامی نظام کے نفاذ کا کوئی نیا طریقہ تلاش کرنا چاہیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اس طریقہ کو بھی موثر بنایا جاسکتا ہے کوئی اور طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سوال: تو کیا آپ کے خیال میں اسلامی نظریاتی کونسل موثر ادارہ نہیں ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: کیا اس نے کوئی کام کیا ہے؟ اس نے سوسائٹی پر کوئی اثر ڈالا ہے اصل بات یہ ہے اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس کسی بھی قانون پر عمل درآمد کروانے کا اختیار نہیں ہے۔

سوال: پارلیمنٹ کو تو عملدرآمد کا اختیار ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پارلیمنٹ نے اس معاملے پر کتنی بات کی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے بھیجے ہوئے کتنے قوانین پر عملدرآمد ہوا ہے اصل میں ہم لوگ ہر ادارے کے قوانین کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

سوال: تو پھر آپ کے خیال میں اسلامی نظام کو نافذ کرنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: لوگوں میں آگاہی اور شعور پیدا کریں۔ سیمینارز کرائیں، دیہی علاقوں تک لوگوں کو اسلامی آئیڈیاز سے روشناس کرائیں۔

سوال: غیر سودی بینکنگ، انشورنس اور شراکتی کھاتوں کے بارے میں بعض علماء تحفظات رکھتے ہیں ان کی رائے میں یہ سب ماضی کے سودی نظام ہی کی مختلف شکلیں ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ ایک لمبا چوڑا اور گھمبیر مسئلہ ہے مضاربہ، مشارکہ اور کفالہ کے تصورات غیر اسلامی نہیں ہیں۔

سوال: پی ایل ایس اکاؤنٹ یعنی منافع نقصان شراکتی کھاتوں کے بارے میں آپ کی

رائے کیا ہے کیونکہ بنکوں میں سب سے زیادہ یہی کھاتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پی ایل ایس (پرافٹ لاس شیئرنگ اکاؤنٹ) کے بارے میں میرے تحفظات ہیں کسی چیز کو غلط طریقے سے پیش کر کے اصول کو خراب کر دیا جاتا ہے اس میں شیئرنگ صرف نفع کے لئے ہے جو غیر اسلامی ہے اور پھر نفع آنے سے پہلے ہی نفع کا معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو غلط بات ہے کسی بھی چیز کو کیموفلاج کیا جائے تو اس کی اصلیت ختم ہو جاتی ہے۔

سوال: جسٹس صاحب! آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے اور آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق کس علاقے سے تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جس کو مڈل کلاس کہا جاتا ہے۔ میرے والد برٹش انڈیا میں سرکاری ملازم تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں ہی ان کی تعیناتی مشرق وسطیٰ میں ہوئی۔ انہوں نے عراق میں تقریباً 20 سال تک سروس کی۔ ہم تین بھائی ہیں دو بڑے بھائیوں میں سے ایک منصور احمد آفندی بزنس ایگزیکٹو ہیں۔ دوسرے بھائی پروفیسر منظور احمد ہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق گورداسپور سے تھا میرے ننھیال کی زمینیں بھی گورداسپور کے گاؤں میں تھیں لیکن وہ امرتسر میں رہائش پذیر تھے۔

سوال: کیا بنیادی طور پر آپ کا تعلق زمیندار گھرانے سے ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جی آپ کہہ سکتے ہیں لیکن سنٹرل پنجاب میں اس طرح کے زمینداریوں کا رواج نہیں ہے۔ جس طرح جنوبی پنجاب میں ہے میرے ننھیال والوں کے پاس دودھیال والوں کی بہ نسبت زیادہ زمینیں تھیں میرے نانا درویش صفت انسان تھے۔ ان کا نام غلام جیلانی تھا اور وہ دنیاوی کاموں پر کم ہی توجہ دیتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہتے اپنے گھر کے پاس مسجد ضرور تعمیر کرواتے تھے۔ میرے ماموں جب امرتسر شفٹ ہوئے تو وہ میرے نانا کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے میرے ماموں کے ساتھ یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ تمہارے گھر کے ساتھ مسجد نہیں ہے حالانکہ بعد میں میرے ماموں نے مسجد بھی تعمیر کروائی تھیں لیکن نانا شفٹ نہیں ہوئے۔

سوال: آپ کے والد صاحب پولیس کے محکمے سے وابستہ تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بنیادی طور پر وہ پولیس کے محکمے سے وابستہ تھے لیکن وہ انٹیلی جنس میں بھی ملازمت کرتے رہے ہیں وہ عراق میں بھی انٹیلی جنس کے محکمے میں رہے تھے۔

سوال: والد صاحب کی زندگی کا کوئی خاص واقعہ جو وہ اکثر آپ کو سناتے ہوں اور آپ کے ذہن میں نقش رہ گیا ہو؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے والد کا نام "خان صاحب" منظور واحد تھا۔ "خان صاحب" کا خطاب انہیں برطانیہ کی حکومت نے دیا تھا۔ ایک دفعہ میں نے ان سے سوال کیا کہ جی یہ خطاب وغیرہ تو ان کو ملتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کے لئے خدمات سرانجام دیتے تھے آپ نے ان کے لیے ایسی کیا خدمات سرانجام دی تھیں کہ اتنی جلدی آپ کو "خان صاحب" کا خطاب دے دیا گیا۔ یہ خطاب اس وقت بہت کم لوگوں کو ملتا تھا۔ میرے اس سوال پر انہوں نے مجھے دو تین چٹھیاں پڑھائیں ان میں سے ایک خط انڈین حکومت کو برطانوی آفیسر کی جانب سے لکھا گیا تھا کہ یہ بڑا مذہبی قسم کا بندہ ہے اور مشرق وسطی مڈل ایسٹ میں چونکہ مسلم کمیونٹی بہت زیادہ ہے تو میرے خیال میں برٹش مفادات اس کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ وہاں پر موجود ایمبسیڈر سر ہمفری نے لکھا کہ یہ بات درست ہے کہ یہ بڑا مذہبی آدمی ہے لیکن مسلمان ہوتے ہوئے اس شخص میں یہ خصوصیت ہے کہ اسے جس کام کے بارے میں بھی کہا جائے وہ ضرور کرتا ہے اور جو بھی اسائنمنٹ دی جائے اسے وہ انتہائی محنت اور لگن سے نبھاتا ہے۔ اس وقت کے انگریز کا بھی یہ خیال تھا کہ جو اچھا مسلمان ہے وہ ہر لحاظ سے اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ غداری کرے گا۔

سوال: 1930ء میں بھی عراق میں لڑائیاں، جھگڑے اور جنگ کی کیفیت تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن اکثر جو سنا ہے وہ یہی تھا کہ مغربی دنیا اس وقت مسلم ممالک کے خلاف سازشوں میں مصروف تھی۔ اور اس کی شروعات اس طرح سے ہوئیں کہ عرب نیشنلزم کے نعرے کو ابھارا جائے اور ترکوں کی عثمانیہ خلافت کے خلاف تحریک چلائی جائے جس سے عثمانیہ خلافت انتشار کا شکار ہو جائے۔ اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے میں انہی دنوں شدت آنا شروع ہو گئی لیکن 1908ء سے باقاعدہ ایک پروگرام کے تحت عربوں کو پیچھے دھکیلنے کا کام شروع کیا گیا اور اس کام کے لئے پہلے شریف حسین کو منتخب کیا گیا۔ اس وقت سعودی عریبیہ کا وجود نہیں تھا آخر شریف حسین کو انہوں نے حکمران بنوایا لیکن شریف حسین کے بارے میں ان کو کچھ تحفظات تھے اور میرے خیال میں وہ درست ہی تھے کیونکہ وہ بھی مغربی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بن سکتا تھا جب مغربی طاقتوں نے یہ محسوس کیا تو پھر انہوں نے کہا اس کو بھی عدم استحکام کا شکار کریں۔ اس کے بعد پھر موجودہ سعودی شاہی خاندان کو لایا گیا۔

سوال: عراق میں قیام کے دوران آپ کے والد محترم کا وہاں کے لوگوں سے اچھا تعلق رہا ہوگا کیا ایسا کوئی تعلق ہے جو اب بھی قائم ہو؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: تقسیم ہونے سے قبل تو کچھ لوگوں سے تعلق تھا لیکن برصغیر سے وہاں

جانے والے اچھے افراد مثلاً نواب بہادر یار جنگ کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔لیکن یہ تعلق اس لحاظ سے نہیں تھا کیونکہ والد محترم سرکاری ملازم تھے۔دوسرے یہاں سے جو''بوہری'' طبقہ کے سربراہ ہیں یہ بھی عراق آتے تھے ان کے ساتھ بھی اچھے مراسم رہے ہیں لیکن وہاں کے مقامی لوگوں کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ لوگ اب تقسیم ہو چکے ہیں کیونکہ یہ بھی عراق کی ایک پرانی تاریخ ہے۔

سوال: آپ نے کتنے سال وکالت کی اور کس وکیل سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: 19 سال کے قریب وکالت کی۔شیخ غیاث محمد ایک اٹارنی جنرل رہے ہیں وہ بڑے ہی اپ رائٹ آدمی تھے ان کا نقطہ نظر بڑا ہی تجزیاتی ہوتا تھا وہ ہر کیس کا جائزہ لے کر اس کے تین چار مفروضے بنا لیتے تھے پھر بحث کرتے تھے۔

سوال: آپ جج کیسے بنے کوئی سفارش وغیرہ تو کروائی ہوگی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بڑی ایمانداری سے میری تقرری ہوئی تھی۔

سوال: اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کون تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: مولوی مشتاق حسین تھے ان سے پہلے کے چیف جسٹس بھی پوچھتے رہے کہ کیا آپ جج بننے کے خواہشمند ہیں۔میں اس وقت بڑا کامیاب وکیل تھا کمرشل سائڈ اور آئینی امور کے مقدمات میرے پاس تھے انشورنش کمپنیوں کا ایڈوائزر تھا۔اس زمانے میں لاہور میں بھی میری یہ انفرادی کارپوریٹ ٹائپ وکالت ہوتی تھی تو اچانک جج بننے کا فیصلہ آیا تو میں نے گھبرا کر اپنے استاد شیخ غیاث سے کہا کہ میں تو نہیں جانا چاہتا۔انہوں نے کہا پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔کیونکہ ججز اس بات کا بہت برا مناتے ہیں۔تو میں نے کہا کہ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔انہوں نے کہ تم جا کر چیف جسٹس سے ملو۔اس وقت کے چیف جسٹس وحید الدین دہلی کے رہنے والے تھے۔میں نے انہیں بتایا کہ میں جج نہیں بننا چاہتا تو انہوں نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں بننا چاہتے۔تو میں نے کہا کہ ایسے تو میرے لئے معاشی پریشانی پیدا ہو جائے گی۔کہنے لگے تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم نالائق تھے؟ غصے سے ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔میں نے کہا کہ میں نے تو جی گزارش کرنی تھی کہنے لگے کہ لکھ کر بھیجو۔میں بڑا پریشان ہوا کہ لکھ کر کیا دوں۔کہنے لگے کہ ساتھ اپنے انکم ٹیکس کے کاغذات بھی بھیجو۔میں چلنے لگا تو پھر مجھے واپس بلایا اور میرے والد صاحب کے بارے میں پوچھنے لگے کہ تم ان کے بیٹے ہو۔میں نے کہا جی ہاں جواب ملا تو پھر ان جیسی مروت بھی رکھو بعد میں جب میں نے لکھنا چاہا کہ میری جج بننے میں دلچسپی نہیں تو شیخ غیاث نے کہا کہ بیٹے ایسا نہیں کہتے تم لکھو کہ اس وقت میرے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں یہ جاب کروں اور وہ کاغذات بھی ساتھ بھیج دیئے۔تیسرے دن چیف جسٹس نے بتایا انوار الحق صاحب نے کہا بھی تھا

لیکن میں نے تم سے پوچھے بغیر تمہارا نام بھیج دیا۔ لیکن اب ناموں کی منظوری بھی ہو چکی ہے۔ میں نے کہا کہ سر میں جوائن کر کے چھوڑ دیتا ہوں مجھے ایسے ہی خیال آیا کہ میں جو تین ماہ کے بعد چھوڑوں گا تو لوگ کہیں گے کہ نالائق تھا چل نہیں سکا۔ میری یہ بات سن کر انہوں نے میرا نام واپس لے لیا۔ یہ 1968ء کی بات ہے پھر کافی دیر سلسلہ چلتا رہا۔ (ہنستے ہوئے) پیسہ تو ویسے بھی بڑی پر کشش چیز ہے۔ پھر والد صاحب نے بھی سمجھایا تو میں نے کہا کہ نہیں مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ اس وقت انوار الحق چیف جسٹس آف پاکستان تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کرو کسی سے مشورہ کرلو۔ پریشانی تو ہوتی ہے کہ جج صاحبان ناراض ہو جائیں گے۔ میری بڑی بہن نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ معاملات ہیں تو پھر والدہ صاحبہ کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ پھر کہنے لگیں کہ دیکھو بیٹا اللہ نے تمہیں کافی نوازا ہے۔ اگر تم لوگ وہاں نہیں جاؤ گے تو پھر اور قسم کے لوگ وہاں آجائیں گے اس لئے کہ انسان کے لیے یہ عزت کی بھی بات ہے تو میں نے پھر ان سب سے کہہ دیا کہ جی ٹھیک ہے۔ اس طرح میں جج بن گیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جج بننے میں میری ذاتی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

سوال: آپ نے بتایا کہ جج ناراض بھی ہوتے ہیں جب وہ ناراض ہوں تو کیا کرتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بس پھر وہ صوابدیدی چیزیں وکیل کے حق میں نہیں کرتے حقیقتاً جج کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتیں لیکن ایک وکیل کے ذہن میں یہ بات ضرور ہوتی ہے۔

سوال: مولوی مشتاق ذاتی طور پر کیسے آدمی تھے؟ ان میں کیا خوبی تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں نے ہمیشہ انہیں ایک اچھا انسان پایا وہ بڑے ہی قابل آدمی تھے۔

سوال: کہا جاتا ہے وہ انتقام کا جذبہ رکھتے تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں انتقام کا جذبہ ہو کیونکہ، ان کی پسند اور ناپسند بڑی سخت ہوتی تھی مجھے تو ان کے انتقام کے جذبے کا تجربہ نہیں ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ان میں ہو۔

سوال: کیا وہ آپ سے سیاست پر بات کرتے تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ میرے خیال میں جتنی مختصر کارروائی ان کے کورٹ میں ہوتی تھی ویسی میں نے کم دیکھی تھی۔ وہ سیاست پر کم ہی بات کرتے تھے۔

سوال: بعد میں بھی آپ ان سے ملتے رہے ہیں سنا ہے کہ بعد کی زندگی میں وہ خوفزدہ رہے اور تنہائی کا شکار رہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ملتے تو رہتے تھے لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا ان کے ساتھ کوئی

واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے وہ بیمار رہتے تھے۔

سوال: شاید ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: تنہائی کا تو مجھے پتہ نہیں اب میں اگر کچھ کہوں تو یہ غلط بات ہے۔ جی وہ چیف جسٹس تھے تو میں اس وقت بھی ان سے ملتا تھا۔ میرے نزدیک یہ بڑی معیوب بات تھی کہ بعد میں ان سے نہ ملوں۔ اس لئے میں ان سے ملنے جاتا رہا ہوں۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تھا تو وہ اکیلے ہی ہوتے تھے۔

سوال: آپ کی شادی محبت کی تھی یا پھر خاندان کی طرف سے طے ہوئی تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ مکمل طور پر ارینج میرج تھی۔ میری بیگم میرے چچا کی بیٹی ہے۔ جو بے حد تحمل مزاج ہے۔ میری ناجائز بات کو بھی برداشت کر لیتی ہے۔

سوال: آپ زیادہ تحمل مزاج ہیں یا آپ کی بیوی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میری بیوی زیادہ تحمل مزاج ہے اور بڑی ہی رحم دل بھی ہے۔ میں اگر اسی ملازم کو ڈانٹ دوں تو وہ ناراض ہو جاتی ہے کہ یہ غلط بات ہے۔

سوال: آپ کے کتنے بچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے تین بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا پروفیشنل اکاؤنٹینٹ ہے۔ لیکن کاروبار کرتا ہے۔ دوسرا بیٹا بھی کاروبار کرتا ہے جب کہ تیسرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔

سوال: عجیب بات ہے کہ آپ کا کوئی بھی بیٹا وکالت کے شعبے میں نہیں آیا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جب میں وکیل سے جج بنا تو میرا بڑا بیٹا اس وقت گریجویشن میں تھا۔ طے یہی تھا کہ میرے ساتھ وکالت کرے گا۔ جب میں جج بن گیا تو میں نے دیکھا کہ اپنے بیٹوں کی وجہ سے کئی ججوں کی بدنامی ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی لا پریکٹس میں لانا چاہ رہے تھے۔ تو پھر میں نے بیٹے سے کہا کہ تم وکالت کی بجائے کچھ اور کر لو۔ بڑے بھائی صاحب کراچی میں انشورنس کمپنی کے چیف ایگزیکٹو تھے انہوں نے کہا کہ اس کو میرے پاس کراچی بھیج دو۔ یہ کراچی میں اپنا دفتر بنا لے۔ لیکن میں نہیں مانا میری بیگم اور دوستوں نے بھی کہا یہ تو بڑی زیادتی ہے میں نے کہا کہ بس میرے ذہن میں یہ بات آ گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا کرنا ہے تو پھر میں استعفیٰ دے دیتا ہوں۔ لیکن اس سے پوچھ لیں جن دن سے یہ وکالت پاس کر لے گا اس دن میں استعفیٰ دے دوں گا پھر دونوں باپ بیٹا وکالت کریں گے۔ لیکن میری بیوی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا اصولی طریقہ کار ہونا چاہیے کہ بیٹا اس ہائی کورٹ میں پریکٹس

نہ کرے جہاں باپ جج ہو۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں سمجھتا ہوں یہ ضروری ہے اگر پیشے اور ذات کی بدنامی ہو رہی ہو تو پھر قربانی دینی پڑتی ہے۔

سوال: آپ خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بہت قائل ہوں۔ عورتوں کی تعلیم اور ان کے کام پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے انہیں ہر معاملے میں شریک ہونا چاہیے۔ بے راہ روی نہیں ہونی چاہیے (ہنستے ہوئے) سیدھی سیدھی بات ہے کہ آپ آزادی اس کو سمجھتے ہیں کہ عورت کھلے عام جدید اور مختصر لباس میں پھرے تو وہ آزادی میں نہیں مانتا۔ مغرب میں وہ آزادی دے کر عورت کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ بس سٹاپ کے اوپر لڑکیوں کے عریاں فوٹو لگے ہوئے ہیں۔ سگریٹوں کے اشتہار میں بھی جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں تو اس قسم کی آزادی کو ہمیں ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ فلمی لباس اور ڈانس میں کپڑے کی قلت ہو گئی ہے۔

سوال: کیا رقص جائز ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ہندو کے مذہب میں ہے۔

سوال: کیا مسلمانوں کے لئے ممانعت ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آپ پابندی نہ لگائیں لیکن اس کو منظر عام پر نہ لائیں۔ یعنی کوئی آدمی اپنے گھر رقص کی محفلیں کرواتا ہے تو جو اس کی مرضی کرے (پنجابی میں) ''وہ کھائے کھسماں نوں''، لیکن منظر عام پر لا کر عام لوگوں کو ترغیب نہ دی جائے بات صرف یہ ہے کہ اس کی تشہیر نہ کی جائے۔

سوال: پاکستان میں سیاسی زوال کی کیا وجہ ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: پاکستان میں سیاست اور جمہوریت چلی ہی نہیں چونکہ بار بار رکاوٹیں آتی رہی ہیں اس لیے یہ عمل چل نہیں سکا۔

سوال: آپ کا اشارہ مارشل لاء کی طرف ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: مارشل لاء اور آمرانہ سیاسی حکومتیں۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستانی تاریخ کی سب سے اچھی حکومت کون سی تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں تو سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں 1958ء سے پہلے کی حکومتیں بہتر تھیں۔

سوال: یعنی 1947ء سے 1958ء تک کی حکومتیں، لیکن کس لحاظ سے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اگر اس میں تجزیہ کریں تو اس وقت غیر ملکی قرضے نہیں تھے۔ آپ اپنے وسائل کے اندر رہ رہے تھے۔ ان حکومتوں نے صرف آئین بنانے میں بہت دیر لگادی۔

سوال: بطور جج آپ کا سیاسی جھکاؤ کس طرح رہا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں بالکل کسی طرف نہیں۔

سوال: لیکن لوگ کہتے ہیں آپ میاں نواز شریف کے بہت قریب تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ بات درست ہے میاں نواز شریف سے میرا ذاتی تعلق ہے تاہم ان کے دور وزارت اعلیٰ اور وزارت عظمیٰ میں، میں چار پانچ مرتبہ سے زیادہ ان سے نہیں ملا۔ میں نے نواز شریف سے کہا کہ میں فاصلہ رکھتا ہوں۔ وہ بھی میرے پاس خود تشریف لائے تھے۔ میں صرف ایک دفعہ اپنے بیٹے کی شادی کی دعوت دینے ان کے گھر گیا تھا، ورنہ میں کبھی بھی ملنے نہیں گیا۔

سوال: بقول آپ کے آپ ملنے نہیں جاتے تھے، فاصلہ رکھتے تھے تو حکمران ناراض تو ہوتے ہوں گے۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے ساتھ تو ایسا نہیں کرتے تھے ہمیشہ میری عزت کی ہے۔ جی وہ وزیر اعظم بھی تھے تو میں جب بھی کسی میٹنگ میں گیا یا ویسے گیا تو وہ مجھے ہمیشہ باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔

سوال: مگر بے نظیر بھٹو سے آپ کا پھڈا ہو گیا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرا کوئی پھڈا نہیں ہوا (ہنستے ہوئے) میں کہیڑی جائیداد ونڈنی سی اوہدے نال'' (پنجابی میں) وہ بات سیدھی سیدھی تھی ایک میٹنگ تھی جس میں گورنر چودھری الطاف حسین (مرحوم) میں اور بے نظیر شریک تھیں۔ ججوں کی تقرری پر بات ہو رہی تھی۔ لاہور ہائی کورٹ میں کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ محترمہ نے کہا ان سیٹوں پر تقرریاں ہونی چاہئیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی سفارشات پچھلی گورنمنٹ کو بھجوائی ہیں نواز شریف حکومت میں ایک بھی تقرری نہیں ہوئی۔ عبوری حکومت میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی ضرور ہوئی ہے کیونکہ جوڈیشل سروس سے بھی ایک دو جج ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں کی عمر بڑھ گئی ہے۔ میں دوبارہ کچھ سفارشات بھیج رہا ہوں کہنے لگیں کہ ہمارے بھی کچھ لوگ ہیں۔ تو میں نے واضح الفاظ میں کہا کہ میں ان کی سفارش نہیں کر سکتا۔ مجھ سے پوچھا گیا کیوں؟ تو میں نے کہا کہ I will not have dictation جس کو میں اچھا سمجھوں گا اس کا نام بھجوا دوں گا۔ وہ چاہے پیپلز پارٹی کا ہے یا مسلم لیگ کا کیونکہ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ کیونکہ مسلم لیگ کی حکومت میں بھی میں نے ان لوگوں کے نام بھیجے تھے جن کی سیاسی وابستگی

آپ کی پارٹی کے ساتھ ہے۔ کہنے لگیں کہ مجھے علم ہے کہ آپ بڑے انصاف پسند ہیں۔ آپ ہمیں ریلیف بھی تو دیتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ میں ریلیف ان کو بھی دوں گا جو اپوزیشن میں ہیں۔ لیکن یہ ایک انتظامی فیصلہ ہے۔ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ کچھ خواتین کو جج بنائیں۔ تو میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی ایسی خاتون نظر نہیں آ رہی۔ جو کہ اس لسٹ کے معیار پر پورا اترتی ہو۔ پھر میں نے کہا کہ میں وہ نہیں کروں گا جو آپ چاہتی ہیں۔ کہنے لگیں میری سیاسی مجبوریاں ہیں۔ میں نے کہا مجھے احساس ہے لیکن میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ کیا آپ ہمارے لوگوں کو اکاموڈیٹ نہیں کریں گے میں نے کہا کہ آپ مجھے نام بتا دیں لیکن فیصلہ میں خود ہی کروں گا کیونکہ میرے بھیجے ہوئے ناموں میں کوئی کسی اور کو شامل نہیں کر سکتا نہ ہی صدر اور نہ ہی وزیراعظم۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہ مجھے ترغیب دیتی رہی لیکن میں نہیں مانا۔ اس کے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔ اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے بتایا گیا کہ آپ کو بطور جج فیڈرل شریعت کورٹ میں بھیج دیا گیا ہے۔ میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔

سوال: انکار کرنا تو مناسب نہیں تھا۔ کیا یہ جج کے شان شایان تھا۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: کیوں مناسب نہیں تھا؟ اگر وہ مجھے سپریم کورٹ میں جج بنا کر بھیجتیں تو میں چپ چاپ چلا جاتا۔

سوال، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس عام طور پر اپنی پوسٹ سے ہٹنا پسند نہیں کرتے آخر اس ایگزیکٹو سیٹ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ ایگزیکٹو نہیں عدالتی سیٹ ہے۔

سوال: لیکن اب تو روایت بن گئی ہے کہ آپ کے بعد جب بھی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو کہیں اور بھیجنے کا کہا جاتا ہے تو وہ مزاحمت کرتا ہے آپ نے ایسا کیا، آپ کے بعد جسٹس مینگل نے بھی ایسا کیا، آپ نے کیا یہ ایک اور نئی روایت نہیں ڈال دی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جسٹس مینگل نے مجھے فالو کیا۔

سوال: آپ کے واقعے کے بعد ہی جسٹس مینگل نے سپریم کورٹ میں آنے سے انکار کیا تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: لیکن انہوں نے تو غلط کیا میں اس وقت کوئٹہ میں تھا میں نے جسٹس مینگل سے کہا کہ تم غلط بات کر رہے ہو۔

سوال: تو آپ کو اصل اعتراض شریعت کورٹ میں بھیجے جانے پر تھا نہ کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے سے ہٹانے پر تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں عدلیہ کی آزادی پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ ہائی کورٹ کا

چیف جسٹس رتبے اور عہدے کے اعتبار سے سپریم کورٹ کے جج کے برابر ہوتا ہے اور شریعت کورٹ کا جج ہائی کورٹ کے جج کے برابر ہوتا ہے مجھے شریعت کورٹ کا جج بنانے کا فیصلہ میری تنزلی تھی اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

سوال: لیکن اگلی حکومت میں آپ چیف جسٹس شریعت کورٹ بن کر چلے گئے۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: بے نظیر بھٹو کے دور میں جب میں شریعت کورٹ نہیں گیا تو مجھے تین ماہ کے بعد ریٹائرڈ کر دیا گیا حالانکہ بات یہ تھی کہ میں تو ایک اصول کے تحت جج شریعت کورٹ نہیں گیا تھا بعد میں عبوری حکومت آئی تو وزیر اعظم ملک معراج خالد خود میرے گھر تشریف لائے میں نے کہا کہ میری شریعت کورٹ میں جج کی تقرری کا حکم نامہ واپس لیا جائے انہوں نے وہ واپس لے لیا تب میں نے چیف جسٹس شریعت کورٹ بننا منظور کیا۔

سوال: پنجاب اسمبلی کی تحلیل کے حوالے سے آپ کی عدالت میں میاں منظور وٹو کا مقدمہ آیا تو کئی انگلیاں اٹھی تھیں ایسا لگتا تھا کہ آپ اس مقدمہ میں غیر جانبدار رویہ نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ منظور وٹو کے ساتھ بھی عدالت میں توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا؟ کیا یہ ایک جج کے شایان شان تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں بالکل نہیں، منظور وٹو تو اس کے بعد میرے پاس آتے رہے ہیں ان کے خلاف فیصلہ میرٹ پر ہوا ہے۔

سوال: تو کیا عدالت کو وزیر اعلیٰ کے اسمبلی توڑنے کے آئینی اختیار کو واپس لینے کا حق تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: لیکن جس طریقے سے اسمبلی توڑی گئی وہ غلط تھا عدم اعتماد کی تحریک موصول ہونے کے بعد اسمبلی توڑنے کا فیصلہ غلط اقدام تھا۔

سوال: پاکستان کی تاریخ میں پہلی آپ نے وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کی طرف سے اسمبلی توڑنے کے آئینی اختیار پر قدغن لگا دی۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ بہت بڑا فیصلہ تھا اس وقت کی حکومت کے خلاف فیصلہ تھا، صدر غلام اسحاق بہت طاقتور تھے لیکن ان کے خلاف فیصلہ دیا جب کہ عاصمہ جیلانی کیس یا باقی بڑے فیصلے تو حکومتیں جانے کے بعد دیئے گئے۔

سوال: لیکن آپ کے فیصلے سے متاثر ہونے والوں کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ سیاسی تعصب کی بنا پر کیا گیا۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: اس بات کا آپ خود جائزہ لیں اگر خرابی ہوتی تو اس کے خلاف اپیل

کی جاتی لیکن اس فیصلے کے خلاف کسی نے اپیل نہیں کی۔

سوال: کیا آپ کے اس فیصلے سے معاشرے پر کوئی مثبت اثر پڑا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بالکل پڑا اور وہ یہ کہ کسی کو بھی آئین کے دائرہ کار سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

سوال: اسی واقعہ کے ساتھ سیکرٹری پنجاب اسمبلی کے اغوا کا معاملہ بھی تھا لیکن عدالت نے اس پر کچھ نہیں کیا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ہم نے تو پولیس کو بلایا تھا آئی جی صاحبان کو طلب کیا تھا کہ اس معاملے کی کھوج لگائیں۔

سوال: لیکن کیا یہ درست نہیں کہ آپ کا عدالت میں منظور وٹو اور چیف سیکرٹری سے رویہ اچھا نہیں تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: حفیظ پیرزادہ منظور وٹو کے وکیل تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کمال کی برداشت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

سوال: کچھ ججوں کے رویے پر اعتراض اٹھا تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھیں میں ججوں پر قدغن تو نہیں لگا سکتا تھا میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ کسی سپیریئر جج پر کوئی بات نہ ہو لیکن اصل بات یہ ہے کہ مجھے تو اس فیصلے پر فخر ہے۔

سوال: لیکن متاثرہ فریق تو ان فیصلوں کو ''چمک'' کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

جسٹس (ر) محبوب احمد: کیا سوئس کورٹ کا فیصلہ بھی چمک کا نتیجہ ہے جسٹس قیوم کے فیصلے کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ ''چمک ہیں''، لیکن سوئٹزرلینڈ میں بھی بالکل وہی ہو رہا ہے جو یہاں ہوا ہے۔ جسٹس قیوم کا فیصلہ درست تھا۔ انسان کو تعصبات پر چلنا ہی نہیں چاہیے میں بالکل ایمانداری سے آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرے کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف تعصبات نہیں تھے بلکہ نواز شریف کا مجھ سے گلہ ہی یہ تھا کہ یہ ہمارے خلاف باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہمارے خلاف فیصلے دیتے آیا ہے۔ بے شمار کیسز میں ان کے خلاف فیصلے دیئے بے نظیر بھٹو نے خود تسلیم کیا تھا کہ تم نے ہمیشہ ہمیں ریلیف دیا ہے۔

سوال: نظریہ پاکستان کے نقاد کہتے ہیں کہ اگر یہ نظریہ درست ہوتا تو پاکستان کیوں ٹوٹتا؟ آپ کے خیال میں پاکستان ٹوٹنے کی وجہ کیا تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جس وقت کسی بھی چیز میں عوام کی شرکت نہ رہے تو اس میں خرابی پیدا ہوتی ہے اس وقت عوام تو حکومت کا حصہ نہیں تھے۔

سوال: تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مارشل لاء کے باعث ملک ٹوٹا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جہاں بھی عوام کی شرکت اور نمائندگی ختم ہو جائے وہاں پر عوامی حکومتی اقدامات کی حمایت نہیں کرتے۔ لوگوں کی آواز ہی نہیں سنی جاتی تھی اور جب آواز نہ سنی جائے تو پھر دو ہی طریقے رہ جاتے ہیں کہ امن وامان کو خراب کرو اور حکومت بدل دو۔

سوال: سیاست میں فوج کا کردار ہونا چاہیے یا نہیں؟ اگر ہونا چاہیے تو کتنا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جب تک سیاسی جماعتیں گراس روٹ پر نہیں جائیں گی اس وقت تک فوج کی مداخلت جاری رہے گی۔

سوال: تو آپ کے خیال میں قصور سیاسی جماعتوں کا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اس لحاظ سے بالکل قصور ہے کہ سیاسی جماعتیں گراس روٹ پر جانے کی بجائے جوڑ توڑ کر کے حکومت میں آتی ہیں ہر کوئی فوج کے ذریعے سے ہی اقتدار میں آتا ہے بے نظیر بھٹو بھی تو دو مرتبہ فوج ہی کی مدد سے اقتدار میں آئی ہیں۔

سوال: کیا پاکستان کی خارجہ پالیسی درست رہی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے خیال میں خارجہ پالیسی میں توازن نہیں ہے اب بھی ہم امریکہ کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکاؤ کیے ہوئے ہیں جو غلط ہے۔ خارجہ پالیسی اور تعلقات میں توازن ہونا چاہیے۔

سوال: بھارت کے ساتھ کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اچھے تعلقات ہونے چاہئیں لیکن سرنڈر نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوا اس وقت تک بھارت سے تعلقات بہتر ہو ہی نہیں سکتے بہتر طریقہ تو مذاکرات کا ہے بشرطیکہ بھارت رضا مند ہو اگر یہ نہیں ہوا تو پھر دوسرا طریقہ......۔

سوال: یعنی جنگ؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جنگ سب سے قابل نفرت بات ہوتی ہے لیکن قومیں قربانی دینے سے ہی زندہ رہتی ہیں ہر وقت کی مصلحت بھی ٹھیک بات نہیں ہوتی۔

سوال: تو کیا لڑ جانا چاہیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جہاں آپ اصول پر ہوں تو آپ کو لڑ جانا چاہیے۔

سوال: دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آئین کو سبوتاژ کرنے والوں کو ان کی موت کے بعد علامتی سزائیں دی گئیں، کیا پاکستان میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آئین کی بے حرمتی نا قابل معافی جرم ہے اس کی سزا بھی آئین میں پہلے سے درج ہے لیکن جب تک کسی قانون پر عملدر آمد نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی خلاف ورزی جاری رہتی ہے۔ نظریہ ضرورت نہیں ہونا چاہیے یہ نظریہ تو صرف نتائج سے بچنے کے لئے دریافت کیا گیا۔

سوال: عدالتوں نے آخر نظریہ ضرورت کے تحت فیصلے کیوں دیئے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: یہ تو اللہ ہی جانے۔ ان کے تحفظات ہوتے ہیں کہ نتائج کیا نکلیں گے نتائج سے ڈر کر یا پھر کسی کے اثر میں آ کر ایسے فیصلے کیے جاتے ہیں لیکن اس وقت آپ کے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا عدلیہ نے اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیئے گئے حالات میں کسی حد تک انہوں نے ذمہ داریاں پوری کی ہیں اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

سوال: کیا ججوں کو اپنے فیصلوں میں زیادہ بہادری نہیں دکھانی چاہیے تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بالکل انہیں بہادر ہونا چاہیے اس میں بہادری کی کیا بات ہے یہ تو ان کا فرض ہے جس کی انہیں بجا آوری کرنی چاہیے۔

سوال: کیا ججز کیس نے ملکی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ججز کیس کو لکھنے والوں نے خود ہی اس کو خراب کر دیا خود ہی اس کی خلاف ورزی کی ایک تو خود چیف جسٹس نے سنیارٹی رول کی خلاف ورزی کی اور پھر دوسرا یہ کہ جن ججز کو لے کر گئے ہوئے تھے ان کو کنفرم کر دیا اور جو ان سے سینئر تھے ان کو چھوڑ دیا۔

سوال: آپ کا اپنا آئیڈیل جج کون رہا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے جسٹس عبدالستار تھے، پھر جسٹس کارنیلس اور جسٹس شبیر بہت اچھے جج تھے۔ دونوں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

سوال: ریٹائرمنٹ کے بعد کی اپنی زندگی سے کتنے مطمئن ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بہت مطمئن ہوں۔

سوال: جج کی کتنی پنشن ہوتی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بڑی معقول پنشن ہوتی ہے میرے خیال میں چیف جسٹس کی تو 52

یا 58 ہزار کے قریب ہے اور یہ کافی رقم ہے اگر آپ اپنے آپ کو دائرہ کار میں رکھیں اور وسائل میں رکھیں تو پھر تکلیف نہیں ہوتی۔

سوال: آپ نے چیف جسٹس انوار الحق کو قریب سے دیکھا وہ کیسے جج تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اچھے جج تھے میرے ان کے بارے میں خیالات بہت اچھے تھے۔

سوال: لیکن؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: متنازعہ ہو گئے بندہ متنازعہ ہو ہی جاتا ہے ابھی جیسے آپ نے سوال کیا تھا کہ میں نے نواز شریف کے حق میں فیصلہ دے دیا اس فیصلے کو پڑھیں فیصلے میں نواز شریف کی جماعت کو جو کہ پٹیشنر تھی اس کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا بات یہ ہے کہ جج کا کام تو یہ ہے کہ صحیح بات کرے اور اصلاحی پہلو کو سامنے رکھے مجھ سے ایک دو صاحبان نے اس فیصلے کے بارے میں کہا کہ آپ نے اسمبلی کے بارے میں فیصلہ کیا اور ساتھ ہی پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ اسمبلی توڑنے کا حکم کر دیا گیا ان صاحبان کا کہنا تھا کہ ہائی کورٹ گورنر کو توہین عدالت کا نوٹس دے۔

سوال: لیکن آپ نے تو اس وقت کے گورنر چودھری الطاف حسین کو توہین عدالت کا کوئی نوٹس نہیں دیا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بھائی دیکھیں، آئین میں گورنر کو اسمبلی تحلیل کرنے کا حق تو ہے۔ ٹھیک ہے ناں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گورنر نے صحیح اقدام کیا۔ لیکن انہوں نے ہائی کورٹ کے آرڈر کی خلاف ورزی تو نہیں کی تو ہم توہین عدالت کا نوٹس کیسے دیتے، سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہائیکورٹ کے آرڈرز کو نہ تو چیلنج کیا اور نہ ہی اس میں اپنے خلاف دیئے گئے ریمارکس حذف کروانے کی کوشش کی انہوں نے آئین کے تحت اسمبلی توڑنے کا ایک آرڈر پاس کر دیا لوگوں کو یہ بات ضرور علم ہونی چاہیے کہ اس نئے آرڈر کو ہائی کورٹ میں چیلنج نہیں کیا گیا تو ہائیکورٹ خود کیسے نوٹس لے لیتی کیونکہ آئین کہتا ہے کہ ہائی کورٹ متاثرہ فریق کی درخواست پر مداخلت کر سکتی ہے۔

سوال: آخر اسمبلی تحلیل ہونے سے متاثر ہونے والی جماعت یا میاں نواز شریف کے حامیوں میں سے کوئی بھی فرد اسے چیلنج کرنے کیوں نہیں آیا تھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھیں کیا اس فیصلے سے میری غیر جذباتی اور غیر متعصبانہ سوچ کا اظہار نہیں ہوتا۔

سوال: اس فیصلے سے اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان ناراض تو ہوئے ہوں گے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: مجھ سے تو انہوں نے کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا مجھے وہ بعد میں

ملے بھی لیکن انہوں نے اس پر کچھ کہا نہیں۔

سوال: آپ جب چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ تھے تو آپ کے مخالفین کہتے تھے کہ آپ اور آپ کے ساتھی جج جسٹس قیوم آپس میں بیٹھ کر سارا کچھ طے کر لیتے تھے باقی ججوں کو بالکل لفٹ نہیں کروائی جاتی تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بالکل غلط بات ہے میرے زمانے میں ساری کی ساری عدالت کو معاملات میں شریک رکھا جاتا تھا۔ کبھی بھی چیف جسٹس نے ججوں کو اتنا زیادہ معاملات میں شریک نہیں رکھا جونیئر سے لے کر اوپر تک سب ججوں کو ڈسٹرکٹ کا انچارج بنایا ہوا تھا ہر ایک مختلف اضلاع کی انسپکشن کر کے رپورٹ لکھتا تھا۔

سوال: یہ بات کس حد تک درست ہے کہ آپ جسٹس قیوم کو بہت زیادہ ترجیح دیتے تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: دیکھیں جی بات یہ ہے کہ وہ آدمی تو قابل تھے، اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ باقی میں اسے ترجیح یا اہمیت نہیں دیتا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ کافی عرصہ میرے ساتھ ڈویژن بنچ میں بیٹھے رہے ہیں لیکن اس ڈویژن بنچ کے زیادہ تر فیصلے میرے اپنے لکھے ہوئے ہیں یہ نہیں تھا کہ مقدمات اس کو پکڑا چھوڑوں کہ یہ لو اور یہ سب کچھ کرتے رہو میرے ہوتے ہوئے ان کے خلاف کوئی بات نہیں آئی۔

سوال: کیا وجہ تھی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: اس لیے کہ میں سب کچھ اپنے طور پر کرتا تھا بعد میں چونکہ چیف جسٹسوں کی گرفت نہیں تھی، اس لیے وہ سب کچھ ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ سب سے زیادہ اہم کیسز اس نے میرے جانے کے بعد کیے آپ بے شک نکال کر دیکھ لیں۔ یہ اہم مقدمات میں نے تو نہیں دیئے جو اور لوگ بیٹھے تھے وہی اسے کیسز دیتے رہے اگر ایسی بات تھی تو کیوں اسے کیسز دیتے رہے میں تو مقدمات کی بڑی منصفانہ تقسیم کرتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا کہ ایک جج کو سارے مقدمات بھیج دوں اور کسی دوسرے کو نہ بھیجوں۔

سوال: دیکھا یہ گیا ہے کہ ماضی میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کی سربراہی کرنے والے کئی لوگ آمریت کے قریب قریب پہنچ گئے تھے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: ہوسکتا ہے کہ ایسا کرتے ہوں لیکن میں کھلے عام یہ کہتا ہوں کہ آپ عدلیہ کے کسی بھی افسر کو بلا کر پوچھ لیں کہ اپنی چیف ججی کے زمانے میں کبھی میں نے کہا ہو کہ یہ فائل روک لو یا فلاں جج کے پاس بھیج دو یا کبھی عدالتی معاملات میں مداخلت کی ہو کوئی ایک بھی ایسا واقعہ بتا

دیں میں یہ کھلے عام کہہ رہا ہوں۔

سوال: آپ کے حوالے سے ایک اور الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ شاید میرا آپ کے سامنے کہنا برا بھی لگے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ آپ نے پراپرٹی کا بزنس جاری رکھا اور بہت جائیداد بنائی؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بالکل غلط الزام ہے میرے تمام اثاثہ جات ریکارڈ موجود ہیں۔ یہ مکان جس میں میں رہا ہوں 1969ء سے میرے پاس ہے آپ میری ایک پراپرٹی بتا دیں جو انکم ٹیکس کے کاغذات میں موجود نہ ہو یا جس کے ذرائع حصول ظاہر نہ ہوں۔

سوال: مذہب کے حوالے سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے کیا آپ روحانیت کو مانتے ہیں کہیں بیعت کی ہے آپ نے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جی ہاں میں نے سائپرس کے ایک بزرگ شیخ ناظم کی بیعت کر رکھی ہے وہ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں کیمیکل انجینئر تھے اب صرف تبلیغ ہی کرتے ہیں۔

سوال: آپ ان سے ملنے قبرص جاتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نہیں وہ برطانیہ آتے ہیں۔ پاکستان آتے رہے ہیں پچھلے سال سے نہیں آئے، کچھ بیمار ہیں۔

سوال: ان میں خاص کشش کی کیا بات ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: بڑے متقی اور پرہیزگار ہیں جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔

سوال: کوئی معجزہ دیکھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں نے کسی معجزے کی طرف خود ہی توجہ نہیں دی۔

سوال: بعض طبقات پیری مریدی کو نہیں مانتے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرے خیال میں اب تو پیر خانوں کو سجدہ گاہیں بنا دیا گیا ہے حالانکہ یہاں پر تو تعلیمی مراکز ہوتے تھے ایک زمانے میں یہاں خانقاہی نظام ہوتا تھا جتنی خانقاہیں ہوتی تھیں اتنے ہی تعلیمی ادارے بھی ہوتے تھے ہم نے اس کو اس نظریہ سے دیکھنا ہی بند کر دیا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی خانقاہی نظام رائج رہا ہے وہاں تعلیم صحیح طریقے سے ترویج پاتی رہی ہے یہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت کے مسلمان جدید علوم سے بہرہ ور تھے اور اس کی وجہ خانقاہی نظام تھا انگریزوں نے اس نظام کو تباہ کر دیا اور جس پیری مریدی پر تنقید ہوتی ہے یہ اسلام کی دی ہوئی نہیں ہے یہ انگریز کی دی ہوئی ہے۔

سوال: حسن کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: حسن کو پسند کیا جاتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں جو اسے ناپسند کروں۔

سوال: دنیا میں سب سے زیادہ حسن کہاں دیکھا؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: فطرت میں تو بے شمار حسن ہے لیکن جہاں تک انسانی حسن کی بات ہے تو لبنان چلے جائیں وہاں بڑا حسن ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ مختلف قوموں کا ملاپ ہے مختلف قوموں کے ملاپ سے جو نسل بنتی ہے وہ زیاہ حسین ہوتی ہے۔

سوال: مشترکہ خاندانی نظام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میں اسے پسند کرتا ہوں کیونکہ اس میں خاندانوں کی معاشی کمزوریاں چھپ جاتی ہیں۔

سوال: عورت کو کیسا پردہ کرنا چاہیے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: سب سے بنیادی پردہ تو حیا ہے۔

سوال: برقعہ نہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: برقع کا تو کہیں باقاعدہ ذکر یا پابندی نہیں ہے اس کو تو ایسے ہی بنالیا ہے بس اپنے آپ کو ایسا رکھنا چاہیے کہ جسم کی نمائش نہ ہو۔

سوال: پسندیدہ اداکارہ کون سی ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آڈری ہیپرن ہوتی تھی وہ بڑی اچھی اداکارہ تھی اصل میں اداکاری کا بہترین طریقہ اپنی اداکاری کے ذریعے جذبات کا اظہار ہے ایکشنز کے ذریعے آپ اپنے جذبات کا اظہار کر دیں تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اداکاری کو صرف جسم کی نمائش سمجھ لیا جائے تو اس کا کوئی تاثر نہیں پڑتا۔ مجھے کیری گرانٹ کی اداکاری بھی پسند ہے۔

سوال: آپ صرف انگلش فلمیں دیکھتے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: جی ہاں! کیونکہ میں لمبی فلمیں نہیں دیکھ سکتا ہماری فلمیں لمبی بہت ہوتی ہیں ہماری فلموں میں اصلاح یا تعلیم کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔

سوال: پسندیدہ گلوکارہ؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: نور جہاں بہت بڑی گلوکارہ تھیں ان کی آواز دلکش اور شخصیت پرکشش تھی۔

سوال: پسندیدہ شاعر؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: حفیظ تائب (مرحوم) کے نعتیہ کلام کی اہمیت ہے کیونکہ اس میں

بہت معنویت پائی جاتی ہے وہ صرف جذباتیت سے کام نہیں لیتے تھے اگر دوسرے زاویئے سے جائزہ لیں تو غزل میں غالب سے بڑھ کر کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ جہاں تک فلسفیانہ شاعری کا تعلق ہے اس میں علامہ اقبال کا بہت بڑا مقام ہے میرے خیالات ان سے ملتے جلتے ہیں۔

سوال: کیا مستقبل میں سیاست میں آنے کا ارادہ ہے؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرا ذہن اس طرف مائل نہیں ہے۔

سوال: تو کیا ریٹائرڈ زندگی سے ہی لطف اندوز ہو رہے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: آپ مجھے ریٹائرڈ نہیں کہہ سکتے آج کل بھی میں بہت سے فلاحی منصوبوں پر کام کر رہا ہوں۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کے بورڈ آف مینجمنٹ کا چیئر مین ہوں گلاب دیوی ہسپتال لاہور اور لیاقت نیشنل ہسپتال کی ایگزیکٹو کا ممبر ہوں گلشن راوی ہسپتال میں چیف پیٹرن کے طور پر کام کر رہا ہوں طویل عرصہ تک ہلال احمر کے چیئر مین کے طور پر کام کرتا رہا۔ قلی فاؤنڈیشن کا بھی چیئر مین ہوں۔

سوال: کیا قانون سے متعلق بھی کچھ کام کر رہے ہیں؟

جسٹس (ر) محبوب احمد: میرا پختہ یقین ہے کہ سپریم کورٹ کے ججوں اور خاص کر چیف جسٹس کو ریٹائرڈ ہو کر کسی بھی طرح کی پریکٹس نہیں کرنی چاہیے ہاں انہیں معاشرے کی قانونی معاملات میں مدد ضرور کرنی چاہیے لیکن اس سے ذاتی مفادات یا فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہیے۔

انٹرویو: جنوری 2005ء (مطبوعہ) جون 2007ء غیر (مطبوعہ)

اشاعت: 6 فروری 2005ء جنگ سنڈے میگزین

13 فروری 2005ء جنگ سنڈے میگزین

چیف جسٹس آف پاکستان

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال

مفکر پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے فرزند ہونے کی حیثیت سے پاکستان میں پہلے ہی محترم شخصیت تھے لیکن اپنی ذاتی قابلیت سے وہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ بنے اور بعد ازاں سینیٹر بھی رہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال جہاں سیاست، مذہب اور فلسفہ کے حوالے سے جدت فکر کے حامل ہیں وہاں شارحین اقبال میں بھی ان کی سوچ سب سے الگ ہے۔ وہ حضرت علامہ اقبال کی شاعری کی روایتی مذہبی تشریح سے انحراف کرتے ہوئے انہیں ایک ''بنیاد پرست مسلمان'' کی بجائے جدید اور لبرل مسلمان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی فکر کے بارے میں ایک یورپی ادیب نے کہا تھا: ''علامہ اقبال جس گزرگاہ کو کھڑکی کے طور پر دیکھتے تھے جاوید اقبال نے اس کھڑکی کو دروازہ بنا دیا ہے''۔ ڈاکٹر جاوید اپنے والد کی فکر کو شاعری سے زیادہ اہم گردانتے ہیں۔ وہ اقبال کی فکر کے حوالے سے سب سے زیادہ اہمیت ان کے چھ لیکچرز کو دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق وہ فکر اقبال کے قائل ہیں اور ان کی سب سے زیادہ نظر بھی اقبال پر بطور مفکر رہی ہے۔ وہ معترضین کی اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ ان کے نظریات اپنے والد سے متضاد اور مختلف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صرف وہی فکر اقبال کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال دوبارہ بھی سیاست میں سرگرم رہے ایک بار 1970ء میں وہ بھٹو اور جنرل سرفراز کے مقابلے میں لاہور سے الیکشن لڑے لیکن ان کی ضمانت ضبط ہو گئی بعد ازاں بھٹو نے انہیں ہائیکورٹ کا جج بنا دیا پھر وہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے اور بعد ازاں سپریم کورٹ کے جج کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں وہ مسلم لیگ کے سینیٹر بھی بنے لیکن زیادہ متحرک نہ ہو سکے۔ ان کی نظر میں آئیڈل سیاست جناح اور اقبال کی تھے۔ شاید اسی لیے وہ آج کی سیاست میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال سے مختلف اوقات میں کئی بار گفتگو ہوئی۔ ان کی فکر کی جدت کے حوالے سے یہ تمام اہم انٹرویو ہیں اور ان کا مطالعہ فکر کو جلا بخشتا ہے۔

اہم نکات

☆ بھٹو کا مقدمہ فوجی آمریت نے شرارت کے تحت سول عدالت میں بھیجا۔
☆ بھٹو آمر تھا بے نظیر کا رجحان جمہوریت کی طرف ہے انہیں جمہوریت پرست کہا جا سکتا ہے۔
☆ دو حکمرانوں کو شہید بنا کر ہم نے تاریخی روایت کے خلاف کفر کا ارتکاب کیا۔
☆ فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوتا تو جنرل ضیاء فوجی عدالت کے ذریعے وہی کچھ کرتے جو انہوں نے کرنا تھا۔
☆ چیف جسٹس ہوتا تو کہتا کہ بھٹو کا مقدمہ فوجی عدالت میں چلالیں۔
☆ جے یو آئی اور دیوبند کے علماء کا قائداعظم اور اقبال کی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔
☆ اقبال کی فکر ان کے ''چھ لیکچر'' میں ہے جنہیں وہ چھپوانے کی ہمت نہ کر سکے۔
☆ ہماری سیاست میں موجود علماء کے پاس علم کے سوا سب کچھ ہے۔
☆ مسلم لیگ کی قیادت بھی فکر اقبال اور جناح سے لاعلم ہے۔
☆ شریعت بل کا مقصد اقتدار کو طول دینے کے سوا کچھ نہیں۔ نہ اس کی اسلام سے کوئی مناسبت ہے۔
☆ ملوکیت کے دور میں بننے والی فقہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔
☆ پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کو ''ڈنڈا'' ہی اکٹھا کر سکتا ہے۔
☆ ''بچے'' شرارتیں کریں گے تو ''ماسٹر'' خود آ جائے گا عوام ساری جماعتوں سے بے زار ہیں۔ فوج پر بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے۔
☆ سندھ میں کارروائی فوج نے کی اور اس کا کریڈٹ بھی فوج کو جاتا ہے، ایم کیو ایم کی کارروائیوں میں پی پی پی اور آئی جے آئی برابر کی شریک ہیں۔
☆ پاکستان میں مکمل جمہوریت نہیں ''کنٹرولڈ ڈیموکریسی'' ہے۔
☆ مغرب کو ناراض کرنے کی بجائے ایٹمی پروگرام ترک کر دیا جائے۔
☆ شاید جنرل ضیاء جنسی درندگی کا نشانہ بننے والی خواتین کی آہوں کے باعث موت کا شکار ہوئے۔
☆ مسلم لیگ مذہبی جماعت ہے نہ سیاسی، یہ منافقت کا ملغوبہ ہے۔ کوئی پنجابی اس کا صدر نہ ہو تو اچھا ہے۔

انٹرویو(I)

سوال: علامہ اقبال کا تصور پاکستان کیا تھا؟ اور پاکستان میں عملی طور پر ان کے نظریات پر کہاں تک عمل ہوا؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: جہاں تک علامہ اقبال کے تخیل پاکستان کا تعلق ہے تو آپ کو ان کے کلام کے سیاق وسباق میں یہ بات نظر آئے گی کہ ان کے ذہن میں ایک نیا مسلم معاشرہ تھا وہ ایسا معاشرہ وجود میں لانا چاہتے تھے جو جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتا ہو اور اس جدید دور میں بحثیت ایک معاشرہ کے زندگی گزار سکتا ہو۔ اس معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے انہوں نے علیحدہ خطہ زمین کی ضرورت محسوس کی۔ اقبال کے ہاں اسلامی ریاست کے تصور کا اصل مقصد یہی تھا کہ یہاں اگر سرزمین ہوگی تو نیا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کا وہ مقصد کہاں تک پورا ہوگا؟ قائداعظم نے برصغیر کے لوگوں کو پاکستان کی شکل میں زمین تو لے کر دے دی اب اصولاً تو مسلم اکثریت والے علاقوں کو اپنی علیحدہ فیڈریشن بنانے کا موقع ملنا چاہیے تھا اور وہ فیڈریشن پاکستان کی شکل میں بن بھی گئی۔

جب مسلمانوں کو قطعہ زمین مل گیا تو سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اس قطعہ میں ریاست کی شکل کیا ہو، اقبال کے ہاں یہ ریاست ایک اسلامی ریاست تھی۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اقبال کے ہاں اسلام کے معنی کیا تھا اقبال اپنے ایک لیکچر میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ توحید کا اصل مقصد انسانی اتحاد، مساوات اور آزادی ہے۔ انہوں نے تو مسلم اتحاد، مسلم مساوات یا مسلم آزادی کی بات نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال کے ہاں اسلام کا تصور انسان دوستی پر مبنی ہے اور نئی ریاست کے قیام کا بنیادی اصول انسان دوستی اور انسانیت پر ہوگا یعنی اسلام کی بنیاد انسانیت اور مساوات کی بنیاد پر معاشرہ ہے نہ کہ جاگیرداری اور انسانی امتیاز اور یہی اقبال کی نگاہ میں اسلام کا تصور تھا۔

سوال: جمہوریت کا تصور اقبال کے نزدیک کیا تھا؟ کیا وہ پارلیمانی جمہوریت کے حق میں تھے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اقبال کے نزدیک جمہوریت کا تصور یہ تھا کہ ایسی جمہوریت قائم ہو جس کی بنیاد انسانیت پر ہو۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اقبال نے پارلیمانی نظام کو جمہوریت کہا ہو۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم جمہوریت کے تصور کو تسلیم کریں۔ اپنی شاعری میں انہوں نے

جمہوریت پر تبصرہ آرائی کی ہے اور اس کے خلاف بھی لکھا ہے۔ علی گڑھ کالج میں ایک طالب علم نے علامہ اقبال سے سوال کیا کہ ایک طرف تو آپ اپنی شاعری میں جمہوریت کے خلاف ہیں جب کہ دوسری طرف آپ جمہوریت کو اسلام کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جواب دیا کہ میں نے اپنی شاعری میں جمہوریت پر تبصرہ کر رکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سیاسی شخص جمہوریت پر اس قسم کا یا اس سے بھی زیادہ اختلاف کر سکتا ہے آپ یہ بتائیں کہ اس کا نعم البدل کیا ہے؟ بادشاہت یا آمریت لیکن یہ نظام آپ کو قابل قبول نہیں ہوں گے۔ لہٰذا جب تک جمہوریت کا کوئی نعم البدل نہیں مل جاتا تمام خرابیوں کے باوجود اسے قبول کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے پہلو ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے جمہوری نظام کو اسلام کے زیادہ قریب پایا۔

سوال: اسلام کی تعبیر کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک پارلیمنٹ اجتہاد کر سکتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: علامہ صاحب کی پارلیمنٹ سے مراد مجلس شوریٰ تھی، لفظ پارلیمنٹ سے مراد یہ نہیں کہ وہ پارلیمانی نظام کے حامی تھے بلکہ پارلیمنٹ سے مراد منتخب ہونے والے قانون ساز افراد ہیں نہ کہ نامزد کردہ افراد۔ پارلیمنٹ مسلم عوام کی نمائندہ منتخب افراد پر مشتمل ہونی چاہیے جسے علامہ اقبال اجماع کا حق بھی دیتے ہیں۔ وہ قانون سازی کا کام بھی پارلیمنٹ کو سونپتے ہیں یہ قانون سازی اسلامی ہو یا سیکولر یعنی ساری قانون سازی اسلام تو نہیں ہے فرض کریں کہ آپ پی آئی کے لیے کوئی قانون بناتے ہیں تو بظاہر اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قانون سازی تین طریقے سے ہو سکتی ہے: (۱) خالصتاً اسلامی قانون سازی (۲) وہ قانون سازی جس میں پہلے سے موجود قوانین کی اسلام سے تصدیق کرائی جائے (۳) ایسی قانون سازی جس کے متعلق اسلام غیر جانبدار (Indifferent) ہو۔ اس سیاق و سباق میں اقبال کے نزدیک جمہوریت کا تصور یہی ہے کہ آپ اسے عوام کی رضا کے بغیر نہیں چلا سکتے۔ یہ تو اقبال کا سیاسی نظام کے بارے میں نظریہ تھا۔ یہاں میں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ علامہ اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد روحانی جمہوریت کا قیام ہے۔ برصغیر میں اسلامی ریاست کے متعلق روحانی جمہوریت کی اصطلاح پہلی مرتبہ علامہ اقبال نے استعمال کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''روحانی غلامی'' اور ''روحانی آزادی'' کی اصطلاح بھی استعمال کی۔ میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ علامہ اقبال نے روحانی جمہوریت کا تصور میثاق مدینہ سے لیا۔ میثاق مدینہ پہلا تحریری آئین ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے متعارف کرایا۔ اس میثاق میں رسول ﷺ نے امت واحدہ کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت میں یہودی بھی شریک ہو سکتے ہیں عیسائی

بھی اور کافر بھی۔ لہٰذا یہ معاملہ ایک نظریہ کو تشکیل دیتا ہے جس کی بنیاد انسانیت پر رکھی گئی ہو۔ دوسری چیز جو میرے ذہن میں آئی وہ ایک قرآنی آیت ہے جو روحانی جمہوریت کے حوالے سے ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کو علیحدہ قانون اور طرز حیات دیا۔ اگر ہم چاہتے تو تم سب کا مذہب ایک ہی ہوتا لیکن یہ ہم نے نہیں چاہا کس بنا پر کہ ہمیں دیکھیں کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس سے تم نے فائدہ اٹھایا ہے یا نہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ نیک اعمال میں سبقت لے جانے کی کوشش کرو اور وہ وقت آئے گا جب آپ سب میرے سامنے لائے جاؤ گے اور ہم تمہیں بتائیں گے کہ تمہارے اختلافات کیا تھے۔ اگر اس آیت پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کیوں یہ کہتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تم سب کا ایک ہی مذہب ہوتا لیکن اس وقت دنیا میں مذہب کی تقسیم یعنی یورپ میں عیسائی، مشرق وسطیٰ میں مسلمان، ہندوستان میں ہندو اور چین میں بدھ ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اسلام کہتا ہے کہ نیک اعمال میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرو اختلافات مت پھیلاؤ۔ نفرت مت ابھارو۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! یہاں ایک تضاد ابھرتا ہے کہ علامہ اقبال نے جمہوریت کے تصور کی بھی حمایت کی ہے لیکن جب ہم امت واحدہ یا روحانی جمہوریت کے تصور کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں جمہوریت کی مخالفت کرتے ہیں اور ہندو اکثریت کو تسلیم نہ کرکے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا ہم ایسی جمہوریت چاہتے ہیں جس میں صرف مسلمان جیت سکیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: دوقومی نظریہ کی بنیاد خالصتاً سیاسی ہے کیونکہ ہندوستان کے سیاسی سیٹ اپ میں مسلمان کے حقوق کے تحفظ کا امکان نہیں تھا لہٰذا سیاسی طور پر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمان علیحدگی اختیار کرلیں۔ یہ صورت آپ کو دنیا میں کئی اور جگہ بھی نظر آ رہی ہے مثلاً یوگوسلاویہ، کسوو وغیرہ، علامہ اقبال کہتے ہیں۔

Nationalism is not in confilct with islam in Muslim majority countries. There islam accomodates nationalism because thier nationalism and islam are one and the same thing. it comes into confilict only where the Muslims are in a minority and there if the Muslims minority has majority in a specific viable territory, they have a right to claim self determination on the basis of a distinct culture and unt.

یعنی مسلم اکثریتی علاقوں میں نیشنلزم اور اسلام کا تضاد نہیں البتہ مسلم اقلیت والے علاقوں میں مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کی وجہ سے خود مختاری ضروری ہے۔ یہ ایک عملی سوچ ہے کہ یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ یہ ایک سیاسی حقیقت تھی جو علامہ صاحب نے ہندو مسلم علیحدگی کی تجویز کی صورت میں بیان کی لیکن جب آپ نے علیحدہ مملکت حاصل کر لی پھر اقبال آپ کو بتا رہے ہیں کہ وہ کس قسم کی مملکت ہونی چاہیے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب اس نقطہ نظر سے تو ہماری بھارت سے دشمنی کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: انڈیا سے ہماری دشمنی ایک الگ چیز ہے۔ انڈیا سے ہمارے اختلافات کشمیر کے مسئلے کی وجہ سے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے جو اسی طرح حل ہونا چاہیے تھا جس طرح پاکستان کا مسئلہ۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو جاتا تو ہمارے انڈیا سے اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ پاکستان کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان میں جو مستقل خانہ جنگی ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر انگریز ہمارے درمیان اس قسم کے مسائل نہ چھوڑ کر جاتا تو ہندوستان اور پاکستان ایسے مثالی ممالک ہوتے جن میں اس طرح آزادانہ آمد و رفت ہوتی جس طرح امریکہ اور کینیڈا میں ہے، ہم اپنا زیادہ تر کلچر تو ہندوستان میں چھوڑ آئے ہیں۔ جس طرح سکھوں کے اکثر مذہبی مقامات یہاں پر ہیں۔ میں نواز شریف کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ ہماری نئی نسل کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان سے ہمارے اختلافات دور ہوں پرانی نسل قیام پاکستان کے وقت کے نفرت آمیز مناظر کو دیکھ کر ذہنی طور پر منجمد ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب ایک تازہ سوچ آگے آنی چاہیے تا کہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے نہ کہ پرانی پوزیشن برقرار رکھی جائے۔ پرانی پوزیشن اب متروک ہو چکی ہے۔ ہمیں نئی سوچ کو آگے لانا ہو گا اور یہ نئی نسل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سوال: آپ نے پاکستان کے پچاس سال دیکھے۔ ان پچاس سالوں میں ملک میں علامہ اقبال کے تصورات پر کس حد تک عمل ہوا؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: پاکستان کا جو تصور اقبال کے ہاں ملتا ہے اس مسئلے پر قائداعظم اور علامہ اقبال کی سوچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پاکستان بنتے وقت اس میں خودداری اور روشن خیالی تھی وہ مفقود ہوتی چلی گئی اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان ہمیشہ ان عناصر کے ساتھ سمجھوتہ کرتے چلے آئے جو ابتدا ہی سے پاکستان کے مخالف تھے۔ ہم نے ان رجعت پسندوں کا کبھی مقابلہ نہیں کیا کہ اس نظریہ پر پاکستان وجود میں آیا اور یہاں یہی نظریہ رائج ہونا چاہیے اس ملک میں قومی یکجہتی کے لیے ضروری تھا کہ ہم کسی ایسی بحث کو نہ چھیڑیں جس سے ہم میں نفاق پیدا ہو لیکن آپ دیکھیں کہ ذوالفقار

بھٹو کو گرانے کے لیے نظام مصطفیٰ تحریک چلائی گئی جس میں اے این پی جیسے سیکولر عناصر بھی شامل تھے۔ انہی عناصر نے بھٹو کو کہا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دو۔ جسے بھٹو جیسے لبرل شخص نے قبول کر لیا۔ اس پر سمجھوتہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بھٹو کو اقتدار کی ضرورت تھی۔ جمعہ کی چھٹی، ریس اور شراب پر پابندی بھی اسی وجہ سے لگائی کہ مولویوں کو دکھایا جا سکے کہ اس نے اسلام نافذ کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود مولوی حضرات مطمئن نہیں ہو سکے کیونکہ ان کا مقصد اسلام کا نفاذ نہیں تھا بلکہ وہ بھٹو سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اب بات یہ ہے کہ ہم کسی کو اقتدار پر بٹھانے یا ہٹانے کے لیے اسلام کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن اگر کوئی اقبال یا قائداعظم کے نظریات کا حامی ہوتا تو وہ استعفیٰ دے دیتا لیکن اقتدار کے لیے کوئی سمجھوتہ نہ کرتا۔ اس کے بعد کی صورت حال دیکھ لیجئے کہ نیویارک جیسی جگہ پر مسلمانوں میں فرقہ پرستی قائم ہو گئی ہے۔ وہاں ایک ایسا شخص بھی پکڑا گیا جس نے دیوار پر ایک دوسرے کے فرقے کے کافر ہونے کے نعرے لکھے تھے۔

ہم اس تفریق کو کہاں تک لے جائیں گے پاکستانی، عیسائیوں کی وہاں الگ سرگرمیاں ہیں۔ امریکہ میں موجود پاکستان کے خیر خواہ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں پاکستان کا وقار بحال کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں پاکستان میں اس کے برعکس قانون سازی ہو جاتی ہے اور ہم مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔

سوال: کیا قیام پاکستان کے وقت مسلم لیگ سیکولر نظریات کی حامی تھی یا پھر آپ آج اور ماضی کی مسلم لیگ کے نظریات میں کوئی فرق دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ اس کو اس انداز سے نہ دیکھیں میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کی سوچ سیکولر نہیں۔ ان کی اسلام کی جو تشریح تھی وہ سیکولرازم سے بہتر نظام تھا۔ قائداعظم انسانی مساوات کا تصور اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے۔ ان بانیاں پاکستان کے ذہن میں ریاست کا جو تصور تھا وہ سیکولر نہیں تھا۔ سیکولرازم کو برا سمجھنا عیسائیوں کی سوچ ہے۔ اسلام کے ساتھ سیکولرازم کا تضاد نہیں ہے، ہماری یہ سوچ غلط ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بانیان پاکستان کا تصور ایک لبرل ریاست کا تصور ہے وہ انسانیت کے لیے ایک الگ ریاست بنانا چاہتے تھے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلم لیگ نے ہی اپنے بانیوں کے تصور کو چھوڑ دیا۔ اس ملک کی پچاس سالہ زندگی میں نصف سے زیادہ عرصہ مارشل لاء نافذ رہا۔ خواہ وہ ایوب خان کا مارشل لاء ہو، یحییٰ خان کا یا ضیاء کا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس کے برانڈ کا اسلام یہاں نافذ ہوا اس کا تعلق اس تصور سے نہیں ہے جو قائداعظم یا اقبال کے ہاں تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ

یہ اسلام کی ضیائی شکل ہے جو ملک میں چل رہی ہے۔اب موجودہ مسلم لیگ کی طرف آیئے۔ مسلم لیگ کو ابھی تک نظریاتی مسائل کی طرف توجہ کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر غور کیا جائے اور میری خواہش ہے کہ ہم مسلم لیگ کو اس راہ پر لائیں جو قائداعظم اور علامہ اقبال کا راستہ تھا مگر ملکی حالات اس طرح کے ہوتے گئے کہ ہم اس طرف توجہ نہیں دے سکتے۔فرقہ پرستی کی لڑائی ان کے بس کی بات نہیں ہے۔اس وقت تو ہماری نظریاتی اساس فتنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ہم ایک دوسرے کی گردن کاٹ رہے ہیں علامہ اقبال اور قائداعظم کا تو یہ تصور نہیں تھا اور نہ ہی اسلام کے متعلق مسلم لیگ کی یہ تشریح ہے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حکومت کو کس طرح نظریاتی اساس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

سوال: کیا علامہ اقبال کا مسلم اتحاد کا تصور قابل عمل ہے؟ جب کہ مسلمانوں کے درمیان بہت سے مسائل پر شدید اختلافات ہیں آپ مستقبل میں علامہ صاحب کے اس تصور کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: علامہ نے اس کے متعلق بڑی حقیقت پسندی سے سوچا۔علامہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے جمال الدین افغانی کی اہمیت کا احساس دلایا۔جمال الدین افغانی پہلے شخص تھے جنہوں نے سوچا کہ مسلم دنیا کو مغربی سامراجیت سے نجات اس وقت مل سکتی ہے جب تمام مسلمان اکٹھے ہو جائیں لہٰذا انہوں نے سوچا کہ تمام مسلمان ممالک کی فیڈریشن بنا کر ترکی کے سلطان کو آئینی سربراہ بنا دیا جائے لیکن ان کی سکیم قابل عمل ثابت نہ ہو سکی پہلی جنگ عظیم کے بعد بادشاہت ختم ہو گئی اور قومی ریاستوں نے جنم لیا۔قومی ریاست بھی مغرب کا تصور ہے اسلام تو امہ کا تصور دیتا ہے۔آج مغرب کی تہذیب میں دو چیزوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ایک قومی ریاست اور دوسرا سیکولرازم جب کہ اسلام ان دونوں چیزوں کے خلاف ہے۔

سیکولرازم کے مقابلے میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ امریکہ کے نئے ورلڈ آرڈر کی بنیاد سیکولر ازم اور قومی ریاست ہے لیکن ہمارا یہ تصور نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس اسلامی نظام کا تصور ہے اور اسلامی نظام کو وہ اپنی تہذیب اور کلچر کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔امریکہ اور یورپ میں اس سوچ کو آگے بڑھانے والی یہودی قوتیں ہیں۔اقبال کے ہاں یہی تصور ملتا ہے کہ قومی ریاست کو قبول کیا جائے اور مسلم ممالک آپس میں معاشی، عسکری اور ثقافتی معاہدے کریں۔اسلامی سربراہی کانفرنس کا تصور بھی علامہ کے تصور کے قریب قریب ہے۔''اوآئی سی'' کا تصور اقبال نے نہیں دیا بلکہ میں اقبال کے اس تصور کو''اوآئی سی'' کے تصور سے زیادہ درست سمجھتا ہوں اسلامی ممالک آپس میں تضادات کا شکار ہیں۔ہر مسلمان ملک دوسرے ملک سے مختلف ہے۔کوئی امریکہ کے زیراثر ہے کوئی بائیں بازو کا حامی

ہے کچھ سیکولر نظام کے حامی ہیں۔ یہ کیسے اکٹھے ہو سکتے ہیں یہ تو بہت سی بلیاں ہیں جن کی دمیں آپس میں باندھ دی گئی ہیں۔ وہ آپس میں لڑتی رہیں گی جیسا کہ ایران عراق جنگ اور بعدازاں عربوں کی صدام حسین کے خلاف جنگ میں ہوا۔

اس وقت عرب قومیت کا نعرہ کہاں گیا؟ اقبال نے قابل عمل حل یہ دیا ہے کہ یہ مما لک انفرادی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کریں لیکن ہمارے نظریہ کا ایک حصہ بہت اہم ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اگر ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان ملک سے تضاد ہے تو پاکستان خارجہ پالیسی کے اعتبار سے ہمیشہ غیر جانبدار رہا ہے اور مسلمان آزادی کے لیے کوشش کرتے ہیں تو پاکستان نے ہمیشہ اقوام متحدہ میں ان کا ساتھ دیا ہے جیسے مراکش، الجزائر، فلسطین وغیرہ ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی اقبال کی سوچ کے قریب ہے کیونکہ ہم نے کبھی بھی اس مسئلے پر بنیادی اصولوں کو نہیں چھوڑا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب کیا موجودہ حالات میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی لڑائی اور احتساب سے قومی سلامتی متاثر نہیں ہو سکتی؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: قومی سلامتی کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی بڑا لیڈر بھی کوئی جرم کرتا ہے تو اسے اس بنا پر نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ سندھی، بلوچی، پنجابی یا پختون ہے۔ ملک کے خلاف جو کوئی بھی کام کرے وہ نہیں بچنا چاہیے۔ حکومت وقت ملک میں موجود مسائل کے حل کے لیے جو سیاسی طریقہ کار اختیار کرتی ہے اس کے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا بڑا مشکل ہے۔ میں مسلم لیگ کا رکن تو ہوں لیکن مجھے کوئی خاص اختیارات حاصل نہیں ہیں میں تو ایک دانشور ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ اس ملک میں دانشوروں کی کیا حیثیت ہے۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ میری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میں اپنی حیثیت کو جانتا ہوں لیکن جو بات میرے دل میں ہوتی ہے وہ میں کہتا رہتا ہوں۔

سوال: پاکستان میں ہمیشہ اسلامی نظام کے تضاد کا دباؤ رہتا ہے جواب بھی موجود ہے اس بارے میں قائداعظم اور علامہ اقبال کے تصورات کیا تھے؟ مذہبی جماعتوں کا مطالبہ کیا ہے اب تک جو اسلام نافذ ہو چکا ہے کس حد تک صحیح ہے اور کیا ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اسلامی ریاست کا جو تصور قائداعظم اور علامہ اقبال کے ہاں ملتا ہے ہم اس سے بہت دور جا چکے ہیں۔ اس تصور کے ساتھ تو ہماری مطابقت رہی ہی نہیں۔ جو اسلام یہاں نافذ کیا جا چکا ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے قوانین تو بنا رکھے ہیں مگر ان کے مطابق کسی کو کبھی بھی سزا نہیں ہوئی۔ توہین رسالت قانون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پادری صاحب نے مسئلے پر خودکشی کر لی وہ تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہم نے آج تک اس قانون کے تحت کسی کو سزا تو دی ہی نہیں یہ اسلام

نہیں ہے۔ آپ نے زنا کی سزا سنگساری اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا رکھی ہوئی ہے مگر آج تک یہ سزا نہیں دی گئی۔ لہٰذا زنا بھی اسی طرح جاری ہے اور چوری بھی بلکہ زنا بالجبر ہو رہا ہے۔

دوسری طرف ہم مسجدوں میں نماز پڑھنے نہیں جا سکتے کیونکہ ہمیں خدشہ ہے کہ دوسرا فرقہ ہمیں مار دے گا۔ یہ کہاں کا اسلام ہے؟ یہ اسلامی نفاذ کا کوئی طریقہ نہیں جہاں تک سود کے نظام کا تعلق ہے ہماری شریعت کورٹ نے یہ فیصلہ دے رکھا ہے کہ ایسی آمدن جس پر آپ کو کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی وہ سود ہے۔ یعنی اگر آپ نے اپنا مکان کرائے پر دے رکھا ہے تو وہ سود ہے، جہاں تک مجھے علم ہے حکومت نے اس کے خلاف اپیل کی ہوئی تھی بہر حال اس وقت آپ کی معیشت ''Stay Order'' پر کھڑی ہے آپ سود لے رہے ہیں آپ نے بینکنگ میں سعودی عرب والا طریقہ کار اختیار کیا ہوا ہے (P.L.S) پی ایل ایس اکاونٹ کے تحت آپ سود ہی لیتے ہیں لیکن اس کا نام آپ نے منافع رکھا ہوا ہے۔ جب تک آپ کی سوچ میں اجتہاد نہیں ہوگا سود سے مبرا نظام تبھی ہو سکتا ہے کہ پوری دنیا میں اسلام نافذ ہو جب آپ کو پوری دنیا سے لین دین کرنا ہے تو اس کے مطابق ہی چلنا ہوگا۔ سود مغرب کی خوشحالی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ سود مذہبی طور پر ان کے ہاں بھی منع تھا، لیکن وہ اس معاملے میں سیکولرازم کے حامی بن جاتے ہیں۔ سیکولرازم کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں عیسائی نہیں رہے۔ وہاں بھی دہرے معیار ہیں جس طرح ہندو خود کو سیکولر کہتا ہے لیکن وہ مسلمانوں کو مارتا ہے۔ اس وقت دنیا میں 80 فیصد مہاجر مسلمان ہیں۔ تمام ظلم مسلمانوں پر ہو رہے ہیں مگر مغرب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہمیں سیکولر ازم جیسے نعروں کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے ہمیں ان بنیادی اصولوں کی طرف آنا چاہیے جو ہمارے بانیوں نے مقرر کیے ہمیں اسی اسلام کی تعبیر کو قبول کرنا چاہیے جو انسانی مساوات کے نظریہ پر مبنی ہو۔

سوال: مولانا مودودی بھی اقبال کی طرح اسلام کی جدید تعبیر کے حامی تھے پھر ان دونوں میں کہاں اختلاف ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: ان دونوں میں یہی فرق نظر آئے گا جو اخوان المسلمین کی سوچ پر غور کریں گے یا پھر ایرانی انقلاب کی سوچ پر غور کریں گے۔ مغرب میں اس وقت تہذیبوں کے ٹکراؤ کی جو تحریک چل رہی ہے اس میں اسلام کو اس لیے خدشے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے کہ اسلام بنیاد پرستی پر مبنی ہے۔ بانیان پاکستان کا جو تصور مولانا مودودی کے تصور سے اختلاف کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا رویہ دوسری تہذیبوں کی مخالفت نہ کرنا ہو بلکہ ان کا معاون ہو جہاں تک اسلام کی بنیادی سوچ کا تعلق ہے تمام مسلمان بنیاد پرست ہیں وہ انقلابی بھی ہیں آپ سیاست کو بھی اسلام سے الگ نہیں کر سکتے۔ بنیاد پرست اسلام، سیاسی اسلام، انقلابی اسلام یہ ساری اصطلاحات مغرب نے بنائی ہوئی ہیں۔ اس میں

سے کوئی بھی اصلاح مولانا مودودی اور اقبال کی سوچ میں فرق واضح نہیں کر سکتی۔ مولانا مودودی اور اقبال میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اقبال کی سوچ پر امن بقائے باہمی کی ہے جب کہ مولانا مودودی کی سوچ محاذ آرائی (Confronatation) کی ہے۔ ہم نے اب یہی فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نے مغرب کے ساتھ کون سی سوچ رکھنی ہے۔ ہماری نفسیات بھی یہی کہتی ہیں "Co- existance" والی سوچ رکھی جائے ورنہ ہم مار کھا جائیں گے۔

سوال: آپ مستقبل کے پاکستان کا کیا نقشہ دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: مجھے یہ شک ہے کہ مستقبل میں یہاں اختلافی رویہ رکھنے والی سوچ زیادہ مقبول ہو گی ایک طرف طالبان ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں دوسری طرف ہم ایرانی انقلاب کی زد میں ہیں۔ آپ ہماری معیشت کی حالت بھی دیکھ رہے ہیں یہاں انقلابی حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ اسلامی انقلاب کا "شیعہ ورژن" ایران میں دیکھ چکے ہیں۔ طالبان اس انقلاب کا "سنی ورژن" ہے اکیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں ہم مزید پیچھے چلے جائیں گے۔

سوال: ہمیں ایٹمی طاقت بننا چاہیے تھا یا نہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

سوال: لیکن ڈاکٹر صاحب! دانشور حضرات تو ہمیشہ دھماکوں کی بجائے امن کے حامی رہے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ کی بات صحیح ہے لیکن اس ایٹمی دھماکوں کا ہمیں نقصان ہو یا فائدہ لیکن یہ ایک مجبوری تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا دھماکہ تو جوابی دھماکہ تھا اس لیے ہمیں بھارت کے ہم پلہ نہیں سمجھا جانا چاہیے؟

انٹرویو: جولائی، 1998ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: 19 اگست 1998ء

اہم نکات

☆ بھٹو کا مقدمہ فوجی آمریت نے شرارت کے تحت سول عدالت میں بھیجا۔
☆ بھٹو آمر تھا بے نظیر کا رجحان جمہوریت کی طرف ہے انہیں جمہوریت پرست کہا جا سکتا ہے۔
☆ دو حکمرانوں کو شہید بنا کر ہم نے تاریخی روایت کے خلاف کفر کا ارتکاب کیا۔
☆ فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوتا تو جنرل ضیاء فوجی عدالت کے ذریعے وہی کچھ کرتے جو انہوں نے کرنا تھا۔
☆ چیف جسٹس ہوتا تو کہتا کہ بھٹو کا مقدمہ فوجی عدالت میں چلا لیں۔
☆ جے یو آئی اور دیو بند کے علماء کا قائداعظم اور اقبال کی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔
☆ اقبال کی فکر ان کے ''چھ لیکچرز'' میں ہے جنہیں وہ چھپوانے کی ہمت نہ کر سکے۔
☆ ہماری سیاست میں موجود علماء کے پاس علم کے سوا سب کچھ ہے۔
☆ مسلم لیگ کی قیادت بھی فکر اقبال اور جناح سے لاعلم ہے۔
☆ شریعت بل کا مقصد اقتدار کو طول دینے کے سوا کچھ نہیں، نہ اس کی اسلام سے کوئی مناسبت ہے۔
☆ ملوکیت کے دور میں بننے والی فقہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔
☆ عدلیہ فوج کے گندے کپڑے دھوتی رہی ہے اب ایسا نہیں ہوگا۔
☆ افتخار چودھری کے واقعے نے لوگوں کو جگا دیا ہے۔

انٹرویو(II)

ریٹائرڈ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا ہے کہ ہم نے ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کو شہید بنا کر شہدائے کربلا کی بے حرمتی کی ہے ایک طرف تو حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو بھی شہادت کا وہ رتبہ نہیں دیا جب کہ پاکستان کے ان دو حکمرانوں کو شہید بنا کر ہم نے اپنی تاریخی روایت کے خلاف کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک خصوصی انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ البتہ بے نظیر بھٹو کا رجحان جمہوریت کی طرف ہے اور بے نظیر بھٹو کو جمہوریت پرست کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کا باپ آمر تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ اگر وہ مولوی مشتاق حسین کی جگہ چیف جسٹس ہوتے تو ضیاء الحق کو کہتے کہ یہ مقدمہ فوجی عدالت میں چلایا جائے۔ انہوں نے کہا بھٹو کا مقدمہ فوجی آمریت نے شرارت کے تحت سول عدالت میں بھیجا اور یہ اس کی بدنامی کا باعث بنا اگر یہ مقدمہ فوجی عدالت میں چلتا تو آٹھ دن میں فیصلہ ہو جاتا۔ انہوں نے کہا میں تو بحیثیت جج یہ سمجھتا ہوں کہ عدالت جو بھی فیصلہ کرے گی درست ہوگا اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ بھٹو کیس میں فیصلہ غلط ہوا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال نے انکشاف کیا کہ ضیاء حکومت نے اپنے طور پر یہ سوچ رکھا تھا کہ عدالت میں فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف آتا ہے تو پھر اسی وقت فوجی عدالت کے ذریعے وہی کرتے جو انہوں نے کرنا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں پیغام بھیجا تھا کہ خدا کے واسطے جاوید کو کہو کہ وہ بنچ میں بیٹھے لیکن میں نہیں بیٹھا۔ انہوں نے کہا مولوی مشتاق نے مجھے کہا تھا کہ میں بنچ میں شامل ہوں لیکن میں نے انہیں کہا کہ میں نے بھٹو کے خلاف انتخاب میں حصہ لیا ہے اور شکست کھائی ہے اس لیے میں بنچ میں کارکن نہیں بنوں گا۔

اپنے والد حضرت علامہ اقبال کے نظریات کے حوالے سے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اقبال کے نظریات کو پاکستان بدر کیا جا رہا ہے، اقبال کے تصور کو بغیر داڑھی کے ملا کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ علماء کی اکثریت اقبال کے خیالات کو پسند نہیں کرتی تاہم یہ علماء اقبال کے صرف وہ شعر پڑھتے ہیں جو ان کے مطلب کے ہوتے ہیں اور ان کی فکر کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ جمعیت علمائے اسلام یا دیوبند کے علماء نہ اقبال کے مزار پر جاتے ہیں اور نہ قائداعظم کے مزار پر ان کا قائداعظم یا اقبال کی فکر سے کوئی تعلق نہیں تاہم جمعیت علمائے پاکستان کا

تعلق ان علماء سے ہے جنہوں نے قائد اعظم کا ساتھ دیا اس اعتبار سے وہ اقبال کو صوفی اور عاشق رسول کے طور پر جانتے ہیں لیکن وہ اقبال کو بطور شاعر سراہتے ہیں بطور مفکر نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کی فکر ان کے ''چھ لیکچرز'' میں نمایاں ہے لیکن اپنی زندگی میں نذیر نیازی سے ترجمہ کروانے کے باوجود خود علامہ اقبال کو اسے چھپوانے کی ہمت نہ ہوئی کہ ان پر کفر کے فتوے لگا دیئے جائیں گے۔ مسلم لیگ کے موجودہ ڈھانچے اور فکری رویوں کے بارے میں سوال پر انہوں نے کہا کہ میں نظریاتی طور پر مسلم لیگ میں ہوں لیکن موجودہ مسلم لیگ کو علامہ اقبال اور جناح کے نظریات کا سرے سے علم ہی نہیں، اسی طرح ہمارے ملک کی سیاسی قیادت بھی سیاسی اور تمدنی سوچ سے عاری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری سیاست میں موجود علماء کے پاس علم کے سوا سب کچھ ہے۔ انہوں نے کہا بے نظیر بھٹو نے اقبال کے افکار کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اقبال کے کسی ایک شعر کا مطلب بھی نہیں بتا سکتی۔ انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ کی لیڈر شپ بھی فکر اقبال اور جناح سے لاعلم ہے۔

پاکستان میں شریعت کے نفاذ کے بارے میں سوال پر انہوں نے کہا کہ اسلام کے بنیادی اراکین مستقل ہیں جب کہ باقی چیزوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل کا مقصد اقتدار کو طول دینے کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کی اسلام سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کسی بھی فقہ کے امام کو پڑھ لیجئے وہ کہتے ہیں کہ ظلم قبول کر لو فتنہ قبول نہ کرو یعنی غاصب اور آمر کو مان لیا جائے لیکن آج کا جدید مسلمان اس تصور کو نہیں مانتا اور اسی بنا پر جس فقہ کی تدوین ملوکیت کے دور میں ہوئی ہے اسے کسی طور پر صحیح مان لیا جائے۔ انہوں نے کہا ملوکیت کے دور میں بننے والی فقہ نظر ثانی کی محتاج ہے اور جدید مسلمان کو حق پہنچتا ہے کہ اسے قبول نہ کرے اور اگر وہ صحیح مسلمان ہے تو وہ کسی بھی فقہ کی تقلید کا پابند نہیں ہو گا اور اپنی رائے قائم کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ عقائد کے علاوہ دین اور دنیا کے معاملات میں اجتہاد کی ضرورت اور اجتہاد منتخب اسمبلی کرے تا کہ اس کی رہنمائی علماء کا ایک بورڈ کرے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں ویلفیئر سٹیٹ کے راستے میں بڑی رکاوٹ آبادی میں اضافہ ہے اسے فوری طور پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ آٹھویں ترمیم کے بارے میں سوال پر انہوں نے کہا کہ آٹھویں ترمیم کے نفاذ سے پاکستان میں کنٹرول ڈیموکریسی نافذ ہو گئی ہے۔ 1962ء اور 1985ء کے آئین میں صرف یہ فرق ہے کہ اب وزیر اعظم کے نام کا ایک شعبہ قائم ہے جب کہ صدر ایوب کے زمانے میں وزیر اعظم نہیں تھا۔

انہوں نے کہا کہ موجودہ صدر کے پاس بھی صدر ایوب جیسے اختیارات ہیں اور وہ کبھی بھی منتخب لوگوں کو فارغ کر سکتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال کی جانب سے ان کو حنفی فقہ پر قائم رہنے کے

بارے میں وصیت کے سلسلے میں سوال پر انہوں نے کہا کہ علامہ اقبال نے مجھے کہا تھا کہ میں حنفی فقہ سے مناسبت رکھوں تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ دوسرے فقہ کی نسبت حنفی فقہ زیادہ لبرل ہے اور اس میں دلائل اور عقل کا استعمال نسبتاً زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا گو اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر اعتراض کیا جاسکتا ہے ایک پہلو تو ریاست کے متعلق ہے کہ فتنہ قبول نہ کرو لیکن ظلم قبول کرلو اسی طرح حنفی فقہ کے تحت اگر خاوند مفقود الخبر ہو جاتا ہے تو بیوی کو ساٹھ سال انتظار کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا نقطہ نظر ہے جسے عقل تسلیم نہیں کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حنفی فقہ میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر مسلمان کا عمل نہ بھی ہو اور ایمان سلامت ہو تو آپ مسلمان رہتے ہیں عقیدہ آپ کا ہو اور آپ بے عمل ہوں تو آپ اسلام کے زمرے سے خارج نہیں ہوتے جب کہ مدرسہ ہائے فکر کا خیال ہے کہ عمل جب تک ساتھ نہ ہو آپ مسلمان نہیں رہ سکتے صرف اکیلا ایمان ناکافی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل ہو تو اچھی بات ہے لیکن اگر نہ بھی ہو تو یہ نہیں کہ ایمان نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ آج کے جو مسلمان جو اکثر بے عمل ہیں وہ حنفی ہی ہو سکتے ہیں کوئی دوسرا مدرسہ انہیں قبول نہیں کرتا۔

انٹرویو: نومبر، 1991ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: 9 نومبر، 1991ء

انٹرویو(III)

سوال: ایک طرف نیو ورلڈ آرڈر کے بارے میں پاکستان بالخصوص اور تیسری دنیا کے ممالک میں بالعموم بہت سے شبہات پائے جا رہے ہیں کہ اس میں بہت سے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ ہو گا اور جمہوریت پروان چڑھے گی آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں تو اپنی طرف سے یہ نہیں جانتا کہ نیو ورلڈ آرڈر کا کیا معنی ہے۔ یہ اصطلاح امریکہ کی طرف سے پیش کی گئی اور اس وقت پیش کی گئی ہے جب امریکہ ایک ''یونی پولر'' قوت کے طور پر ابھرا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے مراحل کم آتے ہیں جب ''بیلنس آف پاور'' برقرار نہ رہ سکے اور ایک پاور سپریم ہو جائے۔ تاریخ میں جس وقت بھی ایسی صورت ہوتی ہے تو یہ صورت تھوڑی دیر ہی برقرار رہی ہے۔ اور اس طرح کا بیلنس قدرت ہمیشہ رکھتی ہے۔ جب آپ ''یونی پولر قوت'' کی اصطلاح میں سوچتے ہیں۔ یعنی ایک قوت رہ جائے اور وہ پوری دنیا پر حکم چلائے تو پھر یہ ایک طرح سے زمین پر خدائی اختیارات رکھنے والی بات ہو جاتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ امریکہ کے اس نیو ورلڈ آرڈر کو کسی جمہوریت کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ کی طرف سے نیو ورلڈ آرڈر کا جو نعرہ ہے کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے ''یونی پولر'' کی طاقت اپنے پاس رکھے۔ میرے خیال میں امریکہ کا یہ وہم زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ مطلب یہ کہ آئندہ عالمی جنگ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو گی لیکن موجودہ ٹیکنالوجی اور معیشت کی جنگ نے دنیا کو نئے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ نے جو نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے دنیا پر اپنی حاکمیت مسلط کرنے کی کوشش کی ہے کیا وہ اسی طرح برقرار رہے گی جس طرح امریکہ نے پاکستان کو امداد دینے سے انکار کر دیا کہ امریکہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے تیسری دنیا کے ممالک پر جمہوری اور سیاسی طور پر حکم چلانا چاہتا ہے۔

سوال: آپ کا شمار سوشل ڈیموکریسی کے تصور کے مویدین میں ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دنیا میں سوشل ڈیموکریسی میں آئیڈیل نظام ہے یا اس میں کچھ تبدیلیاں بھی آئیں ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: سوشل ڈیموکریسی کی اصطلاح سب سے پہلے لینن نے پیش کی تھی اس کے بعد جہاں تک ہماری روایات کا تعلق ہے اس میں سب سے پہلے علامہ اقبال کی تحریروں میں یہ

رنگ نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ایک خط ہے جو علامہ نے قائداعظم کے نام لکھا تھا۔یقیناً ان کے ذہن میں سوشل ڈیموکریسی کا ایک تصور تھا جس کی بنیاد وہ اسلامی شریعت پر رکھتے تھے اور یہ شریعت روایتی شریعت نہیں تھی بلکہ شریعت کے حوالے سے علامہ میں یہ تصور بڑا متحرک تصور ہے کیونکہ جب تک اس میں تحریک نہ ہو وہ بیکار ہے۔ جہاں تک دینی عقائد کا تعلق ہے اس کے ساتھ کسی چیز کی مناسبت نہیں کہ ایک شادی کی اجازت دی جائے یا چار شادیوں کی ان سب چیزوں کا تعلق معاملات سے ہے۔

سوال: اسی حوالے سے سزاؤں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے لیکن جدید دور میں خاص طور پر بے نظیر صاحبہ نے ایسی سزاؤں کو وحشیانہ سزائیں قرار دیا ہے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اس بارے میں بہت کچھ تحریر کر چکا ہوں اگر بے نظیر بھٹو صاحبہ کو اپنی تمدنی روایات سے کوئی مناسبت ہوتی یا ان روایات سے شناسا ہوتیں تو ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار نہ دیتیں۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ ہماری ایک روایت میں ایک اصلاحی انداز فکر موجود ہے۔جس طرح علامہ نے اپنی تحریروں میں حضرت شاہ علی اللہ کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے بھی اپنی تحریروں میں حضرت شاہ ولی اللہ کا ذکر کیا ہے۔تو جہاں تک سزاؤں کا تعلق ہے تو اس قوم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سزائیں عائد کی جاتی ہیں۔اور پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ بعد میں جو قومیں اسلام قبول کریں ان پر ان سزاؤں کا اطلاق سختی سے نہیں ہونا چاہیے۔اگر ہم اپنی تاریخی روایات دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ آج تک کہاں کہاں، کب تک ہاتھ کاٹنے کی سزائیں رائج رہی ہیں؟ ان سے آپ اندازہ کریں کہ ان چیزوں کا ہمارے ارکان دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ساری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔اصل چیز عقیدہ ہے اور عقیدے میں توحید اور رسالت ہے اور اس کے اصل لوازمات صوم وصلوٰۃ اور زکوٰۃ ہیں۔ان میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔اس دین کے دو پہلو ہیں: ایک پہلو تو مستقل ہے جس میں کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں آ سکتی اور دوسرا پہلو تغیر کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ ان پڑھ لوگوں کی اکثریت ہے اس لیے ہم فرسودہ خیالات کو کھینچتے چلے جا رہے ہیں۔مختلف دور اور وقت میں لوگ اپنے نظریات اور فتوے جاری کرتے رہتے ہیں۔جس طرح علامہ اقبال اور سرسید پر کفر کے فتوے لگائے گئے مگر تاریخ اور وقت خود فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی بات صحیح یا غلط ہے۔ آج علامہ اقبال یا سرسید کا نام زندہ ہے۔لیکن ان فتوے لگانے والوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان نے بہت سے جید علماء پیدا کیے لیکن مسلمانوں نے قائداعظم یا علامہ اقبال پر ہی کیوں انحصار کیا یہ کوئی مولوی لوگ نہیں تھے نہ ہی انہوں نے داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔اصل بات یہ تھی کہ ان کی اسلام کے بارے میں سوچ اصلاحی سوچ تھی

اور وہ روایتی نہیں تھے۔ اور یہ تین بڑے اجتہاد ہوئے ہیں کسی بھی عالم نے اس کی حمایت نہیں کی یعنی تین اجماع ہوئے ہیں ایک تو دوقومی نظریہ، دوسرا مسلم قومیت کا تصور اور تیسرا پاکستان، یہی وجہ ہے کہ ان تینوں نئے تخیل کی علماء کی اکثریت نے مخالفت کی۔ یعنی سوائے چند ایک علماء کے جو کہ قائداعظم کے ساتھ تھے سب علماء کرام نے اپوزیشن کا کردار کیا۔ یعنی اکثر علماء نے دوقومی نظریہ کی مخالفت کی۔ حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت نے کہا تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو اسلام نہیں رہے گا اور ہندوستان میں مسلمان نہیں رہیں گے۔ یعنی وہاں ترکی جیسی سیکولر سٹیٹ بنے گی کیونکہ اس کو بنانے والے جناح اور اقبال جیسے لوگ تو مغربی ذہن رکھتے ہیں یہ تو مسلمان نہیں۔ اسی لیے علامہ نے اپنی تحریروں میں نئی مسلم سوسائٹی کا تصور پیش کیا تھا۔ اقبال کے تصور خودی میں بھی اسلام اور قرآن کا ہی بار بار حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ کوئی بھی امام پڑھ لو وہ ایک ہی بات بتاتے ہیں کہ ظلم قبول کر لو فتنہ قبول نہ کرو بجائے یہ کہ غاصب غصب کرتا ہے یعنی آپ خود فتنہ قبول کر رہے ہیں لیکن آج کا جدید مسلمان اس کو فروعی چیزیں کہے گا۔ اصل چیز تو عقیدہ ہے اور عقیدہ ہی ارکان دین ہے اور فرض کریں کہ میرے معاشرے میں جہاں اتنے زیادہ ابہام ہیں کہ سلطان کا حکم مان لو اور فتنے سے دور رہو یہ کوئی جواز نہیں۔ اسلام میں کہیں رعایا کا تصور نہیں۔ اسلام میں شہریوں کا تصور تو ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہم لوگ شہری تھے کیونکہ کوئی بھی شہری خلیفہ کو پوچھ سکتا تھا کہ یہ کام کس طرح ہوا۔ لیکن آج ہم کسی حکمران کو پوچھ سکتے ہیں بالکل نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جس فقہ کی تدوین ملوکیت کے دور میں ہوئی ہے وہ نظر ثانی کی محتاج ہے اور اس نسل کے جو نوجوان مسلمان ہیں ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو مت قبول کریں اور اس میں تبدیلی لائیں اور آج کا جو مسلمان ہے اگر وہ صحیح طور پر مسلمان ہے تو وہ کسی کی تقلید کا پابند نہیں ہوگا وہ خود اپنی رائے قائم کرے گا۔

سوال: لیکن آخر اجتہاد کون کرے، آپ کی رائے میں اجتہاد کا حق کسے ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اب اجتہاد کی بات آ جاتی ہے اگر آپ کہیں گے کہ اسلام میں ویلفیئر سٹیٹ یا سوشل ڈیموکریسی کا تصور کیا ہے تو یہ آپ کو کوئی ملا نہیں بتا سکے گا بلکہ آپ کو ماہر معاشیات ہی بتا سکے گا۔ ملا صرف یہ ہی بتائے گا کہ اسلام میں یہ اصول ہیں جن کے تحت آپ ٹیکسز وصول کر سکتے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ یا خراج کس طرح وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے بہت سے ایسے معاملات ہیں جہاں پر غیر علماء کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ علم کی اتنی توسیع ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علامہ کا اصرار ہے کہ اجتہاد صرف انفرادی مجتہدوں کے ہاتھ میں نہ رہے بلکہ وہ منتخب اسمبلی کے پاس ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کی منتخب اسمبلی میں سمگلر بھی شامل ہیں اور ڈرگ مافیا والے بھی تو ایسے لوگ کہاں اجتہاد کریں گے کیا

ان پر قوم اعتماد کر سکتی ہے؟ نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے انہوں نے ارشاد فرمایا رکھا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے علماء کا ایک بورڈ ان کی راہبری کرے۔ جیسے نظریاتی کونسل ہے اس کے علاوہ چاہتے ہیں کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے یہ کنڈیشن بنا دی جائے کہ جو منتخب نمائندے ہوں وہ اسلامک لاء کے بارے میں بہتر طور پر جانتے ہوں یعنی وہ لاء گریجویٹ ہوں اور اسلامی فقہ کے بارے میں بھی معلومات رکھتے ہوں۔ جس طرح آپ نے سکینڈے نیویا کا ذکر کیا ہے وہاں پر مذہب کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن ان کے ہاں ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب عورت پر اتنی پابندیاں تھیں کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے، سر کے بال نہ کٹوائے، لیکن وہاں پر ایک انقلاب آیا اور ایسی تبدیلی آئی کہ مذہب کو کوئی اہمیت حاصل نہ رہی انہوں نے ایک ویلفیئر سٹیٹ بنا رکھی ہے اور یہ وہاں کا معاشرہ ہے اس لیے جب آپ مادہ پرست ویلفیئر سٹیٹ کا تصور کریں گے، جہاں پر مذہبی یا اخلاقی قیود نہ ہوں گی تو معاشرہ اسی قسم کا ہو جائے گا جیسا سکینڈے نیویا میں ہے۔ میں جو کچھ کما کر لاتا ہوں میرے پاس اتنا ہے کہ میں اپنی زندگی گزار سکتا ہوں۔ ان کے ہاں ٹیکسوں کا سسٹم بہت سخت ہے۔ ہر کوئی ٹیکس دیتا ہے یہاں تک کہ اگر آپ ٹورسٹ کے طور پر جاتے ہیں تو اسے بھی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ وہاں ان کو ایک چیز کا فائدہ ہے کہ وہاں پر آبادی کا کنٹرول ہے اور پیدائش کی شرح صفر ہے لیکن یہاں جو ویلفیئر سٹیٹ کا تصور ہے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ بڑھتی ہوئی آبادی ہے یا جس طرح شرح خواندگی بہت کم ہے اسی طرح آبادی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ پہلے تو اس کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے اسلام کا وہ تصور جو روایتی تصور ہے اس کو آج کے معاشرے میں غیرت مند مسلمان قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان کو کرنے کی ہمیں پوری پوری اجازت ہونی چاہیے ایک تو ہمیں پاپولیشن پلاننگ کی اشد ضرورت ہے پھر اس کے ساتھ ہمارا معاشرہ بہت کرپٹ ہے اور یہ کرپشن صرف اوپر کے طبقے تک ہی محدود نہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ''شارٹ کٹ'' سے کام ہو جائے۔ اور ہمیں شارٹ کٹ کی عادت پڑ گئی ہے مثلاً کوئی کام ہے تو نارملی ایک مہینے میں ہوتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں وہ ہفتے میں ہو جائے اور اس کے لیے پھر میں پیسے دیتا ہوں۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت سے ٹیکس چور ہیں۔ یعنی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ٹیکس دے سکتے ہیں لیکن وہ ٹیکس ادا نہیں کرتے اور اس کو یہاں برا نہیں سمجھا جاتا۔ یعنی یہاں پر جو رجسٹرڈ ٹیکس دینے والوں کے نام ہیں وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ تو ایسی بہت سی رکاوٹیں ہیں جو آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔ ویلفیئر سٹیٹ سے مراد یہ نہیں کہ آپ نیشنلائزیشن کریں۔ ٹیکسیشن کا جو نظام ہے اسے بہتر کرنا ہوگا ٹیکس ہر ایک سے وصول کیے جاتے ہیں جو بھی شہری کماتا ہو خواہ وہ ایک روپیہ دے۔ یہاں اگر ایسا نظام ہو جائے کہ ہر شہری ایک

روپیہ دے دے جسے عوامی ٹیکس کا نام دیا جا سکتا ہے تو تب بھی کروڑوں روپیہ اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ تو ایسے ہی کئی طریقے ہیں جنہیں اختیار کر کے ایک اسلامی ویلفیئر سٹیٹ بنائی جا سکتی ہے۔ جب سے پاکستان بنا ہے ویلفیئر سٹیٹ کا دعویٰ ہم ضرور کرتے ہیں۔ جب بھی آئی جے آئی کی حکومت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہم پاکستان کو ویلفیئر سٹیٹ بنائیں گے لیکن وہ تو خالی پانی ابالنے والی بات ہے اس سے بھلا کیسے لسی بن سکتی ہے۔ زیادہ تر ہم نظریاتی پہلو کا ذکر کرتے ہیں عملی طور پر کچھ بھی نہیں کرتے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! جب بھی دنیا میں ہماری ملکی سیاسی صورت حال کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں تو اس میں ہماری جوڈیشری کے رول پر بھی تذکرہ ہوتا ہے اور یہ تصور بھی عام ہو گیا ہے کہ ہمارے ہاں جوڈیشری ''ابو بورڈ'' (Above board) نہیں ہے آپ اس سلسلہ میں کس حد تک متفق ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے میں تو چاہتا ہوں کہ ملک میں جمہوریت کا نظام ہماری رگ رگ میں آ جائے تا کہ کسی کی جرأت نہ ہو کہ وہ مارشل لاء کی طرف جائے لیکن ہم تو خود جواز پیدا کرتے ہیں۔ ہم تو خود سیاست میں لڑ کر دوسروں کو بلاتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جہاں سیاست دان خود ایسی کیفیت پیدا کریں وہاں جمہوریت کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر جب بھی مارشل لاء آتا رہا ہے عام تاثر یہ ہوتا رہا ہے کہ عدلیہ کو ایگزیکٹو کے تحت ہر حکم ماننا پڑتا ہے۔ حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ کیونکہ جوڈیشری کے ضمن میں بہت سارا جو کام ہے وہ سیاسی نہیں ہے۔ جب مارشل لاء آتا ہے تو اس کی جورسڈکشن کا ایک حصہ علیحدہ کر لیا جاتا ہے یہ ایگزیکٹو کا اختیار ہے کہ وہ ایک حصہ الگ کر سکتا ہے۔

سوال: کیا موجودہ مسلم لیگ قائداعظم اور علامہ اقبال کے نظریات کی حامل ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: ہماری جو سیاسی لیڈر شپ ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ جو ہمارے اکثر علماء کرام ہیں وہ بھی اسلام کے بارے میں زیادہ علم اور فکر نہیں رکھتے۔ ہماری سیاست میں جو علماء ہیں ان کے پاس سب کچھ ہے سوائے علم کے۔ اب یہی ہماری سیاست کا حال ہے یہی مسلم لیگ کا حال ہے اور یہی پیپلز پارٹی کا حال ہے کہ ہمارے جو تمدنی، سیاسی افکار ہیں وہ ان کے پاس نہیں قائداعظم اور علامہ اقبال کا نام تو سب ہی لیتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو نے بھی اقبال کے افکار کا ذکر کیا ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اقبال کے کسی ایک شعر کا مطلب سمجھا سکتی ہیں؟ یا مسلم لیگ کے جو دوسرے لیڈر ہیں وہ اقبال کے شعر کے معنیٰ سمجھا سکتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ جان بوجھ کر نہیں ہو رہا اقبال اور جناح کا ذکر اس ملک سے

غائب کیا جا رہا ہے اور اقبال کے نظریات کے بارے میں حال ہی میں، میں نے کسی تحریر میں ذکر کیا ہے کہ اقبال کے افکار کو پاکستان میں لاعلمی کے طور پر یوں نکالا جا رہا ہے، پاکستان بدر کیا جا رہا ہے جس طرح بدھ ازم کو ہندوستان سے نکالا گیا تھا اسی طرح اقبال کے نظریات کو بھی بتدریج اس ملک سے نکالا جا رہا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب ایک بات اور اقبال کے حوالے سے پوچھنا چاہوں گا جو بہت زیر بحث رہی یعنی تصوف۔ اس کے بارے میں بھی کئی شبہات رہے ہیں۔ مثلاً جو غیر مقلد اور مقلد کی بحث ہے اس میں علامہ اقبال نے آپ کو جو وصیت کی ہے کہ آپ امام ابوحنیفہ کی فقہ کی طرف زیادہ لگاؤ رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اہل بیت سے بھی زیادہ محبت کریں تو اس حوالے سے تصوف کا جو تصور ہے اقبال اس کے کتنے نزدیک ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: آپ کا سوال بہت دلچسپ ہے اور سپین میں عالمی کانگریس ہو رہی ہے میرا موضوع بھی یہی ہے کہ اقبال کے نزدیک انسانیت اور مذہب کا مستقبل کیا ہے۔ آپ نے ایک تو کہا کہ علامہ کے حوالے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ تصوف کے متعلق ان کا زاویہ نگاہ کیا ہے، ایک تو یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ علامہ نے اگر مجھے وصیت میں یہ کہا ہے کہ حنفی فقہ سے مناسبت رکھوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حنفی فقہ زیادہ لبرل ہے۔ گو اس کے بھی بعض پہلو ایسے ہیں جہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو پہلو ریاست کے متعلق ہے کہ فتنہ قبول نہ کرو ظلم قبول کر لو۔ اس پر بھی اختلاف ہے اور بھی کئی پہلو ہیں مثلاً حنفی فقہ کے تحت اگر خاوند مفقود الخبر ہو جاتا ہے تو بیوی کو ساٹھ سال تک انتظار کرنا چاہیے۔ یہ ایسا نقطہ نگاہ ہے جسے عقل سلیم قبول نہیں کر سکتی۔ لیکن حنفی فقہ میں ایسی باتیں ہیں جو زیادہ "لبرل اور منطقی" ہیں۔ سب سے بڑی جو حنفی فقہ میں بات ہے وہ ایمان اور عمل میں تمیز کرتی ہے کہ اگر آپ کا عمل نہ بھی ہو، لیکن ایمان آپ کا ہو تو آپ مسلمان ہیں۔ یعنی سب سے بڑی بات جو حنفی فقہ میں نوٹ کرنے والی ہے وہ یہ ہے کہ عقیدہ قائم ہو تو تب بھی، آپ اسلام کے زمرے سے خارج نہیں ہو جاتے خواہ آپ بے عمل مسلمان ہوں۔ باقی مدرسہ ہائے فکر کا اصرار یہی ہے کہ عمل جب تک ساتھ نہیں ہو گا آپ مسلمان نہیں رہ سکتے۔ صرف اکیلا ایمان ہی کافی نہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل ہو تو اچھی بات ہے لیکن اگر نہ بھی ہو تو یہ نہیں کہ ایمان ہی نہیں رہتا۔ آج کے جو مسلمان ہیں لہٰذا وہ حنفی ہی ہو سکتے ہیں کوئی دوسرا مدرسہ ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرا یہ کہ اقبال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ تصوف سے منحرف تھے یہ غلط ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اقبال نے تصوف کے ایک گروہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ ساری باتیں آج سے پچاس سال پہلے سوچیں تو اقبال نے کہہ رکھی ہیں۔ "چھ لیکچرز"

میں آخری باب پڑھیں۔ اس لیکچر میں علامہ کہتے ہیں کہ انسان کی مذہب زندگی کے تین مراحل ہیں پہلی سٹیج تو یہ ہے کہ جو مذہب کا عباداتی اصول ہے اس کو بغیر کسی سوال کے قبول کریں یعنی آپ کو کہہ دیا ہے کہ یہ فرائض ہیں انہیں قبول کرلیں۔ روزے رکھنے ہیں نماز پڑھنی ہے آپ ان فرائض کو پورا کرتے جائیں بغیر کسی چون و چرا کے۔ دوسری منزل جو اقبال کہتے ہیں کہ قوموں کے لیے بڑی مشکل ہوتی ہے اس میں ایک تو مذہب کے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ دوسرے مذاہب کے خلاف ابھارا جاتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب مذہب انتہا کو پہنچ جاتا ہے اس میں ہر مذہب یہی کہتا ہے کہ سچائی صرف اسی کے پاس ہے تیسری سٹیج علامہ کے نزدیک وہ ہے کہ جب انسان انفرادی طور پر کچھ تجربہ کرنا چاہتا ہے اس کو اقبال تصوف کہتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جب انسان براہ راست حقیقتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنا چاہتا ہے اور یہ انفرادی کوشش ہوتی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر انسان سوچتا ہے کہ یہی مذہب اعلیٰ ترین مذہب ہے اور یہی مذہب کا مستقبل ہوسکتا ہے اور یہی علامہ کا نقطہ نگاہ ہے۔

سوال: ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور جنرل ضیاء الحق ان تینوں شخصیتوں کا آپ کس طرح تقابل کریں گے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: میں بے نظیر کو ان میں شامل نہیں کروں گا۔ لیکن جہاں تک بھٹو اور ضیاء الحق کا تعلق ہے ہم نے ان دونوں کو شہید بنا کر کربلا کی بے حرمتی کی۔ کیونکہ ہمارے ہاں شہید کا جو تصور ہے وہ شہدائے کربلا کا ہے۔ یعنی ہم نے حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو بھی وہ رتبہ نہیں دیا انہیں بھی کبھی شہید نہیں کہا گیا کیا ہم نے ان دو کو شہید بنا کر اپنی تاریخی روایت کے خلاف کفر کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔

بے نظیر کو اس لیے الگ کیا ہے کیونکہ اس کا تھوڑا سا رجحان جمہوریت کی طرف ہے یعنی آپ بے نظیر کو جمہوریت پرست کہہ سکتے ہیں اسے اپنے باپ کی طرف ڈکٹیٹر شپ کی لائن میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ کی باتوں سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 1973ء کا آئین ہمارے لیے آئیڈیل ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: اس ملک میں آئین بنانے کا بہت بڑا مسئلہ تھا پھر اس کے بعد صدارتی اور پارلیمانی نظام کا چکر چلا اس میں ہم نے دو قوتیں پیدا کر دیں ایک صدر اور دوسرا وزیراعظم، خیال یہ تھا کہ اگر صدر مشرقی پاکستان کا ہے تو وزیراعظم مغربی پاکستان کا ہوگا یہ تحریری طور پر نہیں تھا۔ 1973ء کے آئین میں یہ چیز پیش کی کہ پوری طاقت وزیراعظم کے پاس رہے یعنی تمام اختیارات کا

مالک صرف وزیراعظم ہوگا اور صدر برائے نام ہوگا۔ اور بدقسمتی پوری قوم کی کہ بھٹو جیسا ڈکٹیٹر شخص وزیراعظم تھا اور ڈکٹیٹر شخص یعنی ایوب خاں سے اس نے تربیت حاصل کی تھی وہ ایوب خاں کا ہی شائبہ تھا۔ تو اب ضروری تو نہیں کہ ہر وزیراعظم بھٹو کی طرح کا ہوگا۔ تو اصل جمہوریت میں تو پاور وزیراعظم کے پاس ہونی چاہیے۔ اسی طرح ضیاء الحق نے اختیارات بیلنس کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ آٹھویں ترمیم کے تحت صدر کو ہر قسم کے اختیارات حاصل ہیں کہ ایک منتخب حکومت کو ایک جنبش قلم سے ختم کرسکتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ سپریم کورٹ نے اس سلسلے میں تین چیزوں کو اہمیت دی ہے کہ سیاسی، معاشی حالات اور ملک میں امن وعامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر صدر اپنے اختیارات کو استعمال کرسکتا ہے اور پہلی مرتبہ جب ضیاء الحق نے یہ اختیارات استعمال کرنے کی کوشش کی اور جونیجو حکومت کا تختہ الٹایا تو سپریم کورٹ نے یہ کہا تھا کہ پاور تو غلط استعمال ہوئی ہے لیکن اب چونکہ ہو چکی ہے۔ آئندہ کے لیے یہ راستہ بند ہو جائے گا۔ 1985ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم نے اس آئین کو اسی طرح کی کنٹرولڈ ڈیموکریسی بنا رکھا ہے جیسے ایوب خاں کی کنٹرولڈ ڈیموکریسی نے بنایا تھا، 1962ء اور 1985ء کے آئین میں صرف یہی فرق ہے کہ یہاں وزیراعظم کا ایک شعبہ ہے لیکن وہاں پر وزیراعظم کا شعبہ نہیں تھا۔ سارے اختیارات صدر کے پاس تھے صدر جب چاہے کچھ بھی کرسکتا تھا۔ یہاں بھی صدر کے پاس ویسے ہی اختیارات ہیں یہاں پر پوری جمہوریت نہیں بلکہ کنٹرولڈ جمہوریت ہے۔

انٹرویو: نومبر، 1991ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: 29 نومبر، 1991ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

انٹرویو(IV)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ اب مسلم لیگ کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ مسلم لیگ نہ تو مذہبی جماعت رہی ہے اور نہ ہی سیاسی جماعت یہ منافقت کا ملغوبہ بن چکی ہے انہوں نے کہا میرے خیال میں مسلم لیگ نے اپنا کام پاکستان بنا کر مکمل کر لیا تھا اس لیے اس مقدس نام کو بدنام کرنے کی بجائے ختم کر دینا چاہیے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد مسلم لیگ نے کوئی کردار ادا نہیں کیا اس لیے اس کا نام نیشنلسٹ پارٹی یا کچھ اور رکھ دینا چاہیے انہوں نے کہا کہ مسلم لیگی نام قائداعظم اور علامہ اقبال کا لیتے ہیں اور کرتوتیں ایسی کرتے ہیں کہ شرم آتی ہے۔ مغرب کی طرف سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف محاذ بنانے پر انہوں نے کہا کہ ہمیں اس معاملے میں مغرب کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی صورتحال میں جب کہ صرف ایک سپر طاقت رہ گئی ہے ہمیں اگر ایٹم بم کی تیاری کے مرحلے کو ختم بھی کرنا پڑے تو کر دینا چاہیے انہوں نے کہا کہ اگر ہم ایٹمی دھماکہ کر بھی لیتے ہیں تو ہمیں کیا حاصل ہو جائے گا آخر روس نے ہزاروں ایٹم بموں کے ساتھ کیا اپنا ملک بچا لیا تھا ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ مجھے اچھوت بنا دیا گیا ہے مسلم لیگ کے قریب بھی نہیں آنے دیا جاتا میں قائداعظم اور علامہ اقبال کا نام لیتا ہوں جب کہ موجودہ مسلم لیگ، ان کے نظریات کو نہیں مانتی یہ مسلم لیگی وقت گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں کبھی جونیجو کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے اور کبھی کسی اور کی انہوں نے کہا اگر نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو یہ پنجاب کی پارٹی بن جائے گی بہتر ہے کہ کوئی غیر پنجابی ہی مسلم لیگ کا صدر رہے انہوں نے کہا کہ پنجاب کا رول پاکستان کو قائم بھی رکھ سکتا ہے اور توڑ بھی سکتا ہے ملک میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا جب سے جنرل ضیاء الحق نے حدود کے نفاذ کا "تحفہ" دیا ہے جرائم کی رفتار میں اضافہ ہوا ہے پوری تاریخ میں کبھی عورتوں کے خلاف اتنے جرائم نہیں ہوئے جتنے اب ہو رہے ہیں اتنے زنا کبھی نہیں ہوئے جتنے اب ہو رہے ہیں انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں ضیاء الحق جس طرح کی موت کا شکار ہوا ہے اس کو ان عورتوں کی آہیں لگ گئی ہیں جو جنسی درندگی کا شکار ہوئی تھیں اور اس کی وجہ جنرل ضیاء کے قوانین تھے انہوں نے کہا کہ حدود کے تحت سزا موثر نہیں ہے یہ اسلام کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے اس لیے زانی کو قطع عضو کی سزا دی جائے جس طرح کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں رائج کی گئی تھی اور اس سے بڑا

فائدہ ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سزا بعض امریکی ریاستوں میں اب بھی رائج ہے۔

انٹرویو: فروری، 1993ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: روزنامہ جنگ، لاہور

انٹرویو(V)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا ہے کہ ہم موجودہ حالات میں مارشل لاء کے قریب تر ہو رہے ہیں۔انہوں نے کہا آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی میں فاصلہ بہت بڑھ چکا ہے اور انہیں ''ڈنڈا'' ہی اکٹھا کرسکتا ہے اور یہ ''ڈنڈا'' ظاہر ہے فوج کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔انہوں نے کہا کہ اول تو قومی حکومت بنے گی ہی نہیں اور اگر بنے گی بھی تو صرف ڈنڈے کی صورت میں اور اسے پھر بھی قومی حکومت نہیں کہا جاسکتا۔انہوں نے کہا اگر بچے شرارتیں کریں گے تو سکول ماسٹر خود آجائے گا انہوں نے کہا کہ اگر یہاں مارشل لاء آیا بھی تو وہ محدود عرصے کے لیے ہوگا وہ اس طرح کا نہیں ہوگا جس طرح ضیاءالحق کے زمانے کا مارشل لاء تھا ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ سندھ آپریشن کے بعد فوج پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔حالات یہ ہیں کہ عوام ساری پارٹیوں سے بیزار ہیں اور بالخصوص پڑھے لکھے طبقات ارکان اسمبلی کی جانب سے مراعات حاصل کرنے پر ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔انہوں نے کہا کہ سندھ میں کارروائی فوج نے کی ہے اور اس کا کریڈٹ اسی کو جاتا ہے، ایم کیو ایم کی کارروائیوں میں آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی دونوں برابر کی شریک ہیں کیونکہ دونوں براہ راست یا بالواسطہ طور پر ایم کیو ایم کے جرائم سے چشم پوشی کرتی رہی ہیں۔انہوں نے کہا کہ سندھ میں اب تک ہونے والی کارروائی پر عوام خوش ہیں اور سندھ کے لوگ تو بہت ہی اطمینان محسوس کررہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ عوام پر جب تک پیر، زمیندار اور مولوی کا ظلم ختم نہیں ہوتا انتخابات غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتے۔انہوں نے کہا کہ آئندہ انتخابات فوج کی زیر نگرانی ہونے چاہئیں اور ایسے افراد نگران حکومت میں شامل ہوں جو انتخابات میں حصہ نہ لیں، سود (ربا) کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ بینک سے لیے جانے والے منافع کو سود نہیں سمجھتے۔انہوں نے کہا مولانا شبلی نعمانی کا بھی یہی خیال ہے اور حضرت علامہ اقبال تو خود بھی بینک کا منافع حاصل کرتے رہے ہیں اور علامہ اقبال کی انکم ٹیکس فائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال منافع حاصل کرتے تھے۔وفاقی شرعی عدالت کے بارے میں اپنے سابقہ بیانات کے حوالے سے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شریعت کورٹ کی ضرورت نہیں ہے دوسری عدالتیں یہی کام سرانجام دے سکتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ شریعت کورٹ کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ باقی اعلیٰ عدالتیں کے جج

صاحبان کی تعیناتی کے لیے مخصوص شرائط ہیں جنہیں پورا کرنا ضروری ہے لیکن شریعت کورٹ کے جج کے لیے کوئی مخصوص شرائط نہیں ہیں۔ دوسری اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کی تقرری تو صدر صاحب کرتے ہیں لیکن انہیں ہٹانے کی ذمہ داری سپریم جوڈیشل کونسل کے پاس ہے اس طرح جج کی تقرری کے بعد اسے انتظامیہ ہٹا نہیں سکتی لیکن شریعت کورٹ کے جج کو صدر جس وقت چاہیں ہٹا سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عام تاثر کے مطابق یہ صدر کی عدالت سمجھی جاتی ہے اور باوجود اس کے کہ یہ اپنی نوعیت کی اسلامی عدالت ہے اس کے جج صاحبان کی تعیناتی انتظامیہ کے رحم و کرم پر ہے ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ دو چیف جج صاحبان ضیاء الحق کے ایماء پر اس لئے ہٹائے جا چکے ہیں کہ جو فیصلہ انہوں نے لکھا یا لکھنے والے تھے وہ ضیاء کو پسند نہ تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار میں تھا کہ وہ رائج قوانین کو اسلامی نقطہ نظر سے جانچے۔ انہوں نے کہا کہ اس دائرہ اختیار کے تحت تمام ملکی قوانین کو جسٹس آفتاب حسین کے زمانے میں جانچا جا چکا ہے انہوں نے کہا کہ اب اس کورٹ کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ وہ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے لیے خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس عدالت نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ایسے فیصلے دیئے ہیں جن کی زد براہ راست پارلیمنٹ کی بالادستی پر پڑتی ہے۔ انہوں نے کہا مالی قوانین اور عائلی قوانین کے بارے میں حالیہ فیصلوں کے ذریعے پارلیمنٹ کو بلاسود مالی نظام کی قانون سازی چھ ماہ کے اندر کرنے کا پابند کر دیا گیا ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ کی آزادی پر پابندی لگائی گئی ہے۔

انٹرویو: جون، 1992ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: 1 جولائی 1992ء روزنامہ جنگ، لاہور

انٹرویو(VI)

سوال: چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف ریفرنس سے پیدا ہونے والے عدلیہ کا بحران کیسے حل ہوگا؟ اور یہ بحران کیوں پیدا ہوا؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: یہ تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ میں بتا سکوں کہ عدلیہ کا موجودہ بحران کیسے حل ہوگا۔ نہ ہی کوئی پیش گوئی کر سکتا ہے کہ اس کا یہ حل ہوگا۔ جنہوں نے فیصلہ کرنا ہے اس بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہیں یا پھر یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ لیکن ایک بات میں کہنا چاہوں گا کہ عدلیہ کا موجودہ بحران غیر متوقع نہیں تھا۔ جب بھی فوج آتی رہی ہے اور آئین معطل ہوتا رہا ہے اور پی سی او کے تحت ججوں کو مجبور کیا جاتا رہا ہے کہ حلف اٹھائیں تو ایسی چیزیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ میرے دور میں بھی ضیاء الحق کا مارشل لاء لگا تھا ہمیں حلف اٹھانا پڑا۔ وہ وقت اور تھا۔ لیکن اب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار چودھری کی شکل میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جس نے اب ان تمام معاملات پر سٹینڈ لیا ہے۔ اس وقت رائے عامہ نہیں تھی لیکن اب حالات اور طرح کے ہیں اب لوگوں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ جب سے پاکستان بنا ہے اور جب سے فوج نے مداخلت کرنا شروع کی ہے جوڈیشری نے ہمیشہ فوج کے گندے کپڑوں کو دھویا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ لوگ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ عوام نے اب بتا دیا ہے کہ وہ عدلیہ کی بالادستی چاہتے ہیں۔ یہ جو آتش فشاں پھٹا ہے یہ یقینی تھا بڑے عرصے سے لوگوں کے دلوں میں غبار تھا جو اب سامنے آیا ہے۔

سوال: ججوں کے آپس کے اختلافات سے حالات ہمیشہ خراب ہو جاتے ہیں اس کی وجہ؟

ڈاکٹر جاوید اقبال: دیکھیں جی! جب کسی بھی معاملے میں ججوں کی کوئی رائے یا فیصلہ ہوتا ہے تو یقینی طور پر بعض معاملات اور فیصلوں میں اکثریت کا عنصر اقلیت پر حاوی ہوتا ہے۔ اب موجودہ حالات میں بھی ججوں کے آپس کے اختلافات میں کچھ جج چیف جسٹس آف پاکستان افتخار چودھری کے حق میں فیصلہ چاہتے ہیں جب کہ کچھ ججوں کی رائے اس سے مختلف ہے۔ موجودہ حالات میں میں یہی کہوں گا کہ میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ کتنے جج کس طرح کا فیصلہ کرتے ہیں۔ گو ججوں پر عوام کا پریشر یا دباؤ نہیں ہوتا لیکن صحیح اور میرٹ پر فیصلہ کرنے کے لیے سب اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ نیک نیتی پر منحصر ہوتا ہے۔ کہ کون کس نیت پر فیصلہ کرتا ہے۔ اب جو ملک بھنور میں پھنس چکا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جہاز ڈوب جائے گا یا ''عبور'' کر جائے گا۔ لیکن اب میں ایک بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں اور کیسے بھی ہوں جس طرح کی موجودہ صورتحال نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا ہے اب آئندہ کوئی جوڈیشری میں اس طرح کی مداخلت نہیں کر سکے گا۔ بے شک فوج بھی ہو۔

انٹرویو: جون 2007ء
غیر مطبوعہ

جسٹس (ر) ایس اے نصرت

جسٹس (ر) ایس اے نصرت مرحوم پاکستان کے بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہونے کے علاوہ عدلیہ سے متعلقہ انتہائی اہم ادوار کے ایک کردار بھی ہیں۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے متنازعہ ریفرنڈم 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات اور 1988ء کے جماعتی انتخابات کے چیف الیکشن کمشنر بھی رہے اس سے پہلے جب عدلیہ میں عبوری آئین کے تحت ججوں سے نئے حلف لیے گئے تو اس وقت جسٹس (ر) ایس اے نصرت سیکرٹری قانون کی اہم سیٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس حوالے سے ان کے پاس خفیہ کہانیوں، اندرون خانہ معاملات اور عدلیہ کے خلاف سازشوں کے بے پناہ راز تھے۔ جنہیں اس انٹرویو کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی گئی۔

جسٹس (ر) نصرت کراچی کے رہائشی تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کے عقب میں جدید ترین فلیٹ میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ انہیں کوئی قتل نہ کر دے ان کا کہنا تھا کہ کراچی میں کسی کی جان محفوظ نہیں اس لیے اسلام آباد میں مقیم ہوں۔

انٹرویو کے دوران ضیاء الحق کے متنازعہ ریفرنڈم میں جعلی ووٹ پڑنے اور دھاندلی ہونے کا تو انہوں نے برملا اعتراف کیا اور یہ بھی کہا کہ انہیں اس ریفرنڈم میں دھاندلی کا علم ہو چکا تھا۔ پی سی او یا عبوری آئینی حکم نامہ کے نفاذ پر بھی انکا رویہ معذرت خواہانہ تھا اور وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ پی سی او کے نفاذ میں ان کا بھی کوئی رول تھا۔

اس انٹرویو میں بہت سی باتوں اور رازوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ آیئے عدلیہ کے زوال کے کرداروں کو پہچانیں اور دیکھیں کہ کس کس طرح عدلیہ کو نقصان پہنچتا رہا۔

اہم نکات

☆ مارشل لاء روکنے کے لیے اس کے ذمے داروں کو علامتی سزا دی جائے۔
☆ جنرل ضیاء کے ریفرنڈم میں ووٹ غلط طور پر ڈالے گئے، اس سے بہت بدنامی ہوئی۔
☆ جسٹس انوار الحق مقدمہ سن لیتے تو پی سی او نافذ نہ ہوتا۔
☆ جنرل ضیاء کو جسٹس انوار اور جسٹس مولوی مشتاق کی ملی بھگت کا علم تھا۔
☆ پی سی او کی مخالفت نہیں کی، لیکن دل سے ناپسند کرتا تھا۔
☆ لاکھوں روپے خرچ ہو گئے مگر جسٹس انوار کو صرف ایک ووٹ ملا۔
☆ بھٹو اپنی پھانسی کے خود ذمے دار تھے، وکیل صفائی کے غلط سوال پر پھانسی ہوئی۔
☆ پورا آئین ختم نہ ہو جائے اس لیے شریف الدین پیرزادہ نے پی سی او بنوایا۔
☆ سپریم کورٹ پر حملے میں فوج کی مداخلت غلط ہوتی۔
☆ جنرل ضیاء کی موت کا خواب سچا نکلا، وہ اتنے برے نہیں تھے۔
☆ سانحۂ مشرقی پاکستان فوج کی وجہ سے ہوا، معاشی بحران سیاست دانوں نے پیدا کیا۔
☆ لیاقت علی خان کے دور تک صحیح جمہوریت تھی، فوج جہاں آئی وہاں بگاڑ پیدا ہوا۔
☆ 73ء کے آئین میں اسلامی نظام کی گنجائش موجود ہے، شریعت بل کی ضرورت نہیں۔
☆ ضیاء کے ریفرنڈم کا اصل مقصد جمہوریت کی بحالی تھی، یہ میری تجویز نہیں تھی۔
☆ مارشل لاء کے نفاذ پر ججوں کا گورنر بننا غلط تھا۔
☆ جنرل ضیاء الحق جسٹس صمدانی کو حلف دلوانا چاہتے تھے مگر انہیں گورنر ہاؤس نہ جانے دیا گیا۔
☆ نواز شریف کی اسمبلی درست بحال ہوئی، بے نظیر کا بھی ایسا ہی فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔

انٹرویو

سوال: جسٹس صاحب! پاکستان کی سیاسی اور قانونی تاریخ میں آپ کا اہم کردار رہا ہے آپ کئی اہم واقعات کے عینی شاہد بھی ہیں اس حوالے سے پاکستان بننے کے بعد عدلیہ کی کارکردگی پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: عدلیہ کی بات آئے تو شروعات تو مولوی تمیز الدین کیس سے ہی ہوتی ہیں اس سے پہلے سندھ ہائیکورٹ اس مقدمے میں مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے اسمبلی بحال کر چکی تھی جب کہ سپریم کورٹ نے اسمبلی بحال نہ کرنے کا فیصلہ دیا سپریم کورٹ کا فیصلہ جسٹس منیر نے لکھا اور بعد میں انہوں نے یہ کہا کہ فیصلہ سیاسی بنیادوں پر کیا گیا ہے اس کے بعد یہ روایت رکی نہیں بلکہ چلتی رہی دوسری طرف ہندوستان میں اندرا گاندھی نے عدلیہ کے بارے میں کچھ تبدیلیاں کیں اور وہاں معاملہ ٹھیک چلتا رہا اور کوئی بڑی گڑبڑ نہیں ہوئی پاکستان میں عدلیہ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور یہاں پر کچھ جج بھی سیاست میں ملوث رہے ہیں۔

سوال: تو آپ کے خیال میں عدلیہ میں بگاڑ مولوی تمیز الدین کیس کے فیصلے سے ہوا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل، بگاڑ اسی کیس سے شروع ہوا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کا دور آیا اس وقت جسٹس حمود الرحمٰن نے ایک فیصلہ لکھا انہوں نے فیصلہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت حالات اور تھے بعد میں بھٹو نے الیکشن کا اعلان کر دیا وہیں سے انہوں نے فیصلہ تبدیل کر دیا تو گویا ایک فیصلے کے اندر دو آراء نظر آتی ہیں۔ اس سے بگاڑ کی روایت اور مضبوط ہوئی۔

سوال: جسٹس نسیم حسن شاہ نے 93ء میں اسمبلی کی بحالی کا جو فیصلہ دیا تھا آپ اسے بھی سیاسی فیصلہ ہی سمجھتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ فیصلہ میں نے پڑھا ہے میں تو مطمئن ہوں کہ یہ فیصلہ ٹھیک لکھا گیا ہے۔

سوال: لیکن بعد میں جسٹس سجاد علی شاہ نے 97ء میں اسی طرح کے مقدمے میں بے نظیر کی اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دے دیا تھا یہ پہلے فیصلے کی نفی تھی؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جسٹس سجاد علی شاہ تو متنازع ہو گئے تھے (قہقہہ لگاتے

ہوئے) ان کے فیصلوں کو وہ حیثیت حاصل نہیں رہی اصل میں ایک مقدمے میں انہوں نے سندھی وزیراعظم اور پنجابی وزیراعظم کی بات کی تھی اس کے بعد ان کی پوزیشن خراب ہوگئی درمیان میں پھر وہ ٹھیک ہوگئے لیکن بعد میں ان کی صدر لغاری سے بہت دوستی ہوگئی اور معاملہ گڑبڑ ہوگیا جج بہت اچھے تھے لیکن متنازع ہوگئے۔

سوال: جب آپ کی نظر میں جسٹس نسیم حسن شاہ کا فیصلہ میرٹ پر تھا تو پھر آپ کی رائے میں بے نظیر بھٹو کی اسمبلی کے بارے میں فیصلہ کیا ہونا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: نسیم حسن شاہ کا فیصلہ میرٹ پر تھا اور میری نظر میں بے نظیر بھٹو کی حکومت اور اسمبلی بھی بحال ہونی چاہیے تھی دونوں فیصلے ایک جیسے ہونے چاہیے تھے۔

سوال: آپ تمیزالدین کیس کے مقدمے کو عدلیہ کا زوال قرار دے رہے تھے لیکن عدلیہ میں بگاڑ کی انتہا پی سی او تھا جو جنرل ضیاء کے زمانے میں نافذ ہوا اور آپ اس وقت سیکرٹری قانون تھے اس طرح آپ بھی عدلیہ کے زوال میں اہم کردار ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: پی سی او کا نفاذ سیاسی فیصلہ تھا میں یہاں واضح کردوں کہ پی سی او کا مسودہ بنانے میں نہ میرا کوئی کردار تھا اور نہ ہی میرا کوئی تعلق تھا۔

سوال: آپ سیکرٹری قانون تھے، عدلیہ سے آپ کا تعلق تھا، آپ نے یہ مسودہ نہیں بنایا تو کس نے بنایا تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ مسودہ وزارت قانون میں نہیں بنا تھا، اگر آپ آج بھی وزارت قانون میں جا کر اس مسودے کو تلاش کریں تو وہ نہیں ملے گا یہ سب کچھ مارشل لاء سیکرٹیریٹ میں ہوا اس کا گزٹ نوٹیفکیشن بھی وزارت قانون سے جاری نہیں ہوا۔

سوال: آپ عمر کے اس مرحلے پر ہیں کہ آپ اگر خود کو پی سی او کے نفاذ کا ذمہ دار نہیں سمجھتے تو آپ یہ بتائیں کہ پی سی او کس کی فکر کا نتیجہ تھا؟ وگرنہ لوگ تو یہی کہیں گے کہ سیکرٹری قانون بھی یعنی آپ بھی اس جرم میں شامل تھے؟ آپ کو یہ چیز واضح کرنی چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: پی سی او کا تعلق مجھ سے نہیں جنرل ضیاء سے ہے وزارت قانون اس مسودے کی تیاری میں بہر حال شامل نہیں تھی۔

سوال: پی سی او پر عملدرآمد تو آپ نے کروایا سیکرٹری قانون کی حیثیت سے آپ نے ہی سب سے رابطے کیے اس طرح اصل کام تو آپ نے کیا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ قصہ یوں شروع ہوا کہ مارشل لاء کے بارے میں جو بھی

مقدمہ آتا تھا بلوچستان ہائیکورٹ اس کے خلاف فیصلہ دیتی تھی دوسری طرف سندھ ہائیکورٹ کے اختلافی فیصلے آ گئے، ان دونوں فیصلوں کے خلاف حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کی ملک میں دو متضاد فیصلے موجود ہیں ان پر سپریم کورٹ فیصلہ دے لیکن سپریم کورٹ کے چیف جسٹس انوارالحق نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا میں خود ان کے پاس گیا اور کہا کہ یہ تضاد ختم ہونا چاہیے لیکن جسٹس انوارالحق نہ مانے ان سے جھگڑا شروع ہوا اور پھر اسی لیے پی سی او بنایا گیا۔

سوال: دو متضاد فیصلوں کے آنے کے بعد آپ وزیر قانون کا پیغام لے کر چیف جسٹس کے پاس گئے اور انہوں نے فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا جسٹس انوارالحق مارشل لاء کے خلاف ہو گئے تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: انوارالحق ان مقدمات کو جلدی سننے پر تیار نہ ہوئے نجانے ان کی کیا مصلحت تھی انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو بہت سے مقدمات پڑے ہوئے ہیں جسٹس انوارالحق چاہتے تو پی سی او نہ بنتا۔

سوال: تو آپ کے خیال میں پی سی او چیف جسٹس انوارالحق کی وجہ سے بنا؟ کیا وہ جنرل ضیاء کے خلاف ہو گئے تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل! یہ تو علم نہیں کہ وہ خلاف ہو گئے تھے لیکن میں چیف جسٹس ہوتا تو یہ کیس سنتا اور دو متضاد قوانین اور فیصلوں میں سے ایک کو چنتا میں نے بطور سیکرٹری قانون جسٹس انوارالحق سے درخواست کی کہ ان مقدمات کو جلد نمٹا دیں پی سی او کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔

سوال: اور پھر جسٹس انوارالحق نے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھایا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جسٹس انوارالحق جو پہلے فیصلے لکھ چکے تھے وہ ان کے حلف اٹھانے میں مانع آتے تھے۔

سوال: مگر جسٹس انوارالحق تو اس کے بعد عالمی عدالت انصاف میں ووٹ لینے کے لیے نکل پڑے تھے اور حکومت نے ان کی مدد کی تھی؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے اور انہیں صرف ایک ووٹ ملا جسٹس انوارالحق آئی سی ایس تھے ان کے پاس قانون کی ڈگری بھی نہیں تھی اس لیے لوگوں نے ان کا بیک گراؤنڈ پسند نہیں کیا۔

سوال: کیا جسٹس انوارالحق اور جنرل ضیاء الحق میں کوئی اختلافات تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جسٹس انوارالحق اور مولوی مشتاق بہت دوست تھے جنرل

ضیاء کا خیال تھا کہ ان دونوں کی ملی بھگت ہے انہیں ان دونوں پر شک تھا۔

سوال: لیکن مولوی مشتاق نے تو جنرل ضیاء الحق کے خلاف کوئی ایسا فیصلہ نہیں دیا تھا جسے مخالفانہ کہا جا سکے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: واقعی ریکارڈ پر تو کوئی ایسی بات نہیں ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ جسٹس (ر) صمدانی کا حلف نہیں لیا گیا تو اصل بات یہ ہے کہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس شمیم حسین قادری نے بالا ہی بالا جسٹس (ر) صمدانی کو جب وہ گورنر ہاؤس حلف اٹھانے آئے تو ان سے کہا گیا کہ ان کا نام حلف اٹھانے والے ججوں میں شامل نہیں ہے حالانکہ جسٹس (ر) صمدانی بڑی نیک نیتی سے حلف اٹھانے لگے تھے۔

سوال: تو آپ کے خیال میں جنرل ضیاء کا اس میں کوئی رول نہیں تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جنرل ضیاء تو انہیں حلف دلانا چاہتے تھے مجھے بھی علم نہیں تھا کہ جسٹس (ر) صمدانی کا حلف نہیں لیا جائے گا مجھے جب جسٹس صمدانی کا پتا چلا کہ ان کا حلف نہیں لیا گیا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس سے پہلے جنرل ضیاء اور جسٹس صمدانی کی ایک بھری میٹنگ میں تکرار ہو چکی تھی میٹنگ میں جنرل ضیاء نے کہا کہ جو سیکرٹری صحیح کام نہیں کرتے انہیں الٹا لٹکا دینا چاہیے اس پر جسٹس صمدانی نے کہا کہ کچھ جرنیلوں کو بھی الٹا لٹکا دینا چاہیے بعد میں جنرل ضیاء اور جسٹس صمدانی کی ملاقات ہوئی اور جسٹس صمدانی نے کہا کہ میں نے یہ الفاظ نیک نیتی سے کہے تھے جس کے بعد جسٹس صمدانی کو تبدیل نہیں کیا گیا اور وہ بدستور سیکرٹری قانون رہے جب وہ تبدیل ہوئے تو مجھے سیکرٹری قانون بنایا گیا۔

سوال: آپ یہ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ جنرل ضیاء جسٹس صمدانی کو حلف دلوانا چاہتے تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: واقعہ یوں ہے کہ جب مجھے دس بجے کے قریب علم ہوا کہ جسٹس صمدانی کو حلف نہیں دلوایا گیا میں نے جنرل جیلانی کو فون کیا تو انہوں نے کہا کہ جسٹس صمدانی آئے ہی نہیں بعد میں انہوں نے انکوائری کروائی تو پتا چلا کہ جسٹس صمدانی کو باہر گیٹ ہی سے واپس کر دیا گیا ہے میں نے شریف الدین پیرزادہ سے بات کی انہیں بھی بڑا افسوس ہوا اور کہنے لگے کہ سب کو علم ہے کہ جسٹس صمدانی کی ضیاء سے لڑائی ہو چکی ہے اس لیے بڑی بدنامی ہوگی چنانچہ جنرل ضیاء سے رابطہ کیا گیا انہوں نے جنرل جیلانی کو کہا کہ انہیں حلف دلوایا جائے اس کے بعد چیف جسٹس شمیم قادری اور ڈپٹی اٹارنی جنرل کو جسٹس صمدانی نے کہا کہ ان کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے اندر جا کر انہوں نے اپنے پیر صاحب کو فون کیا اور پیر صاحب نے انہیں منع کر دیا کہ حلف نہ اٹھائیں چنانچہ انہوں نے حلف اٹھانے

سے معذرت کرلی اس معاملے میں جنرل ضیاء چاہتے تھے کہ جسٹس صمدانی حلف اٹھائیں مگر ایسا نہ ہوسکا جسٹس صمدانی بہت اچھے آدمی تھے انہوں نے ہمت سے کام لیا اور حلف نہیں اٹھایا۔ بہت سے لوگوں کو حلف نہیں دیا جانا تھا مگر شریف الدین پیرزادہ اور میری وجہ سے بہت سے لوگوں کو حلف دلوایا گیا۔

سوال: پی سی او کے نفاذ سے عدلیہ پر فوری اثر کیا پڑا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: ججوں کے حکومت کے خلاف فیصلے کے بارے میں اختیارات ہی بہت کم ہو گئے تھے حکومت کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا تھا

سوال: عدل وانصاف سے وابستگی کے باوجود آپ نے پی سی او کی مخالفت نہیں کی یہ تو بڑی عجیب بات ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس کی مخالفت نہیں کی میں مجبور تھا جب ایک بار یہ بن گیا تو مجھے عملدرآمد کروانا تھا۔

سوال: تو گویا آپ پی سی او کے نفاذ کو دل سے ناپسند کرتے تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل دل سے ناپسند کرتا تھا۔

سوال: عدلیہ سے پی سی او کو نقصان ہوا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل نقصان تو ہوا بہت سے ججوں کو فارغ کیا گیا کئی لوگ اس کے گواہ بھی ہیں کون سے جج رہیں گے اور کون سے جج فارغ ہوں گے یہ فیصلہ بھی میں نے نہیں کیا تھا۔

سوال: تو پھر یہ فیصلے کس نے کیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کچھ فیصلے تو مجھ سے بالا ہی بالا ہوئے پنجاب کے فیصلے گورنر جیلانی نے کیے ان فیصلوں سے میرا تعلق نہیں تھا۔

سوال: اس سلسلے میں حیران کن بات مولوی مشتاق سے حلف نہ لیا جانا تھا کیونکہ وہ جنرل ضیاء کے کافی قریب تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: اصل میں مولوی مشتاق بھی آخر میں جنرل ضیاء کے خلاف ہو گئے تھے۔

سوال: کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جن لوگوں نے پی سی او کے تحت حلف لے بھی لیا وہ آزادانہ فیصلے کرنے میں آزاد تھے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جی! کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ وقتی فیصلہ ہے اگر حلف نہ

اٹھایا تو نوکری سے جائیں گے تاہم کچھ لوگوں کا تو حکومت نے حلف نہ لیا مثلاً بلوچستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مری صاحب کا حلف نہیں لیا گیا وگرنہ انہیں شاید دعوت دی جاتی تو وہ حلف اٹھا لیتے۔

سوال: آپ جج بھی تھے اور سیکرٹری قانون بھی آپ نے پی سی او کی مخالفت نہیں کی؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: سچی بات یہ ہے کہ مخالفت نہیں کی بلکہ (قہقہہ لگاتے ہوئے) میں نے خود پی سی او کے تحت بطور جج حلف اٹھایا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کے دور میں عدلیہ کے ساتھ ان کا کیا رویہ رہا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جنرل ضیاء ججوں کا بہت احترام کرتے تھے ان کے ساتھ ججوں کے تعلقات بڑے اچھے رہے انہوں نے کسی جج کو سولی پر لٹکانے کی بات نہیں کی ہاں البتہ وہ ڈکٹیٹر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا کام بھی چلتا رہے۔

سوال: خاص طور پر جسٹس مری کو کیوں روکا گیا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کیونکہ وہ ہر فیصلہ مارشل لاء حکومت کے خلاف دے رہے تھے۔

سوال: جنرل ضیاء نے مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی ہائیکورٹ کے چیف جج صاحبان کو گورنر بنا دیا عمومی خیال یہ ہے کہ ججوں کو گورنر بننے سے انکار کر دینا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میرے خیال میں ججوں کو گورنری کے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ججوں نے دباؤ کے تحت گورنر بننے کا فیصلہ کیا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کوئی مجبور نہیں کر سکتا اس میں ججوں کی مرضی شامل تھی۔

سوال: آپ قانون اور انصاف کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ قانون کی حکمرانی کی بجائے آمروں کو ایسے راستے بتاتے رہے جس سے وہ لوگ کو دباتے رہے اگر آپ جیسے لوگ ان کا ساتھ نہ دیتے تو وہ جلد ختم ہو جاتے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ ختم ہو جاتے (قہقہہ لگاتے ہوئے) کیا اور لوگ نہ ان کا ساتھ دے دیتے؟ دیو تو دیو ہی رہتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا آئین کو سبوتاژ کرنے کی کوئی علامتی سزا ملنی چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میرے خیال میں ایسی سزا ہونی چاہیے یہ نہ ہو کہ پھر مارشل لاء آجائے جب تک یہ راستہ رکے گا نہیں کام نہیں چلے گا۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کے مقدمہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: اس مقدمے میں بھٹو خود بھی پھانسی لگنے کے تھوڑا بہت ذمہ دار ہیں۔ اس مقدمے میں بھٹو نے بہت غلطیاں کیں پہلے انہوں نے کوشش کی کہ یہ مقدمہ ملتوی ہو جائے اسی مقدمے میں ایک فائل پر بھٹو نے مسعود محمود کو، احمد رضا قصوری کو ''ایلی مینیٹ'' کرنے کا لکھا ہوا تھا جب وہ مقدمہ چلا تو بھٹو کے مخالف وکلاء نے جان بوجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ مسعود محمود سے یہ سوال نہ پوچھا جائے کہ ''ایلی مینیٹ'' کرنے کا کیا مطلب ہے۔ مگر بھٹو کے وکلائے صفائی نے یہ سوال پوچھ لیا کہ ایلی مینیٹ کرنے سے کیا مطلب لیا تو مسعود محمود نے کہا کہ میں نے یہی مطلب لیا ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے اس سوال پر مولوی مشتاق کے ہاتھ سے قلم گر گیا اور انہوں نے کہا وکلائے صفائی نے آج وکلائے استغاثہ کا کام کیا ہے صرف اس سوال کی وجہ سے بھٹو کو اس قتل کا مجرم قرار دیا گیا۔

سوال: جب قانون دان اور عدل وانصاف کے آپ جیسے محافظ جو جمہوری اقدار کے نگہبان ہونے چاہئیں وہ آمروں کا ساتھ دیں تو اس سے قوم میں کیا اچھی روایات جنم لیں گی؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میں جنرل ضیاء کے بڑے قریب رہا ہوں جنرل ضیاء کی جتنی برائیاں لوگ کرتے ہیں وہ اس قدر برے نہیں تھے ان میں بہت خوبیاں تھیں ضیاء الحق کے کھاتے میں برائیاں زیادہ ڈالی جاتی ہیں لیکن وہ اتنے برے آدمی نہیں تھے۔

سوال: کیا بطور سابق جج کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے ججز کیس کے فیصلے سے مطمئن ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ بالکل صحیح فیصلہ تھا اس پر مکمل طور پر عمل ہونا چاہیے۔

سوال: چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے فوج بلائی تھی کیا فوج کو آنا چاہیے تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: فوج کو مداخلت نہیں کرنا چاہیے تھی جو ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے یہاں کوئی مارشل لاء تو نافذ نہیں ہے کہ فوج مداخلت کرے۔

سوال: آپ 1984ء میں جنرل ضیاء الحق کی صدارت کے لیے کروائے جانے والے ریفرنڈم کے چیف الیکشن کمشنر تھے کیا یہ ریفرنڈم منصفانہ ہوا تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ بڑا متنازع ریفرنڈم تھا ریفرنڈم کا جو آرڈر بنا اس میں یہ تھا کہ آپ اسلامی نظام کے حق میں ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر جنرل ضیاء الحق صدر منتخب کریں۔

سوال: یہ آرڈر کہاں تیار ہوا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ حکم بھی وزارت قانون نے تیار نہیں کیا بلکہ مارشل لاء

انتظامیہ نے بنایا ریفرنڈم کی تجویز وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ کی تھی ان کی اور ہماری رائے یہ تھی کہ ریفرنڈم کے بعد جنرل ضیاء کو یقین ہو جائے گا کہ وہ برسر اقتدار رہیں گے۔ پھر وہ انتخاب بھی کروا دیں گے اور اگر ہم نے ریفرنڈم کی مخالفت کی تو پھر شاید پتا نہیں کب تک انتخابات نہ ہوں۔

سوال: ریفرنڈم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں بے تحاشا جعلی ووٹ بھی پڑے اور پھر جسٹس نصرت نے انہیں بڑھا چڑھا کر بھی پیش کیا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: نہیں نہیں، میرے پاس تو جو نتیجہ پرنٹ ہو کر آیا وہ مجھے قبول کرنا پڑا لیکن میرے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ریفرنڈم جیسا بھی ہوا سے ہونے دیں کیونکہ جمہوریت لانے کا یہی واحد راستہ تھا۔ اگر ریفرنڈم نہ ہوتا تو اس ملک میں جمہوریت آ ہی نہیں سکتی تھی۔ ضیاء الحق بہت طاقتور آدمی تھے آپ انہیں ہٹا نہیں سکتے تھے جنرل ضیاء الحق کو 85ء کے الیکشن کے لیے قائل کرنے میں شریف الدین پیرزادہ کا بہت کردار تھا جس کی انہیں داد ملنی چاہیے غلام اسحاق خان کا بھی اس میں بڑا کردار تھا۔

سوال: ریفرنڈم کے بعد جنرل ضیاء الحق سے ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جنرل ضیاء الحق سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے میں جب ان سے ملا تو میں نے کہا کہ ریفرنڈم میں میری بڑی بدنامی ہوئی ہے اس لیے میں اپنے عہدے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔

سوال: جنرل ضیاء الحق نے پوچھا نہیں کہ کس بات پر بدنامی ہوئی ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: ہم نے کہا کہ ریفرنڈم میں 93 فیصد ووٹ کہاں ڈالے گئے ہیں۔ ووٹ غلط طور پر ڈالے گئے تھے میں نے کہا کہ مجبوراً میرے پاس جو رزلٹ آیا میں نے شائع کر دیا اس کے بعد 1985ء کا الیکشن ہوا اس میں شناختی کارڈ لازمی تھا یہ انتخاب اتنا منصفانہ تھا کہ وفاقی کابینہ کے پانچ نامور ارکان شکست کھا گئے ان میں سے بیشتر میرے جاننے والے تھے الیکشن کے بعد میں انہیں منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہا وہ سمجھتے ہوں گے کہ میں نے گڑبڑ کروائی ہوگی۔ 1988ء کا انتخاب بھی جماعتی بنیادوں پر میں نے ہی کروایا اس میں غلام اسحاق خان کا بہت رول تھا۔

سوال: کیا اس وقت ریفرنڈم کی قانونی اور آئینی حیثیت کے بارے میں سوچا گیا تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میرے خیال میں شریف الدین پیرزادہ کی سوچ یہ تھی کہ آپ جنرل ضیاء الحق جیسے طاقتور آدمی کو ہٹا نہیں سکتے اور جب تک یہ اطمینان نہ ہو وہ ایسا کوئی قانون بننے نہیں دیں گے جو ان کے خلاف جاتا ہو تو اس وقت میرا، شریف الدین پیرزادہ اور کئی دوسرے لوگوں کا خیال یہ

تھا کہ ریفرنڈم کے بعد ملک خود بخود جمہوریت کی طرف بڑھ جائے گا شریف الدین پیرزادہ نے میرے ساتھ اس وقت یہ بات کی تھی جواب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ ہر انتخاب میں شناختی کارڈ ووٹ ڈالنے کے لیے ضروری تھا لیکن ریفرنڈم کے لیے شناختی کارڈ ضروری ہونے کی شرط ختم کر دی گئی بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ مسجدوں میں بیلٹ بکس رکھ دیئے جائیں تا کہ لوگوں کو سہولت ہو شناختی کارڈ کی وجہ سے جو تھوڑا بہت چیک ہوتا تھا وہ بھی نہیں ہوا بہت گڑ بڑ ہوئی اور بے تحاشا جعلی ووٹ پڑے۔

سوال: سندھ کے قوم پرست حلقے آپ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے بطور چیف الیکشن کمشنر مہاجروں کو بہت فائدہ پہنچایا اور آپ نے 1985ء کے انتخابات کی حلقہ بندیاں اس طرح سے کیں کہ ایم کیو ایم کی کئی سیٹیں بڑھ گئیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: سندھ میں اکثر لوگوں نے 85ء کے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا یہ الزام بالکل غلط ہے حلقہ بندیاں بالکل صحیح طریقے سے کی گئی تھیں۔

سوال: کیا آپ اپنی زندگی کی طویل اننگز سے مطمئن ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل! آج میں جہاں بھی جاتا ہوں کوئی مجھے گالی نہیں دیتا، میں نے بطور سیکرٹری قانون بھی لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوال: آپ نے یہ نہیں بتایا کہ پی سی او کس نے بنایا تھا؟ عمر کے اس حصے میں آپ کو مستقبل کی تاریخ کے سامنے سچی بات کرنی چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: (جھجک کر) شریف الدین پیرزادہ نے بنایا تھا اور ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح جنرل ضیاء الحق کو جمہوریت کی طرف لایا جائے مقصد یہ تھا کہ سارا آئین ختم نہ ہو چنانچہ یہی ہوا اور بعد میں سارا آئین بحال ہو گیا۔

سوال: بھٹو کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بھٹو اور میں ایک ہی بلڈنگ میں پریکٹس کرتے تھے بھٹو نے مجھے پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی لیکن میرے والد نے کہا کہ سیاست نہیں کرنی پھر جب میں جج بنا تو بھٹو صاحب نے ہی میری فائل پر دستخط کیے میں اسی دور میں جج بنا میرے نام کی سفارش وزیر قانون حفیظ پیرزادہ نے کی۔ بھٹو بہت ہی قابل آدمی تھے وہ بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن وہ آخر میں بگڑ گئے تھے اس کے ساتھ ساتھ بھٹو نے 1973ء کا جو آئین بنا دیا وہ کمال کی بات ہے انہوں نے تمام صوبوں اور رہنماؤں کا اس پر اتفاق رائے کروایا۔

سوال: سیاستدانوں کے بارے میں عمومی تاثر اچھا نہیں ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: اصل میں بھارت نے شروع میں ہی زمینداریاں، جاگیرداریاں ختم کر دیں یہاں پر یہ نہیں ہوا میرا جیسا عام آدمی الیکشن میں کھڑا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

سوال: مشرقی پاکستان کے سانحے کا کون ذمہ دار تھا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: اس سانحے کی ذمہ دار فوج ہے۔

سوال: کیا ملکی سیاست میں فوج کا کردار ہونا چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل نہیں ہونا چاہیے بھارت میں اتنی بڑی فوج ہے وہ کوئی مداخلت کرتی ہے؟ کیا امریکہ میں فوج مداخلت کرتی ہے؟ کہیں بھی مداخلت نہیں ہوتی۔

سوال: تو گویا نیشنل سیکورٹی کونسل بھی نہیں ہونی چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: ہمارے ملک کے حالات کے پیش نظر تو نیشنل سیکورٹی کونسل ہونی چاہیے چونکہ فوج نے مداخلت تو کرنا ہی ہوتی ہے تو پھر کسی اصول اور ضابطے سے کریں۔

سوال: کیا اس ملک میں کبھی حقیقی جمہوریت رہی ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: صرف لیاقت علی خان کے دور میں صحیح جمہوریت تھی اس کے بعد تو یہ ختم ہو کر رہ گئی۔

سوال: کیا 1973ء کے آئین کے تحت اسلامی نظام نافذ ہو سکتا ہے یا پھر اس میں مزید آئینی ترامیم کی ضرورت ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: 1973ء کے آئین میں اسلامی نظام کے نفاذ کی مکمل گنجائش موجود ہے نئی ترامیم کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: شریعت بل کی ضرورت تو ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے جو شریعت کورٹ بنائی تھی مجھے یہ پسند نہیں ہے آخر میں مقدمہ سپریم کورٹ میں آتا ہے تو پھر سپریم کورٹ کے جو جج موجود ہیں انہی سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

سوال: کیا پاکستان کی خارجہ پالیسی ٹھیک ہے اور یہ پاکستان کے حق میں ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ صحیح نہیں ہے جو حکومت آتی ہے وہ نئی خارجہ پالیسی بناتی ہے حالانکہ بھارت میں شروع سے آج تک ایک ہی خارجہ پالیسی رہی ہے۔

سوال: پاکستان کے معاشی بحرانوں کا ذمہ دار کسے سمجھتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: معاشی بحرانوں کے ذمہ دار تو سیاستدان ہی ہیں۔

سوال: اگر پاکستان میں مارشل لاء نہ آتا تو کیا ہم بہتر صورتحال میں ہوتے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یقیناً اگر مارشل لاء نہ آتا تو ہم آپس میں لڑ بھڑ کر معاملات ٹھیک کر لیتے ہندوستان کتنا بڑا ملک ہے وہاں بھی تو معاملات چل ہی رہے ہیں۔

سوال: کیا آپ بھارت سے پاکستان کے تعلق استوار کرنے کے حامی ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: ہمیں اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیے لڑائی سے ہمیں کچھ ملے گا نہیں۔

سوال: کشمیر کے مسئلے کا جنگ کے علاوہ بھی کوئی حل ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کشمیر کو تو ہم نے شروع میں ہی کھو دیا تھا ہم لڑ بھڑ کر تو کشمیر نہیں لے سکتے اگر ہمارے پاس ایٹم بم نہ ہوتا تو بھارت ہمیں نقصان پہنچاتا۔

سوال: کراچی کے مسئلے کا کیا حل ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: کراچی صرف مہاجروں کا شہر نہیں وہاں سندھی، پٹھان، بلوچی اور مہاجر ہیں وہاں پر آزادی ہونی چاہیے اور حقیقی جمہوریت قائم ہونی چاہیے۔

سوال: سندھی مہاجر تنازع کا کیا حل ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: سندھی مہاجر دوستی کے علاوہ اس کا کوئی حل نہیں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم دونوں میں ڈائیلاگ ہونا چاہیے۔

سوال: خواتین کی آزادی کے قائل ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بہت حد تک قائل ہوں عورتوں کی جو سیٹیں ختم کی گئی ہیں یہ بھی غلط ہوا ہے۔

سوال: کیا آپ پیروں کو مانتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میں پیر پرست تو نہیں لیکن پیر دوست ہوں پیر صاحب گولڑہ شریف سید نصیر الدین شاہ بڑے قابل انسان ہیں میں کبھی کبھی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔

سوال: کیا عورتوں کو صرف نظر کا پردہ کرنا چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جیسا حضور اقدس ﷺ کے دور میں عورتیں پردہ کرتی تھیں ویسا پردہ ہونا چاہیے۔

سوال: کیا آپ احتساب سے مطمئن ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: احتساب ہو ہی نہیں رہا بالکل یکطرفہ احتساب ہو رہا ہے چیف احتساب کمشنر کے پاس بہت اختیارات ہونے چاہئیں وہ اس قدر آزاد ہو کہ جو چاہے کریں لیکن وہ تو کچھ کر ہی نہیں رہے قانون بنانے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک اس قانون پر عمل نہ ہو۔

سوال: کوئی ایسا خواب جو سچ ثابت ہوا ہو؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میں خواب تو بے تحاشا دیکھتا ہوں لیکن جنرل ضیاء الحق کی موت کے بارے میں میرا خواب سچا ثابت ہوا، یہ خواب میں نے ان کے انتقال سے 3 ہفتے پہلے دیکھا کہ ضیاء صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، جنرل ضیاء کی وفات سے پہلے 16 اگست کو میری ان سے اسلام آباد میں ملاقات بھی ہوئی، ان کو اسی لیے اقتدار سے ہٹایا گیا کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس سارے خطے میں اسلام لے آئیں گے۔

سوال: کیا عدلیہ کی فعالیت سے ملکی مسائل حل ہو سکتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: ہاں بالکل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت عدلیہ کے کاموں میں مداخلت نہ کرے۔

سوال: کیا ہمارے ملک میں حکمرانی سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ہاتھ میں رہی ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: یہ سچ ہے کہ ان کی ہر کام میں مداخلت رہی ہے اور فوج نے جہاں بھی مداخلت کی ہے وہاں کام خراب ہی ہوا ہے۔

سوال: کیا آپ مہنگائی سے متاثر ہوتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بہت متاثر ہوا ہوں میرے بچے تو امریکہ میں ہیں میرا پنشن پر گزارا ہے اس لیے مہنگائی کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

سوال: کیا کبھی خوف محسوس ہوتا ہے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: میرا اللہ پر ایمان ہے اس لیے میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

سوال: آپ خوش کس وقت ہوتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: صبح پانچ بجے جب میں نماز کے لیے اٹھتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں اس کے بعد میں ٹہلنے چلا جاتا ہوں۔

سوال: آپ کو زندگی میں سب سے زیادہ صدمہ کب ہوا؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: جب میرے بڑے بھائی کا افریقہ میں انتقال ہوا اس وقت

1985ء کے انتخابات ہو رہے تھے اور میں وہاں جا بھی نہ سکا۔

سوال: کیا صوبوں کو مزید خود مختاری ملنی چاہیے؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: بالکل ملنی چاہیے نہیں ملے گی تو جو حالات جا رہے ہیں وہ بگڑ بھی سکتے ہیں۔

سوال: کیا کراچی کو الگ صوبہ بنانے سے مسائل حل ہو سکتے ہیں؟

جسٹس (ر) ایس اے نصرت: نہیں خیر اس حد تک تو نہیں جانا چاہیے جس طرح بھارت میں صوبوں کو مکمل مالی صوبائی خود مختاری حاصل ہے پاکستان میں بھی یہ کر دینا چاہیے۔

انٹرویو: جون، 1999ء

مقام: اسلام آباد

حوالۂ اشاعت: 25 جولائی، 1999ء

جسٹس (ر) شیخ آفتاب حسین

جسٹس (ر) شیخ آفتاب حسین مرحوم نے پاکستانی عدلیہ کی تاریخ کا سب سے متنازعہ فیصلہ لکھا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا لاہور ہائیکورٹ کا فیصلہ اگرچہ عدالتوں کے لیے نظیر نہیں ہے لیکن جسٹس (ر) شیخ آفتاب آخری وقت تک اس فیصلے کا دفاع کرتے رہے۔

جسٹس (ر) آفتاب حسین پکے مسلم لیگی تھے قائداعظم کے علاوہ کوئی سیاسی لیڈران کے آئیڈیل کے قریب تک جگہ نہیں پا سکتا تھا وہ جنرل ضیاء الحق سے آخری عمر میں شدید ناراض ہو گئے تھے کیونکہ جنرل ضیاء نے بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے بعد انہیں وفاقی شرعی عدالت کا چیف جسٹس بنا دیا اور بعد ازاں جب وہ بیرون ملک دورے پر گئے ہوئے تھے انہیں وفاقی شرعی عدالت سے بھی فارغ کر کے اپنا مشیر بنانے کی پیشکش کر دی لیکن جسٹس (ر) آفتاب نے یہ عہدہ قبول کرنے کی بجائے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا اور بعدازاں اپنی وفات تک ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے عملاً سیاسی و عدالتی زندگی سے الگ ہو گئے۔

جسٹس (ر) آفتاب کا یہ انٹرویو ان کی زندگی کے آخری دنوں میں لیا گیا جس میں انہوں نے بھٹو کیس، عدلیہ اور جنرل ضیاء الحق کے حوالے سے اپنا زاویہ نظر پیش کیا جو ریکارڈ کا حصہ بن چکا ہے۔

اہم نکات

☆ ضیاء الحق نے میرا ایک فیصلہ تبدیل کرانے کی کوشش کی لیکن بھٹو کیس میں مداخلت نہیں کی۔

☆ انسان اس سے بڑا نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے کتنا جھک کر ملتا ہے یا کار تک چھوڑنے آتا ہے۔

☆ جنرل ضیاء نے اقتدار کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

☆ مولوی مشتاق سخت آدمی تھے۔ ضیاء الحق ان سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ ضیاء الحق نے انہیں سبکدوش ہی کر دیا۔

☆ ججوں کو مراعات بھٹو نے دیں لیکن انہوں نے ججوں کو ماتحت کرنے کی کوشش نہیں کی، 88ء میں بے نظیر کو اقتدار دینے کا حامی تھا۔

☆ ملاازم کو جنرل ضیاء الحق نے فروغ دیا۔

انٹرویو

سوال: مارشل لاء اور جمہوریت میں سے آپ کسے پسند کرتے ہیں؟

جسٹس شیخ آفتاب: میں ہمیشہ ہی سے مارشل لاء کے خلاف رہا ہوں جب ایوب خان کے مارشل لاء کا اعلان ہوا تو میں اس وقت باتھ روم میں تھا وہ اعلان سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں کسی نے گھونسہ مار دیا ہو یعنی مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس وقت اندازا یہ تھا کہ مسلم لیگ بھاری اکثریت سے انتخاب جیت جائے گی۔ مارشل لاء لگتے وقت یہ بھی خیال تھا کہ ایوب خان اور سکندر مرزا کا اتحاد زیادہ دیر نہیں چلے گا پھر چند دنوں بعد یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ ان کے درمیان اتحاد ٹوٹ گیا ہے میری ضیاء الحق کے ساتھ زیادہ شناسائی بھی نہ تھی مجھے لاہور ہائیکورٹ سے نکالنے کے لیے ایک دن میں ہی شریعت کورٹ بنائی گئی۔ لاہور ہائیکورٹ میں میں اس بنچ کا ممبر تھا جو اصغر خان کی رٹ سماعت کر رہی تھی۔ اس رٹ کا واضح مقصد مارشل لاء سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اس کیس میں جنرل ضیاء الحق کو یہ اطلاع دی گئی کہ فیصلہ لکھا جا چکا ہے بعد میں الیکشن کی تاریخ مقرر ہو گئی جس پر بنچ توڑنے کے لیے دو ججوں کا اخراج ضروری سمجھا گیا اس لیے مولوی مشتاق کو تو فوری طور پر سپریم کورٹ کا ایڈہاک جج بنا دیا گیا اور میرے اخراج کے لیے جنرل ضیاء الحق نے راتوں رات شریعت کورٹ بنا ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایک اور مقدمہ کا فیصلہ لکھ کر ذکی الدین پال کو فائل بھیج دی تھی چونکہ وہ سینئر جج تھے اس پر ضیاء الحق کو اطلاع فراہم کی گئی کہ یہ فیصلہ اصغر خان کے مقدمے میں ہے۔ مولوی مشتاق کو سپریم کورٹ بھیج دینے سے فیصلہ ہو سکتا تھا کیونکہ امکان یہ تھا کہ میں اور ذکی الدین پال بھی فیصلہ بحثیت ڈویژن بنچ صادر کر سکتے تھے لہٰذا ضیاء الحق نے مجھے شریعت کورٹ کی راہ دکھائی اس کے بعد پھر جنرل ضیاء الحق نے مجھے چیف جسٹس کی حیثیت سے جانچنے کے لیے اپنے پاس بلایا کیونکہ اس زمانے میں شریعت کورٹ کے متعلق جتنے فیصلے تھے ایک کے علاوہ اتفاق سے وہ سب میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اس وجہ سے میں کچھ مشہور ہو گیا تھا۔ اور شاید اسی مجبوری کی وجہ سے انہوں نے اپنے پاس بلا لیا انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کی میرے مسلک کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا میں صرف قرآن اور سنت رسول کا پابند ہوں میں نے ان کو دو باتیں مزید سنائیں پہلی یہ کہ میں ایک جج ہوں اور بلا خوف فیصلہ کرنے کا پابند ہوں دوسرا یہ کہ مارشل لاء کو میں نے ہمیشہ ناپسند کیا

ہے یہ میں نے اس لیے کہہ دیا تھا کہ وہ کل کو مجھ سے آکر کوئی سفارش وغیرہ نہ کریں میں اس بات کو چھپا کر نہیں رکھتا کہ میرے مارشل لاء کے بارے میں کیا خیالات رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ سے کون کہتا ہے کہ آپ اپنے فرائض اپنے ضمیر کے علاوہ کسی اور طرح ادا کریں یہ الگ بات ہے کہ میرے اخراج کی وجہ بالآخر وہی بنی جس کا مجھے ڈر تھا۔

سوال: آپ کے مزاج کی وجہ کی بنیاد کن اختلافات پر تھی اور اس کا پس منظر کیا تھا؟

جسٹس شیخ آفتاب: اختلافات کے متعلق زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں لوگوں کو بھی پتا ہے کہ کن وجوہات کی وجہ سے مجھے نکالا گیا تھا اور اس بارے میں جسٹس انوار الحق بھی اکثر اشارہ دیتے رہتے ہیں اصل میں بات ایک جج اور ایک ہمہ وقت چیف ایگزیکٹو کے مختلف رویوں کی تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وکیل کی حیثیت سے جب میں نے دین کا مطالعہ شروع کیا تو میری کچھ علمی حیثیت بھی تھی کیونکہ میں کوئی ٹوٹا پھوٹا وکیل نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ''بار اور بنچ'' میں مجھے تھوڑا بہت نام بھی دیا تھا اسی وجہ سے میرے شریعت کے بارے میں آرٹیکلز میں دین کے بارے میں وسیع معلومات ہوتی تھیں جو میرے ذہن کو بھی اطمینان بخشتی ہیں دوسرا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا اور میرا خیال ہے کہ سوچنے والے ذہن جن کی دین کی طرف رغبت ہو ان کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم نے اسلامی اور دینی تعلیم کو ایک خاص طبقے کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور ان کو آپ ملا یا مولوی کہہ سکتے ہیں یہ ملا بیچارے تو اپنی طرف سے کوئی چیز پیش ہی نہیں کر سکتے انہوں نے تو ہمیشہ دوسروں کی تقلید کی ہے دوسرے لوگوں نے جو کہہ دیا ہے اس سے آگے یہ بڑھ ہی نہیں سکتے۔ تدبر اور تدبیر کی جب سوچ نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی بات نہیں مانی لیکن اگر ہم مشرق اور مغرب یعنی سائنس اور مذہبی تعلیم کو یکجا کر کے دیکھیں تو اس میں ہمیں بہت سی کامیابیاں دیکھنے کو ملیں گی اس کی مثال آپ کو دیتا ہوں کہ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جن کے پاس مدرسے کی دینی تعلیم تک نہیں ہے لیکن وہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں سے کہیں زیادہ ذہین اور علم رکھنے والے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ سب کچھ سیکھا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے کہ جہاں دینی اور دنیاوی دنوں ''علوم کی گرائنڈنگ'' ہو اور ایسا آدمی اسلام کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتا ہے اور تدبر کر سکتا ہے۔

سوال: علماء کے علم سے کیا قانون سازی میں مدد نہیں مل سکتی علماء اور انگریزی پڑھے لکھے افراد میں کیا تضاد ہے؟

جسٹس شیخ آفتاب: علماء اس بات پر راضی نہیں کہ مدرسوں میں علم دین کے ساتھ سائنس اور

دیگر علوم پڑھائے جائیں اور انگریزی زبان کی بھی تعلیم دی جائے کیونکہ اس طرح سے مدارس سے اس کی سرداری ختم ہونے کا ڈر ہے اور ہمارے ہاں جو مغربی تعلیم یافتہ طبقہ ہے ان میں سے بعض یہ سمجھتے ہیں کہ دین کے بارے میں جو ہمارے علمائے کرام کہتے ہیں وہی حرف آخر ہے اکثر لاعلمی کی وجہ سے دین میں من مانی کرتے ہیں علم حدیث اور آئمہ پر بھی تنقید کرنے سے دریغ نہیں کرتے ایسے بھی لوگ ہیں کہ جب کسی معاملے پر ان سے کوئی بات کی جائے تو وہ سوچتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر صحیح نتیجے پر بھی پہنچ جاتے ہیں شرعی عدالت نے بھی اس بارے میں لوگوں کی کافی رہنمائی کی ہے یہی وجہ ہے کہ جب میں شرعی عدالت میں تھا تو ہمیں علماء کی نسبت وکلاء سے زیادہ مدد ملی تھی۔

سوال: آپ کی نوکری کا خاتمہ کیسے ہوا، یہ قصہ بھی سنا ڈالیں؟

جسٹس شیخ آفتاب: اصل تو یہ تھی کہ حکومت نے مجھے سوڈان بھیجا کیونکہ ان کے ہاں شریعت کانفرنس منعقد ہونا تھی لیکن میں نے بحیثیت حکومتی نمائندہ جانا پسند نہ کیا میں نے پندرہ دن کی چھٹی لی ہوئی تھی تاکہ واپسی پر عمرہ ادا کرتا آؤں جب میں سعودی عرب میں تھا تو میرے سیکرٹری کا فون آیا اس نے بتایا کہ میرا یہ عہدہ ختم کر دیا گیا ہے اور مجھے مذہبی امور کی وزارت میں بطور مشیر تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن وہ بات بہت واضح نہیں تھی۔ کسی نے بتایا کہ مجھے صدر کا مشیر بنایا گیا ہے لیکن جب میں یہاں آیا تو میں نے احکام اور آئینی ترامیم دیکھیں۔

جج بننا اس لیے قبول کیا کہ یہ بھی قوم کی خدمت ہے اور اگر اسی خدمت سے مجھے محروم کر دیا جائے تو پھر نوکری کرنا تو مقصد نہیں تھا اس لیے میں نے استعفیٰ دے دیا اس طرح ہائی کورٹ اور شریعت کورٹ دونوں سے نکالنے کے لیے جنرل ضیاء الحق نے آئینی ترامیم کا سہارا لیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے لیے یہ ایک جگمگاتا ہوا افتخار ہے۔

سوال: ہمارے ہاں کبھی کبھی ایک تاثر یہ بھی بنتا ہے کہ بھٹو کیس کے جو جج حضرات تھے جنرل ضیاء ان کو مراعات دینا چاہتے تھے دوسری بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ بعد میں جنرل ضیاء ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے؟

جسٹس شیخ آفتاب: بات یہ ہے کہ بھٹو کیس کا جو فیصلہ ہوا تھا وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کیا تھا دوسری بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء کی طرف سے ججوں کے لیے مراعات کا کوئی ذکر نہ تھا اور نہ ججوں کو مراعات دینے سے ان کے فیصلوں پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا مراعات کا جہاں تک تعلق ہے تو اگر کوئی آئین تمام مراعات جج حضرات کو دے تب بھی کوئی جج آئین میں ترمیم کرنے والی حکومت کے حق میں کوئی

بات نہیں کرسکتا نہ مراعات اس خیال کو مدنظر رکھ کر دی جاتی ہیں۔ مراعات جب بھی دی گئیں سب ججوں کو دی گئیں لیکن اگر کسی ایک شخص کو مراعات دی ہوگی تو وہ رشوت میں گنی جائے گی ایسا کوئی واقعہ کم از کم میرے علم میں نہیں۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کو بطور انسان آپ نے کیسا پایا، آپ کا جو تھوڑا بہت تعلق تھا اس حوالے سے آپ بتائیں گے؟

جسٹس شیخ آفتاب: جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے تو وہ کسی شخص کے عہدے کے حوالے سے جانچی جائے گی محض ظاہری اخلاق کوئی معنی نہیں رکھتا ایک ایسا شخص جو اپنا کام پوری تندہی کے ساتھ کرتا ہے لیکن بظاہر بڑا سخت ہے میں سمجھتا ہوں وہ بہت تیز ہے قائداعظم نے مسلمانوں کے آپس کے اختلافات ختم کرائے تھے لیکن ضیاء الحق نے ان اختلافات کو دوبارہ سے ہوا دی شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان بھائی چارہ قائم تھا لیکن اب انہی کے درمیان دوبارہ تفرقہ بازی شروع ہوگئی ہے قائداعظم کی قیادت کا بہت بڑا کردار ہے کہ سب فرقے متحد تھے لیکن آج ضیاء الحق کی باقیات کا اثر باقی ہے ضیاء الحق نے دیوبندی اور بریلوی فرقہ بندی کو فروغ دیا اس زمانے میں اذان سے پہلے سلام پڑھتے ہیں جہاں تک ضیاء الحق کا تعلق ہے ان سے بہت بڑی برائی یہ ہوئی کہ انہوں نے ملاازم کو فروغ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب 1956ء کا آئین بنا اس میں صرف ایک پابندی تھی کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگا تو اسے ہر شخص نے بشمول جملہ علماء نے تسلیم کیا تھا لیکن اس کے بعد ہی نئی نئی باتیں شروع ہو گئیں ایک طرف سے یہ بات آئی کہ حنفی قانون ہونا چاہیے یعنی اس سے مختلف فرقوں نے اپنا اپنا قانون بنانے کی باتیں شروع کیں اور زکوٰۃ کا معاملہ آیا تو پھر فقہ جعفریہ بن گئی بعد میں جواباً سپاہ صحابہ بن گئی میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قائداعظم نے تو سب چیزیں ختم کردیں تھی لیکن ضیاء الحق نے ان سب چیزوں کو دوبارہ ہوا دی پہلے میلاد شریف گھر گھر پڑھا جاتا تھا لیکن مسجد میں کبھی بھی نہیں میلاد شریف کی محفل ہوئی یہ سب ضیاء الحق کی بے تدبیریاں تھیں دوسرا ضیاء الحق ایڈہاک ازم پر یقین رکھتے تھے اور ہر مسئلے کو وہ اسی حد تک طے کرنے کے قائل تھے جتنا ان کے اقتدار کے لیے ضروری تھا اور مذہب کو بھی انہوں نے محض اپنی ذات کے لیے استعمال کیا انسان کا کردار انہی چیزوں سے جانچا جاتا ہے نہ کہ اس بات سے کہ وہ مجھے ملتا ہے تو کتنا جھک کر ملتا ہے یا یہ کہ وہ مجھے کار تک چھوڑنے آتا ہے یا نہیں۔

سوال: اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کو آپ بطور انسان کیسے سمجھتے ہیں؟

جسٹس شیخ آفتاب: میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ہاں البتہ آپ کو یہ بتا سکتا ہوں کہ جب بے نظیر بھٹو کے اقتدار کا سوال تھا تو میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ سب سے بڑی پارٹی کی لیڈر ہیں اور

دوسری پارٹیاں چھوٹی ہیں تو میں اس چیز کا حامی تھا کہ اقتدار بے نظیر بھٹو کو ہی ملنا چاہیے میں سیاسی طور پر مسلم لیگی ہوں لیکن میں منصفانہ طور پر یہ سمجھتا کہ بے نظیر بھٹو اقتدار کی حق دار ہیں میں نے انگریزی میں ایک کتاب اسلام میں عورت کا مقام کے نام سے بھی لکھی تھی جس میں خاص طور پر یہ ثابت کیا تھا کہ عورت سربراہ مملکت بھی بن سکتی ہے اب مسلم لیگ کیسی ہی ہو لیکن میرے ذہن میں قائداعظم والی مسلم لیگ کا خیال ہے اور میں کسی اور مسلم لیگ میں عملاً حصہ لینے کو اب تک کبھی تیار نہیں ہوا ایک زمانے میں نشتر (مرحوم) نے بھی کہا کہ ادھر آ جائیں اور میں نے ممبر سازی شروع بھی کی لیکن 1958ء کے مارشل لاء نے وہ قصہ ہی ختم کر دیا۔

سوال: اب جو تازہ حالات ملک کے ہیں اس میں آپ کیا دیکھتے ہیں، مسلم لیگ کی پوزیشن کے بارے میں نواز شریف اور بے نظیر کی چپقلش کے حوالے سے آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جسٹس شیخ آفتاب: بات یہ ہے کہ جب جمہوریت کی بات ہوتی ہے تو اس میں برسر اقتدار اور اپوزیشن کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے نواز شریف کو بھی چاہیے کہ وہ بے نظیر کو ساتھ لے کر چلیں اسی طرح بے نظیر کو بھی اپنے نظریات میں لچک پیدا کرنی چاہیے اصل میں ہمارے ہاں لچک ختم ہو گئی ہے ہر آدمی دوسرے کے خلاف بول رہا ہے۔ ابتدا سے ہی بے نظیر دور میں صوبے اور مرکز کے درمیان محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی اب یہ محاذ آرائی ختم ہونی چاہیے۔

انٹرویو: جون، 1992ء

مقام: مسلم ٹاؤن لاہور

حوالۂ اشاعت: 25 جولائی، 1992ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم

فخر الدین جی ابراہیم جنہیں عرف عام میں ''فخرو بھائی'' کہتے ہیں واقعی قابل فخر شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت بے داغ ہے اور وہ ضمیر کے خلاف کوئی کام کرنے پر تیار نہیں ہوتے زندگی میں جہاں کہیں ان کے ضمیر کے خلاف کوئی بات ہو وہ فوراً اس کے خلاف موقف اختیار کرتے ہیں۔ اپنی صاف گوئی، راست بازی اور ایمانداری کی بدولت کئی بار اعلیٰ عہدوں سے مستعفی ہو چکے ہیں۔ ضیاء الحق کے دور میں وہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج تھے۔ پی سی او کا نفاذ ہوا تو انہوں نے حلف لینے سے انکار کر دیا اور اس طرح سے ایک نئی تاریخ رقم کی، پھر وہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے اٹارنی جنرل تھے ان کی مرضی کے برخلاف حکومت نے شریف الدین پیرزادہ کو ایک مقدمے میں وکیل کیا تو انہوں نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ فاروق لغاری کی نگران حکومت میں احتساب اور انتخابات میں اہلیت کے حوالے سے قانون میں تبدیلی کی بات کی گئی تو وہ فوراً بطور وفاقی وزیر قانون مستعفی ہو گئے لیکن ان استعفوں کے باوجود وہ ملک کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں وہ سپریم کورٹ کے جج، سندھ کے گورنر، پاکستان کے اٹارنی جنرل اور پاکستان کے وفاقی وزیر قانون کے عہدوں پر متمکن رہے ہیں۔ ان کی باتیں دلچسپ، ان کا انداز سادہ، ان کا مطالعہ وسیع، ان کا کردار غیر متنازعہ اور ان کی وکالت شاندار ہے اب بھی وہ ملک کے بڑے وکلاء میں سے ہیں اور پاکستان میں زیادہ انکم ٹیکس دینے والے پرائیویٹ شہریوں میں سر فہرست ہیں۔

فخر بھائی سے انٹرویو کا تجربہ عجیب تھا وہ سوالات کے انتظار سے پہلے ہی خود کلامی کے تحت ماضی کے واقعات کا احاطہ کرتے گئے اور لگتا یوں تھا کہ ان سے سوالات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ خود ہی سوالات اٹھاتے اور خود ہی جوابات دیتے رہے۔ وہ ایک اصولی مگر جذباتی آدمی ہیں۔ ان سے جس بھی معاملہ پر بات ہوئی اس پر بحث میں ان کے لہجے میں جوش اور جذبہ تھا جیسے وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہوں لیکن شاید پاکستان میں ایسے جوش و جذبے کی قدر نہیں وگرنہ فخر بھائی جیسے اثاثے کا استعمال ملک و قوم کی بہتری کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آیئے ان کے جوش و جذبے سے بھرے خیالات سنیں۔

اہم نکات

☆ سیاسی مقدمات نے عدلیہ کو تباہ کر دیا۔
☆ جج غیر ضروری طور پر خود کو کمزور محسوس کرتے ہیں۔
☆ سیاسی مقدمات کے لیے الگ آئینی کورٹ بنائی جائے یا پھر سیاسی مسائل اسمبلی اور گلیوں میں حل کیے جائیں۔
☆ لاہور ہائیکورٹ بار میں یہ بات کھلے عام ہوتی ہے کہ فلاں جج کرپٹ ہے اور فلاں جج اور وکیل ملے ہوئے ہیں۔
☆ ججز کیس میں یہ بات طے ہے کہ سینئر موسٹ چیف جسٹس بنے گا لیکن اب نئی نئی باتیں کی جا رہی ہیں۔
☆ محتسب اعلیٰ بہت بڑا عہدہ ہے لیکن یہ صرف پنشن وغیرہ کے معاملات پر فیصلہ کرتے ہیں۔
☆ معراج خالد کی نگران حکومت جانبدار تھی میرے خیال میں صدر لغاری کے ساتھ ان کی کابینہ ہاتھ کر گئی۔
☆ پی سی او کے نفاذ پر جسٹس انوار الحق ڈر گئے اور اپنا رول نہ نبھا سکے۔
☆ بھٹو کو سازش کے تحت مارا گیا۔ عالمی طاقت ان کو مارنا چاہتی تھی اور یہ چیز ضیاء الحق کو سوٹ کرتی تھی۔
☆ اعلیٰ عدلیہ کے جج ماتحت عدالتوں کے محتسب ہوتے ہیں لیکن ججوں کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔
☆ ماتحت عدلیہ کے لیے الگ سے عدالتی محتسب مقرر ہونا چاہیے۔
☆ ججوں کو بھی ہر سال اپنے اثاثوں کی تفصیلات جمع کروانی چاہیے اور پھر اس کی سکروٹنی ہونی چاہیے۔
☆ بھٹو صرف بھٹو پر یقین رکھتے تھے وہ بہت ذہین تھے اور پاکستان میں نمایاں کی صلاحیت رکھتے تھے۔
☆ مولوی مشتاق اور شفیع الرحمٰن مجھے سمجھاتے رہے کہ پی سی او کے تحت حلف اٹھاؤ لیکن میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔
☆ سپریم جوڈیشل کونسل کے معاملات پر ججوں کو خود نوٹس لینا چاہیے۔
☆ حکومت کو اپنی ٹرم مکمل کرنی چاہیے۔ جمہوریت کا کوئی نعم البدل نہیں۔

☆ امریکہ اور فوج کی وجہ سے وزیراعظم آزاد نہیں رہ سکتا۔

☆ بے نظیر بھٹو سے ڈیل کرنا بہت مشکل ہے وہ بہت چالاک ہیں۔

☆ ''یہ پاکستان ہے سب چلتا ہے'' سن کر بہت دکھ ہوتا ہے۔

☆ جسٹس انوارالحق کی بیوی نے ججوں کو جھاڑا کہ تم نے پی سی او کا حلف کیوں لیا۔

☆ جسٹس افتخار چودھری کیس ملک کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

☆ بندوق کو خدا حافظ نہ کہا گیا تو دستور کا خدا حافظ ہے۔

انٹرویو

سوال: وکالت کے 50 سالہ دور اور پھر بطور جج آپ کا عدلیہ سے گہرا تعلق رہا ہے آپ کا عدلیہ کی کارکردگی کے بارے میں کیا تجزیہ ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میری نظر میں اگر کوئی مقام سب سے اونچا ہے تو وہ عدلیہ کا ہے اور آج مجھے اس بات کا بہت زیادہ دکھ ہے کہ لوگوں کا عمومی تاثر یہ ہے کہ ججوں تک رسائی ممکن ہے اور بعض کے بارے میں لوگ کھلے عام کہتے ہیں کہ وہ کرپٹ ہیں اور عام طور پر لوگوں کا عمومی تاثر حقائق سے زیادہ دور اور مختلف نہیں ہوتا اور عمومی تاثر حقائق سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے ابھی میں آپ کو ایک حالیہ واقعہ سناتا ہوں میں اسلام آباد میں تھا وہاں ایک وکیل نے بڑے مشکل مسئلہ پر دلائل دیئے میں اتفاق سے وہاں موجود تھا میں نے وکیل کو داد دی دوسرے روز مجھے وہی وکیل ملا اور کہنے لگا آپ سے ایک بات کرنی ہے کل آپ نے مجھے دلائل پر داد دی مگر کیس خارج ہوگیا میرا موکل کہتا تھا کہ اس کی ایک جج سے بات ہو چکی ہے جب کیس خارج ہوا تو موکل اس جج سے ملا تو جج نے کہا کہ آپ کے وکیل نے اچھے دلائل نہیں دیئے مجھے وکیل کی بات سن کر بہت رنج ہوا حالانکہ کیس کے دوران وہ جج ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے یہ کیوں کہا کہ تیرے وکیل کو کچھ پتا نہیں اگر اس اعلیٰ سطح پر اس طرح کی باتیں ہوں گی تو بڑی افسوسناک بات ہوگی یہ بات سچ ہے کہ میں ججوں کے بارے میں تجزیہ سختی سے کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ میرا عدلیہ پر غیر متزلزل ایمان ہے۔

سوال: آپ جب جج تھے تو آپ کو فیصلوں کے بارے میں حکومت کی طرف سے کچھ اشارے ملتے تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: دس سال کے دوران مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا جج کی نوکری ایک بڑی اطمینان بخش نوکری ہے جب میں سندھ ہائی کورٹ میں تھا میں نے بے نظیر بھٹو کی رہائی کا حکم دیا میں نے ایڈووکیٹ جنرل ظہور الحق (جو بعد میں جج بھی بنے) سے پوچھا کہ آپ اپیل نہیں کر رہے تو انہوں نے کہا کہ اپیل کی گنجائش ہی کہاں ہے۔

سوال: ججوں اور عدلیہ کے بارے میں عمومی تاثر کی وجہ اعلیٰ عدالتوں میں جسٹس سجاد علی شاہ کے دور میں ہونے والی ججوں کی لڑائی تو نہیں؟

فخر الدین جی ابراہیم: ہاں جی! لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا حل کیا ہے ہاں ایک حل ہے کہ سپریم کورٹ جوڈیشل کونسل نے کسی بھی جج کے بارے میں کوئی نوٹس نہیں لیا جس کے بارے میں کہا گیا ہو کہ وہ کرپٹ ہے لاہور ہائیکورٹ کے بار روم میں بیٹھنا ایک عذاب ہے وہاں کھلے عام یہ بات ہوتی ہے کہ فلاں جج کرپٹ ہے فلاں جج اور وکیل ملے ہوئے ہیں اور بعض نامور وکیلوں کے نام لیے جاتے ہیں ان کے ججوں کے ساتھ رابطے ہیں وکیل تو اس نظام کا حصہ ہے میں نے تو یہ باتیں سن سن کر لاہور ہائیکورٹ بار روم میں جانا چھوڑ دیا ہے اب جب وکیلوں اور ججوں کا نام اس طرح کی باتوں میں آئے تو آپ کیا کریں گے میرا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انصاف کے معاملے میں معاف نہیں کریں گے مجھے ڈر یہ لگ رہا ہے کہ جج غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہے ہیں اور Vulnerable محسوس کرتے ہیں جج سے بہتر کوئی نوکری نہیں ہے ایک فریق ایک طرح کے دلائل دیتا ہے دوسرا اس کے مخالف، اب جج کے لیے کون سی بڑی بات ہے ان دونوں میں سے فیصلے کرنے کی، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مقدمات نے ہماری عدلیہ کو تباہ کر دیا ہے یا تو سیاسی مقدمات کے لیے الگ سے آئینی کورٹ بنا دی جائے جس میں صرف سیاسی اور آئینی مقدمات چلیں یا پھر سیاسی مسائل کو اسمبلی اور گلیوں میں حل کیا جائے انہیں عدالتوں میں لایا ہی نہ جائے اب تک پاکستان میں جو بھی سیاسی فیصلہ ہوا ہے وہ متنازع رہا ہے اور اس پر نکتہ چینی ہوئی ہے۔ اس وقت عدلیہ کی عزت قابل فخر جسٹس اجمل میاں کی وجہ سے ہے وہ جون تک چیف جسٹس ہیں پھر اس کے بعد دیکھیے کیا ہوتا ہے ابھی سے یہ بحث شروع ہوگئی ہے حالانکہ ججز کیس کے حوالے سے یہ طے ہے کہ سینئر موسٹ چیف جج بنے گا لیکن اب نئی نئی باتیں کی جارہی ہیں۔

سوال: آپ نے سپریم جوڈیشل کونسل میں ججز کے حوالے سے کیسز لانے کی بات کی ہے آپ کی اس بارے میں تجویز کیا ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میرے خیال میں چیف جسٹس کو اس بارے میں سوموٹو (Suo moto) نوٹس لینا چاہیے یہ کہہ دینا کہ ہمارے پاس کافی ثبوت اور شواہد نہیں ہیں صحیح جواب نہیں ہے۔

سوال: کچھ ججوں کے بارے میں تو سپریم جوڈیشل کونسل میں مواد گیا تھا؟

فخر الدین جی ابراہیم: اب تک صرف 3 ججوں کے خلاف معاملات سپریم جوڈیشل کونسل میں آئے ایک صوبہ سرحد سے فضل غنی دوسرے پنجاب سے جسٹس شوکت علی اور تیسرے غلام صدر شاہ جن کے خلاف سیاسی طور پر یہ ریفرنس بنایا گیا تھا۔ ابھی حال ہی میں میری اس سلسلے میں بات ہوئی ہے

کہ اس بارے میں شواہد اور ثبوت نہیں ہیں، میں نے کہا کہ سول سرونٹ کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ فلاں اپنے وسائل سے بالاتر زندگی بسر کر رہا تھا اس لیے اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے تو پھر ایسے ججوں کے خلاف کیوں نہیں۔ میری نظر میں ججوں کو بھی ہر سال اپنے اثاثوں کی تفصیلات جمع کروانی چاہئیں اور پھر اس کی سکروٹنی ہونی چاہیے ہوسکتا ہے میری ججوں کے بارے میں رائے ذرا سخت ہو لیکن چونکہ میری نظر میں عدلیہ اور ججوں کا مقام بہت بلند ہے اس لیے میرا رویہ سخت ہے میرے خیال میں عدلیہ گئی تو سب کچھ گیا۔

اب آپ ذرا ماتحت عدالتوں کو دیکھیں اصولی طور پر اعلیٰ عدلیہ کے جج ماتحت عدالتوں کے محتسب ہوتے ہیں لیکن اب ججوں کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا میرے خیال میں ماتحت عدلیہ کے لیے الگ سے ایک عدالتی محتسب مقرر ہونا چاہیے مجھے بے نظیر بھٹو نے گورنری کی پیشکش کی اور میں نے انہیں کہا کہ آپ مجھ سے کچھ کام لینا چاہتی ہیں تو مجھے محتسب اعلیٰ بنا دیں اب تک جو بھی محتسب بنے ہیں ان میں صرف جسٹس (ر) سردار اقبال نے کمالات دکھائے ہیں باقی تو صرف پنشن وغیرہ کے معاملات پر فیصلہ کرتے رہے ہیں حالانک یہ عہدہ بہت بڑا ہے۔

فاروق لغاری کی نگران کابینہ کے دوران چیف احتساب کمشنر کے بارے میں قانون بناتے ہوئے میں نے اسے مکمل آزاد اور خود مختار بنایا تھا اس کا دفتر، بجٹ اور بیوروکریسی سب آزاد تھے اس وقت میرے ذہن میں جسٹس ناصر اسلم زاہد تھے اسی لیے میں نے قانون میں یہ گنجائش رکھی تھی کہ چیف احتساب کمشنر اپنے عہدے کی معیاد مکمل ہونے کے بعد بھی جج بن سکتے ہیں اگر ناصر اسلم زاہد احتساب کمشنر ہوتے تو آج احتساب کے نتائج کچھ اور ہوتے بد قسمتی سے جسٹس غلام مجد دمرزا نے کچھ کام کر کے نہیں دکھایا۔

سوال: اچھا تو بے نظیر نے آپ کو گورنری کی پیش کش کی پھر آپ نے قبول کیسے کی؟ جب کہ آپ انکار کر چکے تھے۔

فخر الدین جی ابراہیم: ہوا کچھ یوں کہ مجھے بے نظیر بھٹو سے ملاقات کے دو تین روز بعد بینظیر بھٹو کے سیکرٹری کا فون آیا کہ آپ کب حلف لے رہے ہیں میں نے کہا کہ مجھے علم نہیں جب تک وہ نہیں کہتے میں کیسے حلف اٹھا سکتا ہوں صدر اسحٰق سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کی تقرری کا فیصلہ میرا اپنا ہے میں بیوروکریٹ ہوں میں نے آپ کے پیش رو گورنر جسٹس قدیر الدین احمد سے آپ کے بارے میں پوچھا ہے اور آپ کی مکمل انکوائری کی ہے سب نے آپ کی تعریف کی ہے صدر اسحاق کی شخصیت نے مجھے متاثر کیا ان باتوں کو میں ایک دن لکھنے والا ہوں۔

سوال: آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آج آپ سب کچھ کہہ ڈالیں گے؟

فخر الدین جی ابراہیم: آپ اتنا لکھ نہیں سکیں گے پھر مجھے شریف الدین پیرزادہ کے پہلے کیس کا ذکر کرنا پڑے گا شریف الدین پیرزادہ، محمود علی قصوری، منظور قادر اور طفیل علی عبدالرحمٰن کا ذکر کرنا پڑے گا جو کہ انتہائی اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور اپنے پیسے کے جنون میں شمار ہوتے تھے پھر مجھے اپنے اختلافی نوٹ کا ذکر کرنا پڑے گا اور اختلافی نوٹ بھی اپنے محسن جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن سے، طفیل علی عبدالرحمٰن سے میرا اتنا قریبی رشتہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام ان کے نام پر رکھا مگر اس کے باوجود اختلافی نوٹ لکھا۔ اس مقدمے میں وکیل کے طور پر شریف الدین پیرزادہ تھے اور تین ججوں میں طفیل علی عبدالرحمٰن جسٹس حلیم اور میں تھا جب فیصلے کی بات پر بحث ہوئی تو میں نے کہا کہ مجھے ابھی وقت درکار ہے طفیل علی عبدالرحمٰن بہت بڑے آدمی تھے کہنے لگے دوستی اپنی جگہ فیصلہ میرٹ پر ہونا چاہیے چنانچہ میں نے طفیل علی عبدالرحمٰن اور جسٹس حلیم سے الگ اختلافی نوٹ لکھا مگر طفیل علی عبدالرحمٰن مجھ سے ناراض نہیں بلکہ خوش ہوئے۔

سوال: آپ کے خیال میں عدلیہ کا زوال کب شروع ہوا؟

فخر الدین جی ابراہیم: جب جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگایا تو وہ بڑے پریشان تھے کہ عدلیہ کا کیا ردعمل ہو گا اس وقت لاء سیکرٹری عبدالحیٔ قریشی تھے ان کو رات تین بجے اٹھایا گیا اور ان سے رائے لی گئی جنرل ضیاء الحق نے انہیں بتایا کہ آئین کو معطل کرنا پڑے گا اور اس پر عدلیہ کیا کرے گی، جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ وہ تو چیف جسٹس صاحبان کو گورنر بنانا چاہتے ہیں اگر یہ لوگ گورنر بن جائیں گے تو حکومت کی قانونی اور آئینی ساکھ بحال ہو جائے گی عبدالحیٔ قریشی نے رات ساڑھے پانچ بجے صدر کو اطلاع دی کہ سارے چیف جسٹس گورنر بننے پر رضامند ہو گئے ہیں پھر ضیاء الحق نے ان قائم مقام گورنروں کو مکمل گورنر کے اختیارات دے دیئے اس طرح عدلیہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس سے زیادہ افسوسناک کیا ہو سکتا ہے۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ عدلیہ نے ہتھیار ڈال دیئے پھر کہتے ہیں کہ یہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اس کے باوجود آپ عدلیہ کے بارے میں بڑی اعلیٰ رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں یہ تضاد نہیں ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میری ابھی بھی ان سے امید ہے کہ شاید اب انہیں احساس ہو اور وہ معاملات کو درست کر دیں اس لیے میں کہتا ہوں کہ سیاسی اور آئینی معاملات کو ان کے پاس نہ لے جائیں۔ دیکھیں جب چیف جسٹس جولائی 77ء میں قائم مقام گورنر بن گئے تو اس سے خود بخود

1973ء کا آئین ختم ہو کر رہ گیا۔

سوال: عبوری آئین کے آرڈیننس (پی سی او) سے پہلے آپ جج تھے پی سی او کے وقت کیا ہوا؟ ذرا تفصیل سے بتائیں۔

فخر الدین جی ابراہیم: میں اس روز لاہور میں تھا میں اس وقت سپریم کورٹ کا جج تھا میرے ساتھ جسٹس عبدالقادر شیخ بھی تھے میں نے رات کا کھانا کھالیا تھا۔ رات کو رجسٹرار سپریم کورٹ لطیف صاحب کا فون آیا کہ صبح سب ججز کو آنا ہے آپ کو حلف لینا ہے اور سب کو آنا ہے۔ ہم نے پوچھا چیف جسٹس کو علم ہے، اس نے کہا انہیں بھی علم نہیں۔ جسٹس عبدالقادر شیخ بڑے وسائل اور تعلقات والے آدمی ہیں انہوں نے ادھر ادھر فون کیے تو پتا چلا کہ ابھی ریڈیو پر پی سی او کی تفصیلات جاری ہوں گی میں نے وہ سنی تو اس سے عدلیہ کی تذلیل کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا مجھ پر ہمیشہ یہ الزام رہا ہے کہ میں جذباتی آدمی ہوں پی سی او سے چند روز پہلے مجھے وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ نے بتایا تھا کہ آپ کو چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ بنایا جا رہا ہے، اب ایک طرف تو چیف جسٹس بننے کا لالچ تھا اور دوسری طرف اصول کی بات تھی۔ پی سی او میں ججوں کے 5 جولائی 1977ء سے پی سی او کے نفاذ تک تمام فیصلے ختم کر دیئے گئے اس میں یہ بھی کہا گیا کہ مستقل جج اگر حلف نہیں اٹھاتے تو ان کی ججی ختم اور اگر کسی جج کو حلف کے لیے نہیں بلایا جاتا تو تب بھی اس کی نوکری ختم، میں نے اسی رات کراچی میں بیوی کو فون کیا کہ میں صبح اسلام آباد جا رہا ہوں شام کو کراچی آجاؤں گا میری چھٹی ہوگئی، بیوی چھٹی سے کچھ سمجھی یا نہیں معلوم نہیں۔

رات دو بجے جسٹس عبدالقادر شیخ دوبارہ میرے کمرے میں آئے تو میں نے انہیں بتا دیا کہ میں تو حلف نہیں اٹھا رہا انہوں نے کہا یہ تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے میں نے کہا میں جج تھا اب نہیں رہوں گا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد سیکرٹری جنرل قانون جسٹس ایس اے نصرت کا فون آیا کہ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ حلف نہیں اٹھا رہے ہیں میں خاموش رہا میں نے کچھ نہیں کہا اس کے بعد ایس اے نصرت کا پھر فون آیا کہ آپ اسلام آباد آ رہے ہیں۔ سپریم کورٹ جانے سے پہلے وزیر قانون شریف الدین پیرزادہ سے ملتے جانا میں نے کہا یہاں سے سب اکٹھے جا رہے ہیں میں الگ ہو کر نہیں آ سکتا اب جب فلائٹ میں بیٹھے تو مولوی مشتاق سے ملاقات ہوئی وہ میرے بڑے اچھے دوست تھے وہ اور میرے لیے انتہائی قابل احترام اور معزز جج شفیع الرحمٰن مجھے سمجھاتے رہے کہ حلف لے لو، لوگ یہی چاہتے ہیں کہ اچھے لوگ چلے جائیں تو تم واقعی چھوڑ رہے ہو ہمارا جہاز لیٹ تھا ہم وہاں پہنچے تو چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس حلیم، جسٹس افضل ظلہ اور جسٹس دراب پٹیل وہاں موجود تھے وہاں سب بیٹھ جاتے ہیں وہاں پر رسم ہے کہ سب سے پہلے جونیئر جج کو پوچھتے ہیں تو مجھ سے پوچھا کہ فخر الدین آپ

نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں اس پر کسی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اس کے بعد شفیع الرحمٰن کی باری تھی انہوں نے کہا کہ میں حلف لوں گا میں اس حلف کا پابند نہیں ہوں کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ برا قانون ہے پھر مولوی مشتاق کی باری آئی انہوں نے کہا کوئی بحث نہیں میں تو حلف اٹھاؤں گا اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال کی بات چل رہی تھی کہ ٹیلی فون آ گیا کیونکہ اس وقت چیف جسٹس کے پاس ہاٹ لائن بھی ہوتی تھی حالانکہ چیف جسٹس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں اسے ہاٹ لائن کی ضرورت ہی کیا ہے ٹیلی فون کے دوران جسٹس انوار الحق یس سر یس سر کرتے رہے فون رکھا اور آ کر کہا مولوی صاحب! آپ کو حلف کی دعوت نہیں دی گئی چودہ آدمیوں کے سامنے مولوی مشتاق کی بے عزتی ہوئی کسی نے ایک لفظ نہیں کہا جسٹس انوار الحق، مولوی مشتاق کے دوست تھے وہ بھی نہیں بولے اس کے بعد ججوں نے کہا کہ وہ حلف لے رہے ہیں۔ میں گھر آیا اور دراب پٹیل کے پاس گیا انہوں نے مجھے حوصلہ دیا کہ وہ بھی حلف نہیں لے رہے۔ مولوی مشتاق کی ایوان صدارت میں کرسی آخری وقت میں ہٹالی گئی۔

سوال: مولوی مشتاق سے آخر جنرل ضیاء الحق کا کیا اختلاف ہو گیا تھا؟

فخر الدین جی ابراہیم: کہتے ہیں کہ ایئر مارشل اصغر خاں کیس میں مولوی مشتاق زیادہ بولے تھے اصل میں مولوی مشتاق بھی تو تگڑے آدمی تھے۔

سوال: پھر جسٹس انوار الحق کو کیسے فارغ کیا گیا؟ ان کو ہٹانے کی کیا وجہ تھی؟

فخر الدین جی ابراہیم: دیکھیں میں تو لاہور تھا مگر بعد میں مجھے علم ہوا کہ جسٹس انوار الحق نے ضیاء الحق سے بات کی کہ یہ آپ غلط کر رہے ہیں آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے جس پر ضیاء الحق نے کہا کہ میں آپ تھوڑا یہ کر رہا ہوں مجھے لیگل ایڈوائس دی گئی ہے اور پھر جنرل ضیاء نے بات کو بدلتے ہوئے کہا کہ آپ کا انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے لیے نام دیا گیا ہے اس کا کیا بنا اور پھر انہیں اس کی کنوسنگ اور بیرون ممالک دوروں کے لیے فنڈز بھی دیئے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ بعض جج چیف جسٹس سے الوداعی ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے چیف جسٹس اندر تھے چیف جسٹس انوار الحق کی بیگم نے ججوں کو بہت جھاڑا اور کہا کہ آپ بہت بزدل ہیں آپ نے حلف لیا دو تین جج تھے وہاں ان کی بہت بے عزتی کی اس طرح یہ بات ختم ہو گئی۔

سوال: آپ کے خیال میں پی سی او کے نفاذ سے پہلے جسٹس انوار الحق کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں نے بعد میں جسٹس دراب پٹیل سے پوچھا کہ ہم تو لاہور میں تھے

پیچھے کیا ہوا؟ دراب پٹیل نے کہا کہ میں نے انوارالحق صاحب سے کہا کہ جنرل ضیاء الحق سے کچھ وقت لے لیجئے یہاں میں آپ کو بتا دوں کہ ماسوائے بھٹو کیس کے انوارالحق بہت اچھے جج تھے بھٹو کیس میں ان کی بدنامی ہوگئی وگرنہ وہ اچھے دماغ والے جج تھے لیکن پی سی او کے نفاذ والے دن جسٹس انوارالحق جو عدلیہ کے سربراہ تھے خود ہی قیادت سے دست بردار ہو گئے اگر وہ اس دن اعلانیہ یہ کہتے کہ یہ برا قانون ہے تو کوئی بھی حلف نہ لیتا۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا جسٹس انوارالحق نے کمپرومائز کر لیا تھا؟

فخرالدین جی ابراہیم: ڈر گئے تھے یا پھر سوچا ہوگا کہ میں تو انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس جا رہا ہوں سٹینڈ کیوں لوں اور سرینڈر کر دیا۔

سوال: کیا حلف نہ اٹھانے پر آپ کو ڈر نہیں لگا؟

فخرالدین جی ابراہیم: میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ڈر لگا لیکن ڈر لگا اس بات پر کہ دس سال سے پریکٹس چھوڑ چکا ہوں اب یہ چلے گی بھی یا نہیں میں تقدیر کا بڑا قائل ہوں میرے کراچی پہنچنے کے تیسرے ہی روز میرا ایک پرانا موکل میرے دفتر آیا جاتے جاتے بارہ ہزار روپیہ چھوڑ گیا کہ کل سے آپ ہمارے پھر سے وکیل یہ منظر مجھے کبھی نہیں بھولتا میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور پھر دیکھیے یہ بھی قسمت کے کھیل ہیں کہ میں نے سب کمائی اس کے بعد کی ہے اگر میرے پاس ایک روپیہ تھا تو اب پچاس ہیں۔

سوال: آپ نے مارشل لاء دور میں بے نظیر بھٹو کی رہائی کے مقدمہ کا ذکر کیا تھا؟

فخرالدین جی ابراہیم: وہ بڑا دلچسپ کیس ہے یہ دور کنی بنچ تھا میرے ساتھ جسٹس اجمل میاں تھے جو اس وقت کچے اور نئے جج تھے بے نظیر بھٹو کی نظر بندی کا مقدمہ تھا اب میرا یہ ریکارڈ تھا کہ میں ہر نظر بند کو رہا کر دیتا تھا ماسوائے حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو کے کیونکہ ان دونوں نے عدالت میں ایسی تقریر کر دی کہ ان پر ہی ان کے خلاف نظر بندی کا کیس بنتا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ بے نظیر کا کیس سنوں کہ لوگ کہیں گے کہ یہ سب کو چھوڑ رہا ہے بے نظیر کی نظر بندی کا معاملہ ہمارے پاس منگل کے روز آیا جب کہ نظر بندی ہفتے کے روز ختم ہو رہی تھی میں نے اجمل میاں سے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ کوئی اس کیس کو سنتا نہیں ہے فائل اتنی موٹی ہو چکی ہے اگر ہم اس کیس کو نہ سنیں تو ہفتے کو نظر بندی کا نیا آرڈر آ جائے گا اور اگر اس معاملہ کو چلانا ہے تو پھر آج یا کل فیصلہ کرنا ہے تو جسٹس اجمل میاں نے کہا میری وجہ سے آپ سماعت ملتوی نہیں کریں گے ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے کچا اور نیا جج سمجھتے ہوئے آپ ملتوی نہ کریں یہی وجہ ہے کہ میں آج بھی اجمل میاں کی عزت کرتا ہوں جب کیس شروع ہوا تو بے نظیر بھٹو کھڑی ہو گئیں،

میں ذوالفقار علی بھٹو کو تو جانتا تھا لیکن بے نظیر کو وہاں پہلی بار دیکھا اب بے نظیر بھٹو نے وہاں تقریر کرنی چاہی میں نے زور سے کہا کہ آپ بیٹھ جائیں کیا آپ کا وکیل نہیں ہے بعد میں کورٹ میں چہ میگوئیاں ہوئیں کہ فخر الدین تو بالکل اینٹی ہو گیا بعد میں میں نے فیصلہ لکھا کہ مجھے طفیل علی عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ ہمیشہ پرسٹ پرسن میں یعنی صرف اپنی طرف سے لکھو اور پھر بعد میں دوسرے جج کو بھیج دو وہ چاہے تو اتفاق کرے اور چاہے تو اختلاف کرے۔ میں نے فیصلہ لکھ دیا اور جسٹس اجمل میاں کو بھجوا دیا ان کا فون آیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں میں سمجھا کہ وہ اختلاف کریں گے دوسرے دن وہ آئے اور کہا کہ اتنی جلدی فیصلہ لکھ لیا میں نے کہا کہ مجھے آٹھ نو سال ہو گئے جب آپ کو پانچ چھ سال ہو جائیں گے تو آپ بھی ایسے ہی جلدی لکھیں گے پھر ہم نے اتفاق رائے سے بے نظیر بھٹو کو رہا کر دیا۔

سوال: بے نظیر بھٹو نے اپنی کتاب دختر مشرق میں تو اس فیصلے کے حوالے سے صرف آپ کا ذکر کیا ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: یہ بھی دلچسپ بات ہے پیپلز پارٹی کی حکومت تھی میں گورنر تھا کہ بے نظیر اس بات پر پیچھے پڑ گئیں کہ اجمل میاں کو شریعت کورٹ بھیجو اتفاق سے ذوالفقار مرزا کی شادی تھی میں بھی اسٹیج پر بیٹھا تھا اجمل میاں بھی بیٹھے تھے میں نے کہا کہ آپ نے کتاب میں اپنی رہائی کا اور میرا ذکر کیا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا اگر جسٹس اجمل میاں میرا ساتھ نہ دیتے اور پھر میں نے کہا کہ آپ کو برے وقتوں میں اچھے ججوں کی ضرورت ہوتی ہے میں بڑا خوش ہوں کہ پھر اجمل میاں کو شریعت کورٹ میں نہیں بھیجا گیا۔

سوال: تو گویا بے نظیر بھٹو نے آپ کی ایڈوائس مان لی؟

فخر الدین جی ابراہیم: جی کبھی کبھی مان لیتی تھیں زیادہ نہیں مانتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو سے ڈیل کرنا بہت مشکل ہے وہ بہت چالاک ہیں اور ایک بات بتا دوں کہ ابھی تک مجھے ایک بھی ایسا سندھی نہیں ملا جو بے وقوف ہو ان میں بہت کامن سنس ہوتی ہے جو عام طور پر باقی لوگوں میں بہت کم ہوتی ہے۔

سوال: آپ نے الطاف گوہر کو بھی تو ایک مشہور سیاسی مقدمے میں رہا کیا تھا اور بھٹو اس پر ناراض ہوئے تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: یہ 1972ء کا واقعہ ہے جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن اور مجھ پر مشتمل دو رکنی بنچ تھا طفیل صاحب پر بہت دباؤ تھا کہ الطاف گوہر کو مت چھوڑیں، یحییٰ بختیار ہمارے دوست بھی تھے مگر کیس میں کچھ بھی نہیں تھا فیصلہ میں نے لکھا اور الطاف گوہر کو رہا کر دیا اس پر یحییٰ بختیار مجھ سے 9 سال تک ناراض رہے اور بھٹو کو بھی کہا میں نے ان کا کیس سپریم کورٹ میں لڑا انہیں 5 سال سزا ہو چکی

تھی وہ رہا ہوئے اور پھر ہماری صلح ہوئی آج کل پھر ناراض ہیں۔

سوال: آپ کا فاروق لغاری کی نگران کابینہ میں جانے کا فیصلہ کیسے ہوا؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں آج یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرا یہ فیصلہ غلط تھا مجھے صبح شاہد حامد کا فون آیا کہ صدر پاکستان فاروق لغاری کی خواہش ہے کہ آپ اٹارنی جنرل بن جائیں تو میں نے کہا میں اٹارنی جنرل نہیں بنوں گا کیونکہ میں پہلے اٹارنی جنرل بن چکا ہوں اور پھر مستعفی ہو چکا ہوں اب دوبارہ کیا بنوں گا پھر تھوڑی دیر بعد فون آیا کہ آپ وزیر قانون بن جائیں میں نے کہا کہ آپ مجھے ایک گھنٹے بعد فون کریں میں نے اپنے سارے خاندان کو اکٹھا کیا اور آپ حیران ہوں گے کہ میرے خاندان کی اکثریت میرے کابینہ میں جانے کے خلاف تھی مگر میرا یہ خیال تھا کہ نگران حکومت غیر جانبدار ہوگی اور میں اس دوران ملک کو چند اچھے قانون دے جاؤں گا اسی لیے میں نے نگران حکومت میں شمولیت اختیار کی صبح ساڑھے آٹھ بجے کام شروع کرتا تھا اور رات ساڑھے دس بجے تک کام کرتا تھا لیکن پھر پہلا واقعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے لاء سیکرٹری سٹنگ جج نہیں چاہیے مجھے کہنے لگے آپ جسٹس عارف چودھری کو لاء سیکرٹری کے عہدے سے ہٹاؤ میں نے کہا میں تو نہیں نکالنے والا عارف چودھری ایک شاندار شریف آدمی ہیں ایک دن میں نے انہیں کہا کہ اگر آپ اس بات سے مطمئن ہیں کہ بطور لاء سیکرٹری آپ کا کام مکمل ہو گیا تو آپ واپس عدلیہ میں چلے جائیں جسٹس عارف نے کہا کہ مجھے گزشتہ حکومت نے بنایا تھا میں اس لیے جانا چاہتا ہوں چنانچہ یہ معاملہ اس طرح خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اس کے بعد سٹنگ جج کو لاء سیکرٹری بنانے والا معاملہ شروع ہو گیا سٹنگ جج وہاں بطور لاء سیکرٹری عدلیہ کو بہت نقصان پہنچاتا ہے وہ ججوں کو فون کرتا ہے کہ فلاں ملک میں وفد جانے والا ہے آپ وہاں گئے تو نہیں یا پھر کسی مقدمے کے بارے میں فون کر کے جج کی رائے لے لیتا ہے اس سے عدلیہ کو نقصان پہنچتا ہے۔

سوال: نگران حکومت سے کس اختلاف کی وجہ سے الگ ہوئے؟

فخر الدین جی ابراہیم: اس سے پہلے تو لاء سیکرٹری پر اختلاف ہوا پھر میرے استعفیٰ تک یہ جگہ خالی رہی بعد ازاں احتساب کے قانون میں اختلاف ہوا کہ میرے مجوزہ قانون میں کسی بھی صنعت کار کو جس کے 20 فیصد کنٹرولنگ حصص ہوں اور اس کی کمپنی ڈیفالٹ ہوا سے الیکشن میں لڑنے کا حق نہیں ملنا چاہیے اس پر شاہد حامد نے مجھے کراچی فون کیا کہ یہ تو غلط ہے دوسرے دن کابینہ کی میٹنگ تھی وہاں پر میں نے حقائق پیش کیے کہ 20 فیصد حصص والے ہی اصل مالک ہوتے ہیں ساری کابینہ نے اتفاق کیا تو شاہد حامد نے کہا کہ کل ایوان صدر میں دوبارہ کابینہ کا اجلاس ہوگا دوسرے دن کابینہ کے اجلاس میں شاہد حامد نے میاں نواز شریف کا خط پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ انہیں یہ قانون منظور نہیں ہے اس پر

شاہد حامد نے کہا کہ انتخابات کا بائیکاٹ ہو جائے گا اور ہماری ساکھ مشکوک ہو جائے گی میں نے اس کی مخالفت کی میری اور صدر لغاری کی سخت لہجے میں بات ہوئی مگر اس کے باوجود کابینہ کے 3 ارکان صاحبزادہ یعقوب، ارشاد حقانی اور نجم سیٹھی نے میری حمایت کی اس کے چند روز بعد مجھے ملک معراج خالد نے بلایا اور کہا کہ تعلیم کی وزارت اچھی ہے میں سادہ آدمی ہوں میں نے کہا کہ مجھے شاید اضافی وزارت دینے والے ہیں میں نے کہا کہ میرا یہ کام نہیں ہے میں باہر نکلا تو باقر میرا دوست تھا اس نے کہا بات اور ہے یہ وزارت قانون آپ سے لینا چاہتے ہیں صبح میں صدر لغاری کے پاس گیا تو انہوں نے بھی مجھ سے آنکھ ملائے بغیر کہنا شروع کر دیا کہ تعلیم بہت اہم ہے آپ اس کی وزارت لے لیں اس دوران میں فیصلہ کر چکا تھا میں نے اس بارے میں صرف الطاف گوہر سے مشورہ کیا انہوں نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا کہ مستعفی ہو جانا چاہیے چنانچہ میں اسی روز مستعفی ہو گیا۔

سوال: آپ بے نظیر بھٹو کے دور میں اٹارنی جنرل کے عہدے سے بھی مستعفی ہوئے تھے وہ کیا واقعہ تھا؟

فخر الدین جی ابراہیم: ہوا یہ کہ صوبہ سرحد کا کیس چل رہا تھا میں اس کی تیاری کے لیے اسلام آباد آیا تو مجھے اچانک پتہ چلا کہ میرے علم کے بغیر ہی شریف الدین پیرزادہ اور دوسرے وکلاء بھی حکومت کی پیروی کریں گے میں نے سوچا یہ تو اٹارنی جنرل کے عہدے کی بے عزتی ہے اور اسی رات میں مستعفی ہو کر کراچی چلا گیا شیر پاؤ اور سندھ کے سینئر وزیر مجھے منانے گھر آئے تو میں نے کہا کہ میں نے اٹارنی جنرل بنتے ہی پرائیویٹ کیس لڑنے چھوڑ دیئے لیکن اٹارنی جنرل کو بتائے بغیر اس کی جگہ آپ نیا وکیل کریں تو یہ توہین ہے میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

سوال: کیا معراج خالد کی حکومت غیر جانبدار تھی اور صدر لغاری کے بارے میں آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: یہ جانبدار تھی میرے خیال میں صدر لغاری کے ساتھ ان کی کابینہ ہاتھ کر گئی وزیر دفاع شاہد حامد کرتا دھرتا تھا ایک روز اٹارنی جنرل سپریم کورٹ میں کہتے ہیں کہ ججوں کی تقرری میں وزیر اعظم کا اختیار نہیں ہونا چاہیے میں وزیر اعظم ملک معراج خالد کے پاس گیا اور کہا کہ ہم عبوری حکومت میں ہیں اس طرح کے اصولی معاملات ہمیں طے نہیں کرنے چاہئیں ملک معراج خالد نے اپنے سیکرٹری ایم ایس باقر کو کہا کہ آپ اٹارنی جنرل سے بات کریں اٹارنی جنرل نے باقر سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا ''ہو آر یو؟'' بعد میں شاہد حامد نے کہا کہ میں نے اٹارنی جنرل کو ایسا کرنے کو کہا تھا میرے خیال میں طارق رحیم اور ممتاز بھٹو کو نگران حکومتوں میں شامل کرنے کی غلطی کی گئی۔

سوال: آپ نے بھٹو کے ساتھ وکالت بھی کی ان کو قریب سے بھی دیکھا کیا بھٹو قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتے تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: بھٹو صرف بھٹو پر یقین رکھتے تھے وہ بہت ذہین تھے اور پاکستان میں تبدیلی کی صلاحیت رکھتے تھے وہ پاکستان میں کئی نمایاں تبدیلیاں لے کر بھی آئے مزدوروں کے حقوق سے لے کر بہت سی پالیسیاں انہوں نے بنائیں لیکن بالآخر جاگیرداری ان پر غالب آ گئی بھٹو کو سازش کے تحت مارا گیا عالمی طاقت ان کو مارنا چاہتی تھی یہ چیز ضیاء الحق کو بھی سوٹ کرتی تھی۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کے عدالتی فیصلے پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں کریمنل سائیڈ کا وکیل نہیں ہوں لیکن ایک روز گورنر اشرف تابانی نے مجھ سے کہا کہ ایک آدمی کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہوئی کیا اس کو شہید کہنا جائز ہے؟ میں خاموش رہا مگر وہاں پر امام علی قاضی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ آپ اگر بھٹو کے فیصلے پر بات کر رہے ہیں تو اب کبھی بھی عدالتوں میں یہ مقدمہ بطور حوالہ پیش نہیں ہوتا کیونکہ مشورہ دینے والوں کو قتل کرنے والے کے برابر سزا نہیں ہو سکتی۔

سوال: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھٹو کے وکلاء نے مقدمہ کو سیاسی رنگ دے دیا؟

فخر الدین جی ابراہیم: دیکھیں اب تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اب تک شروع کے بنچ میں پانچ جج تو واضح طور پر کہہ چکے ہیں وہ بھٹو کو چھوڑنے والے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقدمے میں تاخیر کیوں کی گئی؟ یہ سارا مقدمہ ہی مشکوک تھا کسی جج کو نکال دیا۔ مگر یہ بھی دیکھیے کہ ہو سکتا ہے کہ بھٹو خود مقدمے میں تاخیر چاہتے ہوں پھر وکلاء کیا کر سکتے تھے۔

سوال: سہروردی سے آپ کی ملاقات رہی؟ وہ کیسے وکیل اور سیاستدان تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں وکیل اس طرح بنا کہ زیڈ اے سلہری مرحوم اور ان کی اہلیہ لندن سے میرے واقف تھے میں کراچی میں آیا تو ایک روز بیگم سلہری میرے پاس آئیں کہ سلہری صاحب پر بغاوت کا کیس بن گیا ہے آپ سہروردی کو وکیل کریں میں سہروردی کے پاس گیا وہ بنیان پہنے مالش کروا رہے تھے اور دس آدمی کھڑے تھے ان سے باتیں بھی کر رہے تھے میں نے سلہری صاحب کے کیس کی بات کی مگر میں نے واپس آ کر سلہری صاحب کو بتا دیا کہ سہروردی نے تو میری بات ہی نہیں سنی مگر دوسرے روز بلایا ہے میں دوسرے دن گیا تو سہروردی تیار ہو رہے تھے اب انہوں نے پندرہ منٹ کے اندر پورا مقدمہ مجھے سنا دیا میں بہت متاثر ہوا۔ سہروردی کو پیسے سے محبت نہیں تھی وہ اس کیس کے لیے کبھی ڈھاکہ اور کبھی لاہور سے آتے تھے صرف ایک دفعہ انہیں کچھ خرچ دیا گیا باقی کیس

انہوں نے مفت لڑا۔ اس مقدمہ کی وجہ سے سہروردی کے ساتھ میرا نام بھی شائع ہونا شروع ہو گیا کہ میں بھی وکیل ہوں اور پھر انہی دنوں سلہری صاحب سے ملاقات کے سلسلے میں جیل جاتا تھا وہاں دائیں بازو کے طالب علموں سے تعارف ہوا جو معافی مانگنے کے لیے تیار نہ تھے میں نے ان 30 طالب علموں کے مفت کیس لڑے یہ میرے پہلے مقدمے تھے یہ لڑکے رہا ہوئے اور یوں میری وکالت کا آغاز بھی ہوا۔ انہی لڑکوں میں حسن ناصر بھی تھا جو بعد میں ہلاک کر دیا گیا۔

سوال: آپ کو بطور جج کئی سفارشیں تو آتی ہوں گی؟

فخر الدین جی ابراہیم: جی دو بار ایسا ہوا۔ ایک بار تو میرے والد صاحب جو میرے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے میرے پاس آئے اور کہا کہ صبح تمہارے پاس تمہارے پرانے کرایہ دار کا مقدمہ ہے اسے دیکھ لینا۔ اب میں روایتی طور پر کرایہ دار کی سائیڈ لیتا تھا صبح جب میں کورٹ گیا تو میں نے سوچا کہ اگر میں نے کرایہ دار کے حق میں فیصلہ دیا تو یہ سمجھے گا کہ باپ کو کہا تھا بیٹے نے کام کر دیا اور اگر اس کے خلاف فیصلہ دیتا ہوں تو کہے گا کہ اس نے انتقامی کارروائی کر دی میں نے یہ مقدمہ سننے سے انکار کر دیا والد صاحب نے مجھے دوبارہ اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ میرے بمبئی کے ایک دوست ایم ایم بخشی تھے وہ کراچی کرکٹ بورڈ کے کرتا دھرتا تھے۔ ایک روز عرصے کے بعد میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صبح میرا کیس آپ کے پاس ہے آپ صرف اس کی سماعت ملتوی کر دیں دوسری صبح میں عدالت میں گیا تو مخالف وکیل رو رہا تھا کہ کوئی ہمارا کیس نہیں سنتا ہر بار سماعت ملتوی ہو جاتی ہے میں نے سرکاری وکیل سے پوچھا تو انہوں نے کہا ملتوی کر دی جائے میں نے کہا کہ نہیں آج ہی سماعت ہو گی چنانچہ سماعت ہوئی اور فیصلہ ایم ایم بخشی کے خلاف ہو گیا بعد میں کئی سالوں بعد جب میں جج نہیں تھا بخشی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے گلہ کیا تو میں نے کہا کہ مقدمہ میں ایک مخالف فریق بھی ہوتا ہے آپ غلط کو صحیح کیسے قرار دے سکتے ہیں۔

سوال: آپ اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں یہ کہاں گزرا اور اس کی کچھ یادیں؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں بمبئی میں پارسی سکول میں پڑھا کرکٹ کا بڑا شوق تھا اسکاؤٹنگ میں لیڈر رہا وہیں سے سینٹ جیمز لاء کالج سے ایل ایل بی کیا یہ 1947ء کا زمانہ تھا پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی ایک طرف بندے ماترم چلتا تھا اور دوسری طرف ''سارا جہاں ہمارا'' چلتا تھا ہم نوجوان تھے ہم کہتے تھے کہ لے کے رہیں گے پاکستان۔ اس زمانے میں لاء کالج کے پرنسپل اے اے فیضی تھے ایک دن مجھے کہنے لگے ''ینگ مین سٹاپ دس'' کیا آپ کے پاس ڈائری ہے۔ میں نے کہا: ہے۔ انہوں نے کہا لکھ لو پاکستان نہیں بنے گا جب 1951ء میں میں واپس آیا تو ان سے ملا تو انہوں نے کہا

کہ ینگ مین تم پاکستان جاؤ تمہارا مستقبل وہاں ہے دیکھیں یہ کتنے مخلص لوگ تھے۔ یہ اے اے فیضی وہی تھا جس نے مسلم لاء پر کتاب لکھی۔

سوال: فوج کا حکومت میں کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے؟

فخر الدین جی ابراہیم: بالکل کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے اس ملک میں کوئی وزیر اعظم کیسے آزادانہ کام کرسکتا ہے جب کہ اس کی ایک آنکھ واشنگٹن پر اور دوسری آنکھ جی ایچ کیو پر ہوتی ہے۔

سوال: کیا آپ ایٹمی دھماکے کے حق میں تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں اس کے خلاف تھا میرے خیال میں یہ ایک غلطی تھی میں ایک امن پسند ہوں۔

سوال: بھارت سے تعلقات کے سلسلے میں کشمیر کا مسئلہ پہلے آنا چاہیے؟

فخر الدین جی ابراہیم: میرے خیال میں پاکستان کا مفاد دیکھنا چاہیے کیا روٹی مکان کا مسئلہ اہم ہے یا کشمیر سرفہرست ہے میرے خیال میں پاکستان اسلام کے لیے نہیں بنا تھا بلکہ مسلمانوں کے مفاد کے لیے بنا تھا کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم ہمیشہ ہندو کے مقابلے میں دوسرے درجے کے شہری رہیں گے۔

سوال: کیا آئین سے انحراف کرنے والوں کو علامتی سزا نہیں ملنی چاہیے؟

فخر الدین جی ابراہیم: اگر میرے پاس فیصلہ کرنے کا اختیار ہو تو میں نئی شروعات کروں اور کہوں کہ جو بھی آج تک عوامی نمائندے رہے ہیں وہ نااہل ہیں اب نئے لوگ آئیں۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جمہوریت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اور نہ ہی اس سے بہتر کوئی نظام ہے۔ میرے خیال میں اس حکومت کو اپنی ٹرم مکمل کرنی چاہیے۔

سوال: بچپن کا کوئی یادگار واقعہ؟

فخر الدین جی ابراہیم: میری کلاس میں پانچویں چھٹی پوزیشن آتی تھی مگر ریاضی میں ہمیشہ زیرو آتا تھا میں نے کبھی ٹیوشن نہیں لی لیکن میٹرک میں صرف ڈیڑھ ماہ کے لیے پارسی ٹیچر سے ٹیوشن لی اور اس نے اتنا پڑھا دیا کہ میں پاس ہوگیا۔

سوال: تحریک پاکستان کا کوئی واقعہ؟ آپ بمبئی میں تھے قائداعظم سے کوئی ملاقات؟

فخر الدین جی ابراہیم: ایک بار اتفاق سے میں ہندو علاقے سے ٹرام میں بیٹھا۔ ہندو مسلم فسادات زوروں پر تھے ٹرام میں صرف ایک خوفناک پٹھان بیٹھا تھا اب میں ڈرا کہ یہ مجھے مار دے گا ہندو سمجھ کر۔ ان دونوں پشاوری چپل کا رواج تھا میں نے وہی پہنی ہوئی تھی میں نے جرأت کر کے

پٹھان کو کہا کہ چچا نے پشاور سے جوتی بھیجی ہے وہ ہنسنے لگا اور چلتی ٹرام سے اتر گیا۔ میں تحریک پاکستان میں پر جوش حصہ لیتا تھا لیکن قائداعظم سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی قیصر باغ میں میٹنگ میں شریک ہوا کرتا تھا۔

سوال: آپ کے خاندان کے کچھ لوگ بمبئی میں بھی ہیں؟

فخر الدین جی ابراہیم: جی ہاں وہاں میری دو بہنیں ہیں اور کزنز ہیں وہاں میرے خاندان کے کئی لوگ بیرسٹر ہیں اور آدھے درجن میڈیکل اسپشلسٹ ہیں وہاں بمبئی میں انہوں نے بڑی ترقی کی ہے یہاں پر بھی میرے خاندان کے لوگ بڑے اچھے رہے ہیں میرے بیٹے وکیل ہیں اور بہت سے رشتے دار بچے ڈاکٹر ہیں۔

سوال: بیوی سے کن باتوں پر اختلاف ہوتا ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: وہ کہتی ہے کہ میں بہت زیادہ ذمہ داریاں اٹھالیتا ہوں اور دوسرا میں ان سے مشورہ نہیں کرتا۔ یہ بات سچ ہے میں جب گورنر بنا تو ان سے مشورہ نہیں کیا۔

سوال: آپ سیاست میں کیوں نہیں آئے؟

فخر الدین جی ابراہیم: یہ بھی تقدیر کا جبر ہے 1970ء میں حفیظ پیرزادہ میرے پاس آئے کہ آپ الیکشن لڑیں میں نے کہا کہ میرے پاس زمین نہیں ہے میں تو وکالت سے روزی کماتا ہوں انہوں نے کہا روزانہ چار پانچ گھنٹے نکالیں اور الیکشن پر صرف چار پانچ لاکھ خرچ ہوگا اتفاق سے تھوڑی دیر بعد کمال اظفر آ گئے وہ الیکشن میں امیدوار تھے میں نے پوچھا کہ کتنے گھنٹے الیکشن مہم میں لگتے ہیں انہوں نے کہا ساری رات میں نے پوچھا کتنا خرچ ہوا اس نے کہا چار پانچ لاکھ لگ چکے ہیں اور اتنے ہی اور لگیں گے میں نے والد سے جو 1958ء میں پاکستان آ گئے تھے مشورہ کیا انہوں نے بھی کہا کہ سیاست میں مت جاؤ۔ بعد میں بھٹو کو لوگوں نے بھی کہا کہ فخر الدین ڈرپوک ہے مگر جب طفیلی عبدالرحمٰن نے میرا نام بطور جج پیش کیا تو بھٹو انکار نہ کر سکے شاید وہ بھی مجھے جج بنانا چاہتے تھے تاہم الطاف گوہر کے مقدمے کے فیصلے کے بعد پارٹی میں ان سے ملاقات صرف سلام دعا تک محدود رہتی تھی وہ ناراض ہو گئے تھے۔

سوال: آپ نے تقدیر کے جبر کا قائل ہونے کی بات کی؟ آپ کی ذات پر تقدیر کیسے حاوی رہی؟

فخر الدین جی ابراہیم: دیکھو بھائی یہ سب تقدیر کے چکر ہوتے ہیں میں نے لندن یونیورسٹی سے انٹرنیشنل افیئرز کا ڈپلوما کیا اور میں یہ ڈپلوما حاصل کرنے والا پہلا پاکستانی تھا میرے پاس ہائی کمشنر

رحمت اللہ صاحب کا بڑا اچھا لیسٹر بھی تھا میں وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے ملنے گیا تا کہ فارن سروس میں نوکری لے سکوں اب ہم بمبئی کے رہنے والے تھے ہم بوہرہ برادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بمبئی میں ہر خاندان کا ایک SUR NAME ہوتا ہے ہمارا خاندان KADIANI کہلاتا تھا جس سے ہر کوئی مجھے قادیانی سمجھتا تھا جب میں سر ظفر اللہ خان سے ملا تو وہ مجھے قادیانی سمجھ کر بہت تعریف کرتے رہے کہ آپ بڑے ہوشیار نوجوان آدمی ہیں۔ اب مجھے علم ہی نہیں کہ کوئی قادیانی بھی ہوتے ہیں میں نے لندن سے قانون کی بھی ڈگری لی اتفاق سے ڈگری لے لی میرا دوست مشیر پیش امام تھا اس نے زبردستی مجھ سے امتحان دلوائے اور میں پاس بھی ہو گیا میرا زیادہ فوکس انٹرنیشنل افیئر ز پر تھا لیکن پھر قسمت دیکھیے کہ اتفاق سے لی جانے والی قانون کی ڈگری ہی کام آئی۔

ایک دن میں بندر روڈ پر جا رہا تھا کہ نوکری ملی نہیں تھی کہ اتفاقاً مجھے ایک بورڈ نظر آیا فاضل بھائی ایڈووکیٹ بی اے (علیگ) بی اے (لندن) میں نے سوچا یا تو یہ میری کمیونٹی کا بوہرہ ہے اور پھر لندن سے بھی پڑھا ہوا ہے میں اوپر چلا گیا اور کہا کہ مجھے نوکری ملنے والی ہے اس وقت تک میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے والد بمبئی کے مشہور وکیل تھے وہ میرے پاکستان آنے پر ناراض بھی ہوئے میرے بڑے بھائی آرکیٹیکٹ تھے پہلے وہ پاکستان آ گئے بعد میں میں بھی لندن سے سیدھا پاکستان آ گیا۔

سوال: آپ تقدیر کے جبر کی بات کر رہے تھے؟

فخر الدین جی ابراہیم: ہاں جی میں فاضل بھائی کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ کراچی یونیورسٹی کے انٹرنیشنل افیئر ز ڈیپارٹمنٹ میں ایک اسسٹنٹ لیکچرز کی پوسٹ نکلی میں نے درخواست دی پینل کے سامنے پیش ہوا پانچ منٹ کے انٹرویو کے بعد انہوں نے مجھے فارغ کر دیا شاید یہ سمجھا ہو گا کہ یہ بچہ کیا کرے گا اس کے چند روز بعد مجھے کسی نے کہا کہ لاء کالج کے پرنسپل حسن علی اے رحمٰن آپ سے ملنا چاہتے ہیں حسن علی اے رحمٰن سے میری ملاقات شاید میری زندگی کا اہم موڑ تھی اس ملاقات کی وجہ سے میری ملاقات طفیل علی عبدالرحمٰن سے ہوئی ان کی وجہ سے میں جج بنا یہ سارے اتفاقات ہیں میں انہی اتفاقات اور حادثات کی پیداوار ہوں۔

پھر ایک دن میں فاضل بھائی کے ساتھ ہائی کورٹ میں پیش ہونے کے لیے جا رہا تھا، 1951ء کی بات ہے کہ راستے میں شریف الدین پیرزادہ سے ملاقات ہوئی میری نہ جان نہ پہچان تھی فاضل بھائی سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ فارن آفس میں نوکری ملنے کا انتظار ہے شریف الدین نے کہا کہ نوکری مل گئی تو زیادہ آگے نہ جا سکو گے کیونکہ تم نہ تو پنجابی ہو اور نہ ہی بنگالی۔

انہی دنوں میں ایک دوست دفتر خالی کر رہے تھے انہوں نے کہا چاہے آدھا لے لو شریف الدین پیرزادہ نے کہا کہ ضرور لے لو فوراً دفتر میں شفٹ ہو جاؤ۔ یہ بھی حادثہ تھا کہ میری منگنی ہوئی اور ساتھ ہی 1952ء میں مجھے پانچ ہزار کی ریٹینر شپ مل گئی تو یہ اتفاقات کی بات ہے میں تو حوادث کی پیداوار ہوں۔

سوال: آپ کا پاکستان کے عدالتی نظام اور سیاست کے بارے میں ایک وسیع تجربہ ہے اس طویل اننگ میں آپ کو زیادہ دکھ کس بات پر ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ پاکستان ہے یہاں سب چلتا ہے تو مجھے سب سے زیادہ دکھ ہوتا ہے اس ایک فقرے کے ذریعے پوری قوم اور پورے ملک کو تباہ کر دیا جاتا ہے اور یہ فقرہ عام لوگ نہیں پاکستان کے اہم عہدوں پر متمکن لوگ کہتے ہیں فخرو بھائی! یہ پاکستان ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے میرے دوست مجھے اکثر کہتے ہیں کہ "تو چپ کیوں نہیں رہتا؟" مگر میں سچ کہنے پر مجبور ہوں۔

سوال: آپ کتنے سالوں سے وکالت کر رہے ہیں؟

فخر الدین جی ابراہیم: میں گزشتہ پچاس سال سے پریکٹس کر رہا ہوں 71 سال میری عمر ہو چکی ہے اس عرصے میں بہت کمایا ابھی تھوڑا عرصہ پہلے وزیراعظم صاحب سے ملاقات ہوئی میں نے انہیں کہا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے میں نے تو گزشتہ سال 37 لاکھ کا پرسنل انکم ٹیکس دیا اس پر وزیراعظم نے کہا کہ آپ اتنا ٹیکس دیتے ہیں تو میں نے کہا کہ ہاں اتنا تو ہو جاتا ہے کیا کریں۔

انٹرویو: اپریل، 1999ء

مقام: کراچی

حوالۂ اشاعت: 16 مئی 1999ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

گفتگو

سوال: موجودہ عدالتی بحران کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: موجودہ عدالتی بحران عدلیہ اور ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ ساتھ اداروں کے استحکام اور مضبوطی کا بھی اسی مقدمے کے ذریعے فیصلہ ہوگا میری نظر میں عدلیہ ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ عوام کی نظریں سپریم کورٹ پر لگی ہوئی ہیں۔

سوال: پاکستان کی 60 سالہ تاریخ کے حوالے سے موجودہ عدالتی بحران کی کیا اہمیت ہے؟

فخر الدین جی ابراہیم: عدلیہ نے ہمیشہ غیر آئینی حکومتوں کو تحفظ دیا ہے اب آئین سے یہ مذاق بند ہونا چاہیے۔ جنرل مشرف ریفرنڈم کے ذریعے منتخب ہوئے آئین کے مطابق صدر کا انتخاب ریفرنڈم کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ غیر منتخب صدر ریفرنس نہیں بھیج سکتا پاکستان کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک ادارے نے ملک کے 3 ستونوں پر قبضہ کرلیا ہو اب بندوق کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ورنہ دستور کا خدا ہی حافظ ہے۔

گفتگو: جون 2007ء، غیر مطبوعہ

جسٹس (ر) قیوم ملک

جسٹس قیوم ملک عدلیہ کی حالیہ تاریخ کے گواہ بھی ہیں اوراہم ترین ومتنازعہ کردار بھی۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف سوئس منی لانڈرنگ کیسز کا فیصلہ انہوں نے کیا تھا، اس حوالے سے ٹیپس بھی آئیں بعدازاں سپریم کورٹ نے اس فیصلے کے خلاف رائے دی تو وہ مستعفی ہو گئے۔

ان کے والد جسٹس ملک اکرم بھٹو کو سزائے موت دینے والے ججوں میں شامل تھے جب کہ ان کے بھائی پرویز ملک مسلم لیگ (ن) کے ایم این اے ہیں، جسٹس قیوم ملک، وزیراعظم نواز شریف سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ دوسرے سیاستدانوں سے بھی ان کی راہ ورسم تھی، وہ ہائیکورٹ میں عدلیہ کے اہم ستون سمجھے جاتے تھے بیشتر چیف جسٹس ان کے ذاتی دوست رہے۔

عدلیہ سے فراغت کے بعد وہ سپریم کور بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہو گئے انہوں نے ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد حکومت کی طرف سے چیف جسٹس کے خلاف مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا ان سے انٹرویو 2006ء میں ہوا تاہم تازہ ترین صورتحال پر ان کا تبصرہ شامل ہے۔ قیوم ملک سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے تو ان کا رجحان اپوزیشن کی طرف تھا بعد میں صدر مشرف سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان کا رویہ بدلا۔ چیف جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس آیا تو تب بھی ان کا ردعمل ملا جلا تھا کبھی تو وہ ریفرنس کے خلاف بولتے اور کبھی حق میں۔ لیکن بالآخر انہوں نے وفاق کا وکیل بننا قبول کر لیا۔ تاہم اب ان کا مؤقف ہے کہ اگر عدالت نے ریفرنس کو غلط تصور کیا تو وزیراعظم کو مستعفی ہونا چاہئے نہ کہ صدر کو۔ کیونکہ ریفرنس وزیراعظم نے بھیجا ہے۔ جسٹس قیوم کا اب یہ بھی کہنا ہے کہ پی سی او کے تحت انہوں نے جو حلف اٹھایا تھا وہ غلط تھا حالانکہ زیرنظر انٹرویو میں وہ اس کے حق میں دلائل دے رہے ہیں آئیے ان کے دلچسپ خیالات پڑھیں۔

اہم نکات

☆ بطور جج دوبئی میں بے نظیر بھٹو سے خفیہ ملاقات کی تھی، جسٹس راشد عزیز غائب ہو گئے تھے۔
☆ مولوی مشتاق بھٹو کیس نہ سنتے تو عدلیہ کے لئے بہتر ہوتا۔
☆ نصرت بھٹو کیس میں اپنے والد جسٹس اکرم کے فیصلے سے اختلاف ہے۔
☆ کون سی ٹیپ؟ کیا میں بے وقوف ہوں جو کہوں ''تم بتاؤ میں بے نظیر کو کتنی سزا دوں''۔
☆ سلمان تاثیر کی ضمانت لی تو نواز شریف نے میرے بھائی کو کہا تم کتنے اچھے ہو مگر تمہارا بھائی کیسا ہے۔
☆ افتخار چودھری کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس بھیجا جا سکتا ہے۔
☆ میرے نواز شریف سے تعلقات تھے بے چارہ سیف الرحمٰن مجھ پر کیا دباؤ ڈال سکتا تھا۔
☆ نسیم حسن شاہ کی عزت کرتا ہوں مگر انہوں نے فیصلوں مین مصلحت کی حمایت کر کے غلط کیا۔
☆ بہترین عدلیہ گھر چلی گئی باقی وہ رہ گئے جن کا حال سب کو علم ہے۔
☆ سعید الزمان صدیقی کو پی سی او کے تحت حلف لینا چاہیے تھا بعد میں انصاف اپنی مرضی سے کرتے۔
☆ عجیب بات ہے کہ میں نے سفارتی پاسپورٹ کے بدلے بے نظیر بھٹو کو سزا دے دی۔
☆ احمد فراز کا فین ہوں، وہ مولوی مودودی نہیں، شاعر ہے۔
☆ مولوی مشتاق کی ضیاء الحق سے دوستی تھی، بھٹو کے وکیلوں نے ٹرائل کا بائیکاٹ کر کے غلطی کی۔
☆ صدر مشرف کو صدر ماننا نظریہ ضرورت نہیں، ایسا نہ کیا تو انتشار پیدا ہوگا۔
☆ سپریم کورٹ کے لئے بہت سے اہم کام میں پتنگ بازی اور شادیوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔
☆ سپریم کورٹ نے میرے فیصلوں کی بجائے بطور جج میرا ٹرائل کیا ہے۔
☆ میں اب سپریم کورٹ کا جج بننے کا خواہش مند نہیں میں کس طرح دس سال جونیئر کے پیچھے بیٹھ جاؤں۔
☆ میں پاکستان کا سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا شخص ہوں اس سال 76 لاکھ روپے ٹیکس دیا۔
☆ عدلیہ ڈٹ جاتی، چاہے جنرل ضیاء بریگیڈیئروں کو عدالتوں میں بٹھا دیتے۔
☆ مارشل لاء لگانے والوں کا ایک بار ٹرائل ہو گیا تو کبھی مارشل لاء نہیں آئے گا۔

☆ ججز کیس کے فیصلوں کو خود اس کے لکھنے والوں نے توڑ دیا ورنہ یہ اچھا فیصلہ تھا۔
☆ سجاد علی شاہ ضدی تھے حدود سے تجاوز کرے تھے۔
☆ کوئٹہ بنچ کا فیصلہ غلط تھا چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف فیصلے سے عدلیہ مجروح ہوئی۔
☆ جج بننے کی خواہش نہیں تھی، جج بن کر انسان اکیلا ہو جاتا ہے۔
☆ سپورٹس سے بے حد لگاؤ ہے ابن صفی کی جاسوسی کہانیاں پڑھتا تھا۔
☆ ہینڈ رائٹنگ بہت بری ہے اپنا لکھا ہوا بھی کچھ دیر بعد نہیں پڑھ سکتا۔
☆ اپنی بیوی دنیا کی خوبصورت ترین عورت لگتی ہے۔

انٹرویو

سوال: آپ کے خیال میں عدلیہ کے زوال کی کیا وجہ ہے اور عدلیہ کی اصلاح کس طریقے سے ممکن ہے؟

قیوم ملک: عدلیہ کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ججوں کی میرٹ پر تقرری نہ ہونا ہے۔ججوں کی تقرری کے لئے جو آئینی طریق کار طے ہے وہ بالکل درست ہے مگر اصل بات چیف ججوں کی ناکامی ہے جو حکومت اور سیاستدانوں کے دباؤں میں آکر غیر مستحق لوگوں کو جج بنا دیتے ہیں۔

سوال: تو کیا آج کل کے ججوں کا معیار اچھا نہیں ہے؟

قیوم ملک: کچھ لوگ ضرور اچھے ہیں یہ لوگ ایسے ہیں کہ کوئی بھی حکومت ہو وہ میرٹ پر ہی سیلیکٹ ہو جاتے ہیں لیکن ان دنوں زیادہ تر لوگ بھرتی کے ہیں صرف عدلیہ کی بات کیا کریں سارا معاشرہ ہی اسی طرح کا ہو گیا ہے۔

سوال: کیا جسٹس افتخار چودھری کے احتساب کے لیے درست طریقہ اختیار کیا گیا؟

قیوم ملک: اس میں کئی غلطیاں تھیں لیکن حکومت کو سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس بھیجنے کا اختیار ہے اسی اختیار کو استعمال کیا گیا ہے۔

سوال: عمران خان اور کئی دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ اگر پاکستان میں عدلیہ ٹھیک ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟

قیوم ملک: میں اس رائے کو مانتا ہوں، عدلیہ کا اصل رول ہی احتساب کا ہے اگر کسی کو یہ علم ہو کہ مارشل لگانے پر اس کا ٹرائل ہوگا اگر ایک بار یہ ٹرائل ہو گیا تو پھر کوئی مارشل لاء نہیں لگائے گا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف کے ٹیک اوور کو نظریہ ضرورت کے تحت قبول کرنے والے ججوں کی رائے ہے کہ اگر وہ اس نظریے کو قبول نہ کرتے تو فوجی عدالتیں لگ جاتیں بریگیڈیئروں کو عدالتوں میں ججوں کی جگہ بٹھا دیا جاتا۔

قیوم ملک: (غصے سے) تو لے آتے بریگیڈیئروں کو۔ابہام تو نہ رہتا پھر عدلیہ کی تو بدنامی نہ ہوتی۔جسٹس نسیم حسن شاہ میرے والد کے کولیگ رہے ہیں وہ بڑے لائق ہیں لیکن میری رائے میں جن ججوں نے یہ فیصلہ کیا انہیں جسٹس کارنیلس کے ایک فیصلے کی یہ بات رکھنی چاہیے کہ انصاف ہر صورت

میں لاگو ہونا چاہیے۔Even if Heavens fall let them fall جب کہ جسٹس نسیم حسن شاہ نے اپنے ایک فیصلے میں لکھا کہ Justice should be done in a manner that heavens should not be allowed to fall زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ بدلتی گئی جب آپ مصلحت یا نام نہاد عوامی مفاد کے تحت فیصلے کریں گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔

سوال: تو کیا ان ججوں کے فیصلے مصلحت پر مبنی تھے؟

قیوم ملک: میں نہیں کہتا کہ یہ مصلحت پر مبنی تھے یعنی ہر جج کے 99 فیصد فیصلے تو درست ہی ہوتے ہیں جج اصل میں حکومت کے خلاف مقدمات یا شہری حقوق کے ایک فیصد مقدمات سے پرکھا جاتا ہے۔ان مقدمات میں انہوں نے اپنے خلاف یعنی عدلیہ کے خلاف پابندیاں لگادیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

سوال: کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ عدلیہ کے زوال کا آغاز مولوی تمیزالدین کے مقدمے سے ہوا؟

قیوم ملک: میرے خیال میں جسٹس منیر نے غلطی کی وہ تکنیکی مسائل میں الجھ گئے حالانکہ فیصلہ تو اسمبلی کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے پر ہونا تھا انہوں نے ایک طرح سے اصل مسئلے سے چشم پوشی کی جو نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میرے خیال میں اس غلطی کے صرف جسٹس منیر ذمہ دار نہیں تھے ان کے ساتھ بڑے بڑے نام والے جج بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔

سوال: ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے والے ججوں میں آپ کے والد جسٹس ملک محمد اکرم بھی شامل تھے جب کہ بہت سے لوگوں کی رائے میں یہ ایک منصفانہ فیصلہ نہیں بلکہ جوڈیشل مرڈر تھا۔

قیوم ملک: میں بھٹو کیس پر اس لیے بات نہیں کروں کیونکہ اس کا فیصلہ کرنے والے ججوں میں میرے والد بھی شامل تھے۔اس کو عدالتی قتل کہنے والے وہی لوگ ہیں جو آج میرے خلاف سپریم کورٹ کے فیصلے کو بڑا چوم چوم کر کہتے ہیں کہ یہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے تو کیا بھٹو کیس سپریم کورٹ کا فیصلہ نہیں تھا۔اس کو کیوں نہیں مانتے۔میرے والد کسی لالچ اور دباؤ میں آنے والے آدمی نہیں تھے میرے خیال میں ان کو کسی چیز کا مسئلہ نہیں تھا اب میرے والد اپنے خدا کے پاس جا چکے ہیں وہ جانیں اور خدا جانے۔

سوال: اتنا بڑا اہم مقدمہ اور آپ اس پر تبصرہ بھی نہیں کر رہے؟

قیوم ملک: اصل میں بھٹو کیس کا مسئلہ یہ تھا کہ بھٹو صاحب نے ٹرائل کا بائیکاٹ کر دیا تھا جب آپ گواہوں پر جرح ہی نہیں کریں گے تو جج ان گواہوں کی باتوں کا کیسے یقین نہ کرتے۔

سوال: تکنیکی مسائل سے قطع نظر لوگ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کیا ججوں نے خوف دباؤ یا لالچ کے تحت فیصلہ دیا یا پھر آپ کی رائے بھی وہی ہے جو آپ کے والد کی تھی؟

قیوم ملک: میں اس پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا میرے اس بارے میں کچھ تحفظات ہیں کیونکہ میرے والد اس مقدمے میں ایک پارٹی تھے میں نے تو یہ کیس پوری طرح پڑھا بھی نہیں یہ ایک بڑا لمبا مسئلہ ہے۔ اصل میں بھٹو صاحب کے وکیلوں نے اس مقدمے کو قتل کے مقدمے کی طرح لڑا ہی نہیں۔

سوال: یہ بات کس حد تک درست ہے کہ اگر سپریم کورٹ میں بھٹو کی طرف سے پھانسی کی سزا پر نظر ثانی کی جاتی تو شاید یہ سزا عمر قید میں بدل دی جاتی؟

قیوم ملک: نہیں بالکل نہیں۔ بھٹو صاحب نے نظر ثانی کی درخواست کی تھی میرے والد ہی نے نظر ثانی کی درخواست پر ہی فیصلہ لکھا تھا انہوں نے فیصلے میں لکھا کہ انہیں شروع میں ہی یہ کہنا چاہیے تھا کہ سزا میں کمی کی جائے انہوں نے یہ بھی کہا کہ غور کرنے کے لئے یہ معاملہ بہت ہی متعلقہ ہے اور اس درخواست پر ایگزیکٹو کو غور کرنا چاہیے۔ دیکھیں جی کچھ قانون قدرت بھی ہے جب کیس شروع ہوا تو بھٹو صاحب کے وکیلوں نے کہا کہ سپریم کورٹ کے سارے جج اس کیس کو سنیں انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ایڈہاک جج بھی اس مقدمے کو سنیں حالانکہ اگر صرف مستقل جج اس کیس کو سنتے تو بھٹو بری ہو جاتے اس وقت مستقل جج صرف پانچ تھے جسٹس انوار الحق اور میرے والد جسٹس اکرم خلاف تھے جسٹس دراب پٹیل جسٹس حلیم اور جسٹس صفدر شاہ بھٹو کے حق میں تھے جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس نسیم حسن شاہ ایڈہاک جج تھے، ایڈہاک ججوں کو بھٹو کے وکیلوں کے کہنے پر شامل کیا گیا اور اسی سے توازن بدلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھٹو صاحب نے خود سپریم کورٹ میں پیش ہو کر کہا تھا کہ انہیں ججوں پر اعتماد ہے پھر ہم کیسے اس رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

سوال: اگر آپ اپنے والد کی جگہ پر جج ہوتے تو کیا آپ بھی یہی فیصلہ کرتے؟

قیوم ملک: میں تو میٹریل دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں میں نے وہ میٹریل دیکھا نہیں ہے اس لئے میں اس فیصلے کا دفاع نہیں کرتا۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کے فیصلے کے سیاسی اثرات تو بڑے مضر ہوئے؟

قیوم ملک: سیاسی اثرات تو ضرور مضر ہوئے لیکن میرے خیال میں اس فیصلے سے زیادہ اہم فیصلہ نصرت بھٹو کیس کا تھا اس فیصلے کے ذریعے فوجی حکومت کو قانونی تسلیم کیا گیا حالانکہ اس فیصلے میں ضیاء حکومت کو 90 دن کا وقت دینا چاہیے تھا میرے والد اس مقدمے کا فیصلہ کرنے والوں میں شامل تھے پھر بھی میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے اس فیصلے سے اختلاف کرتا ہوں۔

سوال: لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بھٹو کے خلاف فیصلہ دینے والے ججوں کی جنرل ضیاء الحق سے دوستی تھی؟

قیوم ملک: میرے والد سے تو جنرل ضیاء کی کوئی دوستی نہیں تھی میں اپنے والد کا دفاع نہیں کرتا۔ہم نے جنرل ضیاء سے نہ تو کچھ لیا ہے نہ تو میرے والد کو ضیاء الحق نے جج بنایا بلکہ میرے والد کو جب سپر سیڈ کر کے افضل چیمہ کو سپریم کورٹ بھیجا گیا تو میرے والد نے استعفیٰ دے دیا تھا۔اس پر وزیر قانون ملک معراج خالد کے سیکرٹری شیخ امجد علی کو میرے والد کے پاس بھیجا گیا اور انہوں نے میرے والد کو کہا کہ بھٹو صاحب آپ کی بہت عزت کرتے ہیں جسٹس افضل چیمہ کو اس لئے بنایا گیا ہے کہ وہ ریٹائر ہونے والے تھے جب کہ آپ کے ابھی دو تین سال پڑے ہیں۔دیکھیں مجھے علم نہیں کہ جنرل ضیاء الحق کی مولوی مشتاق سے دوستی تھی یا نہیں،انوار الحق کی ضیاء الحق سے دوستی تھی لیکن میرے والد سے کوئی دوستی نہیں تھی۔انوار الحق کا تو مجھے علم نہیں کہ وہ بھٹو کے خلاف کیوں ہوئے لیکن مولوی مشتاق ہٹ دھرم تھے اور بات دل میں رکھ لیتے تھے چیف جسٹس نہ بننے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ مولوی مشتاق نے اپنے دل میں کوئی بات رکھ لی ہو۔

سوال: اگر جج کے دل میں بات ہو یا تعصب رکھتا ہو تو کیا اسے کیس سننا چاہیے؟

قیوم ملک: اسلامی طور پر تو اسے سننا چاہیے اسلام میں تو یہ ہے کہ اگر کیس آپ کے بھائی کے خلاف بھی ہے تو انصاف کرنا چاہیے میرے خیال میں اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا جج یہ سمجھتا ہے کہ میں انصاف کرسکوں گا تو اسے سننا چاہیے وگرنہ نہیں۔میرے خیال میں جب بھٹو کے وکلاء نے مولوی مشتاق پر عدم اعتماد کر دیا تھا تو انہیں یہ مقدمہ نہیں سننا چاہیے تھا۔مولوی مشتاق اگر یہ کیس نہ سنتے تو ان کے اور عدلیہ کے لئے بہت بہتر ہوتا۔

سوال: بے نظیر بھٹو کے مقدمے کے حوالے سے آپ کی گفتگو کی ٹیپس آنے پر بطور جج آپ کے کیریئر کو دھچکا لگا؟

قیوم ملک: (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) پتہ نہیں کون سی ٹیپس، میں نے سنی ہیں نہ دیکھی ہیں یہ آئی کہاں سے ہیں یہ تو مجھے بتائیں حکومت نے تو سپریم کورٹ میں اس سے انکار کیا ہے کہ نہ تو کوئی ایسی ٹیپس بنائی ہیں نہ بنی ہیں ان کے پاس کیسے آگئیں جنہوں نے پیش کیں؟ اور کب ٹیپس سامنے آئیں جب سارا کیس ختم ہو گیا تھا اپیل کے وقت بھی وہ Tapes پیش نہیں کی گئیں ایک دن وہ اچانک سامنے لے آئے آج تک ہم سے تو کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ Tapes آپ کی ہیں یا نہیں؟ اور جس طرح کی وہ Tapes ہے اتنا کوئی آدمی بے وقوف ہو ہی نہیں سکتا کہ کہے ”تم بتاؤ میں کتنی سزا

دوں؟'' کیا یہ کوئی کسی سے پوچھتا ہے۔

ٹیپ تو بطور گواہی عدالتوں میں پیش ہی نہیں ہو سکتیں آپ جس طرح کی چاہے صبح میں آپ کو ٹیپ بنا کر دے دوں گا۔

سوال: اگر ٹیپس درست نہیں تھیں تو آپ کو استعفیٰ دینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟

قیوم ملک: (تیزی سے) اس لیے کہ سپریم کورٹ نے میرے خلاف فیصلہ دیا تھا اور کہا تھا کہ آپ کا فیصلہ تعصب اور جانبداری پر مبنی ہے اگر کسی جج کے متعصب ہونے کے بارے میں عدالتی فیصلہ آ جائے تو پھر اسے زیب نہیں دیتا کہ وہ جج رہے میرے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ یا تو میں سپریم کورٹ کے پیچھے لگ جاتا اور کہتا کہ انہوں نے یہ غلط کیا یا وہ غلط کیا یا پھر یہ کہ فیصلے کو قبول کر کے ایک طرف ہو جاؤں۔ میں نے دوسرا راستہ پسند کر لیا۔

سوال: لیکن تاثر تو یہ ہے کہ آپ کو عالمی دباؤ پر نکالا گیا ٹیپس آنے کے بعد حکومت نے آپ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا؟

قیوم ملک: نہ کوئی عالمی دباؤ تھا حکومت میں سے مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا کہ آپ استعفیٰ دے دیں آپ کسی سے بھی پوچھ لیں میں نے رضا کارانہ طور پر استعفیٰ دیا۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ سب سے زیادہ دباؤ حکومت کی طرف سے نہیں تھا بلکہ میڈیا کی طرف سے تھا میری بڑی بڑی تصویریں شائع کر دیتے تھے خیر چھوڑیئے اس بات کو۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ اور جسٹس راشد عزیز دونوں پر استعفوں کے لئے دباؤ ڈالا گیا تھا؟

قیوم ملک: راشد عزیز پر دباؤ ڈالا گیا آپ پوچھ رہے ہیں تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں ارشاد حسن خان چیف جسٹس آف پاکستان تھے میں اور جسٹس راشد عزیز ان کے پاس گئے میں نے انہیں کہا کہ میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس پر جسٹس راشد عزیز نے چیف جسٹس ارشاد حسن سے کہا ملک قیوم غلط کر رہا ہے اسے یہ نہیں کرنا چاہیے یہ بے وقوف ہے، جذباتی ہو رہا ہے میں تو استعفیٰ نہیں دوں گا۔ ارشاد حسن خان نے راشد عزیز سے کہا تم استعفیٰ کیوں نہیں دینا چاہتے؟ راشد عزیز نے کہا ابھی صرف ایک طرف کا موقف آیا ہے، ہم سے ٹیپس کے متعلق کسی نے پوچھا نہیں۔ سپریم کورٹ نے ہمارا موقف سنا ہی نہیں۔ یہ چیز انصاف کے تقاضوں ہی کے خلاف ہے میں سپریم کورٹ میں درخواست دے رہا ہوں کہ ہمارے خلاف ریمارکس کو حذف کیا جائے یہ جون جولائی کی بات ہے اس زمانے میں عدالتوں کی چھٹیاں تھیں راشد عزیز نے کہا کہ ستمبر میں جب عدالتیں کھلیں گی تو پھر میں فیصلہ کروں گا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔

اس پر چیف جسٹس سپریم کورٹ ارشاد حسن خان نے کہا کہ تمہیں کس نے کہا ہے کہ اس درخواست کا فیصلہ ستمبر میں ہوگا تم درخواست دو میں کل ہی کورٹ میں بیٹھ کر اسے مسترد کر دوں گا۔ اب یہ بات کسی چیف جسٹس کو تو زیب نہیں دیتی اور وہ بھی اپنے ہی جج سے اس طرح بات کرے۔ ارشاد حسن نے مزید کہا کہ تمہیں Hearing چاہیے تو تمہیں پہلی ہی سماعت میں سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیجوں گا۔ اس طرح سے راشد عزیز پر تو دباؤ ڈالا گیا لیکن میں نے خود فیصلہ کیا کہ استعفیٰ دے دینا چاہیے اور دوسری اس ججی میں کیا خاص دلکش بات تھی جو میں اس سے چمٹا رہتا۔

سوال: ذاتی حوالے سے آپ کا تعلق ''شریف خاندان'' سے تھا پھر بے نظیر بھٹو کا مقدمہ سننے کی ضرورت کیا تھی۔ پھر اس معاملے پر ٹیپس بھی آ گئیں؟

قیوم ملک: ٹیپس میرے سامنے کوئی نہیں لایا۔ نواز شریف سے میرا تعلق کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی۔ آپ نے اچھا سوال پوچھا میرا بھائی نواز شریف کا ایم این اے تھا اور یہ کیس کوئی بے نظیر بمقابلہ نواز شریف تو نہیں تھا۔

سوال: ٹیپس کے مطابق نواز شریف اور سیف الرحمٰن اس مقدمے میں دلچسپی تو لیتے تھے؟

قیوم ملک: سیف الرحمٰن کیا آدمی ہے وہ کوئی آدمی ہے اس کو چھوڑیں ایک دن بے نظیر بھٹو میرے سامنے پیش ہوئیں تو میں نے کہا بی بی آپ کیس اتنا لمبا نہ کریں اس سے فائدہ نہیں ہوگا اور جب میں نے ذرا سختی سے بات کی تو وہ عدالت میں رونے لگیں آپ فائل نکال کر دیکھ لیں اس پر انہوں نے کہا کہ آپ کے والد نے میرے والد کو سزا دی ہے اور آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں۔ آپ میرا کیس نہ سنیں میں اندر چلا گیا تو میں نے کہا ٹھیک ہے آپ مجھے لکھ کر دے دیں۔ میں کیس نہیں سنوں گا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں کیس زبردستی سنوں۔ بہر حال انہوں نے درخواست نہیں دی۔

سوال: مشہور تو یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف فیصلہ سنانے کے عوض آپ کو Blue یا ریڈ پاسپورٹ خاص طور پر دیا گیا۔

قیوم ملک: پاسپورٹ تو اس فیصلے سے بہت پہلے دیا گیا یہی تو سارا جھگڑا ہے۔ بلیو یا نیلا پاسپورٹ تو ہر جج کے پاس پہلے ہی ہوتا ہے۔ ریڈ پاسپورٹ کی بات تھی ریڈ اور بلیو پاسپورٹ میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے ریڈ پاسپورٹ کو سفارتی پاسپورٹ سمجھا جاتا ہے ہر وزیر، مشیر کو دیا جاتا ہے اسحاق ڈار کے پاس یہی پاسپورٹ تھا۔ قانون کی شق میں یہ لکھا ہے کہ وزیراعظم جس کو چاہے ریڈ پاسپورٹ ایشو کر سکتا ہے یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں تھی۔

سوال: آخر آپ کو اس پاسپورٹ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟

قیوم ملک: اس وقت میں چیئر مین الیکشن اتھارٹی تھا میں نے لوکل باڈیز کے الیکشن کروانے تھے میں نے لوکل گورنمنٹ کے نظام کا مطالعہ کرنے جانا تھا۔ ریڈ پاسپورٹ میں ویزے کی بہت آسانی ہے لیکن اس وقت تک میرے پاس بے نظیر بھٹو کا مقدمہ نہیں تھا۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ کیس میرے پاس کیسے آیا یہ مقدمہ جسٹس خلیل رمدے کی عدالت میں تھا۔ انہوں نے دو تین مہینے اپنے پاس رکھا اور پھر لکھ دیا کہ چونکہ میرے بھائی اٹارنی جنرل ہیں اس لیے میں اس کیس کو نہیں سنوں گا۔ اس طرح سے چیف جسٹس نے یہ کیس میرے پاس بھجوایا اور دوسرا ریڈ پاسپورٹ کے ساتھ مجھے کتنے مربعے یا کتنے پیسے مل گئے تھے۔ کیا مجھے علم نہیں تھا کہ بے نظیر بھٹو اس ملک کی وزیراعظم رہی ہیں اور ایک بہت بڑی سیاسی پارٹی کی رہنما ہیں نواز شریف کے کہنے پر یا ایک پاسپورٹ کے عوض۔ بے نظیر کو سزا سنانے کی بات مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی۔

سوال: یہ بھی کہا جاتا ہے آپ کی بے نظیر بھٹو سے دوبئی میں خفیہ ملاقات ہوئی تھی؟

قیوم ملک: بالکل محترمہ سے میری ملاقات ہوئی تھی میں چھپاتا نہیں ہوں زرداری صاحب اس زمانے میں میرے پاس آتے رہے ہیں۔

سوال: بے نظیر بھٹو سے اسی خفیہ ملاقات کے بعد سیف الرحمٰن نے آپ پر دباؤ بڑھا دیا تھا؟

قیوم ملک: (غصے سے) سیف الرحمٰن بچارا مجھ پر کیا دباؤ بڑھائے گا میں ہائیکورٹ کا جج تھا کوئی سڑک پر جاتا ہوا عام آدمی تو نہیں تھا۔ وہ کیا دباؤ بڑھا سکتا تھا اور دوسرا یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ میرے نواز شریف سے بڑے تعلقات تھے تو میرے پر سیف الرحمٰن کیا دباؤ ڈال سکتا تھا۔

سوال: دوبئی میں بے نظیر سے ملاقات میں کیا باتیں زیر بحث آئیں؟

قیوم ملک: میں آپ کو بتا دیتا ہوں آپ بے نظیر بھٹو سے بھی پوچھ لیجئے گا ہوا یہ تھا کہ مجھے اور چیف جسٹس راشد عزیز خان کو دوبئی حکومت نے مدعو کیا تھا وہاں ایک سرکاری فنکشن تھا۔ دوبئی میں ہمارے ایک دوست کافی بڑے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے فون پر کہا کہ بے نظیر (مجھے نہیں) چیف جسٹس راشد عزیز سے ملنا چاہتی ہیں یاد رہے کہ اس وقت میرے پاس بے نظیر بھٹو کا کوئی کیس نہیں تھا اور یہ جو سیف الرحمٰن کے دباؤ بڑھانے والی بات ہے بالکل جھوٹ ہے اس زمانے میں جسٹس عباسی اور جسٹس احسان الحق چودھری یہ کیس سن رہے تھے اس دوست کے فون کے بعد میں نے اپنے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے راشد عزیز کو بتایا کہ ''سر! بے نظیر آرئی اے تہانوں ملن'' کہنے لگے اچھا ٹھیک ہے پتہ نہیں انہیں کیا سوجھی کہ وہ کمرے ہی سے غائب ہو گئے۔

سوال: تو چیف جسٹس راشد عزیز کہاں چھپ گئے؟

قیوم ملک: (ہنستے ہوئے) پتہ نہیں کمرے سے باہر چلے گئے چھپ نہیں گئے ہوسکتا ہے انہیں کوئی جنیوئین کام تھا، ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میرا دروازہ کھٹکا۔ سامنے میرا دوست تھا اور ساتھ بے نظیر بھٹو تھیں۔ میرے لئے چارہ ہی کوئی نہیں تھا اور مجھے کیا ضرورت تھی ملاقات نہ کرنے کی۔ میرے پاس تو کوئی کیس ہی نہیں تھا اور نہ میرا سیاست سے تعلق تھا۔ میں نے انہیں اندر بلالیا اور وہ بیٹھ گئے بے نظیر نے کہا کہ ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہورہی ہے آپ کو پتہ ہے کہ بے نظیر بھٹو نے اس زمانے میں چیف جسٹس ہائیکورٹ کو خط لکھا کہ چار مختلف ججوں کے پاس میرے کیس ہیں۔ مجھے صرف جسٹس قیوم پر اعتبار ہے آپ میرے تمام مقدمات ان کی عدالت میں ٹرانسفر کردیں۔ یہ خط ہائیکورٹ کے ریکارڈ میں ہے۔ میں نے چیف جسٹس راشد عزیز سے کہا میرا دماغ خراب ہے کہ سارے کیس مجھے دے دو پہلے ہی اتنا دباؤ والا کیس میرے پاس تھا۔ دیکھیں مجھے بے نظیر سے آج بھی ذرا برابر عداوت نہیں ہے۔ وہ جو مرضی کہتی رہیں میرے دل میں ابھی بھی کچھ نہیں ہے، اگر واقعی وہ میری اتنی بڑی دشمن ہیں تو انہوں نے میری سگی بہن کو وومن سیٹ پر MNA کا ٹکٹ کیوں دیا۔ میاں مصباح الرحمٰن میرے بہنوئی ہیں میرے بھائیوں جیسے ہیں وہ ان کی پارٹی کے لاہور کے صدر رہے ہیں ہمارا تو اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کو علم تھا کہ آپ کے فیصلے سے بے نظیر بھٹو کو سیاسی نقصان پہنچے گا؟

قیوم ملک: اگر آپ فیصلے کو پڑھ لیں اور دیکھیں یہ کیا ہے سپریم کورٹ نے زیادتی یہ کی ہے کہ انہوں نے کیس کو نہیں پرکھا بلکہ جج کا ٹرائل کیا ہے، تعصب کا قانون یہ ہوتا ہے کہ پہلے آپ مقدمے کا میرٹ پر جائزہ لیں اگر میرٹس ٹھیک ہیں تو اس کے بعد تعصب دیکھا جاتا ہے، میں خود اپنی تعریف نہیں کرنا چاہا، میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں، مجھ میں ایک ہزار غلطیاں ہوں گی لیکن میں آپ کو یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر کوئی بھی فیصلہ بدنیتی سے نہیں کیا، جس پر مجھے شرمندگی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمارے فیصلے میں اتنا ہی نقص تھا تو سپریم کورٹ نے بے نظیر بھٹو کو بری کیوں نہیں کیا، اس کا ریمانڈ کیوں کردیا، آپ کو علم ہے وہ کون جج تھے جنہوں نے یہ فیصلہ لکھا۔

سوال: کون تھے؟

قیوم ملک: چھوڑیں جی! میرے کولیگ رہے ہیں، ان کی اپنی کیا بات تھی، پہلے تو ان کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ مقدمہ میرٹ پر صحیح تھا یا نہیں۔

سوال: بے نظیر بھٹو کے خلاف سوئٹزرلینڈ میں جو مقدمہ چل رہا ہے کہ اس کو بھی آپ کے فیصلے کی بنیاد پر بنایا گیا تھا؟

قیوم ملک: نہیں یہ دو الگ مقدمات ہیں، پاکستان میں مقدمہ پاکستانی قوانین کی خلاف ورزی پر تھا جب کہ سوئٹزرلینڈ کا مقدمہ وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی پر قائم کیا گیا، مجھے نہیں علم کہ وہاں کیا فیصلہ ہوگا، جو زیر سماعت مقدمات ہوں، ان پر بحث نہیں کرنی چاہیے اگر وہ بے گناہ ہیں تو وہاں بری ہو جائیں گی۔

سوال: کیا آپ کی یہ رائے ہے کہ وہ وہاں بے گناہ ثابت ہو جائیں گی؟

قیوم ملک: میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دوں گا کیونکہ یہ تعصب کے زمرے میں آ جائے گا پھر لوگ کہیں گے کہ یہ نواز شریف کا دوست ہے، مجھے تو فخر ہے کہ پیپلز پارٹی کے وکلاء کو سب سے زیادہ ریلیف میں نے ہی دیا تھا، نواز شریف نے میرے بھائی پرویز ملک کو بلا کر کہا تھا" تو ایناں چنگا اے تیرے بھرانوں کی اے" (تم اتنے اچھے ہو تمہارے بھائی کو کیا مسئلہ ہے) نواز شریف جب پورے زور پر تھے، حامد خان جو آج کل بڑی باتیں کرتے ہیں، یہ میرے پاس چیئرمین واپڈا جنرل زاہد علی اکبر کا کیس لے کر آئے تھے، میں نے ایک منٹ میں سٹے کر دیا، اسی طرح پیپلز پارٹی کے سلیمان تاثیر اور اقبال ٹکا کی ضمانتیں میں نے لیں حالانکہ مجھے علم نہیں تھا کہ سلمان تاثیر کی نواز شریف سے ذاتی دشمنی تھی، اس فیصلے کے چند دنوں بعد میں بیمار ہوا اور شہباز شریف میرا پتہ کرنے آئے تو مجھے کہا آپ ہمارے دشمنوں کی ضمانتیں لیتے ہیں میں نے کہا آپ کی ضمانت بھی میں ہی لوں گا۔

ہم جج بنے تھے عزت کے لئے اگر عزت نہیں ہے تو جج بننے میں دلکشی کیا رہ جاتی ہے، جہاں تک مراعات کی بات ہے تو ججی چھوڑنے کے بعد میرے پاس دس گنا زیادہ مراعات ہیں پہلے میرے پاس پولیس گارڈ تھے اب پرائیویٹ گارڈز ہیں، ججی کے دوران ایک کار تھی 1300 سی سی اور وہ بھی پتہ نہیں کس ماڈل کی، اب باہر دیکھیں کتنی کاریں کھڑی ہیں، میں فخر سے کہتا ہوں کہ میں پاکستان میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا شخص ہوں، اس سال میں نے 76 لاکھ روپے ٹیکس دیا ہے، کیا کسی اور شخص نے اتنا ٹیکس دیا ہے؟

سوال: کیا آپ اعلیٰ عدلیہ کے سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعے احتساب کے طریقے سے مطمئن ہیں یا پھر احتساب کا کوئی اور طریقہ ہونا چاہیے؟

قیوم ملک: یہی مناسب طریقہ ہے اگر آپ احتساب کا اختیار کسی اور کو یا پارلیمنٹ کو دے دیں تو جج تو ہر وقت دفاعی پوزیشن میں رہے گا، وہ تو کبھی ان لوگوں کے خلاف کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکے گا، یہی طریقہ درست ہے مگر اس کو زیادہ متحرک کرنا چاہیے۔

سوال: سپریم کورٹ بار کی طرف سے موجودہ حکومت کی مخالفت کی جاتی رہی ہے لیکن آپ

نے صدر مشرف سے ملاقات کر لی یہ تو موقف سے انحراف نہیں تھا؟

قیوم ملک: اگر میں اور آپ صدر مشرف کو نہ مانیں پھر بھی انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دیکھیں انہیں عدلیہ صدر مانتی ہے، پارلیمنٹ صدر مانتی ہے، عوام نے ریفرنڈم میں انہیں ووٹ دیا ہے، فوج انہیں مان رہی ہے تو آپ اپنا علیحدہ ڈھول بجاتے رہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے جو آدمی صدر کے عہدے پر بیٹھا ہوا ہے، اسے عملی طور پر تو صدر ماننا ہی پڑے گا۔

سوال: اسی چیز ہی کو تو نظریہ ضرورت کا نام دیا جاتا ہے؟

قیوم ملک: نہیں نظریہ ضرورت اس کو نہیں کہتے، یہ اس لیے ضروری ہے کہ انتشار سے بچا جائے، دیکھیں میں بار کا صدر ہوں، کوئی اپوزیشن لیڈر تو نہیں ہوں اور اگر اپوزیشن والے جنرل پرویز مشرف کو صدر نہیں مانتے تو وہ پارلیمنٹ میں کیوں بیٹھے ہیں، اور ان کے نظام کا حصہ کیوں ہیں؟ میں وکیلوں کی بھوک ننگ دیکھوں یا ان کے کھوکھلے نعرے کو دیکھوں، صدر سے ملنے پر مجھے لوگ کہہ رہے ہیں کہ میں سپریم کورٹ کا جج بن رہا ہوں، میں نے جواباً کہا کہ میں ساری عمر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا جج ہونے کو تیار نہیں ہوں، میں جج ہو کر اپنے سے دس سال جونیئر جسٹس جیلانی کے پیچھے جا کر بیٹھ جاؤں، مجھے یہ منظور نہیں، مجھے اپنی عزت نفس بہت پیاری ہے، میرے میں اب کیا برائی ہے، میں اب بہت خوش ہوں، آپ سے باتیں کر رہا ہوں، کیا پاگل آدمی ہوں، بار کی تاریخ میں کوئی وکیلوں کے لئے 10 کروڑ روپے ویلفیئر فنڈ کے لئے لے کر نہیں آیا، میں نے اس فنڈ سے کچھ نہیں لینا، ہم نے اس فنڈ میں سے ان وکیلوں کو پیش کش کی کہ وہ اگر پریکٹس کرنے کے قابل نہیں تو پھر اپنا لائسنس سرنڈر کر دیں، ہم ان کو پنشن پر لگا دیتے ہیں، آج بار میں بعض وکیلوں نے بھیک مانگنی شروع کر دی ہے، وکیلوں کے لئے کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں ہے، میں کوئی اپنے لیے پلاٹ نہیں مانگ رہا ہوں، میں بار کے لئے مانگتا ہوں، صدر مشرف نے سپریم کورٹ کے ساتھ ہمیں پلاٹ دیا ہے، وہاں ہم نے دو سو دفتر بنانے ہیں۔

سوال: سپریم کورٹ نے سماجی رسوم مثلاً پتنگ بازی اور شادی کھانوں پر پابندی کے احکامات جاری کیے، کیا یہ فیصلے سماجی، ثقافتی معاملات میں مداخلت کے زمرے میں نہیں آتے؟

قیوم ملک: پتنگ بازی کا فیصلہ تو اس زمرے میں آتا ہے، میں کچھ کہوں گا تو وہ کہیں گے کہ میں پتنگ بنانے والوں کا وکیل ہوں، سپریم کورٹ والے کن چکروں میں پڑے ہیں اور اتنے بڑے بڑے مسائل ہیں یہ کوئی اتنا بنیادی حقوق کا مقدمہ نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک جان ضائع ہونے میں بھی بڑی بات ہے، میں نے ان سے کہا کہ اس سے زیادہ لوگ ٹریفک حادثات میں مرتے ہیں تو آپ ٹریفک کو ٹھیک کر دیں، پتنگ سازی سے تو 40 بندے مرتے ہیں ٹریفک سے 40 ہزار افراد مر جاتے

ہیں، ادھر کیوں نہیں توجہ دیتے، شادی کھانوں میں سپریم کورٹ نے آرڈر جاری نہیں کیا، سپریم کورٹ نے قانون کی تشریح کی ہے، قانون پہلے سے موجود ہے، انہوں نے کہا کہ اس کو نافذ کردو اور اگر شادی کھانوں کے بارے میں قانون غلط ہے تو پارلیمنٹ کو چاہیے کہ وہ نیا قانون بنائے، ان کے لئے کون سی مشکل ہے، مسائل تب حل ہوں گے جب پارلیمنٹ اپنا کردار ادا کرے گی۔

سوال: ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ ججوں کو آمروں کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے اور آمروں کی حکومتوں کو جائز نہیں قرار دینا چاہیے۔ دوسری طرف آپ نے خود پی سی او کے تحت حلف اٹھایا، یہ تو کافی بڑا تضاد ہے؟

قیوم ملک: میں نے پی سی او کے تحت بڑا سوچ سمجھ کر حلف اٹھایا تھا کیونکہ میرے سامنے ایسی مثالیں موجود تھیں کہ آپ اندر بیٹھ کر جدوجہد کریں، میرے پاس سپریم کورٹ کا فیصلہ موجود تھا کہ پی سی او کا حلف اٹھانے کے باوجود آپ کے اصلی حلف پر فرق نہیں پڑتا۔

سوال: کیا آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جسٹس سعید الزمان صدیقی اور جن دوسرے ججوں نے پی سی او کے تحت حلف نہیں لیا، انہوں نے غلط طریقہ اپنایا؟

قیوم ملک: اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ جو بہترین عدلیہ تھی وہ گھر چلی گئی، میرے خیال میں سعید الزماں صدیقی کو بھی پی سی او کے تحت حلف لینا چاہتے تھا لیکن پھر کرنا وہی چاہیے تھا جو انصاف ہوتا، انہوں نے جذباتی ہو کر فیصلہ کیا، میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں، وہ بہت بڑے جج ہیں جو اچھے جج تھے وہ چلے گئے، میں آپ کو بتادوں اگر سعید الزماں صدیقی اور وجیہہ الدین جیسے لوگ جج ہوتے تو جس طرح کا فیصلہ جنرل مشرف کے ٹیک اوور کے بارے میں کیا گیا، وہ کبھی نہ ہوتا۔

سوال: اس فیصلے میں کیا غلطی تھی؟

قیوم ملک: یہ فیصلہ بالکل غلط تھا، اس میں سب سے بڑی غلطی یہ تھی اگر ٹیک اوور کو درست اقدم بھی قرار دینا تھا تو 90 دن کے اندر الیکشن کروانے کا آرڈر کیوں نہیں دیا گیا، 3 سال کا عرصہ تو آئین میں کہیں درج نہیں ہے، یہ کیسے دے دیا گیا، اس دفعہ تو مارشل لاء نافذ بھی نہیں کیا گیا پھر ججوں پر کیا دباؤ تھا۔

سوال: کیا جوڈیشنل ایکٹوازم ہونا چاہیے؟

قیوم ملک: جوڈیشل ایکٹوازم اس لئے ضروری ہے باقی ادارے اپنے کام میں ناکام ہو چکے ہیں، عدالتی ایکٹوازم کی حدود یہ ہونی چاہیے کہ زیر بحث مسئلہ عوامی نوعیت کا ہو اور عوام الناس کا فائدہ ہو، یہ بھی دیکھا جائے کہ اس کی وجہ سے کسی اور قانون کو یا مسئلہ کو تو نقصان نہیں ہو رہا ہے، یہ توازن رکھنا

بہت مشکل ہے۔اس لیے بھارتی سپریم کورٹ نے جوڈیشل ایکٹوازم بالکل ختم کردیا ہے حالانکہ انہوں نے اس مسئلہ پر بہت کام کیا تھا۔

سوال: ملک صاحب ججز کیس کے بارے میں جو فیصلہ ہوا تھا اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

قیوم ملک: ججز کیس بہت اچھا فیصلہ تھا، اس پر عمل ہوا تو بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں لیکن اس فیصلے کی ایک شق پر بھی عمل نہیں ہوا اور اس فیصلہ کو توڑا بھی خود اس فیصلے کے لکھنے والوں نے۔

سوال: چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور کوئٹہ بنچ کے فیصلوں سے عدلیہ کی ساکھ کو نقصان پہنچا؟

قیوم ملک: جن دو ججوں نے کوئٹہ بنچ والا فیصلہ کیا تھا، وہ میرے سینئر تھے اور میرے دوست تھے لیکن چیف جسٹس کے خلاف INJUNCTION جاری کر دینے کا فیصلہ درست نہیں تھا اور اگر انہوں نے یہ فیصلہ کرنا ہی تھا تو پھر دو ججوں کی نہیں فل کورٹ بیٹھتی، کوئٹہ میں بیٹھ کر فیصلہ کرنا غلط تھا، اس سے چیف جسٹس کی عزت مجروح ہوئی ہے، کیا آپ فوج میں تصور کر سکتے ہیں کہ فوج چیف آف سٹاف کو کہہ دے آپ دفتر نہ آیا کریں یہ اسی طرح کی بات ہوئی تھی۔

سوال: جسٹس سجاد علی شاہ کا رویہ کیسا تھا، کئی لوگ اس رویئے پر اعتراض کرتے تھے، اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

قیوم ملک: جسٹس سجاد علی شاہ ایک اچھے آدمی تھے، میں ان کو قریب سے جانتا ہوں، ان کا مسئلہ ان کی ضد تھی اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی حدود سے باہر چلے گئے تھے، سجاد علی شاہ کے ردعمل کی وجہ سے ہی ساری مصیبت پڑی، انہوں نے آئینی ترمیم کو عدالتی آرڈر کے ذریعے بدلنے کی کوشش کی جو غلط چیز تھی، جب نواز شریف ان کے پاس بطور وزیراعظم پیش ہو گئے تھے، اور انہوں نے معافی مانگ لی تھی تو ان کو معاف کر دینا چاہیے تھا، جب ایک آدمی وزیراعظم ہے اور وہ خود چل کر آیا ہے اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے تو اسے معاف کر دینا چاہیے تھا، سپریم کورٹ پر حملے سے بڑا سانحہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا، یہ تو پوری عدلیہ پر حملہ تھا، سپریم کورٹ عدلیہ کی علامت ہے اس حملے کے ذمے دار آج بھی نااہل ہیں یہ لوگوں کے لئے عبرت کی بات ہے۔

سوال: آپ نے کرکٹ میں جوئے کی انکوائری کی، اس انکوائری پر کھلاڑیوں کو بڑے اعتراضات ہیں، اتنے سالوں کے گزرنے کے بعد آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کا فیصلہ صحیح تھا؟

قیوم ملک: میں کرکٹ کا خود بہت بڑا "فین" ہوں اور مجھے اپنے ملک سے بھی بے حد پیار ہے، میرے ذہن میں صرف ملک کی بھلائی تھی، میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا ورنہ یہ کھلاڑی اس

قابل تھے کہ اس سے زیادہ ان کو سزا دینی چاہیے تھی، یہ سارے اس میں ملوث تھے اور میں وسیم اکرم کا بہت بڑا فین ہوں، میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں، میں نے اس کے کھیلنے پر پابندی نہیں لگائی، آپ اندازہ کریں کہ ایک ٹیم جس کے 8 کپتان اور 10 میں سے 8 مینجر یہ کہتے ہیں کہ سارا میچ فکس ہوتا ہے اور یہی لوگ کرتے ہیں تو ان پر میں کیوں یقین نہ کروں اور جن گواہوں میں عمران خان، کوچ میاں داد اور عامر سہیل بھی شامل ہوں تو آپ بتائیں ہم نے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ میچ فکس ہوا ہے تو میچ فکس سڑک پر تو نہیں ہوا۔ آسٹریلوی کھلاڑیوں کو سلیم ملک نے پیسوں کی پیشکش کی۔ ایوان صدر کی ایک پارٹی کے اندر بھی ایسا ہوا اور ان کی ہمت دیکھیں اور چار آسٹریلین پلیئر قسم کھا کر کہہ رہے تھے تو کیا وجہ ہے کہ میں ان پر یقین نہ کروں۔

سوال: آپ جج ابن جج ہیں، آپ کے والد جسٹس ملک اکرم بھی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج رہے، آپ کو وہ کیا نصیحت کرتے تھے، آپ کہاں پڑھے اور آپ کی تربیت کیسی رہی؟

قیوم ملک: میں لاہور کے ایک انگلش میڈیم سکول جارج میکڈونلڈ میں پڑھا، جہاں تک میرے والد کی بات ہے تو وہ ڈسپلن کے سخت پابند تھے، آج کل صورتحال مختلف ہے، والدین کی بچوں سے دوستی ہوتی ہے مگر ماضی میں اس طرح نہیں ہوتا تھا، ہم اپنے والد سے بہت گھبراتے تھے حالانکہ وہ بہت شفیق آدمی تھے مگر ایک حجاب ایسا تھا کہ جب بھی ان سے بات کرنی ہوتی تھی، والدہ کے ذریعے ہی کرتے تھے، ہم میں ہمت نہیں تھی کہ ہم ان سے کوئی چیز مانگ لیں یا کچھ کر لیں، والد سے احترام کا رشتہ تھا۔

سوال: احترام تھا یا خوف تھا؟

قیوم ملک: خوف بھی سمجھ لیں، کچھ چیزیں آج کے زمانے کی اچھی ہیں اور کچھ اس وقت اچھی تھیں، احترام کی حد تک بات اچھی تھی اور خوف زدہ ہونے کی بات درست نہیں، ہم پہ خوف نہیں تھا لیکن اب یہ معاملہ الٹ ہو گیا ہے، احترام ختم ہو گیا ہے اور خوف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال: میٹرک کب کیا؟

قیوم ملک: مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے صرف 12 سال کی عمر میں میٹرک کر لیا تھا اور ساڑھے اٹھارہ سال کی عمر میں وکیل بن گیا تھا، اس لیے جن لوگوں کو میری عمر کا علم نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ میری عمر بہت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے میری عمر 58 سال ہے، بی اے اور ایل ایل بی کے بعد میں انگلینڈ ایل ایم کرنے کے لئے گیا لیکن وہاں ایک ماہ سے زیادہ گزار سکا اور اداس ہو کر واپس آ گیا۔

سوال: بیرون ملک جا کر دل کیوں نہیں لگا؟

قیوم ملک: میں نے لنکنز ان میں داخلہ لیا لیکن ہماری تربیت بڑےPROTECTED ماحول میں تھی، کبھی اکیلے گھر سے باہر تک نہیں نکلے تھے اور پھر یکدم اجنبی ماحول میں انگلینڈ بھیج دیا گیا، میرا وہاں دل نہیں لگا، شاید اسی میں خدا تعالیٰ کی کوئی بہتری تھی۔

سوال: بچپن میں کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے؟

قیوم ملک: مجھے بچپن میں کتابیں پڑھنے کا ہمیشہ سے بہت شوق تھا، لٹریچر سے لے کر جاسوسی دنیا تک سب چیزیں پڑھتے تھے، سپورٹس سے مجھ بے حد لگاؤ تھا، ابن صفی کی جاسوسی کہانیاں پڑھتا تھا۔

سوال: سکول اور کالج کے زمانے میں سپورٹس میں حصہ لیا؟

قیوم ملک: کرکٹ بہت دیر تک کھیلی، کالج اور پھر لاء کالج کی طرف سے بھی کھیلی، ٹینس بھی کھیلتا رہا، اس کے بعد بہت عرصہ گولف کھیلتا رہا، اس میں میں پنجاب کا امیچور چیمپئن تھا، آج بھی مجھے اسپورٹس کا اس حد تک شوق ہے کہ اگر کرکٹ میچ چاہے جنوبی افریقہ اور ویسٹ انڈیز کا ہو رہا ہو اور رات کو دو بجے بھی ٹی وی پر آئے تو میں وہ بھی دیکھتا ہوں، میری بیوی کہتی ہے پتہ نہیں اس کو کیا ہوا ہے، آرام سے سوتا بھی نہیں۔

سوال: بچپن میں کیا خواب دیکھتے تھے، کیا بننا چاہتے تھے؟

قیوم ملک: میں شروع سے ہی وکیل بننا چاہتا تھا، اپنے والد کو دیکھ کر یہی خواہش کرتا تھا، اپنی مرضی سے وکیل بنا ہوں، کسی مجبوری کے تحت نہیں بنا۔

سوال: کیا جج اپنی چوائس پر بنے؟

قیوم ملک: اگر میں آپ کو سچ بتاؤں تو آپ کہیں گے میں اپنی تعریف کر رہا ہوں مجھے جج بننے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ مجھے علم تھا کہ انہیں کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں اس ماحول میں کیا کیا ہوتا ہے اور کس طرح آپ جج بن کر اکیلے ہو جاتے ہیں مگر میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں جج بنوں۔

سوال: آپ کہہ رہے ہیں کہ بندہ جج بن کر اکیلا ہو جاتا ہے ایسا کیوں؟

قیوم ملک: اکیلا ہو جانا چاہیے میرے خیال میں تو جج کو سماجی تقریبات میں بھی نہیں جانا چاہیے۔ البتہ میں اکیلا نہیں ہوا کیونکہ یار دوست مہربانی کرتے رہے جہاں تک اکیلا ہونے کی بات ہے آپ بطور جج میری سماجی زندگی کو دیکھیں تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اب میں کہیں کہیں شادیوں پر جانے لگا ہوں۔

سوال: کیا بطور جج سماجی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے؟

قیوم ملک: عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہاں ضرور جانا چاہیے، کیونکہ آپ دنیا تو نہیں چھوڑ

سکتے۔ دوسرا جو سماجی تقریبات ہیں۔ ان میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدلیہ کے ضابطہ اخلاق میں یہ درج ہے کہ جج اپنے آپ کو کم Expose کریں کیونکہ زیادہ ملنے سے لوگوں کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ میں آپ کو ایمانداری سے بتاؤں جو اچھا جج ہے اس کے پاس وقت ہی نہیں ہے کہ وہ کہیں اپنے گھر سے باہر جا سکے۔ میں آپ کو جج کی Typical life بتاؤں مثلاً لوگ کہتے ہیں میرے پاس لمبی لمبی فہرستیں ہوتی تھیں۔ میرے پاس پچاس سے لے کر سو کیس روزانہ ہوتے تھے۔ اگر میں نے گھر پر رات کو ان کیسز کو پڑھا نہ ہو تو صبح ڈسپوزل ہی نہیں ہو سکتی یا پھر میں وکیلوں کے رحم و کرم پر رہ جاتا۔ اس لیے میری عادت تھی کہ میں پڑھ کر جاتا تھا اگر ایک کیس پڑھنے میں آپ دس منٹ لگائیں تو پچاس فائلیں دیکھنے کے لئے کتنے منٹ لگیں گے؟ میرے پاس ٹائم کہاں ہوتا تھا سونا کھانا بھی ضروری ہے۔ میرے بچے بھی ہیں میرے پاس ٹائم کہاں تھا ایک وکیل کے طور پر آپ کو سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ وکیل اور جج کی زندگی میں فرق ہی یہی ہے۔ جج کو اپنے آپ پر خود پابندیاں لگانی پڑتی ہیں بدقسمتی سے آج کل بعض جج ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ میرے والد جج ہوتے تھے تو جج ہونا ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس وقت ہائیکورٹ کے صرف اٹھارہ انیس جج ہوتے تھے۔ جب میں جج ہوا تو کافی حالات خراب ہو چکے تھے۔

سوال: اب کیا حالات ہیں؟

قیوم ملک: دیکھیے میرا عدل کے پیشے سے گہرا تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ میرے والد اور میرے بچے دونوں اس پیشے سے ہیں۔ میں اپنی مرضی سے جج بنا اگر میں کچھ بھی نہ کرتا تو اپنی زمینوں میں بیٹھا رہتا اپنے ماموں کی طرح زمینداری کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ میرے دو بیٹے وکالت میں ہیں۔ وہ دنیا میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ مگر دونوں وکیل بنے میری حال ہی میں صدر مشرف سے ملاقات ہوئی جسے لوگوں نے متنازعہ بنا دیا ہے جب میں نے بڑی بڑی باتیں کیں تو صدر نے کہا آپ کو علم ہے کہ معاشرے میں وکیلوں کی کیا عزت ہے۔ میں خاموش رہا لیکن مجھے دل میں تو پتہ تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب میری کوششوں سے ہوا ہے وگرنہ وکیل اور صحافی کو تو کوئی بینک کریڈٹ بھی نہیں دیتا تھا۔

سوال: زمانہ طالب علمی میں پسندیدہ مضمون کون سا تھا؟

قیوم ملک: اس زمانے میں ریاضی میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ میری ہینڈ رائٹنگ بہت بری تھی اور میں خود بھی اپنا لکھا نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اب بھی اگر مجھے آپ ایک صفحہ دے دے اور کچھ دیر کے بعد مجھ سے پوچھ لیں کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ تو کئی لفظ مجھے بھی سمجھ نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت مشکل

ہوتی تھی۔ میتھ میں لکھنا کم پڑتا تھا اس لئے مجھے میتھ پسند تھی۔

سوال: ناپسندیدہ مضمون کون سا تھا؟

قیوم ملک: ناپسند کوئی بھی نہیں تھا، اردو نثر سے شاعری زیادہ پسند تھی۔ اردو شعراء میں غالب بہت پسند تھے۔ غالب بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا خودی پر بہت کام ہے۔ میں احمد فراز کا فین ہوں۔ پروین شاکر اپنے وقت کی اچھی شاعرہ تھیں۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں احمد فراز کو بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمٰی کے دور میں ادبی اکیڈیمی کا سربراہ بنایا۔ حکومت تبدیل ہوئی تو نواز شریف آ گئے۔ وہ بھی بادشاہ آدمی تھے۔ انہوں نے احمد فراز کو ہٹا دیا تو احمد فراز نے رٹ کر دی۔ جسٹس محبوب اور میں نے اپیل سنی میں نے جسٹس محبوب کو کہا کہ اسے ضرور سٹے دینا ہے۔ انہوں نے کہا کیوں، میں نے کہا یہ شاعر بہت اچھا ہے۔ جسٹس محبوب میری سنتے بھی تھے۔ ہم نے سٹے دے دیا۔ بعد میں جسٹس محبوب مجھ سے ناراض ہوئے تو کہا کہ احمد فراز تو مذہب کے خلاف ہیں۔ میں نے کہا میں نے کب کہا تھا کہ احمد فراز مولوی مودودی ہیں؟ میں نے تو کہا تھا کہ وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور اب بھی اچھی شاعری کر رہے ہیں۔

سوال: آپ فلمیں دیکھتے ہیں؟

قیوم ملک: فلم دیکھنے کی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ اگر کبھی رشتہ دار خالہ یا ماموں لے جاتے تو اس طرح اجازت مل جاتی تھی ورنہ اکیلے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب بھی ہم ریڈیو پر گانے سنتے تو والد صاحب کہتے کہ یہ تم نے کیا لگایا ہوا ہے تو ہم ڈر جاتے تھے۔ والد صاحب کہتے تھے یہ ناچ بند کرو اب یہ ماحول ہو گیا ہے کہ میں پچھلے دنوں دوبئی گیا تو اپنے بیٹے کے لئے میوزیکل انسٹرومنٹ لے کر آیا۔ سارے دوبئی میں ڈھونڈتا پھرا میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ دیکھو وقت کتنا بدل گیا ہے۔

سوال: دنیا کی سب سے خوبصورت عورت کہاں دیکھی؟

قیوم ملک: مجھے تو اپنی بیوی دنیا کی خوبصورت ترین عورت لگی ہے، (قہقہہ) ان کے علاوہ میں نے کسی کو اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں۔ میری بیوی کافی خوش شکل ہے میں جھوٹ بھی نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں ایک بار میرے دوست جسٹس راشد عزیز نے جب وہ ایڈووکیٹ جنرل تھے میرے پاس ایک عورت کا کیس بھیجا، بعد میں وہ عورت ان سے ملی تو اس نے راشد عزیز کو کہا کہ مجھے لگتا ہے ملک قیوم کی آنکھوں میں کچھ نقص ہے۔ شاید اسی لئے اس نے سر تک اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔

سوال: شادی پسند کی ہونی چاہیے یا والدین کی مرضی سے؟

قیوم ملک: میری شادی تو ارینجڈ تھی میں نے اپنی بیوی کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہیں تھا۔

وہ مصوری کرتی ہیں۔ان کے والد چودھری محمد حسین سخت گیر پولیس آفسر تھے۔ان سے رشتہ بھی اللہ کی دین ہے۔شادی سے پہلے میری بیوی نے شاہ فیصل کی پاکستانی ڈریس میں تصویر بنا کرسعودی عرب بھیجی۔شاہ فیصل کو یہ تصویر اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے ان کے سارے خاندان کو بطور شاہی مہمان سعودی عرب مدعو کیا۔انہی دنوں میرے والدین بھی سعودی عرب حج کے لئے گئے ہوئے تھے میری والدہ کو یہ پسند آ گئیں۔اس لیے میری والدہ میری بیوی کو کہتی تھیں تمہیں تو میں اللہ کے گھر سے لے کر آئی ہوں۔میری بیوی کی خاص بات یہ ہے کہ انہیں اللہ کی مخلوق سے پیار ہے غریبوں کی مدد کرتی ہیں۔ اس لیے اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے۔وگرنہ کئی لوگ تو سمجھتے تھے کہ یہ جج سے ہٹے گا تو ختم ہو جائے گا لیکن ہم اللہ کی مخلوق سے پیار کرتے ہیں اور اللہ ہم سے پیار کرتا ہے۔

سوال: میاں بیوی میں لڑائی کن باتوں پر ہوتی ہے؟

قیوم ملک: بس ہو جاتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا جب لڑائی ہوتی ہے تو میں آگے سے کچھ بولتا ہی نہیں خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔زیادہ تر اس بات پر ہوتی ہے کہ آپ گھر کو ٹائم نہیں دیتے۔شخصیتوں کا تضاد بھی ہوتا ہے میری بیوی Perfectionist ہیں میز پر چھریاں رکھنی ہوں تو وہ بھی بڑی ترتیب سے رکھیں گی جب کہ میرا حال یہ ہے کہ میں سوٹ پہنے ہوئے آتا ہوں تو جوتوں سمیت بستر میں گھس جاتا ہوں۔ان باتوں پر انہیں سخت اعتراض ہوتا ہے۔دراصل مجھے شروع ہی سے اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے۔میری بیوی کہتی ہے کہ تم کپڑے اچھے اور مہنگے خرید لیتے ہو تمہیں پہننے کا پتہ نہیں ہے۔میں اسے کہتا ہوں کہ میں نے کپڑے اپنی آسائش کے لئے پہنے ہیں۔میں انہیں عذاب کیوں بنالوں (قہقہہ)

سوال: کیا فوج کا کوئی سیاسی کردار ہونا چاہیے؟

قیوم ملک: فوج کا کام صرف بارڈر کی حفاظت کرنا ہے۔وہ ہمارے محافظ ہیں۔یہ ان کا کام نہیں ہے۔جو وہ کر رہے ہیں اس لیے فوج کا بالکل کوئی سیاسی کردار نہیں ہونا چاہیے۔

انٹرویو جنوری 2006ء (مطبوعہ) جون 2007 (غیر مطبوعہ)

اشاعت: 5 فروری 2006

جنگ سنڈے میگزین

جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ

دنیا کے ہر خطے کی طرح پنجاب کے دامن پر بھی بہت داغ ہیں دوسرے صوبوں کے رہنما اور کئی تاریخ دان یہ الزام لگاتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ جرأت منداور بہادر نہیں ہیں۔ ان کے اس الزام میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ یہ تو آنے والا وقت ہی طے کرے گا۔ لیکن حالیہ عدالتی بحران میں پورے ملک سے ایک جج نے استعفیٰ دیا اور وہ لاہور ہائی کورٹ کے پنجاب سے تعلق رکھنے والے جسٹس جواد ایس خواجہ تھے شاید یہی وجہ تھی کہ سندھی قوم پرست رسول بخش پلیجو کو یہ کہنا پڑا کہ عدالتی بحران میں پنجاب کے مضبوط مؤقف نے ماضی کے کئی داغ دھو دیئے ہیں۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کا فیصلہ کرنے والے پنجابی ججوں نے تو اب عدلیہ کے دامن پر داغ دھو دیئے ہیں اور اب شاید ماضی میں پنجابی ججوں سے ہونے والی غلطیوں کا کچھ نہ کچھ مداوا ضرور ہو جائے، عدلیہ کا جرأت مندانہ کردار ایک طرف لیکن بارش کا پہلا قطرہ جسٹس جواد ایس خواجہ ہی بنے تھے جس کا کریڈٹ انہیں ہی حاصل رہے گا۔

جسٹس جواد ایس خواجہ بہت ہی پرائیویٹ شخص ہیں وہ شہرت کی دنیا سے دور بھاگتے ہیں شاید اسی لئے انہوں نے استعفیٰ دینے کے بعد نہ تو کوئی انٹرویو دیا اور نہ ہی نمایاں ہونے کی کوشش کی۔ کوئی اور جج ایسا بہادرانہ کام کرتا تو بجا طور پر وہ جلوسوں کی رہنمائی کر رہا ہوتا جلسوں کی صدارت کر رہا ہوتا یا پھر کم از کم اخبارات اور ٹی وی کو انٹرویو تو دے رہا ہوتا لیکن جسٹس جواد ایس خواجہ اپنی درویش طبیعت کے باعث ان سب چیزوں سے دور رہے انہوں نے چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کو اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کیا اور یوں استعفیٰ دے کر وہ اس بوجھ سے آزاد ہو گئے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ سے انٹرویو اور گفتگو انتہائی مشکل کام تھا سب کو علم ہے کہ وہ انٹرویو نہیں دیتے میرے ایک دوست نے میرا ان سے زوردار تعارف کروایا جھوٹی سچی تعریفیں بھی کی ہوں گی یوں میں ان کے پاس جا پہنچا لمبی گفتگو کے بعد طے ہوا کہ اگر تحریری سوال ہوں اور پھر ان کے تحریری جواب ان سے لے کر تیار کر کے انہیں دکھائے جائیں تو انٹرویو ہو سکتا ہے۔ میں نے ہر شرط کو مان لیا۔ تاہم بعد ازاں جب گفتگو چل نکلی تو پھر انہوں نے انٹرویو ریکارڈ کرنے کی اجازت بھی دی لیکن شرط وہی تھی کہ انہیں دکھا کر شائع کیا جائے۔

جسٹس جوادایس خواجہ کافی منفرد اور مختلف ہیں ان کا گھر پاکستان کا شاید وہ واحد گھر ہوگا جس کے باہر ان کی بیگم بینا کا نام پہلے اور ان کا نام بعد میں لکھا ہے جوادایس خواجہ کے القاب و خطاب بھی نہیں لکھے۔ یوں گھر کے اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے کہ یہاں مرد اور عورت برابر ہیں۔ ان کا گھر ایک کمیون کی طرح ہے جہاں کے ملازم بھی گھر کے فرد ہی محسوس ہوتے ہیں۔

جسٹس جوادایس خواجہ سے گفتگو میں جہاں عدالتی بحران پر گفتگو ہوئی وہاں ان کی شخصیت ان کے آئیڈیل جسٹس کارنیلیس اور دیگر پہلوؤں پر بھی بات ہوئی اور دیگر پہلوؤں پر بھی بات ہوئی۔ اس منفرد شخص نے پنجاب کی دھرتی کا مان رکھا۔ آیئے اس کے خیالات پڑھیں۔

اہم نکات

☆ عدلیہ کے بحران سے کئی سالوں بعد نئی سیاسی قیادت مل سکتی ہے۔

☆ ۹ مارچ کو یہ تاثر ملا کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو ہٹایا جا سکتا ہے تو میں کیا چیز ہوں۔

☆ اندرونی دباؤ اتنا تھا کہ کام نہیں کر پا رہا تھا اِس لئے استعفیٰ دے دیا۔

☆ جج بنا ہی اِس لئے تھا کہ بطور جج میرے فرائض کی ادائیگی میں کوئی بھی دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ سپریم جوڈیشل کونسل بھی کسی شکایت پر محض inquiry کر سکتی ہے۔

☆ پی سی او کے تحت حلف اٹھا کر غلط کیا تھا۔

☆ اگر سپریم کورٹ کا جج ہوتا تو استعفیٰ دینے کی بجائے اپنا رول نبھاتا۔

☆ اگر ہائی کورٹ کے جج کوئی اجتماعی فیصلہ کر لیتے تو میں استعفیٰ نہ دیتا۔

☆ ہیرو بننے کے لئے مستعفی نہیں ہوا۔

☆ جج کا یہ کام نہیں کہ وہ دیکھے کہ اُس کے فیصلے کے نتائج کیا نکلیں گے۔

☆ فیصلوں کے نتائج کو دیکھنا انتظامیہ کا کام ہے، عدلیہ کا نہیں۔

☆ میں نے جذبات میں نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر استعفیٰ کا فیصلہ کیا۔

☆ بطور جج میرے پاس آئینی مقدمات نہیں بھیجے جاتے تھے۔

☆ جج کو سرکاری تقریبات میں نہیں جانا چاہیئے۔

☆ جج خود نہ چاہے تو کوئی بھی اُسے اپروچ نہیں کر سکتا۔

☆ یہ مفروضہ غلط ہے کہ آپ عدلیہ کے اندر رہ کر بھی اپنا رول نبھا سکتے ہیں۔

☆ میں نے آٹھ سالہ ججی میں کبھی دباؤ محسوس نہیں کیا۔

☆ تعلیم اور سماجی انصاف ملک کے بنیادی مسائل ہیں۔

☆ میرے آئیڈیل جج، جسٹس کارنیلیس تھے جو ایمانداری اور سادگی کا پیکر تھے۔

انٹرویو

سوال: قانون اور انصاف کے حوالے سے وہ کون سی شخصیات ہیں جن سے آپ متاثر ہوئے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ مجھے جسٹس کارنیلیس کے ساتھ کام کرنے اور انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جسٹس اے آر کارنیلیس کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ اُن میں کوئی پیچ وخم نہیں تھا۔ وہ سیدھی سمت میں چلتے تھے اور مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے۔ اُن میں ایک جینوئن عاجزی تھی۔ اُن کی زندگی بھی سادہ تھی۔ 1951 سے فلیٹیز ہوٹل میں مقیم رہے اور دونوں میاں بیوی سالہا سال وہیں رہتے رہے۔ مجھے یاد ہے، 80 کی دہائی میں، میں اُنہیں کرسمس کی مبارکباد دینے گیا تو وہاں جسٹس نسیم حسن شاہ بھی آ گئے، جسٹس کارنیلیس نے میرا جسٹس نسیم حسن شاہ سے تعارف کرایا تو جسٹس نسیم حسن شاہ نے کہا کہ اچھا یہ وہ جواد خواجہ ہیں جو آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو جسٹس کارنیلیس نے فوراً جواب دیا کہ نہیں میں اِن کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اُن کا میرے ساتھ تعلق اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے اپنی وصیت پر عمل درآمد کروانے والے شخص یعنی executor کے طور پر میرا نام لکھا۔ آخری سالوں میں (1979 - 1991) مجھے اُن کا بہت قرب حاصل رہا۔ جسٹس کارنیلیس سات آٹھ سال تک متحدہ پاکستان کے چیف جسٹس رہے لیکن اُن میں سادگی اور انکساری تھی، خودنمائی اور اپنی projection میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں اور کارنیلیس صاحب پارٹنرز بھی رہے ہیں۔ ایک اور واقعہ ان کی سادگی کا یوں ہے کہ ہمارا منشی ایک چٹھی لے کر آیا، جسے دیکھ کر وہ پریشان سا تھا۔ لاہور کے خزانہ افسر نے کارنیلیس صاحب کے نام چٹھی لکھی تھی کہ وہ اُس کے سامنے پیش ہوں اور ثابت کریں کہ ابھی زندہ ہیں۔ غالباً پینشن کا معاملہ تھا، میں نے وہ چٹھی دیکھی تو میں بھی کافی برہم ہوا کیونکہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ کارنیلیس صاحب جب دنیا سے جائیں گے تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔ اور پھر ایسی ہستی کو اس طرح کی چٹھی بھی غیر مناسب تھی۔ میں ہچکچاتا ہوا وہ چٹھی لے کر کارنیلیس صاحب کے پاس گیا اور ان کو دکھائی، اُنہوں نے مجھے کہا کہ مائی ڈیئر جواد! ناراضگی کی کوئی بات نہیں، وہ شخص تو اپنے سرکاری فرائض نبھا رہا ہے۔ پھر اُنہوں نے دو چٹھیاں لکھیں اُن میں سے ایک چٹھی سپریم کورٹ کے رجسٹرار کے نام تھی اور اُس میں لکھا تھا کہ میں اپنا نمائندہ بھیج رہا ہوں، اُس کو ایک سرٹیفکیٹ جاری کر دیں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ دوسرا خط اُنہوں نے خزانہ افسر کو لکھا کہ میں یہ سرٹیفکیٹ بھجوا رہا ہوں

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں زندہ ہوں۔

I do hope this satisfies your requirements

پھر اُنہوں نے لکھا:

"If this does not meet your requirements, please inform me of the date and time when I should appear before you in person"

(اگر یہ چٹھی آپ کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو براہِ کرم مجھے تاریخ اور وقت سے آگاہ کردیں، میں خود ذاتی طور پر آپ کے سامنے حاضر ہو جاؤں گا)

اُن کی ہر بات سے عجز جھلکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جسٹس کارنیلیس کا میری زندگی پر گہرا اثر ہے۔ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن اُسکے باوجود اُن میں کوئی نمود ونمائش نہیں تھی اور وہ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ بعد میں جسٹس صمدانی سے بھی قریبی تعلقات پیدا ہوئے، اُنکی شخصیت نے بھی مجھے متاثر کیا۔

سوال: کارنیلیس صاحب کتنے ایماندار تھے؟

جسٹس جوادایس خواجہ: اُن کے بارے میں ایسا سوال کرنا ہی تکلیف دہ ہے کیونکہ اُن میں لالچ اور حرص نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

سوال: کارنیلیس صاحب مشہورِ زمانہ مقدمات جیسے مولوی تمیزالدین کیس، اُن کے حوالے سے کیا کہتے تھے؟

جسٹس جوادایس خواجہ: میری اِس حوالے سے اُن سے کبھی بات نہیں ہوئی۔

سوال: آپ کی نظریہ ضرورت کے حوالے سے کیا رائے ہے؟

جسٹس جوادایس خواجہ: (تھوڑا سوچنے کے بعد) میرے خیال میں اِس کے بارے میں کافی کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اور میں اِس پر مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا، چونکہ ہم کارنیلیس صاحب کی بات کررہے ہیں تو کئی لوگ اُن کے جنرل یحییٰ خان کی کابینہ میں وزیر بننے پر اعتراض کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اُن کی تنقید میں کچھ وزن ہو لیکن چونکہ میں جسٹس کارنیلیس صاحب کو جانتا ہوں مجھے علم ہے کہ اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ نیا آئین بنے اور ایسا آئین بنے جو عوام کی خواہشات پر پورا اترے، یہ الگ بات ہے کہ جو آئین بنا وہ خفیہ ہی رہا اور اسے روشنی نصیب نہ ہوسکی، یہ بھی نہیں پتا کہ اُس آئین کی کوئی کاپی اب موجود بھی ہے یا نہیں۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ اور تعلیم کہاں حاصل کی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں 1950 میں وزیر آباد میں پیدا ہوا اور سترہ سال تک وہیں رہتا رہا، ابھی بھی ہمارا گھر وہیں ہے۔ میرے بڑے بھائی خواجہ عمر وہاں ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے بہت تھوڑے عرصے کے لئے میں وہاں مشن سکول میں پڑھا۔ پھر لارنس کالج مری میں چار سال رہا، پھر ایچی سن کالج سے 1967 میں سینئر کیمبرج کیا۔ ایف سی کالج سے ایف اے اور بی اے کیا، یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کیا اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا (برکلے) سے میں نے 1975ء میں ایل ایل ایم کیا، پھر واپس آ کر میں نے بطور ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پریکٹس شروع کی۔

سوال: کتنے سال پریکٹس کی اور کتنے سال جج رہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: 1975ء سے 1999ء تک چوبیس سال پریکٹس کی اور پھر 1999ء سے 2007ء تک آٹھ سال بطور جج لاہور ہائی کورٹ فرائض انجام دیئے۔

سوال: والدین کا آپ کی شخصیت پر کیسا اثر پڑا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں سمجھتا ہوں کہ بہت گہرا اثر پڑا، گھر میں مادی چیزوں کی اہمیت نہیں تھی، اصل چیز انسانیت تھی۔ یہ چیز بتائی نہیں جاتی مگر آپ خود بخود اس کو اختیار کر لیتے ہیں، یہ ایک اہم اثر تھا اور اب بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں اب بھی یہی قدر پائی جاتی ہے۔

سوال: زمانہء طالب علمی میں کھیلوں سے دلچسپی تھی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: سکول میں ساری سپورٹس کھیلی ہیں، سوئمنگ تو میں اب بھی کرتا ہوں، لیکن اُس زمانے میں ٹینس اور ہاکی کھیلی، فٹ بال، باسکٹ بال کھیلا اور رائڈنگ کی۔

سوال: بچپن میں کبھی جج بننے کا خواب دیکھا تھا، یا وکیل بننے کا سوچا تھا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (ہنس کر) نہیں، مگر اِس حوالے سے ایک دلچسپ بات بتانا چاہتا ہوں، وزیر آباد میں ہمارا ایک صفائی کرنے والا لال دین تھا، وہ مجھے جج صاحب کہتا تھا، مجھے نہیں پتا یہ اُس کے ذہن میں کیوں آیا، لیکن میں نے بچپن میں کبھی جج بننے کا نہیں سوچا تھا۔

میرے وکیل بننے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ وزیر آباد میں میرے والد صاحب کو ایک امریکن بزنس کے سلسلے میں ملنے آیا، میں اُس وقت وہاں نہیں تھا لیکن میرے والد صاحب نے مجھے بتایا کہ اُس امریکن کے سات یا آٹھ بیٹے بیٹیاں تھے، والد صاحب نے اُس سے اُن کی تعلیم کے بارے میں پوچھا اور یہ کہ وہ کیا کرتے ہیں تو اُس نے بتایا کہ اُس نے سب کو تاکید کی کہ law پڑھیں، دو تین سال پریکٹس کریں اور اُس کے بعد جو جی میں آئے وہ کریں۔ اُس امریکن کی یہ بات میرے والد صاحب

کو بہت اچھی لگی اور اُنہوں نے مجھے بھی قانون پڑھنے کی تلقین کی۔ اِس طرح میں نے law پڑھا۔

سوال: آخر برکلے میں ہی تعلیم کیوں حاصل کی؟ بھٹو صاحب بھی تو برکلے یونیورسٹی میں پڑھتے رہے تھے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ: ایک وجہ یہ تھی کہ اچھی یونیورسٹی تھی، بھٹو صاحب والی بات کا تو اِس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن مجھ سے پندرہ سال پہلے میری بڑی ہمشیرہ نے 1960 میں برکلے سے ماسٹرز کیا تھا، برکلے سے ایک پرانا تعلق تھا اور اُسی وجہ سے میں کارنیل یونیورسٹی میں داخلہ ہونے کے باوجود وہاں نہیں گیا تھا، ویسے بھی کیلی فورنیا کا موسم خوشگوار ہوتا ہے، کارنیل جانا مجھے زیادہ appeal نہیں کیا۔

سوال: زمانہ طالب علمی میں آپ کا پسندیدہ مضمون کونسا تھا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: کوئی خاص فیورٹ نہیں تھا۔

سوال: کوئی ٹیچر یاد ہے آپ کو؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میرے ٹیچرز بہت اچھے تھے اور مجھے یاد بھی ہیں، اُن میں سے ایک ہمارے تاریخ کے استاد تھے چوہدری رحمت اللہ صاحب، اُس وقت تو احساس نہیں تھا مگر اب میں سوچتا ہوں کہ وہ کافی منفرد تھے، شاید وہ اُس وقت کسی مقام پر پہنچ چکے تھے۔

سوال: روحانی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: جی ہاں

سوال: کیا آپ روحانیت پر یقین رکھتے ہیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: روحانیت سے پتا نہیں آپ کا کیا مطلب ہے، ہم مادی زندگی میں اتنے زیادہ پھنس جاتے ہیں کہ ہم اِسی زندگی کو ہی واحد حقیقت سمجھتے ہیں۔ ہماری زندگی کی ایک اور dimension بھی ہے۔ لیکن میں اِس کے لئے کوئی اصطلاح استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اِس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ experiential چیز ہے۔

سوال: کیا آپ اِس تجربے سے گزرے ہیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (ایک لمحے کو رک کر) میرے خیال میں اس پر کچھ کہنا مناسب نہیں۔

سوال: کیا آپ بچپن میں شرارتی تھے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (مختصر سا قہقہہ لگا کر) نہیں، کوئی خاص نہیں، نہ زیادہ سنجیدہ، بس ایک نارمل بچپن۔

سوال: کیا فلمیں دیکھتے تھے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: ہاں، پر زیادہ نہیں۔ اُس وقت ویک اینڈ پر سکول والے بھی ایک فلم دکھاتے تھے، اتوار کو چھٹی ہوتی تھی تو جا کر فلم دیکھ لیتے تھے، میرے کچھ دوست مجھ سے زیادہ فلمیں دیکھتے تھے اور کچھ بالکل نہیں دیکھتے تھے، میں اُن کے درمیان درمیان تھا۔

سوال: پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک کے حالات آپ نے دیکھے ہیں اور بیرونی ممالک کے دورے بھی آپ نے کئے ہیں، کیا سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (کافی دیر سوچنے کے بعد) چند بنیادی مسائل ہیں۔

سوال: بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ اگر عدلیہ ٹھیک ہو جائے تو ملک ٹھیک ہو جائے گا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میرے نزدیک تعلیم اور انصاف بنیادی مسائل ہیں اور انصاف میں لیگل اور سوشل دونوں طرح کا انصاف۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ اہمیت اِن دونوں شعبوں کو دینی چاہیے۔ اور باقاعدہ تعلیم، صرف خواندگی نہیں۔ ہر بچے کو یکساں معیار کی تعلیم ملنی چاہئے، کوئی امتیاز یا تفریق نہیں ہونی چاہئے، ہمارا روایتی ادب بھی نصاب میں شامل ہونا چاہئے، اب دیکھیں جیسے کہ ایچی سن کالج اشرافیہ کا سکول تھا جہاں انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی لیکن اُس وقت وہاں فارسی اور عربی بھی پڑھاتے تھے، اب یہ نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ ہم نے شیخ سعدی کو پڑھا، گلستان میں جو حکایات ہیں، اُن کی افادیت تو ہر وقت کے لئے ہے اور اب اگر آپ ذکر کریں تو بچے پوچھتے ہیں کہ شیخ سعدی کون تھے۔

سوال: پاکستان کے کس شعبے سے مطمئن ہیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (سوچتے ہوئے) ابھی ذہن میں نہیں آرہا۔

سوال: اس کا مطلب ہے کوئی نہیں ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: مجھے سوچنے دیں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ابھی بھی ڈاک کا نظام ٹھیک چل رہا ہے، خط ڈالیں تو اگلے دن یا دو دن بعد پہنچ جاتا ہے لیکن عمومی طور پر باقی سب شعبوں میں زوال آیا ہے۔

سوال: آپ کا کبھی کسی سیاسی جماعت سے تعلق رہا ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: نہیں، ابھی تک تو نہیں۔

سوال: کسی سیاسی شخصیت سے متاثر ہیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: کم عمری میں ایوب خان کو اچھا سمجھتا تھا اور اُس کی وجہ والد صاحب

کی ایوب صاحب کے حوالے سے پسندیدگی تھی لیکن جوں جوں میں بڑا ہوا، میں نے محسوس کیا کہ نہیں۔ حسین شہید سہروردی کے بارے میں جو پڑھا اور سنا اُس نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حالیہ عدلیہ کے بحران کے نتیجے میں شاید کوئی بہتر لیڈر شپ سامنے آئے۔ اِس بحران کے فوراً بعد نہ سہی لیکن چار پانچ سالوں کے اندر تو یقیناً بہتر لیڈر شپ آئے گی، یہ میری توقع ہے۔

سوال: آپ کیا سمجھتے ہیں عدلیہ یا جج پاکستان میں کیوں آزاد نہیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں نے جج کے طور پر آٹھ سال کام کیا ہے۔ 9 مارچ سے پہلے تک میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں آزاد نہیں، اِس آٹھ سال کے عرصے میں نہ تو مجھ پر کسی نے دباؤ ڈالا اور نہ ہی کسی شخص نے اپروچ (approach) کرنے کی کوشش کی۔ میں اگر خود کو پابند کرلوں اور غیر آزاد بنالوں تو یہ کسی کا قصور نہیں۔ جج کا کام تو بہت ہی سیدھا اور آسان ہے، اُس کو کیس کے حقائق دیکھنے ہیں اور قانون کے مطابق فیصلہ دینا ہے۔

سوال: آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ جج کو نتائج کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: یقیناً نہیں، یہ تو جج کا کام ہے ہی نہیں، جج کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ دیکھے کہ کیس کے حقائق کیا ہیں اور قانون کیا کہتا ہے، بس اُس کے مطابق فیصلہ کردے۔

سوال: جسٹس نسیم حسن شاہ کا کہنا ہے کہ جج کو دیکھنا چاہئے کہ کہیں اُس کے فیصلے کے نتیجے میں تباہی تو نہیں آئے گی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: نہیں، میرے نزدیک یہ جج کا کام نہیں ہے، کیس میں حقائق اور قانون کے علاوہ اگر جج اپنے فیصلے میں تیسرا عنصر شامل کرتا ہے تو وہ غلط ہے، بالکل غلط ہے، کیونکہ کیس کے حالات جج نے پیدا نہیں کئے ہوتے۔ اُس نے بطور امپائر (umpire) واقعات اور قانون کی روشنی میں اپنا فیصلہ صادر کرنا ہوتا ہے۔

سوال: مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی سوچ کے برخلاف عدلیہ نے کام کیا ہے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ: اگر آپ کسی خاص مقدمے کا ذکر کریں تو شاید میں اُس پر تبصرہ کرسکوں۔

سوال: تمام اہم سیاسی فیصلے، جیسے مولوی تمیز الدین، ڈوسو کیس، یہ تمام مقدمات ایسے ہیں جن میں کبھی بھی عدلیہ نے ایسا فیصلہ نہیں دیا جس سے حکومت یا اسٹیبلشمنٹ کو نقصان پہنچے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ: یہ تو جنرلائیزیشن (generalisation) ہے، مگر میرا جواب اب بھی وہی ہے کہ یہ جج کا کام نہیں ہے کہ وہ کیس کے حقائق اور قانون کے علاوہ کوئی تیسرا عنصر اپنے

فیصلے میں شامل کرے۔

سوال: نظریہ ضرورت کے حوالے سے آپ کے کیا تحفظات ہیں؟ جس کا عدلیہ کی تاریخ میں بارہا ذکر ہوا ہے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ: آئین میں ایسے کسی نظریہ کا ذکر نہیں اِس لئے قانونی فیصلوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، جج اور عدالتیں خود آئین کی پیداوار ہیں اُن کے اختیارات بھی آئین میں ہی تحریر ہیں، آئین سے ماورا اُن کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ جیسے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جج کا کام تو بہت آسان اور سیدھا ہے۔

سوال: پاکستان میں صحیح طرح سے جمہوریت نہیں رہی، اِس کی کیا وجہ ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: پہلے تو جمہوریت کی اصطلاح کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اِس کی وضاحت ایک ایسے سسٹم کے طور پر کرتے ہیں جہاں A system where the will of the common people finds exressions. تو اِس کی تاریخی وجوہات ہیں جن میں سب سے اہم میرے نزدیک لیڈرشپ کا فقدان ہے کیونکہ عوام کا جذبہ تو پہلے بھی ظاہر ہوا، برصغیر کی تقسیم کے موقع پر بھی اور آج کل بھی وہ اپنے جذبے اور خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر لیڈرشپ ایسی ہو جس کا ہاتھ عوام کی نبض پر ہو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

سوال: سر، جس دن آپ نے استعفیٰ دیا، اُس دن آپ کے کیا احساسات تھے، کیا سوچ تھی، کیا دباؤ محسوس کر رہے تھے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (ہلکا سا قہقہہ اور پھر سوال کو دہراتے ہوئے) آپ کا سوال ہے کہ میں اُس دن کیا محسوس کر رہا تھا؟ یہ 19 مارچ کا دن تھا مگر جو محسوس کرنے والی بات تھی وہ 9 اور 19 مارچ کے درمیان ہو چکی تھی۔

سوال: ذرا اُس کی بھی تفصیل بتائیں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: 9 مارچ کو جمعہ تھا، ہائی کورٹ میں اگلا ورکنگ ڈے پیر (12 مارچ) تھا، 12 مارچ کو میں حسبِ معمول صبح آٹھ بجے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، مگر اُس دن میں نے محسوس کیا کہ میں کام نہیں کر پا رہا اور نہ ہی اپنے کام پر توجہ دے پا رہا ہوں، اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں نے جج کا منصب قبول کیا تو بنیادی بات میرے ذہن میں یہ تھی کہ بطور جج میرے فرائض کی ادائیگی میں کوئی بھی دخل انداز نہیں ہوسکتا۔ حتیٰ کہ سپریم جوڈیشل کونسل بھی کسی شکایت پر محض inquiry کر سکتی ہے۔ 9 مارچ اور اُس کے فوراً بعد میرا یہ یقین shatter ہوگیا۔ کیونکہ اُن دنوں جو واقعات ہوئے اُن سے

یہ واضح پیغام دیا گیا کہ بطور جج ہائی کورٹ میں کیا چیز ہوں جبکہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے ساتھ اِس طرح کا برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور اُنہیں ایک صدارتی حکم کے ذریعے اپنے فرائض انجام دینے سے روکا جا سکتا ہے۔

سوال: گویا 12 مارچ کو آپ نے کام نہیں کیا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں بہت مضطرب تھا اور کام نہیں کر پا رہا تھا۔ لہذا میں نے عدالت میں موجود وکلاء سے کہا کہ اگر کوئی ایسا کیس ہے جس کا سنا جانا بہت ضروری ہے اور جس کے نہ سنے جانے سے کسی فریق کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ کیس میں سن لوں گا، باقی تمام کیسز کی سماعت میں نے ملتوی کر دی۔ گھر آ کر میں نے اپنی بیوی سے بھی کہا کہ مجھ سے کام نہیں ہو سکتا، اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ عدلیہ میں موجود ہو اور جس پوزیشن پر ہو، آپ لوگوں کو انصاف دے سکتے ہو اور انصاف دے رہے ہو، اِس لئے آپ کو منصب چھوڑنے کی بجائے کام جاری رکھنا چاہئے اور یہ بات بعد میں مجھے چند اور ملنے والوں نے بھی کہی، اِس کے ساتھ ساتھ میری بیوی نے یہ بھی کہا کہ آپ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اِس سوچ کی وجہ کیا ہے، کہیں اِس لئے تو نہیں کہ آپ کوئی بڑا ہیرو بننا چاہتے ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ سبب نہیں ہے، اِس کے باوجود میں نے اُن سے کہا کہ میں دو تین دن اور دیکھ لیتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ اگر آج مجھ سے کام نہیں ہو رہا تو دو تین دن بعد شاید میں دوبارہ کام کر سکوں۔ لیکن پھر بھی مجھ سے کام نہ ہوا۔ جمعرات (15 مارچ) کو میں نے یہ محسوس کیا کہ کچھ کیا جانا چاہئے اور اگر جج صاحبان مل کر کوئی فیصلہ کریں تو وہ زیادہ بہتر ہوگا اور اِس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ اجتماعی استعفے دیں۔ مجھے اندازا تھا کہ لاہور ہائی کورٹ کے تمام 35 جج صاحبان مجموعی طور پر تو شاید کوئی فیصلہ نہ کریں لیکن اگر سات یا آٹھ جج صاحبان مل کر کچھ کریں تو شاید کوئی ایسی صورت نکل آئے اور ایک مشترکہ اقدام تجویز ہو جس سے کچھ جج صاحبان کا مشترکہ ردعمل ظاہر ہو۔ میرے نزدیک یہ بھی کافی تھا اور شاید اِس طرح کے اقدامات سے (catharsis) کیتھارسس ہو جاتا۔ اِس کے باوجود جمعرات (15 مارچ) کو جب میں مختلف آپشنز پر غور کر رہا تھا تو استعفیٰ بھی اُن آپشنز میں شامل تھا، لہٰذا جمعہ (16 مارچ) کو میں نے ایک مختصر خط لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور دیگر جج صاحبان کو بھیجا، اُس میں لکھا تھا کہ جو حالات ہیں اُن میں میرے لئے کام کرنا بہت مشکل ہے، اگلے ورکنگ ڈے یعنی پیر (19 مارچ) کو تمام جج صاحبان کو صبح ساڑھے دس بجے کامن روم میں آنے کی درخواست کی تا کہ حالات پر اظہار خیال ہو سکے، جج صاحبان کو بلانے کا مقصد یہ تھا کہ میری سوچ سے مختلف رائے یا تبصرہ باقی جج صاحبان دے سکیں، لیکن سوموار (19 مارچ) کو چائے کے وقفہ

میں اِس حوالے سے کچھ نہ ہو سکا۔

سوال: افواہیں تو یہی ہیں کہ وہاں ججوں میں جھگڑا ہو گیا تھا، ایک جج نے دوسرے جج سے کھینچا تانی کی تھی اور وہ اجلاس ہلڑ بازی کی نذر ہو گیا تھا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: No comments۔

سوال: بدمزگی ہوئی وہاں پر؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: مختصراً وہاں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے میں مطمئن ہوتا، میں وہاں سے چلا آیا، استعفیٰ کا خط میں گھر سے تیار کر کے لے گیا تھا مگر اُس پر تاریخ اور دستخط نہیں تھے کیونکہ تب تک یہ ممکن تھا کہ استعفیٰ کی ضرورت پیش نہ آئے لیکن ٹی روم کے واقعات کے بعد میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ یہی میری آخری آپشن ہے اور اُسی وقت میں نے استعفیٰ دے دیا۔

سوال: بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ استعفیٰ دینے کے بعد آپ باہر کیوں نہیں نکلے؟ جلسوں سے خطاب کرتے تو لیڈر بن جاتے، ایک ایسا موقع جس میں آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے، لوگ آپ کو ہیرو سمجھتے تو پھر آپ باہر کیوں نہیں نکلے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: لوگ مجھے ہیرو سمجھتے ہوں گے لیکن میں اپنے آپ کو ہیرو نہیں سمجھتا، دوسرا یہ کہ جیسے میں نے پہلے بھی عرض کیا میرے فیصلے کی وجہ ہیرو بننا یا اپنے آپ کو بڑا بنانا نہیں تھا۔

سوال: پورے پاکستان سے سپریم یا ہائی کورٹ سے صرف ایک جج نے استعفیٰ دیا، آخر کوئی تو ایسی بات ہے جو آپ کو باقی لوگوں سے منفرد کرتی ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے اور ہر ایک کی سوچ بھی الگ ہے۔

سوال: کیا آپ نہیں سمجھتے کہ یہ دوسرے لوگوں کے ضمیر کی بھی آواز ہوگی، لیکن وہ یہ جرأت مندانہ فیصلہ نہیں کر سکے، یہ جرأت اور بہادری تو ہے ناں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں اِس پر بھی تبصرہ نہیں کروں گا، جیسے میں نے کہا کہ ہر انسان کی سوچ اپنی ہے، ہو سکتا ہے کہ دیگر جج صاحبان کی یہ رائے ہو کہ وہ عدلیہ کے اندر رہ کر زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، میں اپنے حالات اور اپنی سوچ کی روشنی میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ رائے درست نہیں۔ بتاتا ہوں کیوں۔

اولاً یہ رائے اِس مفروضے پر مبنی ہے کہ میں 9 مارچ سے پہلے اچھا کام کر رہا تھا اور 9 مارچ کے بعد بھی وہ کام جاری رکھ سکتا تھا، جیسے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ جو کام میں 9 مارچ سے پہلے کر رہا تھا وہ میں نہیں کر پا رہا تھا، مجھے یقین ہے کہ میرے لئے حسبِ سابق کام کرنا ناممکن تھا، اِس

لئے مذکورہ بالامفروضہ درست نہیں۔

ثانیاً اگر میں یہ سمجھتا کہ ہائی کورٹ کا آئینی کردار مؤثر طریقے سے ادا کرسکتا ہوں تو میں شاید پھر بھی استعفیٰ نہ دیتا۔ ہائی کورٹ کا آئینی کردار یہ ہے کہ وہ ایگزیکٹو اور مقننہ، دونوں کی زیادتیوں پر نظر رکھے اور اگر ضرورت پڑے تو اُن کو روکے، اِس کی مثال یہ ہے کہ پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے، مجھے بطور جج ہائی کورٹ فیصلہ دینے کا اختیار ہے کہ یہ قانون آئین کے منافی ہے لہٰذا اِس کا اطلاق نہیں ہوسکتا یا انتظامیہ میں سے کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو غیر آئینی ہو تو میں اُس کو روک سکتا ہوں، یہ عدلیہ کا آئینی کردار ہے۔ یہاں عدلیہ سے مراد سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ہیں کیونکہ ماتحت عدالتیں ایک عام قانون کے تحت بنائی گئی ہیں جبکہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ آئین کے تحت بنی ہیں۔ 9 مارچ سے پہلے بھی میرے پاس آئینی نوعیت کے کیسز نہیں لگتے تھے، میں یہ نہیں کہوں گا کہ ایسے کیسز میرے پاس لگنے چاہئے تھے، میرا کام اُن کیسز کو دیکھنا تھا جو میری لسٹ میں شامل ہوتے تھے لہٰذا میرے پاس جو بھی کیس لگتے تھے وہ میں نمٹاتا تھا۔ ایک بات البتہ عیاں تھی کہ میرے پاس ایسے کیسز نہیں لگیں گے جن کے فیصلے میں ہائی کورٹ کے آئینی کردار کی ضرورت ہو، اِس وجہ سے میرے نزدیک کوئی صورت نہیں تھی جہاں میں ایگزیکٹو کو اپنے فیصلوں کے ذریعے اختیارات کے تجاوز سے روک سکوں۔

سوال: اِس کی کیا وجہ تھی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں اِس کی وجہ پر قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا، میں بتاتا ہوں کہ میری عدالت میں کون سے مقدمات لگتے تھے، میرے پاس سِول نگرانیاں، اپیلیں اور اِسی نوعیت کے مقدمات لگتے تھے، عائلی قوانین کے تحت لڑکیوں کے جہیز، طلاق وغیرہ کے کیسز لگتے تھے، میرے لئے یہ کیس بھی اہمیت کے حامل تھے اور میں کر رہا تھا لیکن جو مفروضہ تھا کہ میں عدلیہ کے اندر رہ کر آئینی کردار ادا کرسکتا تھا تو وہ بھی غلط مفروضہ ہے۔

تیسری بات، اگر کوئی اجتماعی فیصلہ ہو جاتا تو پھر بھی میں استعفیٰ نہ دیتا۔ چونکہ یہ تینوں باتیں نہیں ہوئیں، خاص طور پر ہائی کورٹ کے آئینی کردار کے صحیح طرح سے ادا نہ ہونے کی وجہ سے۔ مذکورہ بالا تین وجوہات تھیں جن کی وجہ سے میں نے استعفیٰ دیا، یہ کوئی جذباتی یا غصے کا فیصلہ نہیں تھا، جو حالات میں نے اوپر بیان کئے ہیں اُن کی موجودگی میں میرے پاس کوئی ایسا آپشن نہیں تھا جس کے ذریعہ سے میں صدارتی اقدام اور چیف جسٹس سے بدسلوکی کے خلاف اپنا شدید ردعمل ظاہر کرسکتا۔

سوال: سر! کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاید آپ کا کچھ معاملہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ بہاولپور اور ملتان کافی عرصہ رہے، کہیں آپ کے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تو

نہیں تھی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: نہیں نہیں، مجھے یقیناً اس کی وضاحت کرنی چاہئے کہ میرے اِس حوالے سے کوئی تحفظات یا غصے کے جذبات نہیں تھے جہاں تک معاملہ ہے بہاولپور یا ملتان بنچ میں جانے کا، میں سمجھتا ہوں کہ ایک ضابطہ ہونا چاہئے جس کے تحت سب جج صاحبان کو بنچوں پر جانا چاہئے کیونکہ وہ بنچ بھی ہائی کورٹ کا حصہ ہیں، جب میں جنوبی پنجاب میں تھا تو اِس کے ہر علاقے میں گیا اور وہاں کی ثقافت سے بھی بہت لطف اندوز ہوا۔ میری اور چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کی سوچ کچھ اُمور پر ایک دوسرے سے خاصی مختلف تھی لیکن یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، دو جج تو بنچ میں بھی ایک مقدمہ سنتے ہوئے اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

سوال: چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اور آپ کے درمیان کوئی تناؤ تھا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں اِسے تناؤ نہیں کہوں گا لیکن میں نے اپنے حوالے سے جج صاحبان کی بنچوں پر تعیناتی کا سوال نہیں اٹھایا تھا مگر ہمارے ایک ساتھی جج کی فیملی لاہور میں تھی اور اُن کو تین سال تک ملتان میں تعینات رکھا گیا، انہوں نے باقی جج صاحبان کے درمیان اِس معاملے کو اٹھایا تو اِس معاملے پر میں نے اُن کو سپورٹ کیا، دوبارہ کہوں گا کہ یہ میرے ذاتی مفاد کیلئے نہیں تھا کیونکہ میں ملتان میں چھ ماہ اور اگلے سال بہاولپور میں تین ماہ رہ کر لاہور آ گیا تھا اور جیسے میں نے کہا میں نے کافی انجوائے کیا مگر میں اصولی طور پر اِس بات سے اختلاف رکھتا تھا کہ ایسے فیصلے چیف جسٹس کی بلاٹوک صوابدید پر ہوں۔ جب میرے ساتھی جج نے یہ معاملہ اُٹھایا تو اُس کو سپورٹ کرنے کے لئے میں نے چیف جسٹس اور دیگر جج صاحبان کو دو خط لکھے، جب اِن خطوں کا جواب نہ ملا تو میں چیف جسٹس کو ملا بھی اور اُس ملاقات میں دوسری باتوں کے ساتھ میں نے اپنا نکتہ نظر بھی پیش کیا، اُن کا خیال یہ تھا اور اُن کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ یہ چیف جسٹس کا مکمل اختیار ہے جو پہلے بھی استعمال ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوگا، میں نے اُن سے کہا کہ اس پر میرا نکتۂ نظر اُن سے مختلف ہے، میرا کہنا تھا کہ ہمارے جو اختیارات ہیں وہ صرف ادارے کی بہتری کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اور اُن کی مرضی بھی ادارے کے مفاد کے تابع ہونی چاہیے، میں یہ کہوں گا کہ اُن پر اس بات کا اثر ہوا کیونکہ اگلے ہفتہ کے لئے جاری روسٹر کینسل کیا گیا جس کے مطابق ساتھی جج جن کی ڈیوٹی مسلسل ملتان بنچ میں تھی واپس لاہور آ گئے۔

سوال: 6 مئی 2007ء کو چیف جسٹس افتخار چوہدری کے دورہ لاہور کے موقع پر جب لاہور ہائی کورٹ کے سترہ جج صاحبان اُن سے ملنے گئے تو آپ کی سوچ کیا تھی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میری اُس دن کوئی خاص سوچ نہیں تھی لیکن میں سوچتا ہوں کہ سترہ ججوں کی استقبالیہ میں شرکت جج صاحبان کی فکر میں تبدیلی کی علامت تھی، میری 19 مارچ کی خواہش کہ ہائی کورٹ کے آٹھ یا دس جج صاحبان اپنی سوچ کا مشترکہ اظہار کریں، رونما ہوئی۔

سوال: اب آپ کیا کریں گے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: فی الحال تو میں زندگی انجوائے کر رہا ہوں۔ 19 مارچ سے اب تک تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں اور میں سات آٹھ جگہ سیر و سیاحت کیلئے جا چکا ہوں۔

سوال: جج کی مراعات کیا ہوتی ہیں اور کیا آپ اُن کی کمی محسوس کریں گے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: دیکھیں، مراعات چاہے وہ تنخواہ ہے یا دوسری سہولیات، اگر یہ میرے پیشِ نظر ہوتیں تو میں ہائی کورٹ کا جج بھی نہ بنتا۔

سوال: کیا اب آپ اپنی لیگل پریکٹس شروع کریں گے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں نے اس حوالے سے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

سوال: آپ نے پہلے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کیا اور پھر حلف اٹھالیا۔ کیوں؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: یہ سوال مجھے اور لوگوں نے بھی پوچھا ہے، کچھ وجوہات میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں اپریل 1999ء میں ہائی کورٹ میں تعینات ہوا، اُس وقت میں لاہور ہائی کورٹ کا جونیئر ترین جج تھا، میرے ساتھ جو جج صاحبان ملتان بنچ میں تعینات ہوئے تھے اُن میں ایک سینئر جج بھی وہاں تھے جو آج کل سپریم کورٹ کے جج ہیں، ہم کُل آٹھ جج ملتان میں تھے اور تین بہاولپور میں تھے۔ حلف لینے سے پہلے میں نے حلف کا متن مانگا جب میں نے پڑھا تو کہا کہ مجھے یہ حلف نہیں لینا۔ یہ میرا فوری ردِعمل تھا جس میں ملامت کا خوف بھی شامل تھا۔ تقریب دوسرے کمرے میں ہونی تھی اور میرے علاوہ باقی جج صاحبان اُس کمرے میں چلے گئے لیکن تقریب میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر ہوگئی کیونکہ ساتھی ججوں کا خیال تھا کہ مجھے بھی حلف اٹھانا چاہئے، جو سینئر جج تھے وہ اور صوبائی وزیر قانون خالد رانجھا میرے پاس آئے اور وہی مفروضہ پیش کیا کہ آپ عدلیہ کے اندر رہ کر کچھ اچھا کام کر سکتے ہو جو باہر رہ کر نہیں کر سکتے، یہ اُن کی ایک دلیل تھی۔

دوسرا میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا میرے علاوہ بھی کوئی جج ہے جو حلف نہیں لے رہا تو اُن دونوں نے مجھے کہا کہ نہیں، صرف آپ ہی ہیں۔ ہوسکتا ہے اُنہوں نے یہ سوال لاہور ہائی کورٹ کے تناظر میں سمجھا ہو اور وہاں واقعی میرے علاوہ کسی اور نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار نہیں کیا تھا، تو یہ بات بھی مجھے محسوس ہوئی کہ صرف میں ہی ایسا کر رہا ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اُس وقت بھی میں نے خود سے سوال کیا اور وجہ جاننے کی کوشش کی کہ میں کیوں انکار کر رہا ہوں تو مجھے یہ عنصر نظر آیا کہ میں ممتاز نظر آنے کے لئے اور ملامت کے خوف سے یہ فیصلہ کر رہا ہوں۔

سوال: پی سی او کے تحت حلف لینا غلط ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: ہاں۔ یہی جواب ہونا چاہئے۔ اپنے حوالے سے میں نے وجوہات بیان کر دی ہیں۔

سوال: چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کا کیا انجام ہوگا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: پتا نہیں، مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے، میں کوئی قیاس آرائی نہیں کر سکتا۔

سوال: اگر آپ سپریم کورٹ کے جج ہوتے تو کیا کرتے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (قہقہہ لگا کر) اگر میں سپریم کورٹ کا جج ہوتا تو شاید میں استعفیٰ نہ دیتا، ابھی تک جو واقعات سامنے آئے ہیں اُن کے مطابق اگر میں سندھ ہائی کورٹ کا جج ہوتا تو پھر بھی شاید میں استعفیٰ نہ دیتا کیونکہ اُنہوں نے اجتماعی طور پر کوئی فیصلہ کر لیا تھا اور اگر لاہور ہائی کورٹ میں بھی کوئی اجتماعی فیصلہ ہو جاتا تو شاید میں استعفیٰ نہ دیتا۔ اگر میں سپریم کورٹ کا جج ہوتا تو میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

سوال: مثال کے طور پر وہ کیا ہوتا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: سپریم کورٹ میں ہر جج کے سامنے اور ہر مقدمہ میں سپریم کورٹ کی آئینی حیثیت کا سوال اٹھ سکتا ہے۔ کوئی بھی وکیل یہ عذر کر سکتا ہے کہ آپ کیس نہیں سُن سکتے کیونکہ سپریم کورٹ کی تشکیل آئینی نہیں ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب چیف جسٹس موجود ہیں تو اُن کی موجودگی میں کوئی ایکٹنگ چیف جسٹس نہیں ہو سکتا، میں اِس عذر پر فیصلہ بھی کر سکتا تھا اور اگر خود فیصلہ نہ بھی کرتا تو اُس عذر کو اپنے آرڈر میں لکھ کر ایک بڑا بنچ بنانے کی تجویز دے سکتا تھا، اِس طرح کے اور بھی عذر آسکتے تھے جن کا میں قانونی طور پر نوٹس لے سکتا تھا۔

سوال: آپ کا گھر پاکستان کے اُن تین چار گھروں میں سے ایک ہے جس کے باہر آپ کا نام، آپ کی مسز کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے، 'بینا اور جواد' اِس کی کیا وجہ ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: اِس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کوئی شعوری وجہ نہیں۔ ہمیں نہیں لگتا کہ اِس سے کچھ فرق پڑتا ہے، نام نہ بھی ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے، لکھ دیا گیا ہے تو بھی ٹھیک ہے۔

سوال: 'بینا اور جواد' ایسے نام لکھے ہونا سوسائٹی سے مختلف ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے۔ اور سوسائٹی سے مختلف ہے بھی۔

سوال: اس کی وجہ سے آپ کو سوسائٹی میں move کرنے میں مسئلہ تو نہیں ہوتا؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: میں ویسے بھی سوسائٹی میں بہت کم آتا جاتا ہوں، میں کم ہی سماجی تقریبات میں جاتا تھا اور جب ہائی کورٹ میں آیا تو یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا، بطور فیملی بھی ہم سماجی طور پر زیادہ متحرک نہیں ہیں، حتیٰ کہ جو ساتھی اور کولیگ تھے اُن کو ایک طرح سے شکایت تھی۔ لیکن نام کی پلیٹ کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہیں اُٹھا۔

سوال: جج لاہور ہائی کورٹ ہوتے ہوئے آپ اپنے گھر کو کتنا وقت دیتے تھے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: دیکھیں صبح آٹھ بجے کورٹ ورک شروع ہوتا تھا اور ڈیڑھ بجے ختم ہوتا تھا، اُس کے بعد چیمبر میں آدھا پونا گھنٹہ باقی رہ جانے والے فیصلے لکھواتا تھا اور پھر فارغ ہوکر گھر آجاتا تھا، میں کبھی کوئی عدالتی کام گھر میں نہیں لاتا تھا۔ باقی سارا وقت میں گھر پر ہی گزارتا تھا۔

سوال: سرکاری فنکشن میں بھی آپ نہیں جاتے تھے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: سرکاری فنکشن میں میں بالکل نہیں جاتا تھا، میرے خیال میں یہ جج کا کام نہیں کہ وہ سرکاری فنکشن میں شریک ہو۔ میری جانب سے میرے عملے کو ہدایات تھیں کہ اگر کسی سرکاری عہدیدار جیسے گورنر، صدر، وزیراعلیٰ کی طرف سے کوئی دعوت نامہ آئے تو میری طرف سے معذرت کرلی جائے۔

سوال: جسٹس افتخار چوہدری سے آپ کی واقفیت تھی؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: نہیں، میں اُن سے کبھی بھی نہیں ملا تھا، اگر میں اُن سے ملتا تو اُن کو پہچان لیتا کیونکہ بطور چیف جسٹس آف پاکستان اُن کی تصاویر وغیرہ اخباروں میں آتی تھیں لیکن انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ ہم کبھی ملے ہی نہیں تھے۔

سوال: پاکستان کی لبرل اشرافیہ نے پاکستان کی ترقی میں کتنا کردار ادا کیا ہے؟ زیادہ تر یہ مصلحت سے کام لیتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: (تھوڑا سوچ کر) میں اس پر تبصرہ نہیں کرسکتا۔

سوال: پاکستان کی پسماندگی یا پاکستان کے پیچھے رہ جانے کی یہی وجہ ہے؟

جسٹس جواد ایس خواجہ: ہوسکتی ہے، کیونکہ جسے آپ مڈل کلاس کہتے ہو یا پڑھا لکھا طبقہ کہتے ہو اُس کا قومی زندگی میں اہم کردار ہے، میں پھر کہوں گا کہ میں نے اِس پر اِتنا غور نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ آپ کا نکتہ نظر ٹھیک ہو۔

سوال: عورتوں کو کتنی آزادی ہونی چاہئے؟ خصوصاً پردے کے حوالے سے؟

جسٹس جوادایس خواجہ: اِس میں جبر کا عنصر نہیں ہونا چاہئے، ایک خاص قسم کا لبادہ پہننے پر مجبور کرنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہمیں تو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ اگر کوئی خاتون گزرے تو آدمی اپنی نظریں جھکا کر چلے، مگر ہم اِس پر عمل درآمد کرنے کو تیار نہیں۔ ہماری ایک جاننے والی خاتون ہیں، بہت اچھی، نیک، تمام شرعی احکامات کی پابند، وہ بتا رہی تھیں کہ وہ ایک دن سیر کر رہی تھیں اور چلنے میں اکثر ہوتا ہے کہ دوپٹہ سر سے سرک جاتا ہے، سامنے سے ایک مولوی صاحب آ رہے تھے، انہوں نے اُن خاتون کو دوپٹہ ٹھیک کرنے کو کہا۔ وہ خاتون کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہیں، انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب! آپ کی نظر مجھ پر کیوں پڑی اور آپ کو پتہ کیسے چلا؟ کہ میرے سر پر دوپٹہ نہیں۔ میرے خیال میں جبراً کسی سے بھی ایسے کام کروانا صحیح نہیں ہے۔

سہیل وڑائچ: بہت بہت شکریہ۔

غیر مطبوعہ، جون، 2007ء

اعتزاز احسن

کہتے ہیں کہ کامیابی کی ہر کہانی کے پیچھے مسلسل محنت اور مشکل فیصلوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے نوجوان اعتزاز احسن نے سول سروس کے امتحان میں اول آنے کے باوجود جب وکالت کے پیشے کا انتخاب کیا تو یہ ایک مشکل فیصلہ تھا کیونکہ یہ نوجوان اس وقت ایک بریف لیس (Brief less) وکیل تھا لیکن مسلسل محنت سے اعتزاز احسن آج اپنے آپ کو وکیل، سیاستدان اور دانشور تینوں حیثیتوں سے منوا چکے ہیں۔

سابق وفاقی وزیر داخلہ چودھری اعتزاز احسن نے سیاسی کیریئر کا آغاز پیپلز پارٹی سے کیا بھٹو دور میں گجرات سے ضمنی انتخاب میں رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے تو بھٹو نے انہیں صوبائی وزارت اطلاعات کا قلمدان سونپ دیا قومی اتحاد کی تحریک چلی تو وہ وزارت سے مستعفی ہو گئے جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی دور میں تحریک استقلال اور ایم آر ڈی میں سرگرم رہے اور پھر 1988ء میں واپس اپنی جماعت پیپلز پارٹی میں لوٹ آئے وفاقی وزیر داخلہ رہے بعد ازاں سینٹ میں قائد ایوان بھی رہے۔

منگوال ضلع گجرات کے جاٹ وڑائچ گھرانے سے تعلق رکھنے والے اعتزاز احسن کے دادا چودھری بہاول بخش اور ان کے والد چودھری احسن علیگ تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی سیاست میں اپنا لوہا منوا چکے تھے اپنے خاندان کی روایات کے وارث اعتزاز احسن کا کہنا ہے کہ اصول پرستی کی سیاست انہوں نے اپنے خاندان سے سیکھی وہ کہتے ہیں کہ مفاد پرستی کی سیاست کے وہ اہل ہی نہیں۔

اعتزاز احسن نے موجودہ عدالتی بحران میں لیڈنگ رول ادا کیا ہے ان سے تفصیلی گفتگو تو کافی عرصہ پہلے کی ہے جس سے ان کی شخصیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے تاہم چند سوالات نئے حالات پر بھی ہیں۔

اہم نکات

☆ آخری فتح عدلیہ اور جمہوریت ہی کی ہوگی۔
☆ جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس غلط ہے۔
☆ سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل غلط ہے۔
☆ فوج نے قائداعظم سے بھی سوالات کیے تھے مگر انہوں نے ڈانٹ دیا۔
☆ مذہبی انتہاپسندوں کو نہ روکا گیا تو یہ ریاست کو بے بس کردیں گے۔
☆ سیاستدان کے پاس حکومت تو آتی ہے اقتدار نہیں آتا۔
☆ جمہوریت کے خاتمے کے لیے تین ٹرک کافی ہوتے ہیں۔
☆ نیشنل سیکورٹی کونسل کا مطلب فوج کی برتری ہے۔
☆ آزاد خارجہ پالیسی ضروری تھی لیاقت علی خان نے روس کا دورہ منسوخ کر کے غلطی کی۔
☆ افغانستان میں روس کا مقابلہ غلط تھا پاکستان نے امریکہ سے بڑی معاشی امداد نہیں لی۔
☆ ایٹم بم کبھی استعمال نہیں ہوسکتا، اس کا مقصد صرف اندرونی سیاست چمکانا ہے۔
☆ مسئلہ کشمیر کا فوجی حل ممکن نہیں بات چیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔
☆ فوجی حکومت سے کوئی توقع نہیں انارکی بڑھے گی۔
☆ اگر سکھوں کی فہرستیں بھارت کو دینے کا الزام درست ہوتا تو فوج مجھے الٹا لٹکا دیتی۔
☆ جدید تہذیب کی بنیاد چھاپہ خانہ اور جہاز رانی ہے، مسلمان اس میں پیچھے رہ گئے۔
☆ بیل اور ہاتھی مقامی جانور ہیں، گھوڑا اور رکاب وسط ایشیاء سے آئے۔
☆ 42 مسلم ریاستوں میں جدید نظام ہے۔ جمہوریت ہی مسائل کا حل ہے۔
☆ پنجابی ایک بہادر سپاہی اور ناکام منتظم ہے چار سو سال کی انارکی نے اسے بدل ڈالا ہے۔
☆ بنیاد پرستی روکنے کے حوالے سے فوج نے بہت مایوس کیا۔
☆ صوبوں کو مزید خودمختار دینے سے پاکستان مضبوط ہوگا۔
☆ حفیظ پیرزادہ سے ملاقات کی وجہ سے تحریک استقلال سے نکالا گیا۔
☆ الطاف حسین کے کہنے پر اسلم بیگ نے پکا قلعہ آپریشن ناکام بنادیا۔

☆ پنجاب بزدل نہیں یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ مزاحمت کی، 8 لوگوں نے خودسوزی کی تھی۔

☆ عدم تحفظ کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں بچت کی عادت نہیں ہے۔

☆ ایجنسیاں بہت طاقتور ہیں فوج خود انہیں روکے۔

☆ اگر قومی اتحاد کے لوگ ضیاء الحق کی کابینہ میں نہ جاتے تو جمہوریت پسند کہلا سکتے تھے۔

☆ ایئر مارشل اصغر خان نے ملائیت کی مخالفت کی جس پر انہیں داد ملنی چاہیے۔

☆ شلوار، شیروانی، تکہ اور کباب وسط ایشیاء سے آئے۔

☆ سول سروس کے امتحان میں فرسٹ آیا، امتحان والے دن ووٹ مانگتا رہا۔

☆ افسری میں بڑی دلکشی تھی، وکالت چلی نہیں تھی پھر بھی مشکل راستہ چنا۔

☆ والد اقبال کے عاشق تھے، میرے پسندیدہ شاعر غالب، فیض اور اقبال ہیں۔

☆ سینٹ کے الیکشن براہ راست ہونے چاہئیں مالی اختیارات بھی ملنے چاہئیں۔

انٹرویو

سوال: جسٹس افتخار چودھری کے وکیل کی حیثیت سے آپ کا تجزیہ کیا ہے حکومت اور عدلیہ کی جنگ میں کون جیتے گا؟

اعتزاز احسن: یہ مقدمہ عدالت میں ہے اس لیے میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا لیکن آخری فتح عدلیہ اور جمہوریت ہی کی ہوگی میرا عدالت میں یہ موقف ہے کہ جسٹس افتخار چودھری کے خلاف ریفرنس غلط ہے سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل بھی غلط ہے۔

سوال: آپ پر الزام ہے کہ آپ خالص عدالتی معاملے کو سیاسی رنگ دے رہے ہیں؟

اعتزاز احسن: ابھی تک چیف جسٹس نے کوئی سیاسی بات نہیں کی ایک انٹرویو نہیں دیا اگر ان کے اخلاقی مؤقف کی سیاسی جماعتیں حمایت کریں تو اسے سیاسی رنگ دینا کہہ لیں۔ کیا سیاسی لوگوں کو حق نہیں کہ وہ اس معاملے پر بولیں۔

سوال: ملک کی موجودہ سیاسی صورتحال کے حوالے سے بتائیں کہ فوجی حکومت سے جو توقعات تھیں وہ کس حد تک پوری ہوئیں اور آپ ملک کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

اعتزاز احسن: اس حکومت سے زیادہ توقعات اس کے اپنے حامیوں کی ہی تھیں۔ میں تو ایسی کوئی توقع کسی بھی غیر جمہوری حکومت سے نہیں رکھتا کہ اس کے ہاتھوں ملک کی ترقی یا بہتری ہو سکتی ہے۔ ہمارا تجربہ یہی ہے کہ ایوب خان اور یحییٰ خان کی حکومتوں کے نتیجے میں ملک ٹوٹ گیا ایسی پیچیدگیاں اور عدم توازن پیدا ہوا کہ مشرقی پاکستان الگ ہو گیا ضیاء الحق کا طویل عرصہ جو غیر جمہوری تھا، اس کے نتائج بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ کلاشنکوف کلچر، ہیروئن، جرائم، فرقہ واریت اور مذہبی جنونیت یہ سب ضیاء الحق کے دور کی پیداوار ہے۔ اگر آپ چیف ایگزیکٹو کے اپنے سات نکاتی پروگرام کو سامنے رکھیں تو میرے خیال میں حکومت اپنے مقاصد اور اہداف حاصل کرنے میں بری طرح ناکام ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس حکومت کا مستقبل بھی افراتفری کا شکار ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ انارکی طرف جائیں گے جہاں جتنی بھی انتہا پسند تنظیمیں اور قوتیں ہیں ان کے پاس اسلحہ موجود ہے اگر ان کا سد باب نہ کیا گیا تو یہ ریاست اور حکومت کو بالکل بے بس کر دیں گی۔

سوال: موجودہ حکومت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑی لبرل ہے اور اس کا ایجنڈا ابھی

لبرل ہے آپ خود بھی لبرل ہیں اس کے ایجنڈے سے اتفاق کرتے ہیں؟

اعتزاز احسن: بنیاد پرستی کے حوالے سے اگر آپ پوچھ رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس حکومت نے بہت مایوس کیا جنرل صاحب نے گزشتہ سال کے آغاز میں انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''گو قانون میں ترمیم کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اگر کوئی کسی پر جھوٹا الزام لگاتا ہے تو پہلے اسے ڈپٹی کمشنر دیکھے گا''۔اس سے یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ اب اس قسم کے جھوٹے الزام لگنا ختم ہو جائیں گے ابھی جنرل صاحب کے قدم جمے ہی نہیں تھے کہ انتہا پسند جماعتوں نے تھوڑی سے آنکھیں دکھائی تو جنرل صاحب وہاں سے پیچھے ہٹ گئے۔ جنرل صاحب نے اور بھی اعلانات کیے لیکن وہ ان پر قائم نہیں رہ سکے۔ اب تو اور بھی مسائل درمیان میں پیدا ہو گئے ہیں سپریم کورٹ نے سود کے متعلق جو فیصلہ دیا ہے اس کے بارے میں حکومت کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کرے، حکومت سپریم کورٹ کے کندھے پر رکھ کر یہ بندوق چلانا چاہتی ہے اس لیے یہ سارے کام اور معاملات پاکستان کو بے یقینی، افراتفری، انارکی اور طوائف الملوکی کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔

سوال: پاک بھارت مذاکرات کا آپ کیا نتیجہ دیکھتے ہیں؟

اعتزاز احسن: میرے نزدیک پاک بھارت مذاکرات کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکل سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ایران اور بھارت کی پائپ لائن والے منصوبے میں مزید جائزہ لینے کے بعد کوئی معاہدہ ہو جائے گا اور اس سے سرحدیں کچھ نرم ہو جائیں گی لیکن اگر ہم یہ سمجھیں کہ اس ایک ملاقات سے پاکستان کو کشمیر مل جائے گا یا یہ معاملہ طے ہو جائے گا یہ بالکل غلط فہمی ہے ایسا ہرگز نہیں ہو گا لیکن اس ملاقات کے کچھ فوائد بھی ہیں پاکستان کی اندرونی سیاست کو بھی اس کا فائدہ پہنچے گا آج تک جن دو وزرائے اعظم نے اس سلسلہ میں کوشش کی وہی کوشش آج پرویز مشرف کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان دونوں وزرائے اعظم پر غداری اور ملک دشمنی کے الزامات لگائے گئے محترمہ بے نظیر نے راجیو گاندھی اور نواز شریف نے واجپائی سے ملاقات کی تو یہ الزامات لگائے گئے آپ خود بتائیں کہ کوئی وزیر اعظم ملک کے مفادات بیچ سکتا ہے سیاستدانوں پر غداری سے متعلق جو الزام تراشی کی جاتی تھی اس میں اب کچھ کمی آئی ہے۔

سوال: یہ الزام کون لگاتا ہے؟

اعتزاز احسن: زیادہ تر تو یہ کام ایجنسیاں کرتی ہیں وہی ایسے کاموں کے لیے زور لگاتی ہیں اور یہ کام زیادہ تر آئی ایس آئی کرتی ہے۔

سوال: آئی ایس آئی کو تو فوج کنٹرول کرتی ہے؟

اعتزاز احسن: کسی حد تک مکمل حد تک نہیں، آئی ایس آئی میں ریٹائر فوجی بھی کام کرتے ہیں۔ آئی ایس آئی ایک ایسا ادارہ ہے جس کا سربراہ فوج سے تو آتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کی پوری باڈی اس کو اعتماد میں لے رہی ہو۔ مثال کے طور پر محترمہ بے نظیر نے اپنے پہلے دور میں جنرل شمس الرحمٰن کلو کو سربراہ لگایا تھا ان کو آئی ایس آئی والے رپورٹ ہی نہیں کرتے تھے اور نہ ان کو اعتماد میں لیتے تھے۔ نواز شریف نے جنرل ضیاء الدین کو لگایا ضیاء الدین تو بچارہ "جس کے بارے میں خبر دیتی تھیں بجلیاں وہ بے خبر نکلے" کے مصداق جن کو سب خبر ہونی چاہیے کہ ان کو اپنی خبر نہ تھی۔ وزیراعظم اگر نیا چیف آف آرمی سٹاف لگائے گا تو کیا ہوگا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے لگتا ہے جنرل ضیاء الدین ان فیصلوں میں شریک ہی نہیں تھے۔

سوال: آپ نے جس طرح کہا کہ ایجنسیاں الزامات لگا دیتی ہیں آپ پر بھی ایک الزام لگا تھا۔ وہ یہ کہ آپ نے سکھوں کی فہرستیں انڈیا کے حوالے کر دی تھیں۔ یہ الزام آپ پر بار بار لگا ہے اس الزام کی حقیقت کیا ہے؟

اعتزاز احسن: میں نے اس الزام کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ اس لیے میں حقیقت میں جانے کی ضرورت سمجھتا نہیں ہوں۔ میں اس الزام پر آپ سے دو باتیں کہہ دیتا ہوں۔

(1) یہ الزام 1989ء میں لگا تھا اس کو بارہ سال ہو گئے ہیں۔ اگر اس الزام میں کوئی صحیح بات ہوتی تو فوج مجھے الزام دیتی اس وقت سے اب تک چھ چیف آف آرمی سٹاف اور چھ آئی ایس آئی کے سربراہ آ چکے ہیں، یہ صرف اور صرف سیاست دانوں اور ایجنسیوں کی الزام تراشی ہے۔

(2) دوسری بات یہ ہے کہ اول تو میرے خیال میں ایسی کوئی فہرستیں ہوتی ہی نہیں لیکن اگر فہرستیں ہوتی ہیں تو وہ ہوگی سرکاری اداروں کے پاس۔ جنہیں اعتماد میں لیے بغیر کوئی سویلین ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں نہ تو بھارت نے کوئی فہرستیں بنا رکھی ہیں اور نہ ہی پاکستان نے، یہ الزام ہی لغو ہے۔

سوال: آپ پر یہ الزام لگا کیسے آخر کچھ نہ کچھ تو بات ہوگی، آپ کے بھارت سے مذکرات ہوئے ہوں گے یا کچھ اور؟

اعتزاز احسن: بھائی میں اس الزام کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہیں، میں اس کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا، آپ کے متعلق جتنا پوچھیں گے میں یہی جواب دوں گا۔

سوال: آپ کو اس الزام کا جواب تو دینا چاہیے خاموشی کا مطب تو کچھ اور ہوتا ہے؟

اعتزاز احسن: (غصے سے) اگر اس الزام میں کچھ حقیقت ہے تو مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔

سوال: آپ مقدمے کے لیے تیار ہیں؟

اعتزاز احسن: بالکل تیار ہوں۔

سوال: چودھری صاحب! اس الزام کے بعد حال ہی میں بے نظیر بھٹو نے کہا تھا کہ انہوں نے بھارت کو ٹوٹنے سے بچایا اور راجیو گاندھی کی مدد کی تھی اس بات کا مطلب تو یہی ہے کہ سکھوں کی فہرست والا معاملہ سچا تھا؟

اعتزاز احسن: نہیں نہیں وہ اور معاملہ تھا یہ بات آپ بے نظیر صاحبہ سے پوچھے۔ میں اس الزام کو سنجیدگی سے نہیں لیتا، کوئی ایسے سنجیدگی سے لیتا ہے تو لے، میرے لیے تو یہ صرف چھیڑ چھاڑ ہے۔

سوال: چودھری صاحب! یہ بات اتنی غیر اہم اور غیر سنجیدہ نہیں ہے آپ منتخب لوگوں کے نمائندے تھے آخر اسٹبلشمنٹ آپ پہ اعتماد کیوں نہیں کرتی تھی، آپ پر شک کیوں کیا جاتا ہے؟

اعتزاز احسن: میں آپ کو یہ کہہ رہا ہوں کہ الزام لگنے کے بعد بھی میں منتخب ہوا میں آپ کو پھر کہہ رہا ہوں کہ اس الزام میں حقیقت کوئی نہیں ہے میں اس سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوں، مجھے چند لوگ جو مرضی کہیں آپ عام لوگ نہیں ہیں عام لوگ اور الزام لگانے والوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہزاروں کروڑوں لوگ ہیں جو ایسے الزامات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے لیکن اگر میں سنجیدگی سے اس الزام کو لیتا تو لوگ مجھے کبھی منتخب نہ کرتے۔

سوال: دہشت گردوں کی لسٹیں فراہم کرنے کے واقعہ کو چھوڑ کر اصل بات یہ ہے کہ ایجنسیوں کو کیا حق ہے کہ وہ عوامی نمائندوں اور بالخصوص وزیر داخلہ کے خلاف سکینڈل بنائیں؟

اعتزاز احسن: ایجنسیوں والے یہ کام کرتے ہیں اب کیا کیا جا سکتا ہے ہر کسی کے اوپر الزامات لگائے جاتے ہیں۔

سوال: عوامی نمائندوں کی حکومت بہت طاقتور ہوتی ہے کیا اس کے پاس کوئی ایسا طریقہ کار نہیں ہوتا کہ ایجنسیوں کو روک سکے آخر ایجنسی اس کے ماتحت ہی ہوتی ہیں؟

اعتزاز احسن: ایجنسیاں بہت طاقتور ہیں انہیں روکنا مشکل ہے جب تک اس معاملہ کا خود فوج فیصلہ نہیں کرتی وگرنہ ایجنسیاں ملک کو نقصان پہنچائیں گی۔ یہ کام سیاستدانوں کے بس کا روگ نہیں ہے کہ آپ ان سے کہیں کہ ایجنسیوں کو روکیں ایجنسیوں کے پاس بہت وسائل ہیں۔ فوج کا ادارہ تین ٹرک لے کر وزیراعظم کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ سیاستدان اس کو روکے سیاستدان کے پاس حکومت تو آتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج تک اقتدار نہیں آیا اس لحاظ سے سیاستدان مکمل طور پر بے بس ہیں۔

سوال: مانا کہ فوج طاقتور ہے اور سیاستدانوں کو حقیقی اقتدار نہیں ملا، بھارت میں بھی وہی فوج ہے مگر وہاں کے سیاستدانوں نے اقتدار حاصل کیا ہمارے ملک کے سیاستدانوں نے حقیقی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی؟

اعتزاز احسن: بھارت اور پاکستان کی فوج میں بڑا فرق ہے یہاں تو پاکستان بننے کے بعد بانی پاکستان قائداعظم سے فوج کے معاملات نہیں چلے تھے۔ جنرل اکبر نے قائداعظم سے سوالات کرنے شروع کر دیئے تھے اور پوچھا کہ آپ نے فلاں کو کیوں لگایا اور فلاں کو کیوں لگایا، قائداعظم نے انہیں ڈانٹ کر کہا تھا اس کام سے آپ کا کیا تعلق تم کون ہوتے ہو، یہ سول گورنمنٹ کا تعلق ہے، چرچل نے کہا تھا War is too serious a matter to be left with the Generals اب یہ تو حکومت کی بات کر رہے ہیں جرنیل تو جنگ کے بارے میں بھی خود فیصلے نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں جنرل اکبر نے لیاقت علی خان کے خلاف بغاوت کی کوشش کی اس وقت سے بونا پارٹزم شروع ہوا ہے۔ بھٹو صاحب نے اس کو بونا پارٹزم کی اصطلاح دی تھی۔ فوج اور سول کے درمیان یہ جنگ 1952ء 53ء سے ہی شروع ہو گئی تھی اس کے بعد ایوب خان آ گئے پھر یحیٰی خان آ گئے، جنرل ضیاء الحق صاحب آ گئے اور سب نے دانستہ طور پر کوشش یہ کی کہ ملک کے سارے وسائل بیس پچیس سال تک دو باتوں پر صرف ہوں۔ ایک یہ کہ صحیح سیاست دان کو بدنام کیا جائے ان کو جیلوں میں ڈالا جائے یا سیاست سے نا اہل قرار دیا جائے اور اگر نا اہل نہیں کیا جا سکتا تو انہیں پھانسی لگا دیا جائے۔ گزشتہ نصف صدی میں یہ کوشش ہوتی رہی ہے دوسری کوشش یہ ہوتی رہی ہے کہ گملوں میں سیاست دان اگائے جائیں، جنرل پرویز مشرف بھی ایوب، یحیٰی اور ضیاء الحق کی طرح یہی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: چودھری صاحب! اس صورتحال کے ذمہ دار تو سیاستدان بھی ہیں جو خود فوج کو آنے کی دعوت دیتے ہیں؟

اعتزاز احسن: نہیں! میں یہ نہیں کہتا کہ سیاستدان کلی طور پر بری الذمہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا مگر جس قدر کوڑا کرکٹ سیاستدان کے دروازے پر پھینکا جاتا ہے اس قدر وہ بھی درست نہیں ہے۔ فوج کو بھی بری الذمہ نہیں قرار دیا جا سکتا، ضیاء الحق کے دور میں جب اس نے مجلس شوریٰ بنائی تھی تو میں نے اس (مجلس شوریٰ) پر چند اشعار کہے تھے جن میں کچھ یوں تھا کہ

کارگر پس پردہ یوں تھی انگلیاں اس کی
آدمی جو لگتے تھے وہ تھے پتلیاں اس کی

اور

آہنی ہتھیلی پر مخملی تھا دستانہ
ایک نظر سے اوجھل تھا ایک ادا عیاں اس کی

بہت سارے ایسے ہوتے ہیں، اس وقت بھی تھے، آج بھی ہیں ''آدمی جو لگتے ہیں وہ ہیں پتلیاں اس کی'' اور آج بھی پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں اور ہمارے عہد میں بھی ہوتے ہیں بے شک میں سیاستدانوں کو کلی طور پر بری الذمہ نہیں ٹھہراتا اور نہ ہی میں فوج کو کلی طور پر معصوم اور مجبور ٹھہراتا ہوں فوج کا سربراہ سمجھتا ہے کہ آج تو ملک کو میں نے بچانا ہے بھئی ہمارے سربراہ نے تو یہ واضح طور پر کہا ہے کہ اگر نواز شریف مجھے یعنی پرویز مشرف کو برخاست نہ کرتا تو آج بھی وزیر اعظم ہوتا سو تو اصل بات وہ تھی ملکی مفاد اس میں کہاں سے آ گیا؟

سوال: چودھری صاحب! یہ جو دو نقطہ ہائے نظر ایک فوج کی معصومیت والا اور دوسرا سیاستدانوں کی معصومیت والا ہیں اب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جی کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے اور جناب کوئی نیشنل سکیورٹی کونسل بنائی جائے کہ جس میں فوج اور سیاستدان آپس میں مشورہ کر کے ملک کا نظام چلائیں، کیا ایسا ممکن ہے؟

اعتزاز احسن: پاکستان میں یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ سیاسی اور آئینی ڈھانچے میں فوج کو برتری حاصل ہے اور نیشنل سکیورٹی کونسل کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ جمہوریت اور جمہوری اداروں پر ایک ایسے ادارے کا کنٹرول رہے جس میں فوج شامل ہو اور جس ادارے میں فوج بیٹھ گئی ظاہر ہے اس پر فوج بالادست ہوگی۔ سندھ اور بلوچستان یہ تسلیم نہیں کریں گے۔ معاملات بہت آگے چلے گئے ہیں۔ فوج کو پنجاب کی فوج کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے فوج میں کچھ حصہ بہر حال صوبہ سرحد والوں کا بھی ہے لیکن سندھی اور بلوچیوں کا فوج میں کوئی خاص حصہ نہیں ہے اور یہ وفاقی ملک ہے جنرل پرویز مشرف صاحب اردو سپیکنگ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر مہاجر برادری بھی سمجھتی ہے کہ ہماری فوج میں کوئی نمائندگی نہیں ہے سو اگر آپ ایک ایسے ادارے کو بالادست کر دیں گے کہ جس کے بارے میں یہ تاثر ہے ملک کی وفاقی اکائیوں میں یہ تاثر ہے کہ یہ فوج ہماری نمائندہ نہیں ہے اور ہماری نمائندگی اس ادارے میں نہیں ہے تو پھر نیشنل سکیورٹی کونسل کے قومی ادارہ ہونے کی تاثر کی نفی ہو جاتی ہے۔

سوال: چودھری صاحب! یہ بتائیں کہ پاکستان کی 54 سالہ تاریخ میں کوئی اطمینان بخش پہلو بھی آپ کو نظر آتے ہیں یا تمام پہلو مایوس کن ہی ہیں؟

اعتزاز احسن: دیکھیں ضیاء الحق کے دور سے پہلے تو یقیناً اطمینان بخش پہلو بھی تھے لیکن ضیاء

الحق اور افغان جنگ کی معاشی یا معاشرتی طور پر اور ثقافتی طور پر اتنے منفی اثرات پڑے ہیں کہ اب اطمینان بخش صورتحال نہیں رہی ضیاء الحق کے دور سے پہلے کی حکومتیں اچھی تھیں یا بری، لیکن معاشرہ ایک سمت چل رہا تھا جس میں معاشرتی بربریت اور عدم برداشت نہیں تھی۔ آج کی بربریت اور عدم برداشت ضیاء الحق کے دور میں آئی۔

سوال: چودھری صاحب! ضیاء الحق کے زمانے میں ہم نے روس کو شکست دی اور افغانستان کے حوالے سے سٹریٹیجک گہرائی حاصل کی؟

اعتزاز احسن: (ہنستے ہوئے) پاکستان کو افغانستان کی وجہ سے سٹریٹیجک گہرائی نہیں ملی بلکہ پاکستان کے ان تمام مسلم ریاستوں کے ساتھ روابط اور رشتوں جو کہ وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں ہیں اور جو کوئی نہ کوئی دولتوں سے مالا مال ہیں، تیل کی دولت سے، گیس کی دولت سے، مثلاً ثقافتی دولت سے، ایشیا کی ان ریاستوں، مسلم ریاستوں اور پاکستان کے درمیان افغانستان ایک رکاوٹ کے طور پر کھڑا ہے۔

سوال: تو پاکستان کو افغانستان کے حوالے سے کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے؟

اعتزاز احسن: افغانستان کی رکاوٹ کی وجہ سے وسط ایشیا کے ممالک سے آپ کی تجارت نہیں ہو سکتی، گیس کی پائپ لائن نہیں گزر سکتی کیونکہ پاکستان سے تو پائپ لائن گزر سکتی ہے اور ترکمانستان سے بھی، تاجکستان اور ازبکستان سے بھی گزر سکتی ہے لیکن افغانستان سے دنیا کی کوئی کمپنی اس کو گزارنے کے لیے تیا نہیں ہے۔ اگر افغانستان کی رکاوٹ نہ ہوتی تو کراچی بندرگاہ وسط ایشیا کے لیے سستا ترین روٹ تھا اور اس روٹ کے کھلنے سے جو دولت اور خوشحالی آنی تھی وہ ہم کھو بیٹھے ہیں صرف اس لیے کہ رستے میں افغانستان ہے۔ ہم نے اس کو اسی طرح بنایا ہے جس طرح ہم نے افغانستان کو تشکیل کیا یہ جہاد اور یہ سب کچھ ویسے کا ویسا افغانستان کھڑا ہے آج دنیا میں افغانستان کا کوئی ساتھی نہیں سوائے پاکستان کے اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

سوال: چودھری صاحب! گزارش ہے کہ افغانستان کی جنگ تو دفاع میں لڑی گئی روس گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا تھا اس کی اگلی منزل پاکستان تھا؟

اعتزاز احسن: دیکھیے! یہ ایک خام خیالی ہے کہ روس، ایران یا پاکستان کے ذریعے گرم پانیوں تک پہنچ جاتا یہ ممکن نہیں تھا روس افغانستان کو نہیں سنبھال سکا تو پاکستان جیسی آبادی کو کہاں سنبھال سکتا تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں افغانستان میں روس کا مقابلہ کرنا غلطی تھی؟

اعتزاز احسن: یہ بالکل غلطی تھی۔ یہ پاکستان کی غلطی تھی ہمیں مداخلت ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ایک تو ہمیں امریکہ کا فرنٹ مین بن کر اس جنگ میں چھلانگ نہیں لگانا چاہیے تھی۔ دوم ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے تھا کہ سویت یونین افغانستان میں تو پھنسے گا۔ سوم ہمیں وہاں افغانستان میں نو فیورٹ پالیسی رکھنی چاہیے تھی۔ چہارم اگر ہم نے اس میدان میں چھلانگ ہی لگا دی تھی تو ہماری کئی شرائط ہونا چاہئیں تھیں۔ امریکہ کو اس وقت ہماری ضرورت تھی۔ ہمیں امریکہ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ہیروئن اور کلاشنکوف سے ہماری ثقافت متاثر ہو رہی ہے پاکستان میں معاشی ترقی ہو ہمیں امریکہ سے معاشی ترقی کا حصہ لینا چاہیے تھا یہ سراسر امریکہ کا جہاد تھا یہ کوئی اسلامی جہاد نہیں تھا۔ ہم بغیر کچھ حاصل کیے اس جنگ میں داخل ہو گئے۔ آج افغانستان کا کیا عالم ہے؟ وہاں ہر طرف انارکی ہے۔

سوال: یہ ایک نقطہ نظر ہے، دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ افغانستان میں خلافت قائم ہے وہاں پر ایک آئیڈیل نظام قائم ہے؟

اعتزاز احسن: اللہ ایسے نظام سے پاکستان کو محفوظ رکھے بس یہی میں کہہ سکتا ہوں۔

سوال: آپ افغانستان کے حوالے سے خارجہ پالیسی کو برا کہہ رہے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں شروع سے ہی خرابیاں رہی ہیں؟

اعتزاز احسن: خارجہ پالیسی کے بارے میں چند بنیادی معاملات اور اصول ہوتے ہیں کہ خارجہ پالیسی کی بنیاد اپنا محلہ اور اپنے گردونواح ہونے چاہئیں۔ کوئی انسان اپنے محلے میں لڑائی جھگڑا کر کے شہر میں عزت نہیں پا سکتا۔ جس کا اپنے محلے میں ہی جھگڑا ہو اس کی شہر میں کوئی اتنی عزت نہیں ہوتی یا وہ اپنے محلے میں برتر ہو بہت ہی زیادہ بہت ہی برتر ہم وہ بھی نہیں پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے لیکن ہم نے اپنے محلے میں پہلے دن سے ہر ایک سے مخالفت لی ہوئی تھی۔ آپ یہ دیکھیں 50 کے عشرے میں ہندوستان سے ہمارا جھگڑا شروع ہو گیا ہے افغانستان سے ہمارا جھگڑا تب سے شروع ہے اسی زمانے میں چین سے ہماری دوستی نہیں بلکہ نفرت تھی روس ہمارے ہمسائے میں تھا سوویت یونین سے دوستی ضروری تھی مگر ادھر جانے کی بجائے وزیراعظم لیاقت علی خان امریکہ چلے گئے روس کا دورہ منسوخ کر دیا گیا۔

سوال: تو کیا یہ فیصلہ غلط تھا؟

اعتزاز احسن: بالکل غلط فیصلہ تھا دیکھو ناں پاکستان کو پہلے دن سے اپنی خارجہ پالیسی آزاد رکھنی چاہیے تھی۔ جس دن ہم سیٹو اور سینٹو کے رکن بن گئے اس کے بعد سے ہم دو فریقین میں سے ایک فریق کے بالکے بن گئے۔ پھر وہ ہمیں جس طرح مرضی چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ 65ء کی جنگ ہوئی تو

امریکہ نے فاضل پرزہ جات روک دیئے اور جنگ میں ہماری صلاحیت کو اس نے نقصان پہنچادیا۔

سوال: تو کیا امریکہ ایک بااعتماد دوست نہیں ہے؟

اعتزاز احسن: کوئی سپر پاور بااعتماد دوست نہیں ہوتی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ ہمیں جاننا چاہیے تھا کہ ہر ریاست کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور وہ اسی سے دوستی نبھاتی ہے جس کے ساتھ ان کے اپنے مفادات سے مطابقت ہو صورتحال بدل جائے تو دوستیاں نہیں رہتیں۔ عالمی قانون میں نہ تو کوئی عیسائی دنیا اور نہ کوئی مسلم دنیا ہے سب مفادات کی دوستیاں اور دشمنیاں ہوتی ہیں۔ بھارت کشمیر میں بربریت کررہا ہے کیا پاکستان اسلامی ممالک کی تنظیم سے یہ فیصلہ کرواسکتا ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ اقتصادی رشتے، تعلق، تجارت کو کم کردیں وہ ایسا نہیں کریں گے وہ اپنے مفادات دیکھیں گے ہمیں بھی اپنے قومی مفاد کو دیکھنا چاہیے اگر ہم قیام پاکستان کے فوراً بعد سے دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان توازن رکھتے تو اس کے ہمیں زیادہ فوائد ملتے۔

سوال: کیا ایوب خان کی خارجہ پالیسی بھی غلط تھی؟

اعتزاز احسن: ایوب خان نے ایک بڑا اچھا کام کیا انہوں نے چین سے رجوع کیا۔ اس میں ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی بہت حصہ ادا کیا اور پاکستان نے جب یہ نیا توازن قائم کیا تو بنیادی طور پر سرمایہ دار دنیا اور اشتراکی دنیا کی دو طاقتوں کے درمیان توازن قائم ہوا تب سے پاکستان کو بہت فائدے حاصل ہونا شروع ہوگئے۔ 1980ء کے عشرے میں ضیاء الحق کے دور میں پاکستان پھر سے امریکہ کا آلہ کار بن گیا۔

سوال: اب پھر جنرل پرویز مشرف نے بڑا اچھا کیا انہوں نے نئے سرے سے امریکہ اور چین کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے؟

اعتزاز احسن: انہوں نے چینی وزیراعظم کو بلاکر اچھا کیا ہے۔

سوال: تو کیا توازن قائم ہوگیا ہے؟

اعتزاز احسن: نہیں مطلب یہ ہے کہ اگر جنرل پرویز مشرف اچھا کام کرے گا تو میں اس کو اچھا کہوں گا اور برملا کہوں گا مجھے اس میں عار نہیں ہے چین کے ساتھ دوستی پاکستان کے لیے بڑی اہم ہے اور چینی وزیراعظم کی پاکستان آمد کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں حکومت چین کے ساتھ تعلقات استوار رکھے گی اور ان کو مستحکم و مضبوط کرے گی تو یہ اچھی بات ہے۔

سوال: چودھری صاحب! آپ مشرقی پاکستان کے المیے کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

اعتزاز احسن: مشرقی پاکستان کو یہ احساس ہونا شروع ہوگیا تھا کہ اس کی ترقی اور خوشحالی کے

لیے وہ کچھ نہیں کیا جا رہا جو مغربی پاکستان کے لیے کیا جاتا ہے پھر یہاں مغربی پاکستان میں بھی بڑی عجیب سوچ تھی پاکستان بننے کے بعد ہم نے یہاں نئے ہندو بنانے شروع کر دیئے۔

سوال: وہ کیسے؟

اعتزاز احسن: ہم نے ہندو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بنائے۔1953ء میں ہم نے نئے ہندو بنا دیئے اور ایک اینٹی احمدیہ موومنٹ چلا دی۔اس کے بعد ہم نئے ہندو بناتے گئے جہاں ہمیں برداشت سے کام لینا چاہیے تھا۔ جہاں ہمیں قائداعظم کے اس قول پر عمل کرنا چاہیے تھا کہ آپ کا تعلق کسی مذہب سے ہو یا آپ کا کوئی بھی عقیدہ ہو آپ سب برابر کے پاکستانی ہو۔لیکن ہم نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور گروہ بندیاں پیدا کر دیں۔ بنگالی اور مغربی پاکستانی بھی بنا دیئے۔ہم آپس کی لڑائی لڑ رہے ہیں سائنس کہاں پہنچی ہوئی ہے۔آج کی ایک بھی جدید ایجاد کسی مسلمان نے نہیں کی کسی مسلمان نے تھرمامیٹر نہیں بنایا۔ بیرومیٹر نہیں بنایا، بلڈ پریشر کی مشین نہیں بنائی، ایکسرے نہیں بنایا، پینسلین نہیں بنائی، فاؤنٹین پین نہیں بنایا، کمپیوٹر نہیں بنایا، ٹیلی فون نہیں بنایا، فیکس مشین نہیں بنائی، بجلی، بجلی جس سے اندھیرے منور ہو رہے ہیں ہم کہتے ہیں کہ ہتھیار دیکھ لیں جن سے ہم لڑتے ہیں مگر یہ بھی غیروں نے بنائے ہیں۔

سوال: جناب مغربی دنیا کو علم کی روشنی سے تو مسلمانوں نے ہی منور کیا تھا؟

اعتزاز احسن: یہ آپ ہزار سال پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ میں آج کی بات کر رہا ہوں۔ پچھلا ایک ہزار سال پورے کا پورا ان کا تھا ہم یعنی مسلمانوں نے کیا کیا ہے۔

سوال: دیکھیں علم اور ایجادات مغرب نے مسلمانوں سے سیکھی ہیں؟

اعتزاز احسن: یہ تو اب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ تو اب روتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں پنجابی میں جس کو روندو کہتے ہیں یہ روندوؤں والی باتیں ہیں۔فراخ دلی سے تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم ابھی تک اس پر ہی جھگڑے کر رہے ہیں کہ شلوار ٹخنوں سے اونچی ہونا چاہیے یا نیچی ہونا چاہیے۔نماز کے وقت ہاتھ بندھے ہونے چاہئیں یا کھلے۔داڑھی کہاں تک ہونی چاہیے ہم ان چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں اور لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔

سوال: معاشی طور پر پسماندہ رہنے کی وجہ کیا ہے؟

اعتزاز احسن: پیچھے رہ جانے کی وجہ میری نگاہ میں یہ ہے کہ ہم نے اپنے عقیدے اور مسلک کو حتمی، مکمل اور نافذ کرنے والا نظریہ بنا دیا ہے ہم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو میرا مسلک ہے اسی پر سب کا ایمان ہونا چاہیے۔اس پر جس کا ایمان نہیں وہ واجب القتل ہے اس کو تباہ کر دو مغربی دنیا یا جو قومیں آگے

بڑھی ہیں۔انہوں نے شک کواور سوال کو حتمی سمجھا ہے اوراختلاف رائے کو برداشت کرتی ہیں۔

سوال: دیکھیں چودھری صاحب! وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے اس لیے ہر معاملہ میں شک کر سکتے ہیں مسلمان تو ایسا نہیں کر سکتے؟

اعتزاز احسن: آپ شک کریں یا نہ کریں آخر خدا کو ماننے والوں کے بھی تو 72 فرقے ہیں۔ کس کا عقیدہ مکمل ہے ہر کوئی سمجھتا ہے کہ میرا ہی عقیدہ مکمل ہے۔مغربی دنیا نے سوچا اگر کسی کا کوئی مسلک ہے تو اس سے نہ صرف آپ کو اختلاف کرنے کا حق ہے بلکہ اس پر میرے بچوں اور طالب علموں کو بھی شک کرنے کا حق ہے۔انہوں نے ہر بات کو شک، سوال اور عقل کے تابع کر دیا۔ہم نے ہر بات کو مسلک کے اندھے اعتماد کے تابع کر دیا۔اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ اس کی کتاب پر بلائنڈ فیتھ ہونا چاہیے لیکن ہم نے سوچ کے جو دیگر راستے تھے ان کو بھی بتدریج بند کرنا شروع کر دیا۔عورت کس طرح رہے گی۔اس کا رہن سہن کیا ہوگا؟ جو میں سوچتا ہوں وہی میں آپ پر لاگو کروں گا۔لباس کس طرح کا پہنوں گا، وہ میں سوچتا ہوں۔وہی آپ پر میں لاگو کروں گا۔داڑھی بڑی ہوگی، چھوٹی ہو گی، جو میں سوچتا ہوں وہ آپ پر لاگو کروں گا شلوار ٹخنوں سے اوپر ہوگی یا نیچے ہوگی جو میں سوچتا ہوں وہ آپ پر بھی لاگو کروں گا۔

سوال: مسلم دنیا کے ممالک کا اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ان میں سیاسی نظام اور معاشی نظام کے حوالے سے کوئی متفقہ صورت نظر نہیں آئی؟

اعتزاز احسن: مسلم دنیا سے پہلے پاکستان کو دیکھیں میری نگاہ میں ذاتی طور پر علامہ اقبال اور قائداعظم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ہم نے اس کو اسلامی ریاست بعد میں بنانے کا عمل شروع کر دیا۔مسلم ریاستوں میں یہ باتیں تو اتنا مسئلہ نہیں دنیا میں 46 مسلم ریاستیں ہیں۔جن میں سے صرف چار اسلامی ریاستیں ہیں۔مسلم ریاستیں وہ ہیں جن میں مسلمان آباد ہیں اور وہاں پر ان کی اکثریت ہے۔جن میں اردن، شام، عراق، مصر، مراکش، ملائشیا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش وغیرہ شامل ہیں۔اس طرح کی 46 مسلم ریاستیں ہیں۔ان میں سے صرف چار اسلامی ریاستیں اسلامی ہیں۔اسلامی ریاست وہ ہے، جس میں شریعت نافذ ہے۔42 ایسی مسلم ریاستیں ہیں جنہوں نے عہد حاضر کے مطابق نئے نظام ہائے حکومت وضع کیے گئے ہیں۔اور چار وہ ہیں جو اسلامی ہیں اب اسلامی ریاستیں صرف چار ہیں دو کے پاس تو تیل کی دولت ہے سعودی عرب اور ایران دونوں ممالک میں ایک ہی مسلک ہے اس کے بعد افغانستان اور صومالیہ دو ایسی اسلامی ریاستیں ہیں جن کے پاس تیل کی دولت نہیں اور آپ ان دونوں ملکوں کے حالات دیکھ لیں کیا ہیں؟

سوال: جناب ایک دوسرا نقطہ نظر بھی ہے کانگریس کہتی تھی کہ ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر ملک بنے گا تو پھر مذہبی تفریق میں مزید اضافہ ہوگا؟

اعتزاز احسن: قائداعظم اور علامہ اقبال کے ذہنوں میں نئے ملک کا اور خاکہ تھا یہ میرے نہیں علامہ اقبال کے الفاظ ہیں۔ ''نہ ہی ہندوؤں کو یہ خدشہ ہونا چاہیے کہ ایسی خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کا مطلب ان ریاستوں میں مذہبی حکومتوں کا قیام ہے''۔ یہ بات واضح ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان ریاست میں ہندوؤں کو مکمل تحفظ ہونا تھا اور علامہ اقبال کے ذہن میں بھی مذہبی ریاست کا تصور نہیں تھا۔ پھر جب نابالغوں کی شادیوں کی انسداد کو روکنے کا قانون پاس ہو رہا تھا تو برصغیر کے تمام علماء نے کہا کہ یہ قانون غلط ہے اسلام ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے اس موقع پر قائداعظم نے فرمایا ''معاشرے کے اصلاح کار کو ہمیشہ ایسی بنیاد پرستی کا سامنا رہا ہے جس کے پس پردہ بھی عقائد، جذبات اور احساسات ہوتے ہیں۔ جو قابل فہم بھی ہیں انسانیت کے نام پر میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جب مذہب نام پر ہمیں عوامی دباؤ کا سامنا ہو اور ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ اس معاملے کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اندر اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ بے باکی سے کہہ سکیں کہ ہمیں ان باتوں سے خوف زدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علماء کی اس تحریک کے خلاف قائداعظم بول رہے تھے۔ جو 1972ء کے Child Marriage Restraint Act کے خلاف ان کی تقریر کا حصہ ہے اور پھر قائداعظم نے ایک اپنی بات کی تقریر میں جو واضح طور پر کہا کہ ''مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریتی اور اقلیتی ہندو اور مسلم بلکہ مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی اور ہندوؤں میں برہمن، کھشتری، ویش اور پھر بنگالی اور مدارسی کے درمیان تفاوت مٹ جائے گی''۔

''اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو درحقیقت ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری اور حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی مذہبی اختلافات تھے اگر یہ اختلافات حائل نہ ہوتے تو ہم بہت پہلے آزادی حاصل کر چکے ہوتے۔ لہٰذا ہمیں اپنی محکومیت سے سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں۔ آپ اس مملکت پاکستان میں اپنے مندروں اپنی مسجدوں اور عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ ریاست کو اس امر سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کا تعلق کس مذہب، ذات اور نسل سے ہے''۔

سوال: آپ کی باتیں بجا...... لیکن دوسرا نقطہ نظر جو ہم اکثر سنتے ہیں قائداعظم کے دوسرے فرمودات سنائے جاتے ہیں ان فرمودات کے مطابق کہا جاتا ہے ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنائیں گے اب کون سی بات کو مانیں فرمودات تو دونوں طرح کے ہیں؟

اعتزاز احسن: میری نگاہ میں اور قائداعظم کی نگاہ میں اور علامہ اقبال کی نگاہ میں پاکستان کو

مسلم ریاست بنانے کا ایک ہی رستہ ہے اور وہ جمہوریت اور پارلیمان کے ذریعے فیصلے کرنے کا ہے پارلیمنٹ کے پاس اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ اگر چاہے تو یقیناً پاکستان کو مسلمان ریاست سے اسلامی ریاست بنا سکتی ہے پارلیمنٹ ریاست سے اسلامی ریاست بنا سکی ہے پارلیمنٹ میں مذہبی جماعتوں کو تو ووٹ ہی نہیں ملتے۔ لوگ ان کے پیچھے نہیں جاتے۔ آج تک ان کو کل ملا کے 5 فیصد ووٹ نہیں ملے کسی بھی الیکشن میں انہیں اس سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔

سوال: لیکن ان کا پورے معاشرے پر اثر ہے وہ بڑا موثر پریشر گروپ ہے؟

اعتزاز احسن: ہاں پریشر گروپ ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ان کی بات نہیں چلتی۔ پریشر گروپ کی حد تک میں انہیں جانتا ہوں لیکن قائداعظم نے کہا تھا کہ ہم ان کے یرغمالی تو نہیں بن سکتے۔ سب تمام مذہبی جماعتوں کو 90 فیصد اکثریت حاصل ہو جائے تو پھر جیسا چاہیں پاکستان کو بنا دیں لیکن پھر مشکل یہ آئے گی کہ کون سا مسلک نافذ ہو گا۔

سوال: چودھری صاحب! یہ سیاستدانوں پر کرپشن کے الزام عائد کیا جاتا ہے اور لوگ اس الزام کو کچھ جائز بھی سمجھتے ہیں۔ سیاستدانوں کی شہرت کافی خراب ہے۔ آپ بھی اسی کوچے کے شہسوار ہیں آپ کا اس حوالے سے کیا تبصرہ ہے؟

اعتزاز احسن: یہ الزام تو یقیناً بہت لگایا جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ احتساب ہونا چاہیے۔ بالکل یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ الزام درست ہے یا غلط اس بات کا فیصلہ تو ایک ایسا عدالتی نظام ہی کر سکتا ہے جو شفاف اور غیر جانبدار ہو اور جس کے سامنے ہر ایک پیش ہو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اپوزیشن کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے اور جو پارٹی حکومت میں آ گئی وہ احتساب سے آزاد ہو گئی ایسا دوغلا احتساب نہیں چل سکتا۔

سوال: چودھری صاحب! کیا آپ کی رائے میں ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیوں کی ورکنگ شفاف ہے؟

اعتزاز احسن: بات یہ ہے کہ میرے خیال میں سیاسی جماعتوں کے علاوہ آپ کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے اور دو تین یا چار جو بڑی جماعتیں ہیں وہ وفاق کی سیاست کر رہی ہیں ان کے بغیر چارہ نہیں ہے ان کو دبانے یا ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو پھر علیحدگی پسند چھوٹی چھوٹی جماعتیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔

سوال: مسئلہ کشمیر کیسے حل ہو سکتا ہے؟

اعتزاز احسن: مسئلہ کشمیر بالآخر بات چیت کے ذریعے حل ہو گا فوجی حل کم از کم تین مرتبہ

آزمایا جاچکا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں اس کا نتیجہ کوئی نہیں نکلا۔ مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔

سوال: کیا صوبوں کو مزید خودمختاری ملنی چاہیے؟

اعتزاز احسن: صوبوں کو مزید خودمختاری ملنی چاہیے۔ صوبوں کو خودمختاری دینے سے پاکستان یقیناً مضبوط ہوگا۔

سوال: 1973ء کے آئین میں جو خودمختاری کی جو حد ہے کیا اس سے آگے بڑھنا چاہیے؟

اعتزاز احسن: 73ء کے آئین میں صوبوں اور مرکز کے مشترکہ اختیارات کی جو فہرست دی گئی ہے وہ اس وقت تک ختم ہو جانی چاہیے تھی اس لیے صوبوں کو مزید خودمختاری دینا 1973ء کے آئین کے مطابق ہے۔

سوال: چودھری صاحب! یہ جو لوگ مارشل لاء لگاتے ہیں ان پر آرٹیکل 6 کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا انہیں علامتی سزا ہی دے دی جائے؟

اعتزاز احسن: پنجابی میں کہتے ہیں ''ڈاڈے دیاں ستے ویاں سو'' جب کوئی طاقتور ہو تو اس کا حساب کون لے سکتا ہے۔

سوال: یہ فرمائیں کہ خواتین کو کس حد تک آزادی ملنی چاہیے؟

اعتزاز احسن: خواتین ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ خواتین کے بارے میں ہمارے معاشرے کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہم خاتون کو ایک مسئلہ سمجھتے ہیں اور ہمارا رویہ یہ ہوگیا ہے کہ خاتون کو میرے سامنے سے ہٹا دو۔ اس کو برقع میں ڈال دو، اس کو پردے میں لے جاؤ۔ یہ سامنے آگئی اور مجھ سے کچھ ہوگیا تو میرا قصور نہیں ہے۔ اب یہ کہ جی خاتون چلتی پھرتی ایک دعوت گناہ ہے۔ یہ سوچ پست پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ معاشروں کا ایک آسیب ہے۔ دنیا میں عورت نے اپنا مقام پایا ہے۔ عورت کہیں بھی مسئلہ نہیں ہے۔ عورت برابر کی شریک ہے۔ عورت اور مرد انسانیت کے سفر اور ترقی کے سفر میں برابر چل رہے ہیں۔ ہمیں بھی اس معاملے سے آگے نکلنا چاہیے۔ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں۔ خود بڑی باحیاء ہیں، نیک ہیں، پارسا ہیں اور ان کو خود معلوم ہے کہ کیا کیا حدود ان کے لیے معاشرتی طور پر متعین ہیں۔ ان کو دفتروں، سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہونی چاہیے ہمیں اپنے بچوں کو، بیٹوں کو یہ سبق سکھانا چاہیے کہ بیٹا یہ بہنیں ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ سفر میں آگے بڑھنا ہے۔ یہ قائداعظم کا پاکستان ہے۔ یہ کسی ملا کا پاکستان نہیں ہے۔ اس میں عورتوں کو بالکل برابری ملنی چاہیے۔

سوال: کیا عدلیہ نے گزشتہ نصف صدی میں اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہیں؟

اعتزاز احسن: جی نہیں، بالکل نہیں کیں اور یہ پاکستان کے لیے بڑی بدقسمتی کی بات ہے پاکستان کا عدالتی نظام انصاف فراہم نہیں کرتا۔ اس میں تاخیر بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس میں بہت کرپشن آ چکی ہے۔

سوال: کیا اعلیٰ عدلیہ کے ججوں میں بھی کرپشن موجود ہے؟

اعتزاز احسن: جہاں تک اعلیٰ عدلیہ کا تعلق ہے اس کی سب سے پہلی تو ذمہ داری یہ تھی کہ اپنے فیصلوں سے یہ ماتحت عدلیہ کو بھی مجبور کر دیتی کہ فیصلے جلدی کرو، جتنی تاخیر ماتحت عدلیہ میں ہوتی ہے اس قدر ہی تاخیر اعلیٰ عدلیہ میں بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ جس طرح فوجی کمانڈر آئین سے بالاتر ہیں اس طرح عدلیہ بھی آئین سے ماورا ہے۔

سوال: اس بات کو ذرا تفصیل سے بیان کریں؟

اعتزاز احسن: مثلاً کہ اب ایک ایسے وقت میں بھی کہ جب کہ آئینی حکومت نہیں ہے اس وقت آئین سے انحراف ہے۔ سو آئین کے انحراف کو جب عدالتیں جواز بخشتی ہیں تو عدالتوں کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔ 1985ء سے لے کر 1999ء تک کے جمہوری ادوار میں عدلیہ نے بڑے عہد ساز اور مدلل فیصلے دیئے ہیں اور اس عرصے کو عدالتی روشن خیالی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جب آئین سے انحراف کا وقت آتا ہے تو پھر عدلیہ کا بھی گریز کا وقت آ جاتا ہے تو 1947ء سے یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے۔

سوال: کیا ججز کیس کا فیصلہ آئین سے انحراف تھا یا آئین کی تشریح کے مطابق تھا؟

اعتزاز احسن: نہیں ججز کیس میں بھی ایک بہت بڑا سقم تھا اور وہ یہ تھا کہ ججز کیس میں سنیارٹی مقرر کی گئی تھی لیکن اس کا اطلاق سجاد علی شاہ پر نہیں کیا یہ تو بعد میں جب نواز شریف اور سجاد علی شاہ کی لڑائی چلی تو فیصلہ سامنے آیا سجاد علی شاہ کو ججز کیس کے تحت چیف جسٹس کا عہدہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

سوال: کیا یہ سچ ہے فوج اور عدلیہ دونوں پیپلز پارٹی کے بارے میں تعصب رکھتی ہیں کم از کم بے نظیر بھٹو کا یہی خیال ہے؟

اعتزاز احسن: دیکھیں جنرل ضیاء الحق کے دور میں بہت ساری تقرریاں اور ترقیاں ہوئیں یہ ایک ایسا دور تھا جس میں ایسے لوگ اور ایسی شخصیات ان اداروں میں آئیں جن کو یقیناً کسی نہ کسی حد تک پیپلز پارٹی ناپسند تھی اور بہت سے لوگوں کی تو ترقیاں ہی اس بنیاد پر ہوتی رہیں لیکن میرا خیال ہے کہ گزشتہ 10,8 سال میں وہ اثر اگر ختم نہیں ہوا تو بہت کم ہو گیا ہے اب صورت حال بہت بہتر ہے اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فوج اور عدلیہ پیپلز پارٹی کے خلاف ہیں۔ اس وقت عدلیہ اور فوج دونوں میں

ایسی شخصیات ہیں جن کو شاید پیپلز پارٹی سے محبت نہ ہو ہر کسی کا اپنا اپنا ذہن ہے اور ہونا چاہیے لیکن اب ایسی شخصیات نہیں ہیں جنہیں پیپلز پارٹی سے نفرت تھی۔

سوال: چودھری صاحب کیا آپ مہنگائی کا اثر محسوس کرتے ہیں؟

اعتزاز احسن: مہنگائی کس کو نہیں محسوس ہوتی جس دن بجلی یا ٹیلی فون کا بل آتا ہے یا جب پٹرول ڈلواتا ہوں تو بہت حیرت ہوتی ہے کہ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے۔

سوال: چودھری صاحب آپ نے مقابلے کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود اسے جائن نہیں کیا تو کیا بیوروکریسی کو برا سمجھتے ہیں؟

اعتزاز احسن: دیکھیں جی حقیقت یہ ہے کہ میری سول سروس میں داخل ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ 69-1968ء کی بات ہے کہ میں ایک نوجوان کی حیثیت سے محفل میں بیٹھا تھا میں ان دنوں ولایت سے نیا نیا آیا تھا وہاں پر میں نے کچھ بات کرنے کی کوشش کی تو ایک وفاقی سیکرٹری کی سطح نے کہا کہ برخوردار کیا آپ نے سول سروس کا امتحان دیا ہے؟ میں نے کہا کہ جی نہیں تو انہوں نے کہا کہ پھر آپ کو بات کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں علم و دانش کا معیار یہی ہے۔ اس واقعے کے بعد میں نے سول سروس کا امتحان دینے کا سوچا میرے دوست اور آج کے اداکار راحت کاظمی اور وسیم سجاد کے چھوٹے بھائی آصف سجاد مری سے آ رہے تھے ہم نے پنڈی میں داخلہ فارم جمع کروا دیئے دو مہینے بعد کال آ گئی اور میں امتحان میں بھی بیٹھ گیا۔

سوال: تو کیا آپ نے تیاری نہیں کی تھی؟

اعتزاز احسن: ٹھیک ہے کچھ تیاری تو کی تھی یہ نہیں کہتا کہ بالکل تیاری نہیں تھی لیکن سچ یہ ہے کہ جس دن میرا انٹرویو تھا اس دن صبح ساڑھے سات بجے لاء کالج میں اپنا لیکچر دیا اور امتحان والے ایک دن میں بار کونسل کے لیے ملتان اور وہاڑی ووٹ مانگتا رہا اس لیے میں فرسٹ آنے پر بہت حیران ہوا۔ اکیڈمی جانے کے دن قریب آئے تو والدہ کہنے لگیں سوٹ بنوا لو تو تب میں نے کہا کہ میں جوائن نہیں کروں گا میرے ماموں گجرات سے آئے انہوں نے کہا کہ جس دن سے تمہارا نتیجہ آیا ہے ہر طرف سے تیرے رشتے آ رہے ہیں جس دن اخبار میں خبر آئی میں سول سروس جوائن نہیں کر رہا میری مارکیٹ گر گئی۔ (قہقہے)

سوال: تو کیا آپ وکالت کو بہتر پیشہ سمجھتے تھے؟

اعتزاز احسن: یہ فیصلہ آسان نہیں تھا افسری میں بہت دلکشی تھی اس وقت میری وکالت کچھ نہیں تھی لیکن دوسری طرف شاندار کیریئر تھا۔

سوال: تو کیا آپ افسری کے خلاف تھے؟

اعتزاز احسن: اس وقت ہم کچھ انقلابی سے ہوا کرتے تھے میرا اور میرے دوستوں کا ذہن پیپلز پارٹی والا تھا پھر اسی دوران میری ملاقات بھٹو صاحب سے بھی ہوگئی بس پھر لگتا تھا کہ دنیا کو تبدیل کرنا، غربت کو مٹانے کا خواب تھا۔

سوال: کیا اب بھی وہ خواب ہے یا ختم ہو گیا ہے؟

اعتزاز احسن: اب وہ خواب اتنا واضح نہیں ہے۔

سوال: کیا مایوسی ہوگئی ہے؟

اعتزاز احسن: اسے مایوسی تو میں نہیں کہتا، پر کچھ زیادہ بے بسی ہے۔

سوال: چودھری صاحب پھر آپ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور آپ کو اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے ضمنی الیکشن کا ٹکٹ مل گیا اور آپ وزیر بن گئے؟

اعتزاز احسن: اصل میں 1970ء کے الیکشن میں بھی بھٹو صاحب نے والد صاحب کو یہ کہا تھا کہ وہ الیکشن لڑیں مگر وہ سیاست میں اس طرح حصہ نہیں لینا چاہے تھے اور انہوں نے کہا کہ میرا بیٹا لڑے گا۔ میری عمر اس وقت کم تھی لیکن یہ ٹھیک ہے کہ موقع پھر 1975ء میں ملا بھٹو صاحب نے مجھے پشاور بلایا ان کی یادداشت تیز تھی اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھے نوید دی کہ تم نے ضمنی الیکشن لڑنا ہے تمہیں ٹکٹ مل رہا ہے۔

سوال: آپ الیکشن جیتے، وزیر بنے لیکن جب پیپلز پارٹی پر بحران آیا تو آپ پارٹی چھوڑ گئے یہ تو بڑی زیادتی تھی یہ اقدام سیاسی اخلاق کے خلاف تھا؟

اعتزاز احسن: ہوا یوں کہ 8 اپریل 1977ء کو گورنر ہاؤس لاہور میں پنجاب کابینہ کا اجلاس ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ 9 اپریل کے انتظامات یہ ہیں۔ اس دن جلوس نکلنے تھے میں نے کہا کہ اس طرح کے سخت اقدامات غلط ہیں میں نے ریکارڈ پر پنجاب کابینہ کے اجلاس میں اختلاف کیا دوسرے دن وکلاء پر گولی چلی تو میں نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا مگر دوسرے روز مجھے پارٹی سے نکال دیا گیا۔

سوال: اس وقت آپ کے استعفیٰ کا مطلب تو مارشل لاء لگوانے کے مترادف تھا اور جو لوگ بھٹو سے الگ ہو رہے تھے ان کے کچھ اور عزائم بھی تھے۔

اعتزاز احسن: نہیں! وہ ٹھیک ہے میں آپ کو پورا پس منظر بتا رہا ہوں دوسرے لوگوں نے تو پارٹی سے بھی استعفے دیئے میں نے پارٹی سے استعفیٰ نہیں دیا یہ بڑا واضح فرق ہے میں نے استعفے میں لکھا کہ مجھے کابینہ کے فیصلہ سے اختلاف ہے اس لیے میں مستعفی ہوتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ لکھا کہ میں پارٹی

کی خدمت جاری رکھوں گا اور پارٹی میری جو بھی دوسری ڈیوٹی لگائے گی میں وہ ادا کروں گا۔

سوال: کیا قومی اتحاد کی تحریک امریکہ کے اشارے پر چلی تھی؟

اعتزاز احسن: اشارہ تو خیر ضروری نہیں لیکن امریکہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا ہمارے سیاستدان امریکہ کے اشاروں پر تو کام نہیں کرتے لیکن اگر امریکہ کی پالیسی کو فائدہ پہنچے تو ظاہر ہے امریکہ کیوں فائدہ نہیں اٹھائے گا بھٹو صاحب نے جب ایٹمی پروگرام پر امریکہ کے دباؤ کا مقابلہ کیا تو امریکہ بہر حال ان کے خلاف تھا۔ قومی اتحاد کی تحریک نے ایک طرح سے مارشل لاء کا راستہ ہموار کیا چاہے یہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تھا۔ فوج اور ضیاء الحق نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ امریکہ کا بھی مقصد حل ہو گیا فوج کا براہ راست مقصد حل ہوا۔ پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں منفی عنصر یہ تھا کہ انہوں نے جمہوریت یا دوبارہ انتخاب کی شرط کو ختم کر دیا۔

سوال: قومی اتحاد کے رہنما تو کہتے ہیں کہ انہوں نے دوبارہ انتخابات کی شرط مان لی تھی؟

اعتزاز احسن: وہ تو کہتے ہیں کہ 4 جولائی کو مان گئے تھے پر ایئر مارشل صاحب نہیں مانے تھے سارے حلقے نہیں مانے تھے۔ ضیاء الحق کی کابینہ میں بھی تو چلے گئے سارے لوگ۔ ضیاء الحق کی کابینہ میں نہ جاتے تو ہم کہتے کہ واقعی یہ جمہوریت پسند تھے۔

سوال: پیپلز پارٹی کے بعد آپ تھوڑا عرصہ آزاد رہے اور پھر تحریک استقلال میں شامل ہو گئے جو اس وقت ضیاء الحق کی بی ٹیم تھی؟

اعتزاز احسن: نہیں، میں نے جب تحریک استقلال کو جوائن کیا تو حالات بدل گئے۔ اگر شروع میں یہ کوئی بی ٹیم تھی تو ہم دو چار لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس بات کو برداشت نہیں کیا۔ بہر حال مارشل صاحب (ایئر مارشل اصغر خان) تو مجھے شرارتی عنصر سمجھتے تھے۔ مثلاً میں آپ کو مثال دیتا ہوں۔ یہ فیصلہ تحریک استقلال نے قطعی طور پر نہیں کیا تھا کہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کی مزاحمت کرنی ہے۔ لیکن ہم تحریک اسقلال کے چند وکلاء تھے جنہوں نے وکلاء تحریک میں آگے بڑھ کر تحریک استقلال کو اس تحریک میں شامل کر دیا راولپنڈی سے ظفر علی شاہ اور لاہور سے میں اور میاں محمود علی قصوری صاحب تھے۔ ہم نے اس تحریک میں ایسا تحریک استقلال کو پھنسایا کہ وہ اس سے نکل ہی نہ سکی جب کہ وہ ایم آر ڈی میں شامل ہونے پر بھی مجبور ہوئی اس لیے میرے سے ایئر مارشل صاحب پریشان بھی تھے اور بالآخر 1985ء میں انہوں نے مجھے تحریک استقلال سے خود نکال دیا۔

سوال: کس بنیاد پر نکال دیا؟

اعتزاز احسن: انہوں نے باقاعدہ چارج شیٹ دی ایک الزام یہ تھا کہ میں نے لندن میں

حفیظ پیرزادہ سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ وہ اس وقت سندھ بلوچ پختون فرنٹ کے رہنما تھے۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ جب میں لندن میں ہی تھا تو ایئر مارشل گجرات گئے۔ گجرات میں جب ان کا استقبال ہوا تو کچھ بینر یہ لگے تھے کہ ایئر مارشل زندہ باد، اصغر خان زندہ باد اور کچھ پر یہ لکھا تھا اعتزاز احسن زندہ باد اور جلسے میں بھی اعتزاز احسن زندہ باد کے نعرے لگ گئے تیسرا الزام یہ لگا کہ آپ نے قائد تحریک کی ذات کو پس پشت ڈال کر اپنے نعرے لگوائے۔

سوال: تو کیا ایئر مارشل صحیح جمہوری رہنما نہیں تھے؟

اعتزاز احسن: یہ تو نہیں کہہ سکتا بہر حال فصیح الدین وردگ نے مجھے نوٹس بھیجا۔ انکوائری کمیٹی نے میرے خلاف رپورٹ دی اور آج پاکستان کی وزیر قانون شاہدہ جمیل اس کمیٹی کی سربراہ تھیں۔ (زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے)

سوال: اختلافات تو شاید پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے؟

اعتزاز احسن: اختلافات تو کچھ تھے مارشل صاحب سے۔

سوال: آپ انہیں ایئر مارشل نہیں مارشل صاحب کہہ رہے ہیں کیا ایسا طنزیہ کہہ رہے ہیں؟

اعتزاز احسن: مارشل صاحب آپ کہہ لیں میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہر حال مارشل صاحب کا بڑا کردار ہے پاکستان کی سیاست میں انہوں نے اچھا کردار ادا کیا ہے۔ غلطیاں اور خامیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں ہم میں بھی ہیں خاص کر اگر جمہوریت کی بحالی کے لیے نہیں تو صرف سول معاشرے کے قیام، سول سوسائٹی کی بحالی کے لیے انہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے انہوں نے انتہا پسندی اور ملائیت کی جس طرح مخالفت کی ہے وہ قابل داد ہے۔

سوال: چودھری صاحب! پھر اس کے بعد بے نظیر بھٹو سے آپ کا رابطہ ہوا آپ ان کے پہلے وکیل بنے پھر ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایم این اے کا الیکشن لڑا۔ پھر وزیر داخلہ بن گئے بطور وزیر داخلہ آپ کے دور میں سندھ میں بڑی گڑبڑ ہوئی۔ یہ کہوں کہ آپ انتہائی غیر مؤثر وزیر داخلہ تھے تو غلط نہ ہوگا؟

اعتزاز احسن: جی اس وقت سندھ میں بہت مسائل تھے بغاوت کے حالات تھے اور اغوا برائے تاوان کے بہت سے مقدمات سامنے آ رہے تھے۔ بوری بند لاشیں آتی تھیں اس وقت ہمارے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ صاحب تھے اس میں شک نہیں کہ ہم اس صورتحال کو روکنے کے لیے موثر اقدامات نہیں کر سکے۔ ہماری دو بنیادی منصوبوں، مقاصد میں ہم قدرے ناکام ہوئے۔ پاکستان کی سویلین، جمہوری، منتخب، پارلیمانی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ ہم ڈاکوؤں کو روکنے کے لئے آپریشن اور کراچی

میں امن کے لئے فوج کے کچھ دستے استعمال کریں۔ ہمیں ناکامی اس بات پر ہوئی کہ فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے فوج کو اس عمل میں سول حکومت کے حوالے کرنے یا ماتحت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کو آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت اختیارات دیئے جائیں۔ آرٹیکل 245 کے تحت اگر ہم اختیارات دیتے تو بنیادی حقوق ایک دم معطل ہو جاتے ہیں۔ دوسری ان کی یہ خواہش تھی کہ آرٹیکل 245 کے تحت وہ فوجی عدالتیں قائم کریں ہم یہ دونوں کام نہیں کرنا چاہتے تھے اور ہماری رائے یہ تھی کہ فوج آرٹیکل 147 کے تحت سول حکومت کی امداد کے لیے آ سکتی ہے اور ہم یہ چاہتے تھے فوج صوبائی سول حکومت کے ماتحت کام کرے۔ اس سے فوج نے انکار کر دیا اور پاکستان کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ افواج پاکستان منتخب، پارلیمانی سول حکومت کی ماتحتی کرنے کو تیار نہیں ہوئی میں یہ نہیں کہتا کہ ہر بات پر انکار کرتے ہیں۔ جب فوج انکار کرتی ہے تو حکومت بے بس ہوتی ہے۔ حکومت اس کے بعد کیا کر سکتی ہے۔ ایک نواز شریف نے کوشش کی ناں۔ حکومت زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہے ناں کہ آرمی چیف کو ہٹا دے۔ جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دیا نواز شریف نے آرمی چیف کو ہٹانے کی کوشش کی اور جیل چلے گئے اس کے بعد کیا کوئی سویلین حکومت کسی فوج آرمی چیف کو ہٹانے کی کوشش کرے گی؟ ہرگز نہیں یہ پاکستان کے ساختیاتی ڈھانچے کی بہت بڑی خرابی ہے۔

سوال: پکا قلعہ آپریشن میں کیا ہوا تھا؟

اعتزاز احسن: میں اس طرف آتا ہوں دوسرا مسئلہ جو آپ میں عرض کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ آپریشن کیا جائے۔ سندھ حکومت کے خفیہ اداروں نے اسلحہ جمع ہونے کی رپورٹ دی تھی انہوں نے کوئی 5 یا 6 اضلاع کی پولیس منگوائی۔ حیدر آباد میں پکا قلعہ کا محاصرہ کیا گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن پتا چلا کہ جی سامنے سے فوج کے دستے آ گئے اور پولیس اور فوج کا آمنا سامنا ہو گیا۔

سوال: فوج کیوں آ گئی؟

اعتزاز احسن: اسلم لیگ نے جی او سی جاوید اشرف قاضی (موجودہ وزیر ریلوے) کو براہ راست حکم دیا کہ پولیس کو روکو پھر مجھے وزیراعلیٰ نے فون کر کے پوچھا کہ کیا کریں؟ میں نے کہا بھئی آپریشن روک دو۔ ایک طرف تو صوبائی مسلح طاقت ہے۔ ٹھیک ہے وہ کمزور ہے فوج سے بہت کمزور ہے۔ فوج وفاق کی مسلح طاقت ہے تو آپ ان کے درمیان گولیاں تو نہیں چلوائیں گے۔

سوال: اسلم بیگ کو اس آپریشن کے رکنے سے کیا فائدہ تھا؟

اعتزاز احسن: جو ہماری اطلاع تھی کہ جنرل اسلم بیگ اس وقت خود انڈونیشا میں تھے اور وہاں سے بنگلہ دیش آ رہے تھے۔ لیکن ان سے الطاف حسین نے شکایت کی کہ جی یہ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔

یہ ہوا ہے۔ وہ ہو رہا ہے اور انہوں نے براہ راست صوبائی حکومت کے معاملات میں مداخلت کی پھر کیا کیا جا سکتا تھا؟

سوال: آپ اسلم بیگ کو فارغ کر دیتے آخر چیف آف آرمی سٹاف حکومت کا ماتحت ملازم ہی تو ہوتا ہے؟

اعتزاز احسن: (قہقہہ) اسلم بیگ کو فارغ کر دیتے تو اسحاق خان بھی ان کے ساتھ تھے اس وقت بھی یہ کچھ ہوتا جو نواز شریف سے ہوا ہے۔ اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب بھی اسلم بیگ کے ساتھ تھے۔ اس لیے چیف آف آرمی سٹاف کو ایسے ہی فارغ نہیں کیا جا سکتا یہ بچوں کا کھیل نہیں ہوتا کہ جب چاہے آپ اس کو اڑا دیں۔

سوال: اصولی طور پر سول حکومت کو فوج پر اپنی بالا دستی ثابت کرنی چاہیے؟

اعتزاز احسن: کرنی چاہیے اور بالا دستی ہو گی انشاء اللہ اور میرے خیال میں جس طرف آج حکومت پاکستان کو لے کر جا رہی ہے اس سے یہ نتیجہ ہی نکلے گا اور ایک چیز واضح ہو جائے گی کہ حکومت چلانا افواج کا کام نہیں ہے اور افواج یہ احساس ہونے کے بعد اگلے ایک دو سال میں مجبور ہو جائیں گے کہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے جیسا کہ سندھ میں جس قسم کی ہڑتالیں کر رہی ہے اس قسم کی علاقائی ہڑتالیں صرف غیر نمائندہ حکومت کے وقت ہوتی ہیں۔ سارے پاکستان میں تو ہمارے وقت میں بھی ہو سکتی تھی لیکن جو کل سارے پاکستان میں ہڑتال ہوئی ہے وہ حکومت کو تو کمزور کرتی ہے۔ ریاست کو کمزور نہیں کرتی۔ لیکن ایک صوبے یا ایک علاقے کی ہڑتال وہ حکومت کو بھی کمزور کرتی ہے اور ریاست کو بھی کمزور کرتی ہے۔

سوال: پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں کیوں کمی ہوئی ہے؟

اعتزاز احسن: پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں کچھ کمی ہوئی تھی لیکن ابھی جو بلدیاتی انتخابات ہوئے ہیں ان میں تو پیپلز پارٹی نے بہت نشستیں جیتی ہیں۔

سوال: اچھا اگر مقبولیت کم ہوئی تھی تو اس کی وجہ کیا تھی؟

اعتزاز احسن: لوگ ہم سے ضرور ناراض ہو گئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اگر حکومت ہم کو ملی ہے تو سب وارے نیارے ہو جائیں۔ سب کچھ چھو منتر کے ساتھ ایک دم سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ہمارے خلاف پراپیگنڈہ بھی بہت ہوا تھا۔

سوال: کیا آپ سینٹ کی ورکنگ سے مطمئن ہیں کیا سینٹ کے اختیارات میں اضافہ نہیں ہونا چاہیے؟

اعتزاز احسن: سینٹ کی ورکنگ اچھی رہی۔ سینٹ کے اختیارات میں بالکل اضافہ ہونا چاہیے۔

سوال: اختیارات میں اضافہ کس شکل میں ہو کیا فنانس بل کی منظوری کا اختیار بھی سینٹ کو ملنا چاہیے؟

اعتزاز احسن: سینٹ کے الیکشن بالواسطہ نہیں براہ راست ہونے چاہئیں اور پھر سینٹ کو فنانس بل بھی نظر ثانی کے لیے بھیجا جانا چاہیے۔ ججز اور اعلیٰ افسروں کی تقرری کی منظور بھی سینٹ سے ہونی چاہیے۔

سوال: آپ کو 1993ء میں وزیر کیوں نہیں بنایا گیا؟

اعتزاز احسن: یہ لیڈر کی مرضی ہے بھئی میرا تو اس میں اختیار نہیں تھا۔

سوال: وزیر اعظم کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کوئی خاص وجہ تو ہو گی کیا کوئی ناراضگی ہے؟

اعتزاز احسن: میں نہیں جانتا شاید کوئی ہو۔ یہ تو اب سوال ان سے ہی کرنا چاہیے تھا۔ یہ تو محترمہ بے نظیر بھٹو کی اپنی صوابدید تھی۔

سوال: آپ کی علمی رائے سے میں آگاہ ہوں جس کے مطابق آپ ہند اور سندھ کو دو الگ تہذیبیں سمجھتے ہیں اگر آپ کی بات درست مان لی جائے تو پاکستان جواب ایک الگ خطہ ہے اس کے مختلف صوبوں میں تناؤ کیوں موجود ہے۔ یہ بلوچ، پنجابی، پٹھان اور سندھی کشیدگی تو ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر تاریخی طور پر یہ خطہ ہم آہنگ ہے تو اب یہ افتراق کیوں ہے؟

اعتزاز احسن: بات یہ ہے کہ ہم نے دراصل پاکستان کو ایک ایسی بنیاد مہیا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک دوسرے کے اندر جذب کرنے اور سمو لینے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ اس میں تفریق کا عنصر ہے مثال کے طور پر یہی کہ اگر یہی کہا جائے کہ پاکستان صرف اور صرف ایک نظریئے کی بنیاد پر بنا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ملک کے اندر بسنے والی اقلیتوں کا اس میں حصہ نہیں ہے وہ جذب نہیں ہو سکتیں۔ اگر پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے تو پھر پاکستان میں جو ہندو بستا ہے پاکستان میں جو عیسائی بستا ہے پاکستان میں جو دیگر غیر مسلم قومیں بستی ہیں ان کا اس میں پھر وجود ثانوی ہی ہو سکتا ہے برابری کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پھر پاکستان بنا ہی ایک نظریئے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ دیکھیں تو اس میں نظریئے کی ہم آہنگی کو ساتھ رکھتے ہوئے اس نظریئے کی نفی نہیں ہوتی لیکن اس میں ہی نظریئے اور اسلام کی اس بنیاد کو تسلیم کرتے ہوئے ساتھ ساتھ آپ یہ دیکھیں کہ یہ مسلم ریاست دریائے سندھ کی وادی میں ہی کیوں بنتی ہے۔ یہ مسلم ریاست بھارت میں زیادہ مسلمان اکثریت کے علاقے میں کیوں

نہیں بنتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی یہ ایک عنصر ہے لیکن دوسرا عنصر اس میں یہ ہے کہ ثقافتی طور پر کئی ہزار سال سے دریائے سندھ کا علاقہ اور گنگا جمنا کا اور جزیرہ نما ہند کا علاقہ یعنی ہند کا علاقہ ہند اور سندھ میں ایک تفریق تھی اور اس کو ہند اور سندھ کہنے والے سب سے پہلے عرب تھے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے پہچان یا کہ اگر آپ سندھ کو دیکھیں تو ان میں بڑی بنیادی فطری تفریق ہے۔ فطری تفریق اس لیے ہے کہ یہ تہذیبیں جب تک ریلوے لائن نہیں آئی تھی اور سڑک اور موٹر کار نہیں آئی تھی ان کے درمیان واحد ذریعہ رسل و رسائل دریا تھے ریلوے کو آئے ڈیڑھ سو سال ہوئے اور موٹر کار آئے سوا سو سال ہوئے دونوں مغربی ایجادات ہیں جب تک یہ ایجاد نہیں ہوئیں دنیا میں موٹر وے آبی تھیں دریا کے ساتھ ساتھ تہذیبیں تھیں سو اگر ہم اندر سمو لینے والے نظریات کو سامنے رکھیں تو پھر ہم بلوچ، سندھی، پٹھان، کشمیری ان تفریقوں سے ایک بڑی قومیت میں ضم ہو جائیں گے لیکن اگر ہم تفریق رکھیں گے تو پھر یہ ضم نہیں ہوں گی لہٰذا اسلام کے ساتھ ساتھ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس ریاست کی جو بنیادیں ثقافت اور وادی سندھ کے اپنے تشخص میں ہیں اس کو ہمیں رد نہیں کرنا چاہیے ان دونوں کو ساتھ رکھیں گے پھر قومی یک جہتی پیدا ہوگی۔

سوال: چودھری صاحب اگر آپ کی یہ بات مان لی جائے تو پھر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر سندھ کی وادی کے لوگ پہلے جڑے ہوئے تھے یا آپس میں ان کے اندر برداشت کا مادہ موجود تھا تو پھر 1947ء میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں اس قدر نفرت کیسے دیکھنے میں آئی؟

اعتزاز احسن: بات یہ ہے کہ ہندو تو سندھ میں ابھی بھی بہت ہیں یہ ہنگامے زیادہ تر پنجاب میں ہوئے ہیں سندھ میں یہ نہیں ہوا۔ بلوچستان میں بھی یہ نہیں ہوا۔ بلوچستان میں بھی ایک عرصے تک ہندو بھی رہے۔ صوبہ سرحد میں بھی رہے پنجاب میں یہ واقعات کیسے ہوئے اس وقت میں نہیں جانتا بہر حال کسی نہ کسی نے پہلے وار کر دیا ہو گیا اور پھر جب ہجوم کی نفسیات ہوتی ہے اور افواہ چلتی ہے تو پھر حالات بس سے باہر ہو جاتے ہیں بندوق کا پہلا گھوڑا دبانے والے نفرت پھیلاتے ہیں وگرنہ یہ کام خوش اسلوبی سے ہو سکتا تھا۔

سوال: چھوٹے صوبوں کا کہنا ہے کہ پنجاب استحصال کرتا ہے ایسا کیوں ہے؟

اعتزاز احسن: پنجاب بڑا صوبہ ہے۔ پنجابیوں کا بھی بہت استحصال ہوتا ہے خود پنجابی بھی بہت مظلوم ہے؟

سوال: جب پنجاب دوسروں کے استحصال کا تماشا دیکھے گا اور اسے روکنے کی کوشش نہیں کرے گا تو پھر اسے ذمہ دار تو ٹھہرایا جائے گا؟

اعتزاز احسن: نہیں میں کہتا ہوں پنجاب اور پنجابی تو خود استحصال ہوتا ہے اس کا استحصال اسی طرح ہوتا ہے جس طرح سندھی کا یا بلوچی کا ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر چونکہ صوبہ بڑا ہے تو استحصال کا الزام زیادہ تر اسی پر لگتا ہے۔ ایک، نمبر 2 ریاستی مشینری میں اور فوج میں چونکہ زیادہ تر لوگ پنجاب ہی سے جاتے ہیں اس لیے بھی الزام لگتا ہے۔ پنجاب نے مزاحمت بھی بڑی کی ہے۔ آپ دیکھیں ضیاء الحق نے جب مارشل لاء لگایا اور کوڑے برس رہے تھے تو یہ صرف پنجابی ہی تھے جنہوں نے مزاحمت کی 8 پنجابیوں نے خودسوزی کی تھی۔

سوال: الزام تو یہ ہے کہ پنجابی موقع پرست ہیں؟

اعتزاز احسن: نہیں صرف پنجابیوں نے خودسوزی کی موقع پرست یہ نہیں کر سکتے۔

سوال: کہتے ہیں جی جو بھی فاتح آیا پنجابی اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے؟

اعتزاز احسن: نہیں یہ غلط ہے آپ نجابت کی شاعری پڑھیں آپ ''دلا بھٹی کی وار'' پڑھیں یہ واریں اور یہ شاعری وہ ہیں جو کہ ہم عصر ریکارڈ ہے یہ سب مزاحمت کی باتیں ہیں۔

سوال: دلا بھٹی یا احمد خان کھرل کے واقعات اجتماعی تحریک نہیں ذاتی شجاعت کی کہانیاں ہیں ان دونوں میں بڑا فرق ہے؟

اعتزاز احسن: اجتماعی تحریکیں بھی چلی ہیں۔

سوال: تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ 1857ء میں انگریزوں کی قیادت میں پنجابیوں نے دلی پر حملہ کیا۔ احمد خان کھرل جیس واقعات اکا دکا ہیں یہ اجتماعی تحریک ہر گز نہیں تھے؟

اعتزاز احسن: اصل میں جب 1948ء میں انگریز پنجاب پر حملہ آور ہوا تو اس کے ساتھ پوربی سپاہی تھے انہوں نے چیلیانوالہ اور ملتان کی جنگ میں بڑے ظلم کیے جوابا 9-8 سال بعد پنجابی ڈھول بجاتے ہوئے دلی کو فتح کرنے نکل پڑے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ انگریز کے پاس تار کا نظام تھا ٹیکنالوجی تھی اس نے تار کے ذریعے بغاوت کی خبر پہنچا دی تھی اور پنجاب میں سپاہیوں سے معصومانہ انداز میں ہتھیار واپس لے لیے گئے اس لیے وہ بغاوت کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

سوال: ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کہتے ہی کہ پنجابی کرائے کے سپاہی ہیں انہوں نے تو خانہ کعبہ پر بھی گولی چلادی تھی؟

اعتزاز احسن: الطاف حسین ایک خاص طبقے یا گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں میں اس الزام کا جواب اس طرح دینا نہیں چاہتا اس معاملے پر بھی بحث کریں گے۔

سوال: کیا غزنوی اور محمد بن قاسم نے اسلام کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا؟

اعتزاز احسن: ان کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ میری نگاہ میں اسلام کے فروغ اور پھیلاؤ کے لیے جرنیلوں اور عسکری قیادتوں سے زیادہ صوفیائے اکرام نے کردار ادا کیا ہے۔

سوال: ایک عام پنجابی اور پاکستانی کے بارے میں آپ کا کیا تصور ہے؟

اعتزاز احسن: پنجابی ایک بہادر سپاہی اور ناکام منتظم ہے ابھی بھی آپ دیکھ لیں کہ فوج سے ملک کا نظام سنبھل نہیں رہا ہماری قوم پر 3,4 سو سال کی انارکی کا بہت اثر ہے۔

سوال: شاید بچت کی عادت نہ ہونا اسی کی وجہ ہے؟

اعتزاز احسن: وادی سندھ کے باسی کو چونکہ ہر وقت حملے کا خطرہ ہوتا تھا اس لیے بچت کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ لوٹی جا سکتی تھی اسی لیے کہتے تھے۔

کھادا پیتا لاہے دا تے باقی احمد شاہے دا

یہ کہنا کہ پنجاب نے مزاحمت نہیں کی غلط ہے ہندوستان کی ہر جنگ کا پہلا حصہ پنجاب میں لڑا جاتا رہا اور کئی حملہ آور مزاحمت کی وجہ سے واپس گئے کشان، تیمور اور بابر سب کے خلاف پنجاب نے مزاحمت کی۔

سوال: شلوار، شیرانی، تکہ اور کباب، بقول آپ کے فلسفے کے وسط ایشیاء سے آئے تو کیا ہماری ثقافت کی جڑیں وسط ایشیاء کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور بھارت کے ساتھ ثقافت کا رشتہ نہیں ہے؟

اعتزاز احسن: نہیں! مطلب ہے، ہم نے بہت سی چیزیں وسط ایشیاء سے مستعار لی ہیں لیکن ہماری بہت سی چیزیں بھارت کے ساتھ بھی مشترک ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گنگا جمنا کے ساتھ ہمارا بالکل ہی رشتہ نہیں ہے۔ رشتہ ہے وہاں اسلام بھی بہت زیادہ ہے اور رنگ، نسل، زبان بھی ہمارے ان کے ساتھ بھی ملتا ہے لیکن وسط ایشیاء سے بہت کچھ ہم نے لیا ہے یہ جو سندھ اور سندھ کی دھرتی ہے جب تک وہاں سے سرد علاقوں کے لوگ نہیں آئے یہاں کھڈی تھی لیکن سوئی دھاگے کا سلسلہ نہیں تھا اور یہ سینے پرونے کا سلسلہ تھا کپڑا ابنا جاتا تھا سیا نہیں جاتا تھا یہاں کا آپ لباس دیکھیں دھوتی اور ساڑھی تھے جن میں سوئی اور دھاگہ نہیں چلتا یہاں جوتے کھڑاؤں تھے جوتے وسط ایشیا سے آئے یہاں گھوڑا ہی نہیں تھا اس علاقے میں بیل اور ہاتھی تھا گھوڑا اور گھوڑے کے ساتھ رکاب، جس میں دونوں پیر آتے ہیں وہ بھی وسط ایشیاء سے آئی بہت کچھ وسط ایشیا سے آیا لیکن بھارت کے ساتھ بھی ثقافت مشترک ہے اسی لیے ہم بھارتی فلمیں دیکھتے ہیں۔ مولوی تو گھبرا جاتا ہے کہ بسنت کیوں مناتے ہیں بھئی بسنت اس علاقے کا تہوار ہے لوگ اس کو منائیں گے اس سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں یہ ایک مقامی تہوار ہے جس میں لاہور زیادہ بازی لے گیا ہے پاکستان کا تشخص نہ تو اس پہ بنا سکتے ہیں کہ ہم بالکل ہندوستانی

ہیں بے شک نہیں ہیں ہندوستان اور ہے سندھ اور ہے نہ یہ بنا سکتے ہیں کہ ہمارا ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے وہ بھی ہے وسط ایشیاء سے بھی رشتہ ہے۔ ایران سے بھی ہے ان سب سے ہم نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے لیکن سب کو ملا جلا کے ہمارا ایک اپنا الگ تشخص ہے۔

سوال: آپ نے مغل بادشاہت کے زوال میں بحریہ کے نہ ہونے اور چھاپہ خانے شروع نہ کرنے کو بہت اہمیت دی ہے؟

اعتزاز احسن: واقعہ یہ ہے کہ ایک مغل بادشاہ سے کسی نے کہا کہ بھئی چھاپہ خانہ لگنا چاہیے تو اس نے کہا کہ خطاط کا کیا بنے گا؟

سوال: بالکل یہی واقعہ سلطنت عثمانیہ کا بھی ہے کہ وہاں یہودیوں نے استنبول کے اندر چھاپہ خانہ لگایا ہوا تھا جس میں وہ اپنا لٹریچر اور مذہبی کتابیں چھاپتے تھے لیکن ترک اس چھاپہ خانے کو اس لیے استعمال نہیں کرتے تھے کہ کیلی گرافی یا خوش نویسی کا کیا بنے گا؟

اعتزاز احسن: اصل میں ماڈرن تہذیب 600 سال پہلے دو بنیادی دریافتوں یا ایجادات پر بنی اور بد قسمتی ہے دونوں کی ایجادات ہم نے استعمال نہیں کی ایک چھاپہ خانہ اور دوسری جہاز رانی، بحری جہاز رانی میں شروع میں عرب بہت آگے تھے لیکن بحری جہاز رانی میں قطب نما نے بہت آزادی دے دی سیاحوں کو ساحلوں سے آزاد کر دیا آپ 600 میل سمندر میں جا سکتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ راستہ درست ہے۔ ایک طرف چھاپہ خانے نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ تخیل، سوچ اور علم کے بحر بیکراں میں بیڑے ڈال دے اور دوسری طرف سیاحوں کے قطب نما نے انسان کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ زمین، زمین کے اردگرد لپٹے ہوئے بحر بیکراں میں نڈر چل پڑے، جو قومیں یہ دو کام نہیں کر سکیں، وہ آج پست اور پیچھے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہیں یا اور کوئی۔ جو قومیں ان دونوں بڑے بحروں میں سے گزر رہی ہیں۔ ایک علم کا بحر اور ایک پانی کا بحر وہ آج فاتح ہیں اور ساری دنیا پر حکومت کر چکی ہیں۔

سوال: پنجاب میں انتہا پسندی کا کلچر کہاں سے آیا؟

اعتزاز احسن: پنجاب اور وادی سندھ، یعنی پاکستان کا کلچر تحمل اور برداشت کا ہے۔

سوال: مگر مذہبی انتہا پسندی کا خمیر بھی یہیں سے اٹھا، احراری ہوں یا سپاہ صحابہ یا انتہا پسند سکھ سب نے پنجاب سے جنم لیا۔

اعتزاز احسن: ان لوگوں کو کبھی بھی عوامی حمایت نہیں ملی۔ ووٹ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر کو ملتا ہے۔ نواز شریف کو اس وقت ملتا ہے، جب وہ جماعت اسلامی سے ہاتھ چھڑا کر 1993ء اور 1997ء کا الیکشن لڑتا ہے۔

سوال: آپ نواز شریف کے وکیل کیسے بنے؟

اعتزاز احسن: نواز شریف کی خواہش پر۔

سوال: آپ نے بے نظیر بھٹو سے اس کی اجازت لی تھی؟

اعتزاز احسن: بالکل، بے نظیر کے مشورے اور اجازت سے میں نے یہ کام کیا تھا۔ نواز شریف سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پارٹی سے صلاح مشورے کے بعد حامی بھروں گا۔

سوال: آپ کے دادا، چوہدری بہاول بخش صاحب سیاست میں تھے اور آپ کے والد احسن علیگ بھی۔ اس حوالے سے خاندان سے کیا اثر قبول کیا؟

اعتزاز احسن: دادا، والد اور پھر والدہ کا اثر پڑا۔ والدہ کی گود میں رہا، میں سب سے پہلے 1946ء میں قید ہوا۔ اس وقت میں ڈیڑھ سال کا تھا۔ اس وقت میرے دادا اور والد بھی مسلم لیگ کی تحریک کے حوالے سے جیل میں تھے۔ شاید اسی اثر کی وجہ سے مجھ میں کوئی چیز ہے، جو مجھے کبھی ہم خیال گروپ میں جانے نہیں دیتی، اس لیے اپنی رائے اور سوچ کا اظہار کرنے کا موقع نہیں جانے دیتا اور شاید اسی وجہ سے آپ نے سوال کیا تھا کہ آپ کو پارٹی کی حکومت کے دوران کیوں عہدہ نہیں دیا گیا۔ میں نے شاید یہ ہی سیکھا ہے۔ میرے دادا بھی اپنی بات کے بڑے پختہ تھے۔ چوہدری بہاول بخش کا نام مشہور ہی اسی بنیاد پر ہوا۔ میرے والد نہ کبھی ری پبلکن اور نہ کنونشن لیگ میں گئے۔ وہ ہمیشہ اصل لیگ میں رہے۔

سوال: آپ کی شادی لو میرج تھی؟

اعتزاز احسن: جی، ہم نے ایک دوسرے کو یقیناً شادی سے پہلے پسند کیا تھا۔

سوال: پسندیدہ شاعر کون سا ہے؟

اعتزاز احسن: پسندہ شاعر غالب، فیض، فراز اور اقبال ہے۔ اقبال کو میں چوتھے نمبر پر لایا، کیوں کہ اقبال کو اسی طرح بار بار نہیں پڑھا جاتا، لیکن اقبال کا میں اس لحاظ سے مرہون منت ہوں کہ اردو شاعری میں دل چسپی پیدا ہی علامہ کے کلام کی وجہ سے ہوئی ہے، کیوں کہ والد علامہ کو مرشد سمجھتے تھے اور ہر وقت اقبال کے اشعار پڑھتے تھے۔

سوال: سب سے اچھی کتاب کون سی لگی، اپنی کتاب کے علاوہ کس کتاب کو بار بار پڑھا؟

اعتزاز احسن: آج کل جو کتاب پڑھ رہا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑی کتاب ہے، ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے، اس کا عنوان ہے Down to dacadence ایک امریکن پروفیسر Yark barzon نے لکھی ہے اس نے مغربی تہذیب، اس کے ارتقاء اور موجودہ صورت حال کو

موضوع بنایا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا دور آ گیا ہے، جب مکمل خوش حالی ہے، مغربی تہذیب عروج پر ہے اور اس کے بعد شاید اس کا زوال ہو۔ کتابیں جنہوں نے مکمل طور پر مجھے جذب کیا، ان میں قراۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا، بہت کم کتابیں ہیں، جو میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھی ہوں، لیکن تاریخ کی کتب کچھ ایسی ہیں، جن سے ایک Philip hensen کی کتاب The peacock throne ہے، یہ ان تین چار برسوں پر محیط ہے۔ جب شاہ جہان کے بیٹے آپس میں لڑ رہے تھے، کتاب کیا ہے، ایک فلم چل رہی ہے، جسے آپ آنکھوں کے سامنے تخت طاؤس کے وارثوں کو دیکھ رہے ہیں، جو انسان بار بار بھی پڑھ سکتا ہے، ویسے تو قانون کی کتب پڑھنے میں بہت سارا وقت صرف ہو جاتا ہے۔

سوال: پاکستان میں جو ایٹمی دھماکہ کیا گیا تھا، کیا یہ ہونا چاہیے تھا؟

اعتزاز احسن: میرا یہ نظریہ ہے کہ ایٹمی ہتھیار صرف 1945ء میں استعمال ہوا اور اب یہ قابل استعمال نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف ہیں؟

اعتزاز احسن: عملی طور پر دیکھ لیں، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ایٹمی ہتھیار استعمال کر سکیں گے تو بے شک رکھیے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ 1945ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی، دنیا نے تباہی دیکھ لی، وہ دو چھوٹے سے بم تھے، جو ایک ہیروشیما اور ایک ناگاساکی پر گرے، اس کے بعد 80 سے زیادہ جنگیں ہوئی ہیں، کسی میں یہ نہیں استعمال ہو سکا، یہ ہی نہیں، صرف دو جنگوں کا میں بالخصوص ذکر کروں گا، پندرہ سال تک دنیا کی سب سے بڑی ایٹمی طاقت ویت نام میں پھنسی رہی، بھوکے، نہتے، ننگے پاؤں ویت نامی اس سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ اس سپر پاور امریکہ کی انا کو ان ویت نامیوں نے F-16 کی پروازوں سے کھینچ کر اپنی چاول کی فصلوں کے چھ، چھ انچ پانی میں دفنا دیا، لیکن امریکہ جس کے پاس 40 ہزار ایٹم بم تھے، ان میں سے ایک بھی ویت نام پر استعمال نہیں کر سکا۔ اس سے بھی بڑی مثال سوویت یونین کے پاس 35 ہزار ایٹم بم تھے، وہ سپر پاور افغانستان میں دس سال تک پھنسی رہی، اس کے نوجوانوں کی لاشیں وہاں سے جاتی رہیں، بالآخر کیا ہوا کہ وہ طاقت صفحہ ہستی سے مٹ گئی، دنیا کے نقشے سے سوویت یونین افغانستان کی وجہ سے مٹ گیا، کیا اس کے جرنیلوں کی یہ خواہش نہیں ہوگی کہ ایک بم قندھار پر پھینکو، ایک کابل پر پھینکو، جلال آباد پر پھینکو اور یہ معاملہ ختم کر و اور گھر جاؤ، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔ یہ نیوکلیئر بم صرف داخلی حمایت بنانے کے لیے ہے۔ یہ اس طرح کی چیز ہے، جس طرح ایک الماری میں رکھا ہوا ڈنر سیٹ، جس کو آپ استعمال نہیں کر سکتے اور صرف نمائش کے لیے رکھتے

ہیں۔ بھارت اور پاکستان میں تو یہ بم بالکل استعمال نہیں ہو سکے۔ ان ملکوں کے درمیان مون سون چلتی ہے۔ ریڈیائی لہریں بھارت سے پاکستان اور پاکستان سے بھارت جا سکتی ہیں۔ جب بھی جنگ ہوگی، روایتی ہتھیاروں سے ہوگی۔

سوال: قدرتی منظر میں کیا پسند ہے؟

اعتزاز احسن: دریا پسند ہے، کیوں کہ یہ زندگی کی روانی کا مظہر ہے۔

سوال: زندگی میں کبھی خوف محسوس کیا؟

اعتزاز احسن: بالکل کیا، جب میں پڑھنے کے لیے باہر جا رہا تھا تو جہاز کے انجن میں آگ لگ گئی، جہاز تو لینڈ کر لیا گیا، 25,20 منٹ جو فضا میں تھے، اس میں بہت خوف محسوس کیا۔

سوال: بیوی سے کس بات پر لڑائی ہوتی ہے؟

اعتزاز احسن: استری کرنے پر تو نہیں ہوتی، کیوں کہ میں اپنے کپڑے خود استری کرتا ہوں، کھانا میں ہر قسم کا کھا لیتا ہوں، اس لیے اس پر بھی لڑائی کا چانس نہیں، بچوں کی تربیت بیگم نے ہی کی ہے، ہماری لڑائی کم ہی ہوتی ہے۔

سوال: پاپ میوزک اچھا لگتا ہے؟

اعتزاز احسن: ہر قسم کا میوزک اچھا لگتا ہے، تاہم نیم کلاسیکی موسیقی بہت پسند ہے، غزل شوق سے سنتا ہوں۔

انٹرویوز: جون 2007ء غیر مطبوعہ، جون 2001ء
مطبوعہ: 5 اگست 2001ء
حوالہ اشاعت: جنگ سنڈے میگزین

خالد اسحٰق

سابق ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان خالد اسحٰق پاکستان کے صرف معروف قانون دان ہی نہیں، ان کا شمار دائیں بازو کے نامور مفکرین میں بھی ہوتا تھا۔ وہ ملک کی سب سے بڑی پرائیویٹ لائبریری کے بھی مالک تھے۔ اسلامی تاریخ، قانون، معیشت اور مذہب کے حوالے سے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔

بطور ایڈووکیٹ جنرل وہ ایوب خان اور گورنر پنجاب امیر محمد خان آف کالا باغ کے بھی قریب رہے بعدازاں مولانا مودودی پر مقدمہ چلا تو وہ مستعفی ہو گئے۔ قومی اتحاد کی تحریک کے دوران جب بھٹو اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات جاری تھے تو خالد اسحٰق قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کے قانونی مشیر کے طور پر ڈرافٹنگ کرتے رہے جنرل ضیاء الحق کے دور میں خالد اسحٰق اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے وہ ضیاء الحق کے غیر سرکاری مشیروں میں بھی شامل رہے۔ خالد اسحٰق اسلامی قانون سازی میں بھی پیش پیش رہے تاہم وہ بہت ساری اسلامی قانون سازی سے مطمئن نہیں تھے کہ ان کے خیال میں اس میں بہت سی اصلاحات کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم بینکنگ میں سود کے حوالے سے ان کے نظریات روایتی علماء سے متضاد ہیں۔

اس انٹرویو میں خالد اسحٰق سے پاکستان کی دستوری تاریخ، سیاست، مذہب اور ان کی ذاتی دلچسپیوں پر گفتگو ہوئی جس میں ان کا عالمانہ انداز نظر آتا ہے۔

اہم نکات

☆ ماورائے عدالت قتل کی حمایت کرتا ہوں۔
☆ فوج سیاست سے باہر نہیں ہوسکتی، اسے سینٹ میں نمائندگی ملنی چاہیے۔
☆ علماء خلع کے حق کے خلاف تھے، بعد میں اسے مان لیا۔
☆ اسلام میں غیرت کے نام پر قتل کی اجازت نہیں، لومیرج جائز ہے۔
☆ اسلامی نظریاتی کونسل میں اصول طے نہیں ''کمپرومائز'' ہوتے ہیں۔
☆ میں نے خلع کا قانون بنوایا، شروع میں مخالفت ہوئی، اب سب نے مان لیا ہے۔
☆ مشارکہ، مضاربہ صرف نام کے اسلامی ہیں ان میں ظلم سود سے زیادہ ہے۔
☆ بھٹو نے خود پھانسی لی، دوبارہ مقدمہ چلتا تو یہ ممکن نہ تھا۔
☆ نصیر اللہ بابر کے اقدامات سے کراچی کے حالات بہتر ہوئے۔
☆ کشمیر کا مسئلہ حل ہوئے بغیر بھارت سے دوستی نہیں ہوسکتی۔
☆ اسلام سے متصادم قوانین کو ہٹا دینا کافی نہیں، اسلام کی بنیاد پر ایک نئی چیز تعمیر ہونی چاہیے۔
☆ سال میں 500 کتابیں پڑھتا ہوں۔ میری سب سے بڑی پرائیویٹ لائبریری ہے۔
☆ مضبوط مرکز کا حامی ہوں، صوبائی حکومتیں اچھے کام کرنے میں آزاد ہیں۔
☆ عدالتوں کو اسلام کی تشریح کا اختیار دینے پر اے کے بروہی نے مخالفت کی۔
☆ مولانا مودودی پہلے پاکستان کے خلاف تھے، بعد میں حق میں ہوگئے۔
☆ فتاویٰ عالمگیری نافذ نہیں ہوسکتا۔ اس میں صرف جزوی مسائل ہیں۔

انٹرویو

سوال: جناب خالد اسحٰق صاحب! وکالت کے ساتھ ساتھ آپ کی شہرت ایک اسلامی دانشور کی بھی ہے۔ آپ نے ہمیشہ اسلامی قوانین کی بات کی ہے یہ فرمائیں کہ کیا اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے پہلے گراؤنڈ ورک تیار ہے اور کیا فتاویٰ عالمگیری کے نفاذ سے معاملات حل ہو سکتے ہیں؟

خالد اسحٰق: یہ درست ہے کہ کہا جاتا ہے کہ قانون سازی مکمل ہے فتاویٰ عالمگیری موجود ہے، فتاویٰ عالمگیری عام طور پر آٹھ جلدوں میں ملتی ہے اس میں جزوی مسائل کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ فلاں کتاب میں اس کا جواب موجود ہے کوئی بڑی اصولی بحث اس کتاب میں نہیں ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر چاہتا تھا کہ مسلمان اشرافیہ کو ہندو سے الگ کیا جائے اس لیے قانون سازی کی کوشش ہوئی۔ فتاویٰ عالمگیری کو لکھنے والے اچھے عالم تھے۔ جزیات (جزوی مسائل) کے ماہر تھے لیکن قرآن کی اصولی اپروچ سے واقف نہیں تھے۔

سوال: مغربی محقق اکثر اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی اور معاشی نظام کوئی نہیں ہے؟

خالد اسحٰق: نہیں یوں نہیں ہے اسلام کے پاس بڑے جامع اصول ہیں ہر زمانے کے مسائل کا حل ان اصولوں سے نکالا جا سکتا ہے لیکن کوڈ یا باقاعدہ نظام تو شاید آپ کو نہ ملے رہنما اصول مل سکتے ہیں۔

سوال: تو پھر علامہ اقبال کے پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد کے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں؟

خالد اسحٰق: میں اس سے اتفاق نہیں کرتا علامہ اقبال اس وقت ترکی کے تجربے سے بہت متاثر تھے اب ہمیں زیادہ بہتر معلومات ہیں کہ ترکی کو جدیدیت کے نام پر اسلام سے دور کرنے کی سازش تھی اور ترکی میں جو پارلیمنٹ بنی گو وہ مسلمانوں کی پارلیمنٹ تھی لیکن اس کی فکری اساس ہرگز اسلامی نہ تھی۔

سوال: تو پھر آپ کی نظر میں اسلام کے سیاسی نظام کی کیا تشریح ہے؟

خالد اسحٰق: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس وقت جو بھی لیڈر شپ میسر ہو اسے نافذ کر دے۔

سوال: تو گویا اس طرح تو آمریت جائز ہوگئی؟

خالد اسحٰق: نہیں اس میں آمریت ہوگی نہیں اس لیے کہ قرآن کا حکم ہے کہ اسلامی حکومت مشورے اور شوریٰ کے ذریعے معاملات چلائے گی۔

سوال: تو پھر جنرل ضیاء نے جو شوریٰ بنائی وہ جائز تھی؟

خالد اسحٰق: کوشش تو اس نے کی لیکن اس کی کوشش اس لیے ناکام ہوئی کہ شوریٰ کے رکن کو بنانے نہ بنانے کا حتمی فیصلہ تھانیدار نے کیا تو یہ فیصلے درست کس طرح ہو سکتے تھے حالانکہ جنرل ضیاء حقیقتاً اسلام کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کے اسلام کے سیاسی مقاصد بھی تو تھے؟

خالد اسحٰق: جنرل ضیاء الحق شروع میں کہتا تھا کہ میں تین مہینے کے لیے ہوں مجھ سے جو کام کروانا چاہتے ہو کروالو وہ کہتا تھا کہ اسلامی تجاویز لاؤ میں نافذ کروں گا۔ سب سے کہا لیکن جو بھی جنرل ضیاء کے پاس جاتے تھے ان کے پاس تعمیری سوچ تھی ہی نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ہوم ورک تھا۔ اسی طرح گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان کالا باغ کے دور میں، میں ایڈووکیٹ جنرل تھا تو ایک دن نواب کالا باغ نے کہا تم روز اسلامی قانون کی بات کرتے ہو کہاں ہے وہ اسلامی قانون لاؤ میں اسے مغربی پاکستان میں نافذ کر دوں اب میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا میں کراچی آیا اور تمام بڑے علمائے دین کو بلایا اور کہا کہ گورنر راضی ہے کہ وہ مغربی پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کر دے گا تو علماء نے کہا کہ کچھ تیار نہیں مہلت لے لو کچھ کریں گے۔ یہ 1963ء کی بات ہے پھر 1964ء میں، میں نے استعفیٰ دے دیا اور کچھ وکلاء کو جمع کیا کہ ہم تدوین قانون کر لیں تاکہ جب موقع ملے ہمارے پاس سب کچھ تیار ہو ان وکلاء میں کئی لوگ جماعت اسلامی کے تھے ہماری لاہور میں میٹنگ ہوئی اے کے بروہی بھی موجود تھے اور وہاں پر جماعت اسلامی نے اعلان کر دیا کہ ابھی اس قانون کی تدوین کی ضرورت نہیں ہے جب اختیار ہمارے پاس آئے گا تو یہ مسئلہ حل کر لیں گے اس اعلان کے بعد جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے وکلاء غیر متعلق ہو گئے اور یہ کام آگے چلا نہیں اور پھر جب ضیاء الحق کے زمانے میں موقع آیا تو اس وقت کوئی چیز تیار نہیں تھی۔

سوال: آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے بھی رکن رہے ہیں کہا جا رہا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے تمام قوانین پر نظر ثانی مکمل کر لی ہے اور اب آئین مکمل طور پر اسلامی ہو چکا ہے؟

خالد اسحٰق: نہیں بات یوں نہیں ہے۔ کسی قانون پر نظر ثانی اور بات ہے اور اسلامی اصولوں پر ایک نیا قانون بنانا اور بات ہے انگریز نے سول قانون بنایا اس کا اکثر و بیشتر حصہ اسلام سے متصادم

نہیں ہے۔

سوال: اسلامی نظریاتی کونسل کے ذمہ یہی کام تھا کہ اسلام سے متصادم قوانین کو ختم کر دے؟

خالد اسحٰق: میں یہ کہہ رہا ہوں کہ متصادم چیزوں کو ہٹا دینا کافی نہیں بالکل اسلام کی بنیاد پر ایک نئی چیز تعمیر ہونی چاہیے ہمیں ایک ایسی عدالت چاہیے جو کرکٹ کے ایمپائر کی طرح ٹیموں میں فیصلہ نہ کرے بلکہ آگے بڑھ کر مظلوم کی مدد کو آئے۔

سوال: تو پھر آپ کی نظر میں اسلامی نظریاتی کونسل غیر متعلقہ کاموں میں لگی رہی ہے؟

خالد اسحٰق: یہ ذرا سخت الفاظ ہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک کمزوری یہ تھی کہ شروع میں فرقوں کی بنیاد پر سلیکشن ہوتی رہی اس لیے ہر رکن اپنے مسلک کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہار خیال کرتا تھا اس لیے کمپرومائز ہوتا تھا اجتہاد یا مسائل کے حل کے لیے جس لیول کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں پہنچ نہیں پاتے تھے اور نہ ہی اپنی بات آگے چلا پاتے تھے

1977ء کے اواخر کا واقعہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا اور عدالتوں کو اس کا اختیار دے دیا۔ میں نے اس اعلان کے بعد کوشش کی کہ اس کو آئین کا حصہ بنا دیا جائے لیکن وہ جنہیں ہم بہت قریب جانتے تھے انہوں نے مخالفت کی اور ترمیم کا کام آگے نہ جا سکا میں اکیلا رہ گیا۔

سوال: کس نے مخالفت کی اور کسے کن سے خطرہ تھا؟

خالد اسحٰق: خطرہ یہ تھا کہ ہائی کورٹ کے ججوں کو یہ اختیار کیوں دیا جائے کہ وہ اسلام کی تشریح کریں اس سے جج غالب آ جائیں گے اور حکومت کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

سوال: بقول آپ کے جنرل ضیاء الحق اسلام کے نفاذ میں سنجیدہ تھے تو پھر اصل رکاوٹ کیا تھی؟

خالد اسحٰق: ایک دفعہ ضیاء الحق نے اسی سلسلہ میں میٹنگ کی میں نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ میٹنگ میں غلام اسحٰق خان، اے کے بروہی اور کمانڈر انچیف بھی تھے سب نے مخالفت کی میں اکیلا رہ گیا اس طرح یہ معاملہ پھر رہ گیا۔ دوسری طرف آئینی ترامیم کا معاملہ یوں ہوا کہ عدالتوں کو اسلامی تشریح کا اختیار دینے کے بارے میں ترامیم کا ڈرافٹ کمیٹی کے سامنے پیش کیا پہلے تو بڑی لے دے ہوئی کہ ہم کیوں کریں تو اس زمانے میں جسٹس (ر) افضل چیمہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین تھے انہوں نے سختی سے مخالفت کی پھر یہ طے ہوا کہ اسے وزیر قانون کو بھیج دیا جائے میری کوئی تین ماہ بعد جنرل ضیاء الحق سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا کہ اس آئینی ترمیم کا کیا ہوا انہوں نے کہا کہ میرے

پاس تو نہیں آئی بعد میں علم ہوا کہ وہ وزارت قانون کے پاس ہے میں نے بروہی صاحب کو فون کیا کہ اس سلسلے میں کراچی میں میٹنگ ہونی چاہیے جس پر یہ میٹنگ ہوئی تو بروہی صاحب نے کہا کہ میں اس ترمیم کو نہیں مانتا تم کیا چاہتے ہو کہ جسٹس انوار الحق یہ فیصلہ کرے کہ آپ اس قانون کو فارورڈ کریں پھر پارلیمنٹ کو فیصلہ کرنے دیں جس پر اے کے بروہی نے کہا کہ "اوور مائی ڈیڈ باڈی" (یہ میری لاش پر ہی ممکن ہو سکے گا۔)

سوال: تو بروہی صاحب نے مخالفت کی؟

خالد اسحٰق: بالکل! یہ بھی ہوا کہ جب دیت کا مسئلہ آیا تو میں نے کہا کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہونی چاہیے۔ جماعت اسلامی اور مولانا بنوری کا نقطۂ نظر دوسرا تھا میں نے کہا کہ کابینہ کے سامنے بحث کر لیں مگر جماعت اسلامی کے مولانا سیاح الدین کا کاخیل نے کہا کہ وہ غیر عالموں کے سامنے بحث نہیں کریں گے اس طرح یہ معاملہ چلتا رہا اور عورت اور مرد کی برابر دیت کا قانون نافذ ہو گیا اور طاہر القادری نے اس مسئلے پر میری حمایت کی ہمارے علماء حضرات کا خیال ہے کہ پرانی روش سے ہٹنے والی ہر بات اسلام کے خلاف بغاوت ہے۔

سوال: علماء سے آپ مایوس ہیں سیاستدانوں سے آپ مایوس ہیں تو پھر امید کہاں ہے؟

خالد اسحٰق: نہیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں مایوس نہیں ہوں کسی سے، میرا دراصل اس سلسلے میں پیچیدہ ریسپانس ہے۔ 1961ء کی بات ہے میں جسٹس خمیسانی کی عدالت میں حاضر تھا وہاں نے کہا گواہ حسد کی وجہ سے غلط گواہی دے رہے ہیں جسٹس خمیسانی نے کہا کہ کیا حسد کی وجہ سے بھی گواہی دی جاتی ہے؟ میں نے سورۃ یوسف کا حوالہ دیا تو جسٹس خمیسانی نے کہا کہ خبردار عدالت میں قرآن کو مت لاؤ اور اب 1988ء میں چیف جسٹس سپریم کورٹ کہتے ہیں کہ ہمارے فیصلوں میں سب سے روشن چراغ قرآن پاک ہے تو گویا ایک تبدیلی تو آ گئی۔

سوال: اسلامی قوانین پر اتفاق بھی ہوتا رہا ہے یا ہمیشہ اختلاف ہی رہا ہے؟

خالد اسحٰق: دیکھیں جی کچھ معاملات میں اتفاق اور پھر علماء کی قبولیت سامنے آئی ہے بظاہر علماء اتفاق نہیں کرتے لیکن نچلی سطح پر اتفاق ہو جاتا ہے جیسے خلع کا قانون جس میں عورت کو حق مل گیا کہ وہ خاوند سے طلاق لے سکتی ہے اس قانون سے پہلے 1967ء تک علماء کی متفقہ رائے تھی کہ عورت کو خلع کا حق نہیں دیا جا سکتا سپریم کورٹ نے میری تجویز پر خلع کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بعد میں علماء نے اس کو مان بھی لیا۔

سوال: سب سے زیادہ دکھ کس بات پر محسوس ہوتا ہے؟

خالد اسحٰق: سب سے زیادہ دکھ اس بات پر ہوتا ہے کہ اقتدار ان ہاتھوں میں جاتا رہا جو پاکستان کے مقصد اور نصب العین کے قائل ہی نہیں تھے پاکستان میں اقتدار کی جو اشرافیہ پیدا ہوئی وہ ایماناً پاکستان کی قائل ہی نہیں تھی اس لیے 1948ء میں ہی سندھ اور پنجاب کی علاقہ پرستی کی تحریکیں اور تنازعات شروع ہو گئے پنجاب میں جو بڑے زمیندار ہیں انہیں سکھ اور انگریزوں نے جاگیریں دیں پنجاب میں زرعی اصلاحات کی کوشش نہیں کی گئی سندھ میں یہی صورت حال رہی۔ تو اس طرح زیادہ وقت تبدیلی کے خلاف مزاحمت میں گزر گیا۔

سوال: آپ پاکستان میں کسی شعبے کی کارکردگی سے مطمئن بھی ہیں؟

خالد اسحٰق: نہیں کسی سے نہیں، علماء سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ مولانا مودودی پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے حق میں ہو گئے۔ Convert ہو گئے اور پاکستان کے لیے سوچنا شروع کر دیا۔

سوال: تو گویا مولانا مودودی پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کے خلاف تھے؟

خالد اسحٰق: بالکل خلاف تھے بہت سے لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے لیکن میرا یہ اندازہ ہے لیکن مودودی صاحب کی جماعت میں ایک بھی ایسا مفکر نہیں نکلا جو ان کی فکر کو آگے لے جا سکے مولانا مودودی کی فکر میں آزادی فکر، تنظیم نو بھی تھی اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی بات بھی تھی۔

سوال: پاک بھارت دوستی کے تناظر میں ایک حلقے کا کہنا ہے کہ ہندو اور مسلمان کی ثقافت ایک ہے آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

خالد اسحٰق: میرے خیال میں ہندو اور مسلمان کی ثقافت الگ الگ تھی دونوں میں تضادات تھے مسلمانوں کا استحصال بھی ہوتا تھا سندھ میں انگریز کے آنے پر 1880ء میں بندوست اراضی ہوا تو 90 فیصد مالکان مسلمان اور باقی دس فیصد میں ہندو، سکھ اور دوسرے شامل تھے لیکن 1941ء میں دوسرا بندوست ہوا تو ہندو 60 فیصد اراضی کے مالک بن چکے تھے اسی طرح پروفیشنل اداروں کا حال تھا ہندو وکیل چھائے ہوتے تھے۔ تقسیم ہند ہوا تو مسلمان وکلاء کی فیسیں سینکڑوں سے ہزاروں میں پہنچ گئیں میں عرض کر رہا تھا کہ مسلمان اور ہندوؤں کا کھانا پینا الگ تھا رہن سہن الگ تھا کلب میں لوگ اکٹھے ہوتے تھے لیکن افسری کی وجہ سے عزت ہوتی تھی۔

سوال: اس تعصب اور تفریق کی وجہ جہالت اور تعلیم کی بھی ہو سکتی ہے تعلیم یافتہ لوگ تو ایسے نہیں ہو سکتے؟

خالد اسحٰق: جمخانے میں پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے لیکن وہاں بھی یہی حال تھا بمبئی میں

بڑے ہوٹلوں میں چاندی کے برتنوں میں کھلایا پلایا جاتا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ چینی کے برتنوں میں ملیچھ کھالے تو ہندو مذہب کے مطابق ان برتنوں کو توڑنا پڑتا ہے چاندی کے برتن اس لیے استعمال ہوتے تھے کہ وہ دھل کر استعمال ہو سکتے تھے۔ میرے والد ڈپٹی کلکٹر تھے ان کی بڑی عزت تھی لیکن ہمارا ملنا جلنا ہندوؤں سے بالکل نہیں تھا۔

سوال: پاک بھارت دوستی کا ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے کیا امن اور سلامتی کے لیے یہ ایک اچھا اقدام نہیں ہے؟

خالد اسحٰق: میرے خیال میں کشمیر کے مسئلے کے حل سے پہلے کوئی دوستی نہیں ہو سکتی۔

سوال: آپ کی علمی حیثیت، آپ کا مطالعہ اور آپ جیسے فہم اسلام کا حامل شخص مارشل کا حمایتی ہو، کیا یہ تضاد کے زمرے میں نہیں آتا؟

خالد اسحٰق: نہیں میں مارشل لاء کا حمایتی نہیں میں سول سوسائٹی کا حامی ہوں مارشل لاء حالات کی وجہ سے آیا۔

سوال: اور پھر گیارہ سال آپ حمایت کرتے رہے؟

خالد اسحٰق: گیارہ سال حالات نہیں بدلے۔

سوال: آپ نے قوانین پر تو اختلاف کیا مارشل لاء کے مسئلے پر اختلاف نہیں کیا؟

خالد اسحٰق: کیا ہوگا میں نے ضرور اختلاف کیا ہوگا جب بھی موقع ملا حکمرانوں کو اپنی رائے سے آگاہ ضرور کیا۔

سوال: تو کیا نظریہ ضرورت بھی صحیح تھا؟

خالد اسحٰق: نہیں یہ سارے کا سارا غلط نہیں ہے یہ کراچی کا جو مسئلہ ہے میں جنرل نصیر اللہ بابر کا کوئی مداح نہیں ہوں لیکن ان کے اقدامات سے معاملات بہتر ہوئے جو قانون کی حاکمیت کو نہ مانے جو جج کو ڈراتا یا رشوت دیتا ہے گواہ کو گواہی دینے نہیں دیتا وہ آدمی قانون کی بالادستی کو مانتا ہی نہیں جس طرح آپ کا دشمن آپ کے لوگوں کو مارتا ہے تو آپ اسے گولی سے اڑا دیتے ہیں۔

سوال: تو پھر آپ ماورائے عدالت قتل کی حمایت کرتے ہیں؟

خالد اسحٰق: ہاں ایک طریقے سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ جنرل بابر کے ایکشن سے پہلے معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا یہ لوگ گھروں میں آتے تھے کہ آپ کی بیٹی کا رشتہ فلاں جگہ طے کر دیا ہے اور لوگ یہ بات ماننے پر مجبور تھے ہر روز 20,20 لوگ مر رہے تھے۔

سوال: تو آپ کی نظر میں کراچی کے مسئلے کا حل جنرل بابر والا درست تھا یا پھر موجودہ

حکومت کا گورنر راج؟

خالد اسحٰق: دیکھیں جی شروع تو نصیر اللہ بابر نے ہی کیا تھا اس نے انہیں شکست دی بھگا دیا تو جو ڈگری امن کی اب قائم ہے وہ مناسب ہے میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ قانون کی بالادستی ہونی چاہیے۔

سوال: جناب والا! ہم نے تو یہ سنا ہے کہ جمہوریت میں کوئی مشکل پیش آئے تو مزید جمہوریت سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے قانون میں مشکل ہو تو نیا قانون بنانے سے مسئلہ حل ہوتا ہے لیکن آپ جیسا قانون دان اگر ماورائے قانون یا ماورائے عدالت اقدامات کی حمایت کرے تو یہ بڑی عجیب بات ہو گی؟

خالد اسحٰق: کتابوں میں تو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہوتا میں حقیقت پسند ہوں یہ کہنا کہ مزید قانون بنالیں یہ بات چلتی نہیں ہے۔

سوال: سود کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟ اسلام کی سود کے بارے میں کیا تشریح ہے؟

خالد اسحٰق: سود کی حرمت کا واضح حکم ہے اور یہاں تک ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والے سے اللہ کی جنگ ہے قرآن میں سود کی حرمت اور ظلم کا ساتھ ساتھ ذکر ہے میری نظر میں سود کے کاروبار کا جائزہ ظلم کے اعتبار سے لینا ہو گا یعنی سود میں چونکہ ظلم تھا اس لیے اس کی حرمت ہے اب دیکھیے پاکستان میں پہلے سود کا جو نظام تھا اس میں 2 یا 3 فیصد سود پر قرض مل جاتا تھا اب مارک اپ مشارکہ یا مضاربہ کے اسلامی ناموں پر 22 یا 23 فیصد منافع لیا جاتا ہے جو سراسر ظلم ہے اسلامی نام دے کر ظلم بڑھایا گیا ہے جو سراسر غلط ہے مضاربہ، مشارکہ کے ناموں کی وجہ سے یہ اسلامی نہیں ہو سکتا سود کا جو بھی متبادل ہو گا اس میں ظلم کم ہونا چاہیے۔

سوال: سود کے متبادل کوئی نظام موجود ہے؟

خالد اسحٰق: بالکل ہے یہ بن سکتا ہے یہ مال کے بدلے مال کی بنیاد پر نہ ہو بلکہ مال کے استعمال پر ہو میں سودی کاروبار نہیں کرتا نہ میرا کوئی بینک ہے لیکن میری ایک رائے ہے۔

سوال: بینکوں میں نفع نقصان کی شراکت کا جو نظام رائج ہے کیا وہ غیر اسلامی ہے؟

خالد اسحٰق: اس میں ظلم ہے، ہوا یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ میں اسلامی نظام لانا چاہتا ہوں پندرہ دن کے اندر متبادل نظام لا دو اور لوگوں نے عربی ناموں کے ساتھ مارک اپ، مضاربہ، مشارکہ وغیرہ پیش کر دیئے۔ میں نے اعتراض کیا کہ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہو سکتا اور مجھے شک ہے کہ یہ اسلام بھی ہے یا نہیں مجھے کہا گیا کہ اس نظام کو نافذ ہونے دیں بعد میں اصلاح ہو جائے گی میں نے کہا

کہ جب کوئی نظام رائج ہو جائے تو اس میں مفاد پرست گروہ پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر نظام میں تبدیلی ممکن نہیں رہتی اور یہی ہوا کہ بینکوں نے نظام کو کارآمد تصور کیا۔ بینکوں میں پہلے جو نظام تھا اس میں ظلم کم تھا موجودہ نظام میں ظلم زیادہ ہے۔

سوال: آپ بھٹو دور میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے آپ کے ان سے مراسم کیسے تھے؟

خالد اسحٰق: بھٹو جب پاکستان آئے تو ہر دوسرے تیسرے روز میرے دفتر آتے تھے ملاقات ہوتی تھی پھر سکندر مرزا کی کابینہ میں شامل ہوئے پھر بھی ملاقات رہی بعدازاں جب ایوب خان کی کابینہ سے استعفٰی دیا تو بطور صدر ہائی کورٹ بار میں نے انہیں مدعو کیا اور انہوں نے تقریر بھی کی۔ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ میں سیاست میں آؤں مجھے اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بنایا اور پھر سیرت کا پروفیسر مقرر کیا لیکن جب 1971ء کی تحریک چلی تو میں اور جسٹس عامر رضا خان پی این اے کے دفتر میں بیٹھ کر قومی اتحاد کو قانونی مشورے دیتے رہے۔

سوال: تو اس پر یعنی قومی اتحاد کے دفتر میں بیٹھنے پر بھٹو ناراض نہیں ہوئے؟

خالد اسحٰق: ناراض ہو گئے تھے۔

سوال: قومی اتحاد اور بھٹو کے مذاکرات میں بھٹو کے وزارت عظمٰی سے ہٹنے کی تجویز کیا آپ کی تھی؟

خالد اسحٰق: نہیں میری تجویز نہیں تھی، میں نے کہہ دیا کہ یہ مانیں گے نہیں البتہ مذاکرات ایسے طور پر کیے جائیں کہ بھٹو کے اختیارات کم ہو جائیں وہ سلسلہ یوں ہوتا تھا کہ پروفیسر غفور روزرات کو مجھ سے مشورے کرتے تھے مذاکرات کامیاب جا رہے تھے سب نکات مان لیے تھے لیکن پھر بھٹو صاحب کے دل میں بے ایمانی آ گئی سعودی عرب گئے وہاں کہا کہ مذاکرات کامیاب ہو گئے اب پیسے دے دیں، سعودی عرب کے شاہ نے کہا کھجور جب پک جائے تو تبھی میٹھی ہوتی ہے۔

سوال: گورنر مغربی پاکستان نواب کالاباغ کے ساتھ آپ نے بطور ایڈووکیٹ جنرل کام کیا سنا ہے وہ بڑے جابر اور سخت حکمران تھے؟

خالد اسحٰق: جابر تھے لیکن میرے ساتھ ان کے معاملات اچھے رہے انہیں میرے بارے میں علم تھا کہ یہ نہ غلط بیانی کرتا ہے نہ بے ایمانی۔ سوائے جماعت اسلامی کے مقدمے کے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا اور جماعت اسلامی کے معاملے پر بھی انہوں نے کہا کہ یہ ان کا نہیں ایوب خان کا فیصلہ ہے۔

سوال: جماعت اسلامی والے کیس میں ایوب حکومت سے کیا اختلاف ہوا؟

خالد اسحٰق: واقعہ یوں ہے کہ اس کیس کی حکومت کی طرف سے پیروی اٹارنی جنرل کر رہے تھے تاہم مولانا مودودی کے بیٹے نے ایک ایفی ڈیویٹ پیش کیا جس کے مطابق جماعت اسلامی کے دفتر پہلے سیل کر دیئے گئے لیکن نوٹیفکیشن بعد میں جاری ہوا اس طرح یہ معاملہ غیر قانونی ہے عدالت میں چونکہ گواہ پیش کرنے تھے میں نے ہوم سیکرٹری سے پوچھا تو اس نے کہا کہ جماعت اسلامی کے دفتر ساڑھے پانچ بجے سیل ہوئے اور نوٹیفکیشن ساڑھے سات بجے جاری ہوا۔ میں نے کہا یہی تو جماعت اسلامی کہتی ہے ہوم سیکرٹری نے کہا اس میں کیا ہے ہم ابھی وقت بدل دیتے ہیں کاغذ بدل دیں گے۔ (قہقہے) میں نے کہا کہ میرے ہوتے ہوئے تو نہیں بدلے گا میں سارے جھوٹوں کو تو بے نقاب کروں اور حکومت کے جھوٹ پر پردہ ڈال دوں اور خود جعلسازی کروں یہ نہیں ہوسکتا۔ ہوم سیکرٹری نے وزیر قانون کو فون کیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ سرکاری وکیل کو تو یہ کرنا پڑتا ہے میں نے کہا نہیں کروں گا تو انہوں نے کہا کہ تم جماعت اسلامی کے ہو اس لیے یوں کر رہے ہو میں نے کہا کہ میں جماعت اسلامی کا تو نہیں لیکن اس دھمکی میں نہیں آؤں گا کراچی جا کر میں نے بیان دے دیا کہ مولانا مودودی کے بیٹے کا ایفی ڈیویٹ درست ہے یہ بیان دے کر میں نے کوئی مہربانی نہیں کی میں نے صرف سچ بولا۔

سوال: تو آپ نے کبھی کسی مقدمے میں جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی جھوٹا کیس لڑا؟

خالد اسحٰق: کبھی جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹا کیس نہیں لڑا۔ یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ کبھی جھوٹا کیس نہیں لڑا بعض اوقات خود بھی علم نہیں ہوتا کہ کیس سچا ہے یا جھوٹا۔

سوال: بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ درست تھا یا غلط؟

خالد اسحٰق: وہ پھانسی نہیں ہونی تھی بھٹو نے اپنے وکیلوں کے ساتھ مل کر خود اس کا انتظام کیا۔

سوال: تو کیا ججوں کا فرض نہیں کہ وہ خود انصاف سے کام لیتے؟

خالد اسحٰق: دیکھیں مولوی مشتاق نے بھٹو کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی تھی اس طرح سے ان کا فیصلہ چیلنج ہوسکتا تھا سپریم کورٹ میں بارہا کہا گیا کہ بھٹو کے مقدمے کا دوبارہ ٹرائل کر لیا جائے مگر بھٹو کے وکیل نہ مانے اگر دوبارہ کیس چلتا تو پھانسی کی سزا نہ ہوتی۔ بھٹو کے خلاف جتنے بھی ثبوت آئے وہ کراس ایگزامینیشن میں آئے۔

سوال: تو کیا مولوی مشتاق غیر جانبدار جج تھے؟

خالد اسحٰق: وہ بڑے تیز آدمی تھے ڈرپوک بھی تھے انہوں نے بھٹو کو سزا دیتے ہوئے ایک راستہ کھلا رکھا اور ایف آئی آر کوائی اور عوام کے سامنے شیر بن گئے کہ پھانسی کا فیصلہ سنا دیا۔

سوال: جنرل ضیاء الحق کی شخصیت کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

خالد اسحٰق: بہت ہوشیار آدمی تھا لیکن اسلام کے بارے میں مخلص تھا پاکستان کے سلسلے میں بھی مخلص تھا افغانستان کی جنگ لڑنے کے بارے میں بڑی کامیاب حکمت عملیاں اپنائیں۔

سوال: جماعت اسلامی کے موجودہ اور سابقہ اسٹائل میں کیا فرق ہے؟

خالد اسحٰق: میں سابقہ اسٹائل کا حامی ہوں مولانا مودودی کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے پڑھے لکھے مسلمانوں کو سیکولر سے مذہبی بنا دیا یہ کام جاری رہنا چاہتے تھا لیکن اب جو رنگ بازی کی سیاست ہے یہ اسلامی کلچر کا حصہ نہیں ہے۔

سوال: آپ جماعت اسلامی کے رکن رہے؟

خالد اسحٰق: نہیں۔

سوال: لومیرج کے بارے میں کیا رائے ہے؟

خالد اسحٰق: میری نظر میں اسلام میں جائز ہے۔ میں صائمہ کیس میں بھی پیش ہوا کہ یہ جائز ہے البتہ اگر دل کی رضامندی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

سوال: آپ کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟

خالد اسحٰق: سندھ میں ہوئی، میرے والدین پنجاب میں لاہور کے سید مٹھا بازار سے تھے میں نے اسکول میں سندھی پڑھی میرے لیے پنجابی اردو اور سندھی یکساں ہیں۔ بی اے میں عربی پڑھی۔ ایم اے عربی فارسی میں کیا پھر عربی کے ساتھ لومیرج ہوگئی۔

سوال: کالج لائف میں کیا مشاغل تھے؟

خالد اسحٰق: لان ٹینس کا یونیورسٹی چیمپیئن تھا، بیڈمنٹن کی کالج ٹیم کا ممبر تھا۔

سوال: کیا آپ کی لومیرج ہوئی؟

خالد اسحٰق: ارینجڈ میرج تھی، بیک گراؤنڈ ایک سا تھا بیوی کے والدین بھی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے ان کے والد بھی ڈپٹی کلکٹر تھے میرے والد بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

سوال: مشترکہ خاندانی نظام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

خالد اسحٰق: میں 25,24 سال کا تھا کہ والدین کا انتقال ہو گیا ساری ذمہ داریاں مجھ پر آ پڑیں بھائیوں کی دیکھ بھال کی۔ اس گھر میں پہلے تین بیڈروم تھے پھر اٹھارہ ہو گئے آدمی کچھ قربانی کرے تو مشترکہ خاندانی نظام بہتر رہتا ہے۔

سوال: آپ کی لائبریری ملک میں سب سے بڑی لائبریری ہے؟

خالد اسحٰق: اس میں کوئی پونے دو لاکھ کتابیں ہیں کہتے ہیں یہ ملک کی سب سے بڑی پرائیویٹ لائبریری ہے۔

سوال: کون سی کتابیں زیادہ تر پڑھتے ہیں؟

خالد اسحٰق: پڑھنے میں ترکیب یہ استعمال کی کہ ایک سال فلسفہ کو دے دیا، اسلامی تاریخ کو ایک سال دے دیا تو سال میں میری اس موضوع پر 100 کتاب ہو جاتی تھیں۔

سوال: تو دن میں دو کتابیں پڑھتے تھے؟

خالد اسحٰق: میری رفتار بہت تیز تھی یا پڑھتا تھا یا کھیلتا تھا میں سال میں پانچ سو کی لسٹ بناتا تھا ساری پانچ سو تو نہیں پڑھتا تھا کچھ دیکھ کر مسترد کر دیتا تھا میرے پاس 45 ہزار عربی کتابیں ہیں میں مہینہ میں تین چار لاکھ کی کتابیں اور سال میں ستائیس اٹھائیس لاکھ کی کتابیں خریدتا تھا۔ کئی سال تک میں پاکستان کا سب سے بڑا ٹیکس دہندہ رہا ایک سال سے پریکٹس چھوڑ دی ہے۔

سوال: المیہ مشرقی پاکستان پر کیا تاثرات تھے؟

خالد اسحٰق: یحییٰ خان کے مشیروں نے سب کچھ کروایا جن میں بھٹو سر فہرست تھا۔

سوال: سیاست میں فوج کا کردار ہونا چاہیے؟

خالد اسحٰق: فوج ایک پاور سیکٹر ہے ان کا اثر ہوتا ہے سیاست پر۔ اب کے حالات میں فوج کا کوئی عمل دخل نہیں، میری تجویز ہے کہ سینٹ میں فوج کی نمائندگی ہونی چاہیے تین چار فوجی سربراہوں کو سینٹ میں بیٹھنا چاہیے تا کہ فوج کسی معاملے پر اختلاف کرے تو سب کو علم ہو۔ سیاست سے باہر رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جب فوج بات کرتی ہے تو پھر سیاست کا بستر ہی لپیٹ دیتی ہے۔ میری مکمل تجویز یہ تھی کہ فوج کی نمائندگی ہونی چاہیے یونیورسٹیوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔

سوال: پاکستان کو ایٹمی دھماکہ کرنا چاہیے تھا؟ کیا یہی واحد راستہ تھا؟

خالد اسحٰق: بالکل کرنا چاہیے تھا۔

سوال: کیا موجودہ آئین کے تحت اسلامی نظام حیات رائج ہو سکتا ہے؟

خالد اسحٰق: ہاں اگر کوئی نیک نیتی سے چاہے تو کیوں نہیں رائج ہو سکتا۔

سوال: موجودہ آئین میں دی گئی صوبائی خود مختاری کافی ہے؟

خالد اسحٰق: اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے مضبوط مرکز کا حامی ہوں اچھے کام کرنے کا سارا اختیار صوبائی حکومت کے پاس موجود ہے جب وزیر 84,84 گاڑیاں رکھیں تو یہ کون سا اختیار ہے۔

سوال: کبھی کوئی کام کرنے کے بعد ندامت ہوئی؟

خالد اسحٰق: ایک سی ایس پی نے کام میں گڑ بڑ کی میں ایڈووکیٹ جنرل تھا میں نے سوچا کہ اس کو سروس سے نکلوا دینا چاہیے یہ اس کا اہل نہیں ہے میں نے سوچا اس افسر نے سروس کے دوسرے سال یہ بے ایمانی کی۔ ہمارے ایک پروفیسر تھے وہ میرے پاس آئے اور آ کر کہا کہ تمہیں نیا نیا اختیار ملا ہے اسے سختی سے استعمال نہ کرنا میں نے ایکشن نہیں لیا اور اس بے ایمان نے بعد میں بڑی بے ایمانیاں کیں۔ اسے چھوڑنے پر بعد میں بڑی ندامت ہوئی کہ اس کو کیوں چھوڑ دیا تھا۔

سوال: مسلمانوں پر ہی ہر جگہ ظلم کیوں ہو رہا ہے، اسلامی ممالک کے زوال کی وجہ کیا ہے؟

خالد اسحٰق: دیکھیں 1920ء سے 1930ء کے دوران مغربی طاقتوں نے مسلمان ملکوں کو کچل کر رکھ دیا۔

سوال: جب بالکنائزیشن ہوئی؟

خالد اسحٰق: بالکل اس وقت مسلمانوں کی ایک بھی آزاد ریاست نہیں تھی اب 48 ممالک مسلمان ملک کہلاتے ہیں علم و ادب اور سائنس کے ہر شعبے میں مسلمانوں کا عمل دخل ہے تو ہر شعبے میں مسلمانوں نے ترقی کی ہے۔

سوال: برٹرینڈ رسل نے مسلمانوں کے دور کا ذکر کیا ہے وہاں ان کی سوچ کی تعریف کی لیکن تحقیق کے نتیجے میں کوئی عمومی فارمولا دینے میں مسلمان ناکام رہے؟

خالد اسحٰق: پچھلے 50 سالوں میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ تیز رفتار ترقی کی ہے میں نے ذاتی طور پر پاکستان میں خلع کا قانون بنانے اور دستوری سوچ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

سوال: اسلام کی نظر سے غیرت کے لیے قتل یا ''کاراکاری'' کیا یہ جائز ہے؟

خالد اسحٰق: بالکل جائز نہیں ہے۔

سوال: لیکن اگر لڑکی بھاگ جاتی ہے؟

خالد اسحٰق: اگر بھاگ جاتی ہے اور شادی کرتی ہے تو پھر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ جب لڑکی کی شادی کی عمر ہو تو اس کی شادی کریں۔

خالد اسحٰق صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔

انٹرویو: اپریل 1999ء

مقام: کراچی

حوالہ اشاعت: 9 مئی 1999ء روزنامہ جنگ سنڈے میگزین

محمد اکرم شیخ

سابق صدر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن محمد اکرم شیخ نے نوجوانی میں ہی سیاست، بار اور عدلیہ میں اپنی حیثیت منوالی ہے وہ گزشتہ چند سالوں کے دوران ہونے والے عدالتی اور سیاسی تنازعات کے اہم کردار رہے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے دور میں نواز شریف کے وکیل کے طور پر انہوں نے چیف جسٹس سپریم کورٹ سجاد علی شاہ کے خلاف موقف اختیار کیا اور اس حد تک مخالفت کی کہ ان کے خلاف توہین عدالت کے مقدمات پیش ہو گئے، نواز شریف کی حکومت آئی تو انہیں ''ایمبسیڈر رایٹ لارج'' کا اعزاز بخشا گیا جو وفاقی وزیر کے عہدے کے برابر تھا لیکن جب سجاد علی شاہ اور نواز حکومت میں اختلافات پیدا ہوئے تو اکرم شیخ نے بھرپور انداز میں سجاد علی شاہ کی حمایت کی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے اخبارات میں کالم لکھے جگہ جگہ بحث کی حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلم لیگ (ن) کے جاوید ہاشمی ان سے باقاعدہ لڑ پڑے۔ اس حوالے سے شیخ اکرم کے انٹرویو کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے پہلے انٹرویو میں شیخ صاحب نے عدلیہ اور انتظامیہ کے اندرونی جھگڑوں کی کہانی سنائی ہے اور بہت سے معاملات کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے میں امریکی دلچسپی کو بھی وہ سامنے لائے۔ اس انٹرویو کی اشاعت کے بعد اکرم شیخ کا اپنا تبصرہ یہ تھا کہ میں جو باتیں کہنا بھی نہیں چاہتا تھا آپ نے وہ کہلوا ڈالیں۔ اکرم شیخ کا دوسرا انٹرویو عدلیہ کے بحران کے نازک دنوں کے دوران لیا گیا۔ ان انٹرویوز سے عدلیہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور حکومت اور عدلیہ میں تنازعات کی جڑ تلاش کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

محمد اکرم شیخ 5 جنوری 1950ء میں پیدا ہوئے۔ بی اے ایم اے کا امتحان انہوں نے ایف سی کالج لاہور سے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے لاء کرنے کے بعد 1973ء میں کوئین کالج یونیورسٹی آف لندن میں ایک سال قانون کی پریکٹس کی۔ 1976ء میں وہ پنجاب بار کونسل کے سب سے کم عمر رکن منتخب ہوئے۔ 1988ء میں ہائیکورٹ بار ملتان بنچ کے صدر بنے اور 1997ء میں سپریم کورٹ بار کے صدر رہے۔

آیئے اکرم شیخ کی باتیں سنیں اور دیکھیں عدلیہ پر کیا کیا دور آتے رہے۔

اہم نکات

☆ امریکی سفیر کی خواہش تھی کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت بحال نہ ہو۔
☆ جسٹس سجاد علی شاہ نواز شریف حکومت کے خلاف کسی سازش میں شریک نہیں تھے۔
☆ نواز شریف کی اپنی ٹیم بھی نہیں چاہتی تھی کہ توہین عدالت کا مقدمہ پرامن طریقے سے حل ہو۔
☆ ایسا احتسابی عمل جس سے صرف معزول وزراء اور وزیراعظم متاثر ہوں درست نہیں۔
☆ کسی بھی جج کو تعصب کی صورت میں مقدمہ نہیں سونپنا چاہیے۔
☆ بھٹو صاحب کی سزا کا فیصلہ متنازعہ ہے۔ کیس ''ری اوپن'' ہوسکتا ہے۔
☆ ہائیکورٹ میں چیف جسٹس کا منصب بادشاہوں جیسا ہے۔
☆ یہ پلاننگ اعلیٰ سطح پر کی گئی کہ سجاد علی شاہ کو کس طرح مقدمات کی سماعت سے روکا جائے۔
☆ سپریم کورٹ پر حملے سے قبل امریکی سفیر نے مجھ سے کہا'' آپ کا جوڈیشنل ٹائی ٹینک'' ڈوبنے والا ہے۔
☆ جن لوگوں نے کبھی عدالتوں کی شکل نہیں دیکھی تھی انہیں جج مقرر کیا جارہا ہے۔
☆ ہر ملک میں عدالتیں ایسے فیصلے دیتی ہیں جن سے حکومتیں متاثر ہوتی ہیں۔
☆ 1991ء میں نواز شریف نے'' اسپیڈی کورٹ'' کی تجویز دی تو میں نے ان کی مخالفت کی تھی۔
☆ ہم نے ججز کی تعداد کم کرنے کے حکومتی فیصلے کو چیلنج کر دیا۔
☆ حکومت عدلیہ تنازعہ سے جمہوریت مضبوط اور آمریت کمزور ہوئی۔
☆ حکومت دستور کی تعبیر کے حق پر غاصب ہونا چاہتی ہے۔
☆ چیف جسٹس کے اختیارات فل کورٹ کو دینا نابالغ پن ہوگا۔
☆ وکلاء نے افتخار چودھری کا ساتھ دے کر اپنی روایات کو تازہ کیا ہے۔
☆ برادر ججز سجاد علی شاہ کے ساتھ نہیں تھے اب سپریم کورٹ میں ایسی تقسیم نہیں ہے۔

انٹرویو(I)

سوال: شیخ صاحب! آپ کا تعلق عدلیہ سے رہا ہے اس حوالے سے سب سے پہلے میرا سوال یہ ہے کہ گزشتہ 52 سالوں میں پاکستانی عدلیہ کی کارکردگی سے لوگوں کی کس حد تک توقعات پوری ہوئی ہیں؟

اکرم شیخ: آپ نے انتہائی اہم سوال کیا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے جواب میں پاکستان کی نہ صرف موجودہ سیاسی صورتحال بلکہ مجموعی صورتحال کا جواب بھی دینا ہے اس عرصے میں عدلیہ کی کارکردگی ملک کے دیگر اداروں سے نسبتاً بہتر رہی ہے قیام پاکستان کے وقت عالم اسلام کی نظر ہم پر تھی کیونکہ یہ ایک نوزائیدہ مملکت تھی لہٰذا اس کی کارکردگی کو پرکھا جا رہا تھا۔ بہر حال مولوی تمیز الدین کیس اور اس طرح کے دیگر کیسز مثلاً نصرت بھٹو وغیرہ کے کیسز میں ٹیکنیکل بنیادیں بنائی گئیں جب کہ قومی مفادات کو مدنظر نہیں رکھا گیا بلکہ قومی، جمہوری اور وفاق کو جوڑنے والے معاملات کو نظر انداز کیا گیا۔ آج کے دور میں عام شہری کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ عدلیہ مضبوط سے مضبوط تر ہو اور یہی تصور فیڈریشن کا ہوتا ہے چونکہ اس حوالے سے توقعات بہت زیادہ تھیں جو پوری نہ ہوئیں۔

سوال: عام شہری اور مملکت کے درمیان ایک بنیادی معاہدہ جو کہ دستور کی شکل میں موجود ہے اگر کوئی ادارہ ایسا نہیں جو اسے نافذ کر سکے تو پھر شہری کے پاس کوئی گارنٹی نہیں؟

اکرم شیخ: بنیادی طور پر سانحہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں، میں فوجی آپریشن کا مخالف تھا اگر آپ مشرقی پاکستان کے دوستوں سے اس وقت بھی بات کریں یا بین الاقوامی فورم کے موقع پر ان سے ملاقات ہوتی ہے تو ان سے پوچھیں آپ کو محسوس ہوگا کہ ان لوگوں کی جو محرومیاں تھیں ان پر اگر عدالت اپنا کردار ادا کرتی رہتی تو حالات آج مختلف ہوتے انتظامیہ تو اپنی چیرہ دستیوں پر عمل پیرا تھی لیکن اگر اس وقت عدلیہ انتظامیہ کا ہاتھ روک لیتی اور ان کو کہتی کہ آپ فیڈریٹنگ یونٹ کے ساتھ اس طرح نہیں کر سکتے تو پاکستان کی تاریخ مختلف ہو سکتی تھی۔

سوال: شیخ صاحب! مشرقی پاکستان کے حوالے سے آپ فرما رہے ہیں کہ ''میں ملٹری آپریشن کے خلاف تھا'' جب کہ سارا پنجاب ملٹری آپریشن کے حق میں تھا آپ کا نقطہ نظر دوسروں سے مختلف کیوں تھا؟

اکرم شیخ: میں ہمیشہ اپنے ضمیر کے فیصلوں کو مانتا ہوں میں ملٹری ایکشن کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل تھا اسلامی جمعیت طلبہ، البدر اور الشمس اپنے نقطہ نظر کے مطابق پاکستان کو بچانے کے لیے ملٹری ایکشن کو سپورٹ کر رہی تھی میں نے ننکانہ میں 2 اپریل کو ایک تقریر میں ملٹری آپریشن پر تنقید کی یہ تقریب ملٹری آپریشن کے بعد منعقد ہوئی تھی جس میں پورے پنجاب سے مقررین آئے ہوئے تھے۔ اس تقریر کے بعد مارشل لاء والوں نے مجھے ڈھونڈنا شروع کر دیا میں سابق پرنسپل لاء کالج امتیاز شیخ کا مشکور ہوں جنہوں نے مارشل لاء والوں سے کافی عرصے کی تگ ودو کے بعد میری جان بخشوائی لیکن مجھے پابند کر دیا گیا کہ کسی تقریب میں فوجی آپریشن پر تنقید نہیں ہوگی۔

سوال: آپ کا خیال ہے کہ البدر اور الشمس کا موقف درست نہیں تھا؟

اکرم شیخ: جماعت اسلامی کا موقف تھا کہ آپ اقتدار مشرقی پاکستان والوں کو دے دیں لیکن جب مسئلہ ہاتھ سے نکلتا ہوا نظر آیا جیسا کہ اس وقت مکتی باہنی نے انڈین دراندازوں سے الائنس کر کے فزیکلی پاکستان کو علیحدہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو ایسی صورتحال میں ان تنظیموں کی رائے بدل گئی میری رائے فوجی آپریشن سے پہلے اور بعد میں ایک ہی رہی جس پر میں مضامین بھی لکھتا رہا میں نے عرض کیا کہ 2 اپریل 1971ء میں ننکانہ صاحب میں منعقدہ پروگرام میں فوجی آپریشن پر شدید اور کھلم کھلا مخالفت کی۔ وہاں پر موجود یونین کے عہدیداروں نے مجھے منع کیا کہ یہاں پر آرمی انٹیلی جنس والے موجود ہیں اور آپ ہمارے مہمان ہیں ہم نہیں چاہتے کہ آپ کسی مشکل میں پھنس جائیں لہٰذا آپ تقریر چھوڑ کر پیچھے آ جائیں پھر بعد میں ان کا ایک آدمی بطور گارڈ مجھے فیصل آباد روڈ تک بحفاظت چھوڑ کر گیا۔

اس کے بعد ہمارے لاء کالج کے پرنسپل نے کہا کہ کچھ عقل کرو جو آگ مشرقی پاکستان میں لگی ہوئی ہے اس کی چنگاریوں کو آپ یہاں پر کیوں ہوا دیتے ہو جس پر انہوں نے میری جان چھوڑی۔

سوال: آپ نواز شریف حکومت میں گشتی سفیر (ایمبیسڈر ایٹ لارج) تھے۔ بہت سے مقدمات میں آپ نے نواز شریف کی طرف سے پیروی کی وہ کیا محرکات تھے جن کی وجہ سے معاملات خراب ہوئے اور آپ مستعفی ہو گئے؟

اکرم شیخ: میاں صاحب سے میرا تعلق بحیثیت وکیل 1986ء سے رہا ہے۔ 1985ء میں، میں پنجاب بار کونسل کا وائس چیئرمین تھا تب میاں صاحب نے مجھے کہا کہ آپ مجھے اپنی بار کونسل میں بلائیں۔ میں آپ کو 50 لاکھ روپے کی گرانٹ دوں گا آپ بار کونسل کا ریکارڈ چیک کر سکتے ہیں میں نے کہا کہ جی ہم گرانٹ لینے کے لیے آپ کو نہیں بلائیں گے حالانکہ گرانٹ ان اداروں کا قانونی و اخلاقی

حق ہے لیکن ہم آپ کی سیاسی خیرات کو قبول نہیں کر سکتے اس کے بعد وزیر قانون اقبال احمد خان نے بہت دباؤ ڈالا کہ آپ میاں صاحب کو بلائیں یا آپ میرے پاس آ جائیں میں نے کہا کہ میں یہ نہیں کر سکتا لیکن بعد میں، میں نے ان کے کچھ مقدمات کو لیا اور 89ء سے میں ان کے مقدمات کو پرجوش انداز میں لڑتا رہا نواز شریف کے کہنے پر سابق گورنر سرحد فضل حق اور بعض دوسرے صوبائی مقدمات میں نے لڑے، 89ء میں جاوید ہاشمی کا الیکشن لاز پر لیڈنگ کیس ملتان سے میں نے جیتا ریٹرننگ آفیسر سمیت پولنگ کا عملہ وفاقی حکومت نے تبدیل کر دیا تھا اس کے خلاف ہماری رٹ دائر ہو گئی تھی اس کے علاوہ ان کے بزنس ہاؤسز پر بھی میں پیروی کرتا رہا مجھے یہ کہنے پر کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ میں میاں صاحب کا بلا شرکت غیر اکیلا قانونی مشیر تھا جس میں کوئی شبے والی بات نہیں مگر عدلیہ کی آزادی پر میرا یقین ہے۔ 1991ء میں میاں صاحب نے آرٹیکل 212 میں ایک ترمیم کی تھی جس کے تحت ''سمری اسپیڈی کورٹس'' قائم کی تھیں۔ میں اس وقت ان کے قریب تھا وزیر اعظم ہاؤس میں انہوں نے جب یہ تجویز پیش کی تو میں نے مخالفت کی ویسے بھی اس وقت میں پاکستان بار کونسل کا رکن تھا لیکن اس وقت مجھ پر کوئی سرکاری ذمہ داری نہیں تھی میں میاں صاحب کا اپنے پیشے کے لحاظ سے اسسٹنٹ تھا لیکن کبھی میں نے اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ 97ء میں جب میرا میاں صاحب کے ساتھ تنازعہ ہوا تو میں 22 اگست 1997ء تک جنیوا وفد کا پاکستان کی طرف سے لیڈر تھا میاں صاحب کے کہنے پر انہوں نے مجھ سے سان فرانسسکو میں رابطہ کیا جہاں میں امریکن بار ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں شامل تھا انہوں نے کہا کہ ملک کو آپ کی ضرورت ہے جس پر میں میٹنگ نامکمل چھوڑ کر جنیوا پہنچ گیا کیونکہ اس وقت ملک کو جنیوا میں میری ضرورت تھی۔ میڈیم کلیئر پیلی نے پاکستان کے خلاف قرارداد پیش کی تھی جس میں انہوں نے پاکستان میں انسانی حقوق کے بارے میں اپنی رائے دی تھی میں نے کوشش کر کے کلیئر پیلی سے ہی انڈیا کے خلاف قرارداد دلوائی یہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہے جو پچاس سالہ تاریخ میں اپنی نوعیت کی واحد قرارداد تھی جو بھارت کے خلاف بہت سخت قرارداد تھی۔ 22 اگست کو میں وہاں تھا جب قرارداد پر ووٹنگ ہوئی تو بعد میں کلیئر پیلی نے کہا کہ تم بہت خوش قسمت ہو کہ یہ ووٹنگ کل ہو گی اور میری قرارداد ناکام ہو گئی اگر آج تک ملتوی ہوتی تو پھر میں دیکھتی کہ تم یہ سب کیسے کرتے، کیونکہ تمہاری حکومت نے سپریم کورٹ کی ''اسٹرکچرل ریڈکشن'' کر دی ہے میں نے کہا کہ میڈم! آپ تو خوانخواہ پاکستان کے خلاف باتیں کرتی ہیں جس پر وہ کہنے لگیں آپ کو نہیں پتا؟ کہ آپ کے وزیر اعظم سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کم کر رہے ہیں میں نے کہا کہ اس بات کو میں نہیں مانتا تھوڑی دیر بعد جب ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے فیکس موصول ہوا۔ جس میں پیغام درج تھا کہ ججوں کی تعداد 17 سے کم کر کے

12 کر دی گئی ہے۔ اس پر فوری طور پر میں اپنا پروگرام منسوخ کر کے پاکستان پہنچا اور سیدھا وزیراعظم ہاؤس گیا وزیراعظم سے ملاقات کر کے انہیں کہا کہ آپ اس طرح نہ کریں ایگزیکٹو آرڈر سے ملک کی اعلیٰ عدالت کے ججوں کو فارغ کر دینا درست نہیں اور کوئی بھی دانا اور عقل مند شخص اس کی حمایت نہیں کرے گا نواز شریف نے کہا کہ سجاد علی شاہ صاحب اپنے پسند کے ججوں کو بھیجنا چاہتے ہیں اس لیے ہم کس طرح افورڈ کر سکتے ہیں کہ سپریم کورٹ میں ایک مستقل لابی بن جائے میں نے کہا کہ ججز کی لابی کو روکنے کا کیا یہی راستہ ہے اگر وہ ججز ایماندار ہیں اور حق دار ہیں تو پھر آپ کو انہیں قبول کرنا چاہیے ایماندار ججز نہ ہی حکومت کے حامی ہوتے ہیں اور نہ ہی خلاف، وہ آزاد ہوتے ہیں آپ انہیں آنے دیں تو وزیراعظم نے کہا کہ نہیں شیخ صاحب! یہ معاملہ اس طرح نہیں چلے گا آپ اس بارے میں غور کریں اور اس کا حل بتائیں پھر میں نے اس کا حل وزیراعظم کو پیش کیا میں نے کہا آپ سمجھتے ہیں کہ جو جج صاحبان آپ کو قابل قبول نہیں ہیں اور ان کے خلاف اگر کوئی معقول وجوہات آپ کے پاس ہیں تو ججز کیس کے فیصلے کے مطابق آپ وجہ ریکارڈ کر دیں اور ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیں لیکن آپ پہلے اس نوٹیفکیشن کو واپس لیں، اب آپ دیکھیں کیا ہوا کہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدارت میرے پاس تھی میں اپنے آپ کو ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوا محسوس کرتا تھا کہ اگر میں نے اپنے ضمیر اور ادارے کی بہتری کے لیے وہ کام نہ کیا جس کے لیے میں نے 30 سال ڈھنڈورا پیٹا تو میں تو ساری برادری کے سامنے رسوا ہو جاؤں گا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ملکہ الزبتھ کے دورے والے دن مجھ سے برملا گلہ کیا کہ میں نے کہا کہ بی بی میں تو اب بھی لڑ رہا ہوں میں نے کوئی سمجھوتا نہیں کر لیا مطلب یہ تھا کہ میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ تھا کہ ججز کیس کے فیصلے کے نفاذ کے سلسلے میں سپریم کورٹ بار کے صدر کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر بھی لوگوں کی نظریں ہم پر ہی تھیں تو میں نے نواز شریف سے کہا کہ میں بڑی مشکل میں ہوں ایک طرف آپ کی رفاقت اور محبت ہے اور دوسری طرف وہ بار جس کی میں نے ساری عمر تسبیح پڑھی، کیا میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں؟ میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے پھر ہوا یہ کہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن نے قرارداد منظور کر لی کہ ہم اس کو چیلنج کریں گے اب صدر بار ہونے کی حیثیت سے میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو میں سپریم کورٹ کے ساتھ کھڑا ہوں یا پھر حکومت کے ساتھ، پھر میں نے درخواست کی کہ وزیراعظم صاحب! یہ نوٹس آپ واپس لے لیں کیونکہ یہ معاملہ عدالت میں جائے گا میرے لیے بڑی دقت پیدا ہوگی میں آپ کی مدد نہیں کر سکوں گا کیونکہ آپ غلط ہیں آپ اخبار پڑھتے ہوں گے لیکن کبھی بھی آپ نے کسی کا بھی بیان اس سلسلے میں حکومت کے حق میں نہیں پڑھا ہوگا۔ ہاں میں نے پارلیمنٹ کی برتری اور بالادستی کے قصیدے سنے وہاں بھی پارلیمنٹ کی

بالادستی کا سوال کیا تھا اگر وزیراعظم کہتے ججز کی تعداد 12 تو پارلیمنٹ بھی کہتی 12 اگر وہ کہتے 17 تو پارلیمنٹ بھی کہتی 17 ہونی چاہئیں۔تو خیر ہم نے حکومت کے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا اور اس میں ہماری کوئی بدنیتی شامل نہیں تھی، نہ ہی حکومت کے ساتھ کوئی چپقلش تھی یہ ایک اندرونی معاملہ تھا کہ حکومت نے سپریم کورٹ کے ججز کی تعداد کو ایک تہائی کم کر کے سٹرکچر تباہ کیا تھا جو کہ قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا پٹیشن کی سماعت کے دوران مجھے رائیونڈ طلب کیا گیا میں نے بتا دیا کہ میری مجبوری ہے میں یہ تو کر سکتا ہوں بار کا اجلاس بلا کر کیس واپس لے لوں لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ آپ اپنا فیصلہ واپس لیں جس طرح آپ نے جنگ گروپ کے خلاف بغاوت کے الزامات اے پی این ایس اور سی پی این ای کے کہنے پر 92ء میں واپس لیے تھے اسی طرح سپریم کورٹ بار کے اجلاس کی درخواست پر آپ اپنا فیصلہ واپس لے لیں ہم کیس نہیں کریں گے اور اگر آپ یہ نہیں کرتے تو یہ میرا استعفیٰ ہے میں سپریم کورٹ میں پیش ہوں گا حکومت نے شریف الدین پیرزادہ سے پوچھا انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ آپ اس کو واپس لے لیں اور پھر پتا نہیں کس کے مشورے پر 16 تاریخ کو انہوں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا میں نے حکومت سے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں لی جو میرے ضمیر پر بوجھ ہو وزیراعظم صاحب نے وزراء کالونی میں کوٹھی نمبر 15 مجھے الاٹ کی۔ میں نے کہا آپ کو پتا ہے کہ میں پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہوں لہٰذا سرکاری رہائش استعمال نہیں کر سکتا انہوں نے بڑی محبت سے گاڑی بھیجی میں نے کہا میرے پاس پرائیویٹ گاڑی ہے لہٰذا میں نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں آپ نے کہا کہ کوئی یقین دہانی کرا رکھی تھی آپ کو پتا ہے جب میں سپریم کورٹ بار کا صدر منتخب ہو کر گیا تو میرے خلاف توہین عدالت کے الزامات تھے شاہ صاحب کے خلاف بیانات دینے کی بنا پر مجھ پر توہین عدالت کے مقدمات قائم تھے۔

اس وقت کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ صاحب کے ساتھ سپریم کورٹ میں پوری ایگزیکٹو کے ساتھ جب پہلی میٹنگ ہوئی انہوں نے کہا کہ یہاں سیاست کے علاوہ اور جو مرضی کریں تو میں نے کہا کہ چیف جسٹس صاحب! آپ ذرا سیاست کے بارے میں بتا دیں کہ آپ کے نزدیک سیاست کیا ہے اگر سیاست پارٹی پالیٹکس ہے تو میں اس میں آپ کا حامی ہوں سپریم کورٹ بار کی صدارت کی حیثیت سے ہم کوئی ایسا کام نہیں کریں گے کہ وہ کسی جماعت کی حمایت میں یا کسی کے خلاف ہو لیکن اگر آپ کہیں کہ ہم یہاں آزاد عدلیہ وغیرہ کی بات نہ کریں تو وہ ہم کرنے سے باز نہیں رہیں گے کیونکہ ہمارے نزدیک وہ ہمارے پیشے کا حصہ ہے۔

شاہ صاحب نے کہا کہ اگر آپ کے دوستوں کا دور حکومت ہو اور اس میں عدلیہ کی آزادی پر کوئی زد آئے اور وہی معاملات دہرائے جائیں جو آج پیپلز پارٹی کر رہی ہے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا تو

میں نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ میری بات نوٹ کرلیں میں سوائے رب کریم اور اس کی رحمت کے آج جس مقام پر کھڑا ہوں اس میں کسی شخص کا عمل دخل نہیں میں صرف اللہ رب العزت کی رحمتوں سے نہایت عاجزی سے یہاں تک پہنچا ہوں میں آپ کو زبان دیتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا دور آیا جس میں میرے دوستوں نے عدلیہ کی آزادی پر حملہ کیا تو میں عدلیہ کا ساتھ دوں گا اپنے دوستوں کا ساتھ نہیں دوں گا۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کا تعلق مسلم لیگ سے ہے آپ کو پتا ہے وزیراعظم جب 14 ویں ترمیم پیش کرنے لگے جو کہ پارلیمنٹرین کی اظہار رائے پر قدغن ہے 15 مئی کو وزیراعظم مالے سے تشریف لائے اور پارلیمانی پارٹی میں اس پر بحث ہوئی تو 10 یا 11 تاریخ کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے مجھے بلایا اور کہا کہ بھئی آپ لوگ کہتے تھے کہ ہم عدلیہ کی آزادی کے لیے آواز اٹھائیں گے تو یہ ڈرافٹ ہے جو آپ کے وزیراعظم یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور آپ اس کا کچھ کریں، میں نے وزیراعظم تک پہنچنے کی کوشش کی جو کہ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کی وجہ سے مصروف تھے ایک شام 11 یا 12 مئی کو انہوں نے مجھے بلایا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو مجھے بریگیڈیئر صباحت صاحب (ملٹری سیکرٹری ٹو پرائم منسٹر) ملے انہوں نے بتایا کہ وزیراعظم کو اچانک کراچی جانا پڑ گیا ہے یا تو آپ ساتھ چلے جائیں وہاں بات کرلیں یا پھر واپسی کا انتظار کرلیں، میں نے کہا میں شیڈول کے مطابق پرسوں کوئٹہ جا رہا ہوں جہاں بار کی میٹنگ بلائی گئی ہے اس لیے میں کراچی نہیں جا سکتا جس پر انہوں نے کہا کہ اچھا تو پھر مالے سے آ کر بات کرلیں گے تو خیر میں نے اپنی طرف سے وزیراعظم کو فیکس بھجوا دیا کہ یہ آپ نہ کریں لیکن جب پارلیمانی پارٹی تک بات پہنچی تو میں نے سب ممبران کو اپنا نقطہ نظر لکھ کر بھیجا جب 15 مئی کو پارلیمانی پارٹی کا اجلاس ہوا اور وزیراعظم نے 14 ویں آئینی ترمیم کی بات کی تو ان کی حلیف جماعتوں نے وزیراعظم کو بتایا کہ یہ آپ کے وکیل کا خط ہے پہلے آپ اس پر غور کرلیں یہ کام اتنی عجلت میں نہ کریں تمام ممبران پارلیمنٹ کو جن کو میرا لیٹر ملا انہوں نے کہا کہ یہ آپ نہ کریں، تو خیر اس پر اتفاق رائے نہ ہو سکا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے خط کی وجہ سے ایسا ہوا لیکن میرا خط اور اسی دن کے دی نیوز اور نیشن میں چھپنے والا میرا مضمون وزیراعظم کی ناراضگی کا باعث بن گئے انہوں نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ شیخ صاحب! آپ کیا کرتے ہیں اب آپ نے اخباروں میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ میں نے کہا کہ جو بات میں نے آپ سے تنہائی میں کی وہی اخبار میں لکھ دی جب کہ آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ آپ متوازی عدالتی نظام نہیں قائم کریں گے، ہم اسی ایشو پر پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کے دور حکومت میں اتنی بڑی لڑائی لڑ رہے تھے اور آپ کے دور میں یہ کچھ ہوا تو مجھے آپ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا اور آپ نے اپنی پوری مجلس کے سامنے کہا تھا کہ آپ ایسا نہیں کریں گے آزاد عدلیہ کا

ساتھ دیں گے یہاں تک کہ وزیراعظم اس دوران اپنے 80 ممبران پارلیمنٹ کے ہمراہ ہماری دعوت پر سپریم کورٹ میں آئے اور بحیثیت لیڈر آف دی اپوزیشن انہوں نے وہاں تقریر کی کہ ہم یہاں آ کر آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم عدلیہ کی آزادی کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کریں گے۔

یہ ترجیحات تھیں جن کے بارے میں ہم نے چیف جسٹس آف سپریم کورٹ کو یقین دہانیاں کروائی تھیں کہ آپ اس بات کا اطمینان رکھیں اگر ہمارے دوستوں کی حکومت آ گئی تو آپ کے خلاف، عدلیہ اور عدلیہ کے وقار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور اگر ایسا ہوا تو ہم سپریم کورٹ کا ساتھ دیں گے وہ بات ہمارے پاؤں کی زنجیر تھی جو ہمیں روک رہی تھی اور میں اگر شمیم بخاری صاحب کا ذکر نہ کروں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں یہ انصاف نہیں کروں گا بخاری صاحب نے تمام تر تکلیفوں اور مصائب کو برداشت کرتے ہوئے بھی میرا اس سلسلے میں بھرپور ساتھ دیا بلکہ ایگزیکٹو کمیٹی کے تمام ممبران خواہ وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں ان سب نے میرا ساتھ دیا کیونکہ وہ عجیب ذہنی کھچاؤ کا شکار تھے لیکن وہ سب متفق تھے کہ ہم کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے۔

سوال: ججز کیس کے حوالے سے بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ سنیارٹی کے اصول سے پروفیشنل ازم کو نقصان پہنچا ہے ایسا فرد ٹاپ پر آ سکتا ہے جو اس عہدے کا مستحق نہ ہو؟

اکرم شیخ: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ججز کیس میں سنیارٹی اصول کو مروجہ آئین (Constitutional Convention) کے اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا یہ بات درست ہے بعض اوقات موسٹ سینئر آدمی قابلیت کے لحاظ سے میرٹ پر نہیں آ رہا ہوتا لیکن اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر سینئر موسٹ آدمی معیار پر پورا نہیں اتر رہا تو ایگزیکٹو اپنے اعتراضات لکھ کر بھیج سکتی ہے کہ ہم اس کو مقرر نہیں کرتے۔ دوسری بات ترقی پذیر ممالک میں جہاں باقی کوئی اصول وغیرہ موجود نہ ہوں تو میں سمجھتا ہوں وہاں سنیارٹی کا اصول ایک ایسا سہارا ہے جو ایگزیکٹو کو روکنے کے لیے ضروری ہے دیکھیں جب آپ نے کوئی اور اسٹرکچر نہیں بنایا آپ نے سینٹ کی نظر ثانی کی روایت نہیں ڈالی آپ نے کوئی جوڈیشنل کمیشن مقرر نہیں کیا جو کہ جانچ پڑتال کرے تو آپ مجھے بتائیں کہ آپ اس بات کو ایگزیکٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہیں کہ وہ جس کو چاہے چیف جسٹس مقرر کرے میں سمجھتا ہوں کہ سنیارٹی کا اصول ایک غنیمت ہے اور پھر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی ڈس کوالیفائیڈ ہے اس کے خلاف ایسی رپورٹیں ہیں جن کی بنا پر وہ آگے نہیں جا سکتے تو اس صورت میں ایگزیکٹو کے پاس اختیار ہے کہ وہ اپنے اعتراضات ایسی صورت میں لکھ کر اسے مسترد کر دے عدالت کے سامنے انہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ہمارے اعتراضات درست ہیں۔

سوال: شیخ صاحب! ججز کیس کے فیصلہ کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ جوڈیشل آمریت قائم کر رہا ہے اور ایک طرح سے چیف جج بادشاہ بن گیا ہے؟

اکرم شیخ: یہ ایک ابتدائی فیصلہ ہے بارش کا پہلا قطرہ ہے یہ نہیں کہ اس کے آنے کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی مگر جن لوگوں نے کبھی عدالتوں کی شکل تک نہ دیکھی تھی انہیں جج مقرر کیا جا رہا تھا اور ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ججز کیس کے بعد بھی اگر چیف جسٹس اور حکومت آپس میں اتفاق کر لیں تو ابھی بھی وہ کسی جج کو بھی فارغ کر سکتے ہیں میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں ہم پاکستان میں جوڈیشل آمریت قائم نہیں کرنا چاہتے پاکستان کے وکلاء اس ملک میں کسی بھی فرد (خواہ وہ وزیراعظم ہو یا چیف جسٹس) کی آمریت کے حامی نہیں ہیں اسی لیے آپ نے دیکھا کہ میں نے جو جسٹس مینگل کی پٹیشن فائل کی ہے اس میں ہم نے کہا کہ یہ جو تقرری ہے یہ ضابطے کے مطابق ہے نہ کہ صرف چیف جسٹس کی جانب سے ہے اب مجھے توقع ہے کہ سپریم کورٹ اس کو سنے گی اور اس کا فیصلہ کرے گی اور یہ ججز کیس کا دوسرا ثبوت ہے ارتقا پذیر معاشروں میں قانون میں ارتقائی عمل کے ذریعے تبدیلی آتی رہی ہے ججز کیس کا فیصلہ بارش کا پہلا قطرہ تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب اس مسئلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ججز کیس میں حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں بے شمار تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور اس کے لیے میں نے عرض کیا کہ اب مینگل کا جو کیس ہے اس میں چیف جسٹس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا کہ تم سپریم کورٹ میں جاؤ اور انہوں نے انہیں وجوہات کے لیے کہا کہ آپ مجھے سنیارٹی کا اصول توڑ کر اوپر آنے پر مجبور نہیں کر سکتے اور ان کو اپنے منصب سے 11 سال قبل ملازمت سے محروم ہونا پڑا میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا فیصلہ ہے کہ جو فرد کی آمریت قائم کرتا ہے تو وہ فیصلہ درست نہیں اور اس میں بہتری کی گنجائش ہے لیکن یہ فیصلہ جن حالات میں ہم نے لیا یہ کسی جماعت کے خلاف نہیں تھا اب آپ کہتے ہیں کہ عدلیہ نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اس کی وجوہات تین ہیں پہلی بات میرٹ کے علاوہ دوسری بنیادوں پر تقرریاں، اگر ایک آرگن ہے جن افراد پر مشتمل ہے وہ افراد ہی اگر معیار پر پورے نہیں اترے تو پھر اس کے اندر کوئی کمزوری ہے۔ حکومت نے سپریم جوڈیشل کونسل کو آج تک فنکشن نہیں کرنے دیا اور یہ بات ریکارڈ کا حصہ ہے میں عرض کروں کہ حکومت ہر بات کا فائدہ اٹھاتی ہے حکومت بجائے اس کے کہ ان شکایات کو سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیج کر انکوائری کروائے اور عدالتوں کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے دستوری طریقہ اختیار کرے حکومت یہ کرتی ہے کہ جن جج صاحبان کے خلاف ایکشن لینے کے لیے شکایات ملتی ہیں وہ ان کے ساتھ پارٹنرشپ کر لیتے ہیں اور ان کمزوریوں کو اپنے حق میں استعمال کرتی ہے اب میں آپ کو بتاؤں کہ محترم وزیراعظم

نواز شریف کو میں نے چند ججز کے بارے میں بطور صدر سپریم کورٹ بار ایک فائل دی کہ اگر آپ چاہتے ہیں عدلیہ مزید صاف ستھری کارکردگی کو پیش کرے تو آپ اس کو سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیجیں بعد میں مجھے پتا چلا کہ وزیر اعظم صاحب کی متعلقہ جج صاحبان سے ملاقات ہو چکی ہے۔

سوال: کیا ان جج صاحبان میں سے کس ایک نے حال ہی میں کوئی اہم فیصلہ بھی کیا ہے؟

اکرم شیخ: اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ میرا مقصد ایک اصولی بات کرنا ہے میرا مقصد کسی جج کو نشانہ بنانا نہیں ہے ایک کمزور عدلیہ زیادہ مدد، تعاون اور بار کی زیادہ اعانت کی مستحق ہوتی ہے اس لیے میں بہت ساری باتیں جن کو میں ناپسند کرتا ہوں ان کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔

سوال: بے نظیر کی اسمبلی کی معطلی کے خلاف جو رٹ دائر کی گئی تھی اس میں سنا ہے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ سجاد علی شاہ صاحب اسمبلی بحال کرنے لگے وہ کون سا موقع تھا؟

اکرم شیخ: آپ نے جس طرح سنا ہم نے بھی اسی طرح کی باتیں سنیں اور پڑھیں کہ اسمبلی بحال ہو رہی ہے اس سے بے پناہ اضطراب بھی پیدا ہوا خاص طور پر وہ لوگ جو انتخابی سرگرمیوں میں کافی حد تک سرگرم تھے ان میں زیادہ بے چینی دیکھنے میں آئی اس دوران مسٹر تھامس سائمن جونیئر (امریکی سفیر) نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بے نظیر کا مخالف ہوں جس کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے کافی رابطہ رکھا انہوں نے کہا کہ سنا ہے اسمبلی بحال ہو رہی ہے میں نے کہا مجھے تو اس بارے میں معلوم نہیں پھر میں نے الٹا سوال کیا اس خبر کے حوالے سے آپ کے کیا ذرائع ہیں؟

انہوں نے کہا جو باتیں اخبارات میں چھپی ہیں...... میں نے کہا کہ آپ کا اس میں کیا تعلق ہے؟...... کہنے لگے کہ نہیں نہیں ہمارا اس سے بڑا تعلق ہے اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں جو الیکشن ہو رہے ہیں اس کا پراسیس نہیں رکنا چاہیے انتخابی عمل کسی بھی طرح رکنا نہیں چاہیے...... میں نے کہا کہ اگر سپریم کورٹ اسمبلی کو توڑے جانے والے جواز کو غیر قانونی تسلیم کرتے ہوئے اسمبلی بحال کرتی ہے تو یہ بھی جمہوریت کا حصہ ہے سپریم کورٹ نے ہی نواز شریف کی اسمبلی بحال کی تھی اور بجا طور پر کی تھی اور اگر اب بحال ہو گئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے انہوں نے کہا کہ دیکھیں شیخ صاحب!...... بے نظیر بھٹو کمٹمنٹ کی پکی نہیں تھیں لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ وہ دوبارہ واپس آئیں۔

سوال: تو آپ کے خیال میں اس صورتحال میں امریکہ کا کوئی کردار تھا؟ کیا امریکہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کی بحالی کے خلاف تھا؟

اکرم شیخ: کردار کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ امریکہ کی اس میں دلچسپی ضرور تھی اس

میں مجھے کوئی شبہ نہیں امریکی سفیر کی خواہش تھی کہ اسمبلی بحال نہ ہو۔

سوال: سپریم کورٹ کے الیکشن سے عین ایک آدھ دن پہلے فیصلہ دینا اس دلچسپی کی کڑی تو نہیں تھی؟

اکرم شیخ: یہ مجھے نہیں پتا...... میری گزارش یہ تھی کہ بے نظیر صاحبہ کو یہ بھی پتہ تھا کہ انتخابی عمل شروع ہو چکا ہے اگر امریکی دلچسپی امریکی سفیر کی دلچسپی سے مطابقت رکھتی ہے تو میں پھر یہ بات بلاخوف کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں اس وقت امریکی سفیر بہت جذباتی تھے کہ کسی طرح بھی بے نظیر حکومت بحال نہ ہو اور بے نظیر واپس نہ آئیں اور ان کا یہ خیال تھا کہ بے نظیر وعدے کی پکی خاتون نہیں ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ کن وعدوں کی بات کرتے ہیں؟ بے نظیر پاکستان کی لیڈر ہیں اس کے وعدے پاکستان کے لوگوں سے ہیں اگر آپ سے انہوں نے کوئی وعدہ کیا ہے تو کہنے لگے نہیں نہیں شیخ صاحب! یہ خاتون دوبارہ برسر اقتدار آئیں لیکن انہوں نے کوئی کام نہیں کیا اور ہمارے ساتھ جو وعدے تھے ان پر بھی قائم نہیں رہیں میرے خیال میں وہ بڑے منجھے ہوئے سیاستدان تھے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ میں کچی بات تو نہیں کر سکتے تھے بلاخوف وتردید کہتا ہوں کہ وہ دو دن پہلے تک بڑے متفکر تھے کہ کیا فیصلہ آئے گا۔

سوال: سجاد علی شاہ کے سارے فیصلے ایک طرف اور بے نظیر بھٹو کی حکومت بحال نہ کرنے کا فیصلہ ایک طرف اس حوالے سے کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ فیصلہ ان کے باقی فیصلوں سے مختلف ہے؟

اکرم شیخ: دیکھیں شاہ صاحب کے فیصلوں کے متعلق تو میں دوٹوک کوئی بات نہیں کر سکتا شاہ صاحب کا فیصلہ اگر آپ خواجہ احمد طارق رحیم کے فیصلے کے ساتھ پڑھیں تو یہ اس کے مطابق ہے جو معیار سپریم کورٹ نے حاجی سیف اللہ کیس میں ''لے ڈاؤن'' کر دیا ہے سپریم کورٹ نے اسی موقف کو برقرار رکھا ہے مثلاً انہوں نے حاجی سیف اللہ کیس میں کہا کہ اسمبلی غلط طور پر توڑی گئی ہے اسے توڑنے کے لیے کوئی جائز وجوہات نہیں تھیں لیکن اب پوری قوم الیکشن پر آمادہ ہے اور اب الیکشن کا اعلان ہو چکا ہے اور سارے معاملات طے ہو چکے ہیں اس لیے ہم اس کو بحال نہیں کر سکتے۔

سوال: حکومت، سجاد علی شاہ صاحب سے بہت زیادہ ناراض تھی ان اختلافات کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

اکرم شیخ: آپ نے بڑی اہم بات پوچھی ہے اور آپ بھی مجھے گھیر گھیر کر جو بات پوچھ رہے ہیں میں اس کا جواب دوں گا خواہ اس کا نتیجہ مجھے کچھ بھی بھگتنا پڑے میں عرض کروں گا کہ شاہ صاحب

کے حوالے سے پہلی بات جو میں ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ شاہ صاحب کسی سازش کا حصہ نہیں تھے اور وہ بہت اوپن آدمی ہیں انہوں نے وزیراعظم کی موجودگی میں اتنی کھلی گفتگو کی ہے جس کے بارے میں، میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اپنا مؤقف دوٹوک الفاظ میں بیان کریں شاہ صاحب حکومت کے خلاف کسی سازش میں شریک نہیں تھے ان کا یہ موقف تھا کہ میں اپنے عدالتی کام کے متعلق کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا خواہ کوئی وزیراعظم ہو یا کوئی جج اور اگر آپ دیکھیں گے کہ ایک ایسا شخص جس کو حکومت یہ کہے کہ ہم متوازی عدالتی سسٹم قائم نہیں کریں گے اور پھر اس کے بعد پانچ ججز کی ریکوزیشن کے اوپر حکومت دفاعی موقف اختیار کرتی ہے اس کے بعد آپ دیکھیں گے وزیراعظم کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ تھا جس کا ابھی آپ ریفرنس دے رہے ہیں 14 ویں ترمیم کو آپ نے دیکھا کہ اس پر شاہ صاحب کا جو نقطہ نظر تھا اور ان کے جانے کے بعد جو فیصلہ آیا وہ بھی ان کے نقطہ نظر کے مطابق تھا چودھویں ترمیم کو دوٹوک انداز میں تو سپریم کورٹ نے منظور کیا سپریم کورٹ کا فیصلہ تو ظاہر کرتا ہے کہ اس کیس میں شاہ صاحب کا نقطہ نظر غلط نہیں تھا توہین عدالت کے مقدمہ میں 17 نومبر کو میں نے اوپن کورٹ میں یہ کہا تھا کہ توہین عدالت کے مقدمے میں وزیراعظم کورٹ میں آگئے ہیں لہٰذا ان کے آنے کے بعد اس مقدمے کو ڈراپ کر دیں باقی تقاریر آپ دیکھتے رہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وزیراعظم کی اپنی ٹیم بھی نہیں چاہتی تھی کہ یہ مقدمہ پرامن طور پر طے ہو جائے وہ بھی اس بات کی گھات لگائے بیٹھے تھے کہ اب سجاد شاہ صاحب سے کسی نہ کسی طریقے سے جان چھڑا لی جائے تو 18 تاریخ کو جب سپریم کورٹ پر حملہ ہوا تو میں نے ان کی طرف سے جانے سے معذرت کر لی اس لیے کہ جب ذاتی مفاد آ جائے جس طرح عدلیہ کی آزادی ضروری ہے اسی طرح بار کی آزادی بھی ضروری ہے اور میں تو اس بات کا بڑی سختی سے قائل ہوں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں دل میں تعصب پیدا ہو گیا ہے تو نہ ہی میں اس کے حق میں وکالت کرتا ہوں نہ ہی خلاف۔ اسی طرح ایک جج کو بھی تعصب کی صورت میں مقدمہ نہیں سونپنا چاہیے۔

سوال: بے نظیر کا موقف بھی یہی ہے......؟

اکرم شیخ: بے نظیر بھٹو کے موقف کا مجھے پتہ نہیں ہے لیکن وہ قانون ہے جس پر میں یقین رکھتا ہوں اس لیے کہ آپ دیکھیں کہ ہماری اسلامی تاریخ میں اس کے متعلق ایک زریں باب ہے جو عدلیہ کے اصولوں کو اجاگر کرتا ہے۔

ابھی آپ دیکھیں سینٹر ٹنوشی ہاؤس آف لارڈز نے کیس کیا ہے تو لارڈ ہاسٹمین نے دسمبر میں جو فیصلہ دیا تو سینٹر ٹنوشی نے درخواست دے دی کہ جوڈیشل کمیٹی کے فیصلے میں لارڈ ہاسٹمین اس میں

موجود تھے تو وہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے خیراتی معاملات میں ان کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اس فیصلے کو پڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کی پیروی مغربی لوگ کر رہے ہم نہیں کر رہے۔ سجاد علی شاہ کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ غیر معمولی حالات میں اصولوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس وقت ایسا سلوک سامنے آیا جس نے عدلیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

سوال: سپریم کورٹ پر حملے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا نواز شریف کو کیا فائدہ ہونا تھا؟

اکرم شیخ: جج صاحبان نے یہ بات فیصلے میں لکھ دی ہے کہ یہ پلاننگ کسی اعلیٰ سطح پر ہوئی تھی۔ اس کی ضرورت یہ تھی کہ سجاد علی شاہ کو کسی طریقے سے مقدمات سننے سے روکا جا سکے۔

سوال: ایک دن کے لیے......؟

اکرم شیخ: ایک دن کے لیے نہیں یعنی ان کو سبق کیسے سکھایا جائے۔ آپ کو پتا ہے اس کی منصوبہ بندی حکمرانوں کے اپنے ایوانوں میں ہوئی اور لوگوں کو وہاں سے ٹرانسپورٹ مہیا کی گئی یہاں کی مسلم لیگی قیادت کے زیر سایہ بسوں میں لوگوں کو ٹرانسپورٹ کیا گیا اور پھر سپریم کورٹ پر حملہ منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا اب ان لوگوں کو بری کیا گیا ہے کیونکہ اصل عناصر کے خلاف ثبوت نہیں ہیں اب وہ کیس ''ری اوپن'' ہو گیا ہے اس لیے میں اس پر تبصرہ نہیں کروں گا۔ ایک ایڈیشنل سیشن جج صاحب ایک بااثر آدمی کے خلاف مقدمہ سن رہے تھے ایک بااثر آدمی نے جج کو کہا کہ آپ میرے بندے کو بری کر دو ورنہ میں چار ہزار آدمی لے کر آ جاؤں گا تو اس جج نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے افسران سے بات کی تو انہوں نے مجھے کہا کہ یار تم چھٹی لے لو ہمیں اس جھنجھٹ میں نہ ڈالو ایسا ہے کہ دھونس اور دھاندلی سے پورے کلچر کو شہ ملی ہے۔

سوال: ہمارے ملک کے سیاستدانوں کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ یہ کرپٹ ہیں، آپ اس سے متفق ہیں؟

اکرم شیخ: بالکل میں اس سے متفق ہوں کہ عوام میں یہ تاثر عام ہے کہ ہمارے سیاستدان مخلص نہیں کرپٹ ہیں۔

سوال: سیاست میں فوج کا کردار ہونا چاہیے؟

اکرم شیخ: ایک طویل عرصہ سے سیاستدان فوج کے اشاروں پر چل کر سیاست کرتے رہے ہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہو وہ بالکل کھلم کھلا ہونا چاہیے۔ اگر فوج کا کردار ناگزیر ہے تو اسے دستور کا حصہ بنا دیا جانا چاہیے اسے ''ان ڈیفائنڈ'' نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ آپ ان لوگوں کو قائل نہیں

کر سکتے جو اس وقت مطمئن نہیں آپ ان کی اصلاح نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی وجود قانونی طور پر نہیں لیکن عملی طور پر سب کچھ ہو رہا ہے۔

سوال: شیخ صاحب! یہ فرمائیں کہ کبھی ہمارے ملک میں صحیح معنوں میں جمہوریت رہی ہے؟

اکرم شیخ: دیکھیں ہمارے ملک میں جمہوریت اس لیے نہیں ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ڈیموکریسی ہے لیکن وہ ہم سے زیادہ میچور اس لیے ہیں کہ ان کو ڈیموکریسی کے تحت کام کرنے کا زیادہ موقع ملا ہے۔ ہمارے ہاں ڈیموکریسی ہے ہی نہیں ہمارے ہاں ملٹری ڈکٹیٹرشپ ہے جب فیصلہ کن رائے دو اڑھائی لوگوں کی ہی ہو خواہ وہ لوگ بیوروکریٹ ہوں یا سیاسی جماعتوں کے نام پر ہوں یا بیورو کریسی کے ٹولے کے نام پر ہو یا فوج کے نام پر ہو ڈیموکریسی تو نہیں ہے اگر قوم کی تقدیر کا فیصلہ اڑھائی یا پونے تین افراد کو کرنا ہے تو پھر یہ ڈیموکریسی تو نہیں ہے۔

سوال: پاکستان کی خارجہ پالیسی کیا پاکستان کے مفاد میں ہے؟

اکرم شیخ: میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ویسٹرن میڈیا کا جو ردعمل ہے حالیہ کارگل ایشو کے حوالے سے لگتا ہے کہ فارن پالیسی ہماری ہے ہی نہیں۔ حکومت کا سب سے قریبی دوست امریکہ ہے امریکہ نے ہماری وضاحت کو مسترد کر دیا اگر آپ کوئی ایسی پالیسی وضع کرتے ہیں جس کی بدولت ''ایشو ٹو ایشو'' ڈیل ہو ایسی کوئی پالیسی نہیں ہے ہم نے مسلم ممالک کے ساتھ بھی محدود تعلقات بنا رکھے ہیں کسی مسئلے پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ 45/40 مسلم ممالک کا پورا بلاک ہمارے ساتھ ہے۔

سوال: کسی دور حکومت میں بھی ہماری خارجہ پالیسی درست نہیں رہی؟

اکرم شیخ: میرے خیال میں ایوب خان کے دور میں جب ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ تھے تو اس وقت ہماری خارجہ پالیسی بہت اچھی تھی میرے خیال میں اگر بینظیر بھٹو وزیر خارجہ ہوتیں تو بہت بہتر ہوتا جیسا کہ نواز شریف نے اپنے پچھلے دور میں انہیں خارجہ کمیٹی کا چیئرمین بنایا تھا وہ میرے خیال میں صحیح فیصلہ تھا اور میں اس فیصلے سے بہت خوش تھا۔

سوال: آپ نے غیر آئینی کاموں اور عدالتوں کے فیصلوں کو مثلاً تمیز الدین کیس وغیرہ کو ناپسند کیا اور اس کو عدلیہ کے زوال کی ایک وجہ بتایا دنیا کے مہذب معاشروں میں اس طرح کی غلطیوں پر علامتی سزا دی جاتی ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں پر بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے؟

اکرم شیخ: میں تو اس بارے میں ان چیزوں کا بہت بڑا اسپورٹر ہوں بات یہ ہے کہ جو لوگ اس معاملے میں ملوث رہے ہیں معاشرے کو ان سے کنارہ کرتے ہوئے انہیں الگ سے کھڑا کر دینا چاہیے الطاف گوہر صاحب نے کہا تھا کہ ایسٹ پاکستان کے حوالے سے کمیشن بنائیں میں اس کا حامی

ہوں پوری قوم پر جب کسی بات کا الزام آ جائے تو تو پھر قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ حقائق کو متعین کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دے کہ پورا معاشرہ اس جرم کے حق میں نہیں تھا۔ یہ چند لوگ تھے جن کی وجہ سے یہ سب ہوا۔

سوال: آپ کی اس تجویز میں تو پھر جنرل ضیاء الحق بھی آئیں گے یہ ججز بھی آئیں گے؟

اکرم شیخ: پہلی بات تو یہ ہے کہ جج صاحبان کے ادارے کو تقویت دینے والی بات ہوگی اس طرح الزام ایک آدھ فرد پر ہی آئے گا سارا ادارہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا اگر کوئی جج اپنے حلف کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو اس کی نشاندہی کر دی جائے۔

سوال: یہ کیسے ممکن ہوگا؟ اس کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیے؟

اکرم شیخ: جس طرح آپ نے کہا کہ علامتی سزا دینے کے لیے سٹیز نز کمیٹیاں بن جائیں اسی طرح بار ایسے فورم بنا دے جو حکومتی اثر سے الگ ہو کر کام کرے اور اس میں قومی سطح کے لوگ بیٹھیں۔

سوال: آپ کے خیال میں بھٹو کیس بھی ری اوپن ہونا چاہیے؟

اکرم شیخ: اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے، بھٹو صاحب کی سزا کا فیصلہ متنازع ہے بہت سے لوگ اسے ''متنازعہ'' کہتے ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو اس پر بھی کمیشن بٹھایا جا سکتا ہے۔

سوال: عدلیہ بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر رہی؟

اکرم شیخ: عدالتی فیصلوں پر تحقیق کرنے کے لیے ایک ایسی کمیٹی ہونی چاہیے جو اس بارے میں شواہد اکٹھے کر کے اصل حقائق تک پہنچے جس طرح برطانیہ میں ''رف جسٹس'' پروگرام ہے وہ ایک طے شدہ کیس کو پکڑ لیتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ کہیں شہادتیں نظر انداز تو نہیں ہوئیں اور نظر انداز ہونے والی شہادتوں کو وہ ٹی وی کے اوپر دیکھتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جب تک عدلیہ کے فیصلوں پر تنقید نہیں ہو گی تو فیصلوں کی اصلاح کیسے ہوگی۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آپ تنقید کی اجازت دیں جو مثبت تنقید ہے وہ آپ کی اصلاح کر دے گی اور جو منفی یا تخریبی تنقید ہے وہ مخالف کو رسوا کر دیتی ہے اس لیے فیصلوں پر تنقید کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگر احتساب کا عمل موجودہ نظام میں صحیح طرح کام نہیں کر رہا تو نیا نظام بنایا جا سکتا ہے۔ امریکن بار ایسوسی ایشن ججز کی باقاعدہ ریٹنگ کرتی ہے کہ کون سا جج ''اے ون'' ہے کون سا ''بی ون'' ہے اور کون سا ''سی ون'' ہے۔

سوال: پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ اسلامی نظام کا رہا ہے۔ 73ء کے آئین میں ایک سسٹم بنایا گیا کہ اس طرح اسلام نافذ کیا جا سکتا ہے؟ اب حال ہی میں وزیر اعظم نے ایک شریعت بل

کی بات کی ہے جو کہ 73ء کے آئین کی تشریح کے حوالے سے ناکامی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
اکرم شیخ: اسلام کے ساتھ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہوئی ہے کہ اس کے نام کو سلاطین، آمرین، ڈکٹیٹرز نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ ہے اسلامی تاریخ، اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا میں اتنی بڑی سلطنت کس طرح اختتام کو پہنچی تو میں یہ کہوں گا کہ ''آمریت'' کی وجہ سے۔

سوال: اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ 73ء کا آئین خالصتاً اسلامی آئین ہے؟
اکرم شیخ: میرے خیال میں اس میں مزید تبدیلی کی ضرورت نہیں اسلام قانون بدلنے یا نہ بدلنے سے تو نہیں آتا۔

سوال: آپ بورے والا میں پیدا ہوئے آپ نے پریکٹس کہاں کہاں کی؟
اکرم شیخ: میں نے ساہیوال سے پریکٹس کا آغاز کیا وہاں سے لاہور شفٹ ہوا۔ 81ء میں لاہور میں جج بن گئے اس کے بعد ملتان میں بھی دفتر کھول لیا پھر بعد میں اسلام آباد چلا گیا۔

سوال: آپ نے اتنی ترقی کی جو کہ غیر معمولی حیثیت کی حامل ہے اس کی وجہ کیا تھی، کیسے آپ نے اتنی ترقی کی؟
اکرم شیخ: میں سمجھتا ہوں کہ میں تو بہت ہی عاجز اور حقیر سا بندہ ہوں یہ سب کرم اللہ تعالیٰ کا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی کہ میں روزانہ 18 گھنٹے کام کرتا رہا لیکن راستے تو اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے۔ اس میں نہ ہی میری لیاقت کا نہ ہی میری محنت کا نہ ہی میری قابلیت کا کوئی عمل دخل ہے مجھ سے زیادہ محنت تو وہ شخص کرتا ہے جو صبح سویرے گھر سے نکلتا ہے اور سارا دن اینٹیں اٹھاتا ہے۔

سوال: کوئی بھی ہائیکورٹ کا چیف جسٹس سپریم کورٹ میں جانے سے کیوں گھبراتا ہے؟
اکرم شیخ: دیکھیں سپریم کورٹ میں تو درویشی ہی درویشی ہے۔ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس والا منصب بادشاہوں والے منصب کی طرح ہے۔

سوال: یہ جو ترمیم کی ہے کہ جس سے ایک صوبے کا کیس دوسرے صوبے کی کورٹ میں ٹرانسفر ہو سکے گا۔ کیا یہ درست ہے، ایسا ہونا چاہیے؟
اکرم شیخ: جج کی مرضی کے بغیر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ انتظامیہ کو ایک کمزوری مل جائے گی کہ ایک جج ناپسند ہے تو اس کو دوسرے صوبے میں تبدیل کر دے۔

سوال: ججز کیس کی تو خود سپریم کورٹ نے خلاف ورزی شروع کر دی۔ مثلاً جسٹس افراسیاب کے مستقل کرنے......؟

اکرم شیخ: آپ کو میں بتلا دوں کہ میں اس وقت سپریم کورٹ بار کا صدر تھا اور میں نے جسٹس افراسیاب کے بارے میں آرٹیکل بھی لکھا تھا۔ جس میں، میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

سوال: کیا ججز کیس کی روشنی میں جسٹس سجاد علی شاہ کو اپنا عہدہ چھوڑ دینا چاہیے تھا وہ بھی سنیارٹی پر پورا نہیں اترتے تھے؟

اکرم شیخ: دیکھیں شاہ صاحب کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ "سنیارٹی کا سوال" ضرور طے ہونا چاہیے تھا ججز کیس میں اور اس وقت ایک ساتھ ہونا چاہیے تھا اور یہ بات جب پہلا ریفرنس ہوا سپریم کورٹ میں جسٹس منظور حسین سیال کے ریٹائر ہونے پر۔ ججز کیس کا فیصلہ آیا 20 مارچ کو جب کہ 24 مارچ کو منظور حسین سیال کا ریفرنس ہوا۔

میں نے فل کورٹ ریفرنس میں کہا تھا کہ اس ایشو کو ایسے ہی نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اس کا فیصلہ بھی ہو جانا چاہیے تھا۔

سوال: اس میں طے نہیں تھا کہ سجاد شاہ تک......؟

اکرم شیخ: سپریم کورٹ کا موقف یہ تھا کہ یہ التواء میں پڑی ہوئی ہیں اور اجمل میاں صاحب کے اتفاق رائے سے یہ بات طے ہوئی تھی۔

سوال: پھر کیا ضرورت پیش آئی کہ سجاد علی شاہ صاحب کو معطل کر دیا گیا؟

اکرم شیخ: دیکھیں ضرورت تو آپ سب کو پتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری قومی تاریخ کا ایک ناقابل یقین فیصلہ ہے۔

سوال: اس فیصلے کے بارے میں توقع کی جاسکتی تھی؟

اکرم شیخ: میں اس بارے میں کہوں گا کہ یہ فیصلہ میری سوچ کے مطابق غیر متوقع تھا۔ اس فیصلے سے میں کیا کوئی بھی مطمئن نہیں ہے۔ سپریم کورٹ میں بھی اس فیصلے کے متعلق اتفاق یا اطمینان نہیں ہے۔

سوال: سجاد علی شاہ کے بارے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ جج صاحبان بھی ان کے ساتھ نہیں تھے؟

اکرم شیخ: یہ آپ نے بڑی خوبصورت بات کی ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ ہمارے بہت سے چیف جسٹس ایسے رہے ہیں کہ باقی جسٹس صاحبان ان کے ساتھ متفق نہیں ہوتے تھے۔ جسٹس ظلہ، جسٹس شہاب الدین جو کہ بہت بڑے جج تھے، ان کے ساتھ بھی جج نہیں تھے لیکن وہ بہت بڑے ججز تھے۔

سوال: نہیں ان کی کوئی مثال تو ایسی نہیں آئی کہ بغاوت ہوگئی؟

اکرم شیخ: دیکھیں جی چیف جسٹس کا ''الیکٹیڈ آفس'' تو نہیں ہے۔ جج صاحبان اپنے فیصلے میں آزاد ہیں۔ جج کی حیثیت سے تو سارے جج ہم مرتبہ ہیں۔

سوال: ظلہ صاحب کا کون سا ایسا واقعہ ہوا؟

اکرم شیخ: ظلہ صاحب کا بیشتر جج صاحبان کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ آپ کو پتا ہے انہوں نے 18 اپریل کو جب وہ ریٹائر ہوئے تو انہوں نے ریٹائرمنٹ کا ریفرنس نہیں لیا۔ وہ قازقستان میں تھے اور وہیں انہوں نے ریٹائرمنٹ لی۔

سوال: ججز کی بھی ''گروپنگ'' ہوتی ہے؟

اکرم شیخ: دوستیاں اور دشمنیاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔

سوال: شیخ صاحب! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سجاد علی شاہ پرائم منسٹر بننا چاہتے تھے؟

اکرم شیخ: اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میری خوش فہمی یہ ہے کہ شاہ صاحب قانون کی حکمرانی اور دستور کی بالادستی کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وہ کسی ذاتی منصب کے چکر میں نہیں تھے۔ ذاتی منصب اور عہدہ تو حکومت کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا اور حکومت سے اختلاف کے راستے میں چل نکلیں تو اس میں تو مشکلات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ شاہ صاحب اگر کسی ایسے چکر میں ہوتے تو دو ماہ قبل ریٹائرمنٹ لینے کی بجائے حکومت کی رفاقت کو ترجیح دیتے۔

سوال: سنا ہے درمیان میں کوئی صلح ہوگئی تھی؟

اکرم شیخ: وہ جو ایک ہفتے کے لیے کیس ہوا اس کی وجہ چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت تھے جنہوں نے چیف جسٹس سے ذاتی درخواست کی تھی کہ آپ اس کیس کو ایک ہفتے کے لیے کردیں اگرچہ آرمی چیف، چیف جسٹس کو کوئی بات کہنے کے اختیار میں نہیں لیکن وہ فوج کے سپہ سالار تھے ان کی خواہش اور درخواست پر ایسا کیا گیا اور بعد میں پتا چلا کہ یہ خواہش یا درخواست انہوں نے اپنی مرضی سے نہیں کی کیونکہ وہ پاکستان سے باہر دورے پر تھے۔ ان کا دورہ مختصر کر کے انہیں پاکستان بلوایا گیا اور وہ آئے ہی اس لیے کہ وہ اپنا مثبت کردار حکومت کے حق میں استعمال کریں۔ جہانگیر کرامت ابتدا میں پانچ ججز کی تقرری تک بالکل نیوٹرل تھے لیکن بعد میں امریکی سفیر یا حکومت نے اس کو قائل کیا کہ وہ مداخلت کریں کیونکہ اس وقت صدر کلنٹن کا ''برصغیر'' کا مارچ میں دورہ شروع ہو چکا تھا اور امریکی سفیر چاہتے تھے کہ ایسی کوئی فضا یا غیر یقینی صورتحال پیدا نہ ہو۔ بدقسمتی سے اس سارے معاملے میں جہانگیر کرامت صاحب نے جس طرح کردار ادا کیا اور پھر بعد میں جو ان کے ساتھ ہوا وہ اللہ کی طرف

سے......یعنی آدمی کو اپنے کیے کا بھگتنا پڑتا ہے لیکن سپریم کورٹ حملے سے بہت پہلے 24 نومبر کو مجھے امریکی سفیر نے کہا کہ آپ کا جوڈیشنل ٹائی ٹینک ڈوبنے والا ہے اور اگر آپ چاہیں تو میرے پاس لائف بوٹ ہے، آپ سیل آن کر جائیں۔ وہ نواز شریف کی حکومت کے بہت بڑے سپورٹر تھے۔ آپ ریکارڈ دیکھ لیں کہ 24 نومبر 97ء کو انڈین پارلیمنٹ معطل ہوئی۔ نرسیما راؤ وزیراعظم تھے۔ کلنٹن کا دورہ پاک بھارت وہ شیڈول تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکیوں کے کہنے پر جہانگیر کرامت نے وقت لیا اور اس کے بعد کے واقعات آپ جانتے ہیں۔

سوال: آپ کا خیال ہے کہ اس وقت جب چیف جسٹس نے سپریم کورٹ کی حفاظت کے لیے خط لکھا تھا تو فوج کو آنا چاہیے تھا؟

اکرم شیخ: وہ نہیں آئی تبھی حملہ ہوا۔

سوال: بیوروکریسی اور فوج کے بعد عدلیہ ایک بڑی طاقت ہے ان تینوں کا کردار واضح نہیں ہونا چاہیے؟

اکرم شیخ: عدلیہ کا کردار تو واضح ہے۔

سوال: حکومت میں؟

اکرم شیخ: حکومت میں نہیں......۔

سوال: حکومت گرانے میں عدلیہ کا ایک اہم کردار تو آ گیا ہے نا؟

اکرم شیخ: دیکھیں عدلیہ بحران تو پر نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ نے اگر فارن کرنسی اکاؤنٹس پر فیصلہ دیا ہے تو وہ اس نے اپنی عدالتی ذمہ داری پوری کی ہے۔ ہائیکورٹ نے اپنی ذمہ داری پوری کی تھی اگر اس میں اس دوران سیاسی آب و ہوا تبدیل ہو جائے تو آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ عدالت نے حکومت گرانے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ اس اقدام نے، جسے عدالت نے رد کر دیا ہے، کردار ادا کیا ہے۔ عدلیہ کا رول یونیورسل ہے۔ ہر ملک میں عدلیہ ایسے فیصلے دیتی ہے جس سے حکومت متاثر ہوتی ہے۔ تو لہٰذا عدلیہ کا کردار واضح ہے باقی ایگزیکٹو کا، انتظامیہ کا اور باقی اداروں کا رول ڈیفائن نہیں ہے۔ اب آپ کہیے کہ عدلیہ نے ایک شخص کو پھانسی لگا دیا لہٰذا وہ ذمہ دار ہے۔ حالانکہ عدلیہ نے ایسے شخص کو پھانسی لگایا جس نے قابل سزا جرم کیا تھا۔

سوال: لیکن دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ غلط گواہوں پر لوگ پھانسی لٹکا دیئے گئے کہ کیا وہ گواہ مسعود محمود اس قابل تھا؟ کہ گواہی دے سکے۔

اکرم شیخ: اسی وجہ سے وہ فیصلہ متنازع ہے۔ یہ بات ایک آفاقی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی

بڑے آدمی کے خلاف فیصلہ ہوگا تو وہ متنازع ہوگا۔ اب بل کلنٹن کے خلاف ہوا چلی جب کہ عوامی رائے ہے کہ وہ صدارت پر برقرار رہیں اور وہ بڑھتی گئی۔ دن بدن لوگوں نے اس کی کارکردگی کو بطور صدر جج کیا ہے نہ کہ اسے انفرادی حیثیت سے دیکھا۔ قانون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گرے ہوئے گرائے۔ قانون کا مطلب یہ ہے کہ کمزور ترین کو طاقتور کے سامنے کھڑا کرے۔ میں مسلم لیگ کی حکومت آنے سے پہلے بھی کہتا رہا ہوں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ احتسابی عمل جو صرف معزول وزراء اور وزیر اعظم کو مقدمات میں ملوث کر سکتا ہے وہ کوئی احتساب نہیں۔ احتساب وہ ہے کہ جو برسر اقتدار شخص کو احتسابی عمل میں لے آئے۔ آپ اس پر مقدمہ چلا سکیں اور فیصلہ لے سکیں عدل کے مطابق۔ یہ ہے احتساب۔ جب کرپشن ہو رہی ہو اس وقت تو آپ ہاتھ نہ لگائیں اور بعد میں آپ واویلا کریں کہ پکڑ لو، مارو۔

سوال: عدلیہ سے آپ کو امید ہے......؟

اکرم شیخ: جی بالکل! میری ساری امیدیں ہی عدلیہ سے وابستہ ہیں اور میری دعا ہے کہ ایسا وقت آئے جب سارے مسئلے ٹھیک ہو جائیں۔

سوال: آپ مہنگائی سے متاثر ہوئے ہیں؟

اکرم شیخ: مہنگائی سے متاثر ہوا ہوں۔ گھریلو اخراجات کبھی مسئلہ نہیں بنے تھے لیکن اب مشکلات ہیں۔ اگرچہ الحمدللہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی سیلرڈ کلاس ہے۔ گزشتہ دنوں میرے ایک ملازم نے گھر سے کچھ پیسے چوری کر لیے میں نے اسے پکڑا اور پوچھا کہ تم نے کیوں چوری کی؟ حالانکہ میں تو تمہاری مرضی کی تنخواہ دیتا ہوں اس کی آنکھ سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور کہنے لگا کہ جی میرے معاملات حل نہیں ہو رہے تھے اس لیے میں نے چوری کی جب ہر شخص مہنگائی سے متاثر ہوتا ہے تو پھر میں کیسے اس سے بچ سکتا ہوں۔

انٹرویو: جولائی، 1999ء

مقام: لاہور

حوالہ، اشاعت: 29 اگست، 1999ء

انٹرویو(II)

سوال: نواز شریف حکومت کا موقف ہے کہ آئین کی رو سے وزیراعظم کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

اکرم شیخ: آئین کے آرٹیکل 248 کے تحت پاکستانی عدالتوں کے فیصلے بہت واضح ہیں۔ ابتدا سے ہی ہماری عدالتوں کا موقف رہا ہے کہ کسی بھی شخص کو ریاستی امور کی انجام دہی میں اسے آرٹیکل 248 کا تحفظ تو حاصل ہے لیکن ارتکاب جرم خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو اس میں کسی بھی قانون یا دستور کے تحت اسے تحفظ حاصل نہیں۔ اس لیے کہ قانون اور دستور یہ فرض کرتا ہے کہ مختلف امور پر وہ نیک نیتی اور قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ کوئی وزیراعظم قتل، فراڈ یا کسی بھی قسم کا کوئی جرم نہیں کرے گا۔ اس بارے میں دو آراء نہیں ہیں۔ نواب صادق حسین قریشی نے اس دفعہ کا حوالہ دیا تو عدالت نے کہا کہ آپ ایک جرم میں ملوث ہیں۔ آپ کو اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔ احسان الحق پراچہ نے بھی سٹاک ایکسچینج کیس میں اسی دفعہ کو بنیاد بنایا تو سپریم کورٹ کے فل بنچ نے تفصیل کے ساتھ فیصلہ لکھا جو 1990ء کے سپریم کورٹ کے صفحہ 1902 پر درج ہے اس کا صفحہ 1152، 1153 اور 1154 آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں یہ طے ہو چکا ہے کہ کسی بھی وزیراعظم، صدر، گورنر، وزیراعلیٰ یا وفاقی وزیر کو جرم کے خلاف کسی قسم کا تحفظ نہیں ملے گا۔ وگرنہ یہ سمجھنا پڑے گا کہ قانون عمل درآمد کرانے والوں کو جرم کی ترغیب اور تحفظ دیتا ہے۔ دستور یا قانون سے اس قسم کے مفروضے وابستہ نہیں کیے جا سکتے۔

سوال: حکومت کا موقف ہے کہ عدالتی بحران ختم ہو گیا ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟

اکرم شیخ: حکومت اور عدلیہ کی موجودہ کشمکش ایک دستوری بحران تھا اس لیے کہ دستور کے تحت ایک ادارے کے ذمے جو فرائض تھے یعنی جج حضرات مقرر کرنے کے انہیں سرانجام نہیں دیا جا رہا تھا۔ جب دستوری فرائض کی انجام دہی میں تعطل پیدا ہو یا رکاوٹ آ جائے تو ہم اسے بحرانی کیفیت کہتے ہیں۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ چند حکومتی عہدیداروں کے خلاف عدالت میں مقدمات ہیں۔ مقدمات بحران کا باعث نہیں بنتے۔ یہ صرف پاکستان میں ہی نہیں ہے امریکی صدر کے خلاف وائٹ واٹر سکینڈل میں اس کی ایک سابق سیکرٹری نے کہا کہ صدر نے اس پر جنسی تشدد کی کوشش کی۔ برطانیہ میں آئے دن وزراء کی عدالتوں میں طلبی ہوتی رہتی ہے۔ اٹلی کے کئی وزرائے اعظم کو سزائیں مل چکی

ہیں۔ جاپان کے کئی وزیراعظم کرپشن کے الزام میں جیلوں میں بند ہیں۔ کوریا کے سابق صدر اور وزیراعظم کے خلاف احتساب کے سلسلے میں مقدمات جاری ہیں۔ بھارت میں حوالہ اور دیگر سکینڈلز میں ان کے بڑے مضبوط وزرائے اعظم چھوٹے چھوٹے مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں جاتے ہیں، دراصل پاکستان کا مسئلہ انا پرستی اور بادشاہت ہے۔ ہمارے مضبوط ارکان اسمبلی اور وزراء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قانون سے بالاتر ہیں۔ جتنا بڑا مینڈیٹ کسی کے پاس ہو وہ خود کو قانون سے اتنا ہی بالاتر سمجھتا ہے۔ جہاں جمہوریت مضبوط ہے وہاں یہ معمول کی کارروائی ہے اور جہاں جمہوریت کمزور ہے وہاں یہ صورت حال بڑی گھمبیر ہے۔ وہاں کے حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ ایک تنخواہ دار شخص کو انہی نے جج کے منصب پر بٹھایا ہے اس کو یہ مجال نہیں ہونی چاہیے کہ کروڑوں لوگوں کے ووٹ حاصل کرنے والے سے وہ جواب طلبی کر سکے حالانکہ یہ بات طے ہے کہ اس جج پر جانچ پڑتال کی دشوار ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر اس کے پاس بشمول وزیراعظم، صدر، چیف منسٹر، گورنر کسی بھی شخص کے جرم کا معاملہ آتا ہے تو اس نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ جج کا کام حکومت چلانا سڑکیں بنانا پانی مہیا کرنے کے منصوبے بنانا نہیں ہے بلکہ وہ فائلوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

نواز شریف کی حکومت اپنے کاموں میں اضافہ کر رہی ہے میں حکومت سے درخواست کروں گا کہ اس کے ذمے پہلے ہی بہت کام ہے جن کی اسے فکر ہونی چاہیے۔ دستور کی تعبیر حکومت کا کام نہیں ہے۔ دستور کی تعبیر صرف عدالت کرتی ہے۔ دستور وہ ہے جو عدالت کہے گی اور یہ بلا شرکت غیرے اسی کا کام ہے۔

سوال: حکومت کہتی ہے کہ سپریم کورٹ کے بنچوں کی تشکیل کے اختیارات پارلیمنٹ کے ذریعے چیف جسٹس سے لے کر فل کورٹ کو دے دیئے جائیں گے۔

اکرم شیخ: اگر وہ ایسا کریں گے تو عرض کروں کہ ہمارے کسی بھی ہمسایہ ملک میں ایسا نہیں ہے۔ سارک ریجن میں کسی بھی ملک میں یہ اختیار چیف جسٹس کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ دستور کے طالب علم کی حیثیت سے باقی ممالک کے حوالے سے بھی کام کا آغاز کر چکا ہوں کہ کسی ملک میں بنچ کی تشکیل میں چیف جسٹس کے علاوہ کسی دوسرے کو اختیارات حاصل ہیں یا نہیں ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی بات کہنا قبل از وقت ہے۔ اگر حکومت ایسی کوئی ترمیم کرتی ہے جس سے عدلیہ کی آزادی میں مداخلت ہوتی ہے تو پاکستان کی بار ایسوسی ایشن، پاکستان کے وکلاء، شہری عدلیہ کی آزادی کا پورے زور کے ساتھ تحفظ کریں گے اور ہمیں امید کامل ہے کہ عدلیہ خود بھی اپنے حقوق کی اسی طرح تحفظ کرے گی جس طرح اس نے موجودہ دور میں کیا ہے۔

سوال: بے نظیر حکومت عدلیہ سے کشمکش کی وجہ سے ختم ہوئی۔ کیا موجودہ حکومت کا بھی انجام ایسا ہی ہوگا؟

اکرم شیخ: میری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ پیپلز پارٹی تصادم کا کلچر رکھتی ہے۔ اقدار کو کمزور کر کے انہیں ختم کرنا پیپلز پارٹی کے ضمیر میں شامل ہے مگر مسلم لیگ کا کلچر بانی پاکستان حضرت قائداعظم کا کلچر ہے۔ اس سے مجھے یہ توقع ہے کہ وہ اپنا کلچر چھوڑ کر پیپلز پارٹی کا کلچر اختیار نہیں کرے گی۔ میں مسلم لیگ کے ان لوگوں سے جنہوں نے قائداعظم کے ساتھ کام کیا وہ لوگ جنہوں نے مسلم لیگ کے کلچر کو ڈسپلن کے طور پر خود پر طاری کیا ہوا ہے ان کی خدمت میں دست بدست عرض کروں گا کہ وہ اپنا کلچر چھوڑ کر ایسا کلچر اختیار کرنے کی کوشش اور خواہش نہ کریں جو ہمارا کلچر نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی نے ملک توڑ کر حکومت بنائی۔ مسلم لیگ نے انڈیا میں سے ناممکن حالات کے باوجود مسلمانوں کے لیے ملک حاصل کیا۔ دونوں کے کردار، تاریخ اور کلچر میں واضح فرق ہے۔ میں اپنی قیادت سے آپ کی وساطت سے یہ درخواست کروں گا پیپلز پارٹی کی روایات پر عمل ترک کر کے عدالتوں کا احترام کریں۔ عدالتی اداروں کو اہمیت دیں اور قانون کی بالادستی، آئین اور عدلیہ کی آزادی کے آگے سر جھکائیں۔

سوال: قانون کی حاکمیت کو کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے؟

اکرم شیخ: میں قانون کا طالب علم ہوں۔ میں نے 8 سال کی عمر میں پہلا مارشل لاء دیکھا۔ 1958ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے وقت اتنا خوف اور دہشت تھی کہ میں اپنی والدہ سے لپٹ کر پوچھتا کہ مارشل لاء والے مجھے تو کوڑے نہیں ماریں گے۔ میں نے میڈیکل کی تعلیم کی خاطر ایف ایس سی کی تھی مگر بعد ازاں میں نے انگریزی ادب اور اکنامکس میں والدین کو ناراض کر کے ایف سی کالج سے گریجوایشن کی۔ اگر بچپن سے یہ خوف بیٹھ جائے کہ مطلق العنان قوتیں آپ کو کھا جانے، ہڑپ کر جانے، عزت و وقار کو ملیامیٹ کرنے، پس دیوار زنداں اور تباہ کرنے کے لیے ہے تو آپ میں کیا ادراک پیدا ہوگا۔

سوال: بعض ممالک میں تو مارشل لاء سے اچھے اثرات فروغ پائے ہیں؟

اکرم شیخ: آپ بات عملی صورتحال سے دوسری جانب لے جارہے ہیں میں نظام میں تبدیلی اور درستی کا علمبردار ہوں۔ میرا ایمان یہ ہے کہ نیک حکمرانوں اور نیک آمروں نے نہ اس معاشرے میں کوئی اچھا رول ادا کیا ہے اور نہ وہ کرسکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ نظام جس میں خلق خدا کا عمل دخل نہیں ہوتا وہ کسی بھی صورت میں بہتر نتائج نہیں دے سکتا۔ میں کسی ایسی فیکٹری سے واقف نہیں ہوں جہاں ماؤں کی کوکھ سے صرف نیک دل حکمران پیدا ہوتے ہوں۔ 1993ء میں سپین گیا جہاں میں نے مسجد

قرطبہ جا کر حاضری دی، مسجد قرطبہ کے اردگرد چبوترہ ہے کھڑے ہو کر اذان دی اس نیت سے کہ شاید کوئی مسلمان اذان سے متاثر ہو جائے۔ اس ملک میں جہاں نیک دل لوگوں نے سات سو سال حکومت کی مگر افسوس ہے کہ وہاں آج لوگوں کے دلوں میں اسلام کی شمع روشن نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان نیک لوگوں نے اقتدار میں خلق خدا کو شریک نہ کیا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں نظام کی ضرورت ہے نیک افراد کی ضرورت نہیں۔ ہم برے نظام کو تدریجی نظام سے گزار کر اچھا بنا لیں گے۔ ہم نامکمل نظام کو تعمیر کے تسلسل سے گزار کر مکمل کر لیں گے مگر خدا کے لیے ہمیں نیک حکمرانوں کا عادی نہ بنایا جائے۔ لوگ زکوۃ خیرات اور صدقے کے مستحق نہیں ہیں بلکہ اپنے حق کو حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ کسی پر ترس کھا کر خیرات دے دینا انسانیت کی تذلیل ہے جسے اس نے بہترین انداز سے بنایا ہے۔ انسان اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ خدا کے لیے اس مخلوق کو اتنا کمتر نہ کیجئے۔

سوال: ہمارے مذہبی حلقوں کا خیال ہے کہ پاکستان کا دستور اسلام کے مطابق نہیں ہے؟

اکرم شیخ: آپ مولویوں سے میری لڑائی کرانا چاہتے ہیں۔ قرآن کا نظام شورائی نظام ہے۔ مشاورتی سیاست اور نظام قرآن وسنت کے بنیادی اجزاء ہیں، غزوۂ احد میں مشاورت کے نتیجہ میں ساری منصوبہ بندی ہوئی مگر اس کے باوجود عارضی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ آل عمران کی آیت 159 اسی وقت نازل ہوئی اور رب کریم نے فرمایا مشاورت جاری رکھو۔ مشاورت یہ نہیں ہے کہ مشورہ لے کر عمل نہ کیا جائے۔ عوام سے کی گئی مشاورت حکمرانوں کے لیے پابندی ہے۔ موجودہ نظام میں ووٹ مشاورت کی عملی تفسیر ہے۔ میرے نزدیک جمہوری نظام جس میں آپ لوگوں کی رائے لیتے ہیں وہ اجماع کی طرح ہے اور ''وشاورھم فی الامر'' کی عملی تفسیر بیلٹ بکس اور بیلٹ پیپر ہے۔

سوال: حکومت نے حال ہی میں ٹی وی پر پاپ میوزک پر پابندی لگائی ہے کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

اکرم شیخ: معاشرے پر دنیا کے اثرات کو روکا نہیں جا سکتا ہے یہ روشنی کے آگے دیوار کھڑی کرنا ہے۔ میں بے حیائی کا کلچر لانے یا اس کا مقابلہ نہ کرنے کا حامی نہیں ہوں۔ بے حیائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنا ہماری روایت ہے، برائی میں طاقت نہیں ہے، برائی اندھیرا اور سچائی روشنی ہے۔ روشنی کو اتنا پھیلا دیں کہ اندھیرا بھاگ جائے پالیسی یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ہمیں کمرے میں بند کر کے تالا لگانے کے بعد چابی اندھیرے کنویں میں پھینک دیں۔ الیکٹرانک میڈیا کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔ یہ پچھلے پچاس سالوں میں لوگوں کو پاکستان بنانے کے مقاصد سے آگاہ اور پاکستان کی زمین کے ساتھ محبت پیدا نہیں کر سکا ہے۔ ہمارے پرنٹ میڈیا نے ایوب کے دور میں بھی بے شمار قدغنوں کے باوجود مستقل

مزاجی سے خود کو آزاد کرالیا، ضرورت اس امر کی ہے کہ پرنٹ میڈیا کی طرح الیکٹرانک میڈیا بھی آزاد ہو۔ اسے بھی ریاستی کنٹرول سے آزاد ہونا چاہیے کیونکہ دستور بھی اس کا حامی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آرٹیکل 19 کی تشریح کے تحت الیکٹرانک میڈیا کو بھی پابندیوں سے نکالنا چاہیے تاکہ سمجھدار لوگ زی ٹی وی، ایل ٹی وی، سٹار ٹی وی کے مقابلے کے بارے میں سوچ سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھارت کے پاس کلچرل استحکام کے سوا کوئی چیز نہیں ہے اور اس کو انہوں نے بائینڈنگ فورس بنالیا ہے۔ جس سے وہ ہم پر حملہ آور ہیں اور ہم حکومت کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ خیرات کے طور پر ایسی پالیسی بنادے کہ بھارت کی ثقافتی یلغار کو روکا جاسکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غیر ملکی ثقافتی یلغار کو روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا بھی پرنٹ میڈیا کی طرح حکومتی کنٹرول سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ میں پاکستان کے مستقبل سے بہت پرامید ہوں۔ 1996ء میں ججوں کی تقرری کا جو فیصلہ سامنے آیا اس پر میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا فضل کیا۔ پاکستان کے 50 سال بعد کم از کم عدلیہ تو آزاد ہوگئی۔ موجودہ لڑائی میں مجھے نہیں معلوم کہ کس کا کیا نقصان ہوا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس سے جمہوریت مضبوط اور آمریت کمزور ہوئی ہے۔ آئندہ کوئی بھی حکمران اپنی انا کے باعث عدلیہ کی آزادی پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔

سوال: احتساب کے عمل پر آپ کیا کہتے ہیں؟

اکرم شیخ: سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قراردادوں میں ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ سیلیکٹو احتساب ہے جو شفاف نہیں ہے۔ اس بارے میں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قراردادیں آپ کے سامنے ہیں۔

سوال: آپ کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟

اکرم شیخ: میرا موقف سپریم کورٹ بار سے الگ نہیں ہوسکتا کیونکہ جب یہ قراردادیں پیش ہو رہی تھیں میں اس وقت اجلاس کی صدارت کر رہا تھا۔

سوال: بھٹو کو پھانسی دینے کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

اکرم شیخ: بھٹو کو غلط سزا نہیں ملی تھی۔ یہ خدا کا قانون اور انصاف ہے کہ ایک بندہ غلط کام کرتا رہتا ہے اور سزا اسے بچتا رہتا ہے مگر اچانک خدا کی پکڑ میں آجاتا ہے۔ بھٹو سے بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ کوئی شخص بھٹو کو پھانسی نہیں دے سکتا تھا مگر چونکہ وہ خدا کی گرفت میں تھے اس لیے بچ نہ سکے اور میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو خاندان بھی ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ تکبر، غرور، نفرت، انسانیت کی تذلیل کی سزا تو موت سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔

سوال: اس فیصلے پر آپ کیا کہیں گے؟ اس مقدمے کے ایک جج نسیم حسن شاہ تو خود اس فیصلے پر افسوس ظاہر کر چکے ہیں؟

اکرم شیخ: ہماری عدالتوں کے فیصلے اچھے بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں جن پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر کبھی جسٹس نسیم حسن شاہ نے اس فیصلے پر کوئی رائے دی ہے تو ضروری نہیں کہ میں شاہ صاحب کے موقف کی تقلید کروں۔ البتہ میں لوگوں کی اس بات سے متفق ہوں کہ وہ ایک متنازعہ فیصلہ تھا۔ بھٹو کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تکبر غرور اور کئی قتلوں پر سزا ملی تھی۔

سوال: چیف جسٹس سجاد علی شاہ سے اختلاف کرنے والے ججوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

اکرم شیخ: میں تو اپنے اختلاف سے بہت آگے چلا گیا۔ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ اختلاف نہیں رکھنا چاہیے۔ ججوں کو اختلاف رائے کا حق حاصل ہے مگر انہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے اظہار کا کون سا موقع مناسب ہے۔

سوال: ہر شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان ججوں کا مستقبل کیا ہے؟

اکرم شیخ: وہ بہت معزز جج ہیں جن ججوں نے اختلاف رائے کیا ان میں بڑے بڑے نام ہیں۔ جن کے تقویٰ اور طہارت کو سارے ملک پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر جسٹس اجمل میاں، جسٹس ناصر اسلم، جسٹس صدیقی اور باقی جج صاحبان بہت محترم ہیں۔ میں اس بات پر ختم کروں گا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاء است

انٹرویو: اکتوبر، 1997ء

مقام: لاہور

حوالۂ اشاعت: 12 نومبر، 1997ء روزنامہ جنگ، لاہور

انٹرویو(III)

سوال: موجودہ عدالتی بحران نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے آپ اس بحران کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

اکرم شیخ: 9مارچ 2007ء کے دن جنرل مشرف صاحب کی چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کے باعث پیدا ہونے والا بحران، جنرل صاحب کے 12اکتوبر 1999ء کے قبضہ سے لے کر گزشتہ سات سال کے عرصہ میں فوجی حکومت کے خلاف جنم لینے والا سنگین ترین بحران ہے اور 9مارچ سے اب تک رونما ہونے والے واقعات کی سادہ ترین تفسیر میں بات اظہر من الشمس ہے کہ جنرل صاحب کی قیادت کے دن گنے جا چکے ہیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ریفرنس سے پہلے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بظاہر بہت زیادہ ہردلعزیز چیف جسٹس نہیں تھے لیکن بار نے ان کے لیے بے مثال یکجہتی اور جدوجہد کا راستہ اختیار کیا، کیوں؟

اکرم شیخ: پاکستان کے وکلاء نے فوجی آمریت کے لیے ہمیشہ جرأت اور فقید المثال قیادت کے درخشندہ باب رقم کیے ہیں۔ ایوب خان کی طویل آمریت کے خلاف جس کامیاب تحریک نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کیا وہ بارایسوسی ایشن کے ایوانوں سے ہی شروع ہوئی۔ مس رابعہ سلطان قاری اور میاں محمود علی قصوری اس تحریک کے ہراول دستے کے قائد تھے۔

جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد عدلیہ کی آزادی پر جو رکیک حملے کیے ان سب کے خلاف بار نے آواز اٹھائی لیکن اس وقت شاید تبدیلی کا عمل مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس بار جب 9مارچ کو فوجی وردی میں استعفیٰ کا مطالبہ کیا تو پاکستان کا ہر شہری فوجی حکمران کے خلاف صدائے احتجاج بن گیا۔ بار نے نہایت دانش مندی سے اس جدوجہد کی قیادت کسی سیاسی جماعت کے ہاتھوں میں جانے نہیں دی اور قائداعظم کی وراثت کا امین یہ طبقہ بیک زبان اپنے گروہی اختلافات کو چھوڑ کر اس نقطہ پر متحد ہو کر جنرل مشرف کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

سوال: چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے دور میں پیدا ہونے والے بحران کے آپ اہم کردار تھے، سجاد علی شاہ اور افتخار محمد چودھری کے پس منظر میں اس جدوجہد کا تقابلی موازنہ کیسے کریں گے؟

اکرم شیخ: سجاد علی شاہ کا مقابلہ میاں نواز شریف سے تھا جنہیں دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے۔ وفاق کی چار اکائیوں میں ان کی سپورٹ موجود تھی اور وکلاء کے اندر بھی ایک با اثر گروپ ان کے ساتھ تھا، جناب سجاد علی شاہ صاحب چونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے حلقہ نیابت کو چھوڑ کر ان سے ناراضگی مول لے چکے تھے اس لیے ملک کی دوسری بڑی جماعت پیپلز پارٹی بھی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ جب کہ افتخار محمد چودھری کا مقابلہ ایک ایسے فوجی آمر سے ہوا ہے جو طویل عرصہ سے پاکستان کے عوام کے ساتھ ہر ایشو پر تصادم کی راہ اپنائے ہوئے ہے۔ افتخار محمد چودھری کے مستعفی ہونے سے انکار کی ادا نے ہر شخص کو ان کا ہمنوا بنا دیا ہے اور جنرل مشرف ایک واضح پسپائی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

جناب سجاد علی شاہ صاحب کے ساتھی جج ان کے ساتھ نہیں تھے لیکن بار کے اور عوام کے اختلافی موقف کے سبب موجودہ سپریم کورٹ میں وہ تقسیم دکھائی نہیں دیتی۔

سوال: 9 مارچ کے بعد ایسا دکھائی دیتا تھا کہ شاید نعیم بخاری ایڈووکیٹ کا خط اس ریفرنس کی بنیاد بنا۔ نعیم بخاری نے ابتدا میں کہا تھا کہ انہوں نے آپ کو اپنا خط دکھا کر جاری کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس خط میں آپ کی رضامندی بھی شامل تھی؟

اکرم شیخ: آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کبھی سازش کرنے پر یقین نہیں رکھتا۔ جب بخاری صاحب نے مبینہ خط لکھا تھا میں اپنے بیٹے فیصل سلمان کے ساتھ امریکہ کی ریاست میری لینڈ کے ایک ہسپتال میں تھا۔ اس ضمن میں معروف صحافی جناب کامران خان نے مجھ سے گفتگو کی اور میں نے دوٹوک حقائق بیان کر دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں 9 مارچ کو پاکستان میں ہوتا تو چودھری افتخار محمد کا وکیل ہوتا۔ میں اپنی پروفیشنل لائف میں 1974ء سے عدلیہ کی آزادی کی تحریک سے وابستہ ہوں اور یہ امر میرے لیے ایک عقیدے اور ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1989ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے 42 جج صاحبان کو معطل کر دیا جو میری درخواست پر سپریم کورٹ سے بحال ہوئے۔ 1996ء میں بطور صدر سپریم کورٹ بار ججز کیس کا فیصلہ ہماری جدوجہد سے صادر ہوا۔ 1997ء میں نواز شریف کے ساتھ تنازعہ کی واحد وجہ عدلیہ کی آزادی تھی۔ اور موجودہ سٹرگل میں، میں مکمل طور پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے ساتھ ہوں۔

انٹرویو: جون، 2007

غیر مطبوعہ

ضمیمہ جات

نعیم بخاری ایڈووکیٹ کا چیف جسٹس افتخار احمد چودھری کے نام ''مشہور'' خط
چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس
سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کا حلفیہ بیان
چیف جسٹس کا سپریم جوڈیشل کونسل میں بیان
بیان حلفی ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل حامد جاوید چیف آف سٹاف برائے صدر پاکستان
بیان حلفی میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد، ڈائریکٹر جنرل، ملٹری انٹیلی جنس
بیان حلفی بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعجاز احمد شاہ، ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو
اہم عدالتی فیصلے
عدلیہ کے عروج کا سفر -- کب کیا ہوا؟

نعیم بخاری ایڈووکیٹ کا چیف جسٹس افتخار احمد چودھری کے نام "مشہور" خط

"My Lord, I write this letter as an Officer of the Supreme Court of Pakistan and as a stake-holder in the dispensation of justice, vitally interested in the functioning of the Supreme Court. As an Attorney, I look up to the Court and want to see it on a high pedestal of dignity, compassion and justice, tempered with mercy". I believed that you were vigorous, capable of lifting up the SC, creating an espirit-de-corps among your brother judges, restoring the dignity and grandeur of the apex Court, particularly considering the long tenure before you.

And then Naeem takes off his gloves and adds: "Alas this has not come about. I am not perturbed by your insistence on protocol Hethen lists his grievances: "Your desire to be presented a guard of honour in Peshawar, the appropriation of a Mercedes-Benz cars, the useof the Government's airplanes and helicopters, the huge amount spent in refurbishing the chamber and residence of the Chief Justice, the reservation for yourself of a wing in Supreme Court Judge's guest house in Lahore, the permanent occupation by the Supreme Courtof the official residence of the Chief Justice of Sind, who per force lives in the basement of his father's house.

I am appalled that you announce decisions in Court, while in the written judgment an opposite conclusion is recorded. Mr. Fakhruddin G. Ebrahim complained that in open Court you had accepted his appeal but dismissed the same in the judgment. If Mr. Khalid Anwar, a former Minister of Law and Parliamentary Affairs, and Mr. Fakrhuddin, Senior Counsel, are treated in this manner, the fate of lesser known lawyers would certainly be far worse. My grievances also concern the manner in which the highest court of appeal is dispensing justice under your leadership, where you are consistently violating the dignity of lawyers. We are treated harshly, rudely, and brusquely and are not heard and are not allowed to present our case. There is little scope for advocacy and the words used in the Bar Room for Court No.1 are "the slaughter house".

We are cowed down by aggression from the Bench, led by you. All we receive from you is arrogance, aggression and belligerence. You also throw away the file, while contemptuously announcing: "This is dismissed. Yet this aggression is not for everyone. When Mr. Sharifuddin Pirzada appears, your Lordship's demeanor and appearance is just sugar and honey. You are obsequious to the point of meekness. So apart from violating our dignity, which the Constitution commands to be inviolable, we suffer discrimination in your Court. The way My Lord conducts proceedings is not conducive to the process of justice and obstructs its due process. I am pained at the wide publicity to cases taken up by My Lord in the Supreme Court under the banner of Fundamental Rights. In the bar room, this is referred to as a "Media Circus". My Lord, before a rebellion arises among your brother judges and the Bar stands up collectively and the entire matter is placed before the Supreme Judicial Council, there may be time to change and make amends.

Naeem Bokhari

Advocate SC of Pakistan.

Respectfully sheweth: The facts and circumstances necessitating this Reference by the President of the Islamic Republic of Pakistan ("Pakistan") under Article 209 of the Constitution, briefly stated, are as under I, the Prime Minister of Pakistan on receipt of information from several sources, with respect to the conduct of Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, the Chief Justice of Pakistan (hereinafter referred to as, "the learned judge") was pleased to advise the President of the Islamic Republic of Pakistan to "direct" the Supreme Judicial Council of Pakistan, in exercise of its powers under Article 209 of the Constitution, to inquire into the matter and report to the President whether the learned judge has been guilty of misconduct and further, whether he should be removed from office? II. The advice of the Prime Minister was, inter alia, base on the following:

1. Dr. Arsalan Iftikhar is one of the sons of the learned judge. A narrated in paragraph 2 to 25, the learned judge committed misconduct by employing his position to gain undue advantage for Dr. Arsalan Iftikhar. To secure this end he committed and was responsible for the commission of a number of unlawful acts. That all the acts narrated in paragraphs 2 to 25 were committed as a result of his influence and on account of the demands made by him and the pressure exerted by him. He unlawfully used his position as a judge and Chief Justice of the Supreme Court of Pakistan to influence, harass and intimidate all concerned and compelled them to act in an unlawful manner. Such conduct is unbecoming a judge and is particularly reprehensible in the case of the Chief Justice of Pakistan.

2. Dr. Arsalan Iftikhar sought admission to Bolan Medical College in the year 1996. Having secured 639 marks with an overall "C" grade in his Intermediate Examinations he could not be admitted on merit. The

threshold being 750 marks. The Chief Minister of Balochistan was approached who nominated him, "for admission in Ist year MBBS class in Bolan Medical College, Quetta against leftover foreign vacant seats/special seats."

3. On 22 June 2005 Dr. Arsalan Iftikhar was appointed as Medical Officer/Demonstrator in the Institute of Public Health, Quetta.

4. On 18 July 2005, a few days after Dr. Arsalan Iftikhar was so appointed, the Chief Minister of Balochistan passed the following order: "Dr. Arsalan Iftikhar, Medical Officer, presently posted as Demonstrator, Institute of Public Health, Quetta be transferred and posted as Section Officer (Technical) in Health department with immediate effect in the interests of public service. Please issue notification." [Emphasis supplied] The Chief Secretary, Balochistan, to whom these orders were addressed directed these to the Health Department on that very day (18 July 2005).

5. The Health Department on 10 August 2005 referred the case to the Services and General Administration Department ("S&GAD") as the authority "for posting/transfer of Secretariat staff is S&GA Department."

6. On 11 August 2005, in a Summary for the Chief Minister, the S&GAD pointed out that "no...post in Techinical quota is available against which Dr. Arsalan could be considered for posting as Section Officer." It was, however pointed out that 07 posts of Section Officers against the "quota of initial recruitment are vacant", the case for placing the requisition of these posts with the Balochistan Public Service Commission was being processed separately. It was "proposed that Dr. Arsalan Iftikhar may be considered for posting as Section Officer against one of the vacant post as a temporar arrangement".

7. On 15 August 2005 a notification was issued to the effect that Dr Arsalan Iftikhar Demonstrator in Institute of Public Health, Quetta was "transferred and posted as Section Officer (Dev.) in Health Department, against existing vacancy with immediate effect until further orders". [Emphasis supplied]. It

may be stated that as was pointed out in the Summary to the Chief Minister, there was no existing vacancy. The 07 vacancies had to be filled by initial recruitment through th Balochistan Public Service Commission. What was proposed was that at best Dr. Arsalan Iftikhar be temporarily accommodated against one of these vacancies, till it was filled by a suitable candidate by the Balochistan Public Service Commission.

8. Nine days before the notification of 15 August 2005 was issued, the Ministry of Interior, Government of Pakistan addressed a letter no 6 August 2005 to the Chief Secretary Government of Balochistan: The services of Dr Arsalan Iftikhar, a BS-17 officer of the Health Department, Government of Balochistan are required to be utilized in FIA in public interest. [Emphasis supplied] 2. It would be highly appreciated if you could place the services of Dr Arsalan Iftikhar at the disposal of the Ministry of Interior for posting in FIA. On 13 August 2005, two days prior to the notification of 15 August 2005, the S&GAD, Government of Balochistan conveyed to the Ministry of Interior, Government of Pakistan, its "no objection for placing the services of Dr Arsalan Iftikhar (Health/B-17) at the disposal of Ministry of Interior for posting in FIA. While this letter was either in the mail or had not reached the "right" hands, the Ministry of Interior sent a reminder on 16 August 2005.

9. On 5 September 2005 a notification was issued by the Ministry of Interior, Government of Pakistan. Dr Arsalan Iftikhar was transferred and his services were placed at the disposal of FIA for posting as "Assistant Director (BS-17)in the FIA, on deputation basis for a period of three years, in his own pay and scale, with immediate effect and until further order."

10. On 9 September 2005 the Secretary S&GAD brought the matter to the attention of the Chief Secretary, Balochistan. On 13 September 2005 the Chief Secretary Balochistan on behalf of S&GAD issued a notification pursuant to the notification of the Government of Pakistan. On 30 September 2005 Dr Arsalan Iftikhar received charge of the office of Assistant Director, FIA at Islamabad. This was notified on 24 October 2005.

11. Within four months of his appointment as Medical Officer/ Demonstrator in the Institute of Public Health, Quetta, Dr Arsalan a BS-17 Officer, who had not even completed the mandatory period of his probation, was transferred and posted first as a Section Officer in the Government of Balochistan against a non-existent vacancy And then sent on deputation as Assistant Director, FIA, to the Ministry of Interior, Government of Pakistan, for a period of three years; all in the public interest. And this for a person who had appeared thrice in the CSS competitive examinations and failed each time.

12. Under Rule 8 of the Health Department, Government of Balochistan, Services Rules, 1984, a person appointed to the service against a substantive vacancy remains on probation for a period of two years if appointed by initial recruitment. Dr. Arsalan, having been so appointed, on 22 June 2005, his period of probation would have been complete on 21 June 2007.

13. On 22 November 2005, the S&GAD, Government of Balochistan moved a summary to the Chief Minister, Balochistan, proposing confirmation in service of Dr. Arsalan Iftikhar "with immediate effect against the substantive post of Medical Officer in the Provincial Health Department by relaxing Rule 8 of the Balochistan Health Department (Basic Pay Scale 16 and above) Service Rules 1984 for completion of probation period of 2 years." On 5 December 2005 the S&GAD, Government of Balochistan issued a notification whereby the services of Dr. Arsalan Iftikhar were confirmed.

14. On 22 March 2006 in continuation of its notification of 5 September 2005 the Ministry of Interior issued yet another notification. Barely within 5 months of having assumed the charge of Assistant Director FIA in BS-17: Dr Arslan Iftikhar (BS-17) Health Department, Government of Balochistan Quetta is transferred and his services are placed at the disposal of Director General, Federal Investigation Agency for posting as Deputy Director (BS-18) in FIA on deputation basis for a period of three years -- [Emphasis

supplied]. On 7 April 2006 it was notified that he had assumed the charge of the office of Dy. Director (BS-18) FIA on 22 March 2006. On 9 May 2006 by a letter issued by the Office of the Director General Federal Investigation Agency it was clarified as follows: Now he has been upgraded as deputy Director in BPS-18 with retrospective effect. I.e. from the date of initial joining as per notification dated 22-03-2006. On 9 May 2006 the Ministry of Interior issued yet another notification in partial modification of its notification of 22 March 2006. It was stated: Dr Arslan Iftikhar has assumed the charge of the post of Deputy Director/BS-18, FIA on 30th September 2005 with retrospective effect.

15. This done, a campaign was launched to induct Dr. Arsalan Iftikhar in the Police Service of Pakistan. As a BS-17 officer, Dr. Arslan Iftikhar could have joined the Police Service only through the competitive services examination conducted by the Federal Public Service Commission but being in BS-18 made induction possible and the FPSC route could be avoided. As a first step he was to be sent to the Police Academy for training with PSP officers all of Whom had been selected by the Federal Public Services Commission. The training was exclusive to PSP officers.

16. On 19 May 2006, the Ministry of Interior addressed a letter to Commandant, National Police Academy, Islamabad stating that Dr. Arsalan Iftikhar, Deputy Director, FIA was attached with the National Police Academy for training with CTP Batch. The commadant was requested to attach the said officer for filed training along with under training ASPs to cover each aspect of the required training.

17. On 24 May 2006, the Ministry of Interior again issued a letter to Commandant, National Police Academy, Islamabad, stating that after the completion of the specialised training programme at the National Police Academy, the services of Dr. Arsalan Iftikhar be placed at the disposal of Punjab Police for further posting at Lahore for his District Attachment Training.

18. Pursuant to the letter of 24 May 2006, the National Police Academy,

Islamabad on 27 June 2006 relieved Dr. Arslan Iftikhar, "for completion of remaining training programme of 32nd CTP, and directed to report to Elite Police Training School, Bedian Lahore on 02-07-2006 for six week Orientation Course." After completion of the course he was to "report to CPO, Punjab, Lahore for Phase III part of training which is six months Field Attachment".

19. In the meantime, the Prime Minister's Secretariat was approached for the permanent induction of Dr Arslan Iftikhar in the Police Service of Pakistan in BS-18. On 16 May 2006 the Prime Minister's Secretariat sought the views of the Establishment Division in the regard.

20. The U.O note of the Prime Minister's Secretariat was also circulated to FIA. On 3 June 2006 the office of the Director General, FIA stated that, "neither FIA requisitioned his services, nor was involved at any stage for his deputation or district attachment etc." FIA, therefore expressed its inability to offer any views/recommendations on the U.O Note

21. On 23 May 2006 the Establishment Division noted that as per the PSP (Composition, Cadre and Seniority), rules, 1985, "the request of the officer for induction in PSP in BS-18 is not feasible," In a separate note the Establishment Division observed that Dr. Arslan Iftikhar could not be inducted in the Police Services of Pakistan without an amendment in the PSP (Composition, Cadre and Seniority) Rules, 1985. Such an amendment could only be made with the approval of the President.

22. On 31 May 2006 the Secretary, Establishment was called by the learned judge for a meeting at his residence. The meeting too place at 2100 hours. The observations of the Establishment Division were also communicated to him. The learned judge appreciated the aforementioned reservations but the meeting ended with the learned judge insisting on: (a) the induction of Dr. Arsalan Iftikhar in FIA preferable in BS-18 (b) his subsequent deputation to the Punjab Government without their specifically mentioning the post against which he will be posted and (c) simultaneous initiation of proposal to amend the rules to prove for induction of FIA officer in the Police

Service of Pakistan and sought his son's permanent induction in (BS-18) in the Police Service of Pakistan. The Secretary, Establishment, Communicated these demands to the Principal Secretary to the Prime Minister, around midnight the same evening. Soon thereafter the Secretary Establishment received a call from the learned judge saying that he had found a number of precedent of induction into various groups. On 1 June 2006 the papers were received from the learned judge. Later, the learned judge called the Secretary Establishment on the Green Line to enquire if the papers sent by him had been examined. The Secretary Establishment stated that it would take some time. The learned judge stated that orders of the Prime Minister be obtained by referring would be made to the Prime Ministr's Secretary giving the precedents as well as the legal position. The learned judge responded that a written reference would "jeopardize the case and that this was part of a package and reference to the rules need not be made."

23. The learned judge continued to "insist' that all concerned make the necessary changes and warned of "consequences" if his desires were not met. Due to the relentless pressure and the campaign of intimidation and harassment launched by him, ultimately summary was prepared and submitted by the Establishment Secretary on 23 June 2006 to the Prime Minister for additon of new "Rule 7-C" in the Police service of Pakistan (Composition, Cadre and Seniority) Rules, 1985. The amendment was tailor made for Dr. Arsalan Iftikhar.

24. Since then the learned judge has almost on daily basis exerted all kinds of pressure on the Prime Minister's Secretariat to secure the approval of the summary aforementioned and for the consequent induction of Dr. Arslan Iftikhar as an officer in the Police Service of Pakistan as a BS-18 officer.

25. He also used his influence and authority to have Dr Aralan Iftikhar nominated to attend the 2nd Training Course in Combating International Terrorism and Organized Crime from 30 October 2006 to 3 November 2006 in Istanbul. He was the only non PSP officer and the only under training person to attend this course.

26. The learned judge is entitled to one 1600 CC car, but he has contrary to the norms and rules on the subject secured the use of the following cars for himself at Islamabad: (i) Mercedes Benz 3000cc, (ii) IDJ-166 Toyota Corolla Model 1993 1300cc, (iii) ODF 6828 Toyota Corona Model 1993-2000cc, (iv) CIA-9 Toyota Corolla Model 2000 1300cc, (v(GP-8695 Toyota Corolla Model 2002 1300cc, (vi) IDM-7976 Toyota Corolla Model 2003 1300cc, (vii) IDM 7977 Corolla Model 2003 1300cc.

27. Besides these the learned judge has the use of a fleet of cars at Islamabad, Lahore and Quetta.

28. On more than one occasion demands have been made to the Chief Minister or Governor of the province which the learned judge is visiting to provide the cars for their own official use to the learned judge during the period of his stay in the province.

Protocol over and above entitlement

29. The learned judge insists on being provided protocol which has neither beer, ever sought by or provided to a Chief Justice. Besides an outrider to lead the cavalcade the demand is for a number of police vehicles to follow him. The men have to be from elite units at times specific demands have been made for an officer not below a particular rank to act as an outrider. Traffic has to be diverted or stopped while the convoy travels from one point in the city to another at high speed. Such actions are completely unprecedented for a Chief Justice.

30. Demands have been made for senior bureaucrats not below a particular rank to receive him at the airport when he arrives in a provincial capital.

Use of planes and helicopters.

31. The learned judge frequently demands the use of the plane or aircraft of a Governor or a Chief Minister to travel from one place to another or for a private visit to offer condolences or to attend a function. The learned judge is well aware that he is not entitled to the use of these aircraft and helicopter

but is in the habit of making these demands frequently and secures these by insisting on these.

Para 32 deleted.

33. For some time BMW car Registration No. "RAZIA-I" remained in the use of the learned judge and members of his family. The story hit the press and when it refused to die down the car was quietly moved elsewhere.

Judicial Conduct.

34. There are complaints of orders being verbally announced in open court in favour of one party and subsequently a written order at variance from the order announced in court being delivered. Two such cases have acquired particular notoriety. In one of these two cases it is alleged that amounts as large as Rs.55million may have been involved.

Reports

35. These matters have been the subject of general and uncontradicted public comment, press reports, magazine articles, media comments by senior and respected members of the bar and former members of the superior judiciary.

Entitlements

36. The learned judge used the influence of his position to gain undue advantage by "insisting" on an increase and enhancement in his entitlements or in securing the relaxation of the rules in that respect. III. In the light of, inter alia, the foregoing facts and circumstances, and after a thorough consideration of the matter the Prime Minister of Pakistan advised the President of the Islamic Republic of Pakistan to refer to the Council, for its report, the question whether the conduct of Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, Chief Justice of Pakistan in the following matters namely: (a) in using his position, office, influence and authority as a judge of the Supreme Court and Chief Justice of Pakistan to: (i) secure the appointment of his son Arsalan Iftikhar as a Section Officer in the Health Department, Government

of Balochistan; (ii) to have his son Arsalan Iftikhar swent on deputation by the Government of Balochistan to the Ministry of Interior, Government of Pakistan as Assistant Director, FIA in BS-17; (iii) to have his son Arsalan Iftikhar confirmed in the service of the Health Department, Government of Balochistan, much before the expiry of the mandatory period of probation in violation of the applicable rules; (iv) to have his son Arsalan Iftikhar upgraded as Dy. Director, FIA, in BS-18 with retrospective effect; (v) to make efforts to have his Arsalan Iftikhar inducted in the Police Service of Pakistan in violation of the rules and/or to seek an amendment of the applicable rules; (b) in seeking and securing official vehicles and transport for his use much beyond the sanctioned and permissible limits; (c) in insisting on protocol to which he was not entitled; (d) in demanding and securing use of helicopters and planes to the use of which he was not entitled; (e) in accepting accommodation with a litigant before the Supreme Court; (f) in using the BMW car "Razia 1"; (g) in writing judgements which were contradictory to orders announced verbally in open court; (h) in insisting on entitlements or having rules relaxed for such entitlements; constitutes a ground of misconduct on which the learned judge ought to be removed from the office of a judge of the Supreme Court of Pakistan and the Chief Justice of Pakistan. IV. The President of the Islamic Republic of Pakistan is of the opinion that the learned judge may have been guilty of misconduct and therefore, is pleased to refer the question aforementioned to the Council for the purposes of conducting an inquiry into the matter and after such inquiry as it may deem fit report to the President its opinion whether the learned judge has committed misconduct and whether he should be removed from the office of a judge of the Supreme Court and the Chief Justice of Pakistan. V. That the Prime Minister was further pleased to advise the President that besides making the reference to the Council the President may simultaneously, in exercise of his constitutional and inherent powers under the Constitution of Pakistan and all other powers enabling him in that behalf, direct that as a reference would be pending against the learned judge before the Council it would be neither in the public interest nor in consonance with the norms of judicial propriety that he continues to

perform the functions of his office as a judge of the Supreme Court or as the Chief Justice of Pakistan. This would be in consonance with past practice as well. For these reasons, till such time that the reference has been disposed off by the Council and final orders in the matter have been passed, the most senior of the other judges of the Supreme Court shall act as the Acting Chief Justice. The President has been pleased to pass orders accordingly. VI. It is requested that this reference may please be taken up as soon as it may be convenient, an inquiry into the matter be commenced and the reference be disposed off as expeditiously as may be possible for the Council. General Pervez Musharraf President, Islamic Republic of Pakistan Through Mr. Justice (Retd) Mansoor Ahmed Secretary, Ministry of Law, Justice and Parliamentary Affairs.

ضمیمہ

سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کا حلفیہ بیان

I, Mr. Justice Iftikhar Muhammad Chaudhry, the chief justice of Pakistan (hereinafter referred to as the "deponent") do hereby solemnly affirm and state on oath as follows

1. That the deponent has filed the titled petition in this Honorable Court under Article 184(3) of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan 1973, inter alia, assailing the Reference No 43/2007 dated March 09, 2007; Notification No F.1 (2)/2005.A.II dated 09-03-2007, whereby the deponent was illegally and unlawfully restrained to perform his constitutional functions as a judge of this Honorable Court and as chief justice of Pakistan; order dated March 09, 2007 passed by the Supreme Judicial Council; notification No F.1(2)2005.A.II dated 15-03-2007 whereby the deponent was sent on compulsory leave with retrospective effect and the constitution and competence of the Supreme Judicial Council as well as the mode and manner of the proceedings before the Council.

2. This affidavit is being filed in support of the contentions, assertions and pleas raised in the above titled petition. The deponent verifies that the contents of the titled affidavit are true and correct to the best of his knowledge, information and belief an nothing has been concealed. In addition to the facts narrated in the titled petition; the deponent states that:

A. On March 09, 2007, the deponent headed Bench No 1 of this Honorable Court as chief justice of Pakistan and heard several cases till about 10:30am. The Bench rose briefly and had to reassemble for the day except the deponent who left for the Army House, Rawalpindi to meet the president of Pakistan (hereinafter referred to as "respondent").

B. The deponent arrived at Army House, Rawalpindi at about 11:30am along with his staff/protocol staff. The deponent was shown to a waiting

room/visitors room. After five minutes of his arrival, the respondent, wearing his military uniform came into the room along with his MS and ADC. As soon as the respondent took his seat, a number of TV cameramen and photographers were also ushered into the room. They took several pictures and made movie footage.

C. While discussing the SAARC Law Conference, SAARC Chief Justices Conference and the concluding session of the Golden Jubilee ceremony of the Supreme Court, the respondent said that a complaint against the deponent had been received by him (respondent) from a judge of the Peshawar High Court. The deponent replied that it was not based on true facts as a two-member bench had decided his case and that attempts were being made to maliciously involve the other member of the Bench as well. On this the respondent said that there are a few more complaints against the deponent as well. After saying so, he directed his staff to call the other persons.

D. On the direction of the respondent, the 'other persons' entered the room. They included the prime minister, MI DG, ISI DG, IB DG, COS and another official. All officials (except IB DG and COS) were in uniform.

E. The respondent started reading from small pieces of paper with notes on them, which he had in his hand. There was no single consolidated document. The allegations, which were being put to the deponent, had been taken from the contents of a notorious letter written by Mr Naeem Bukhari with absolutely no substance in them. The deponent strongly refuted these allegations as being baseless and engineered to defame him personally and the judiciary as a whole. The deponent promptly denied the veracity and credibility of these allegations as well.

F. On this the respondent said that the deponent had obtained cars from the Supreme Court for his family. The deponent vehemently denied the allegation. The respondent went on to say that the deponent was being driven in a Mercedes, to which the deponent promptly replied 'here is the prime minister, ask him, he has sent the car himself'. The PM did not reply

to this answer even by gesture. Surprisingly the respondent went on to say that the deponent had interfered in the affairs of the Lahore High Court and had not accepted and taken heed of most of the recommendations of the chief justice of the Lahore High Court.

G. The respondent insisted that the deponent should resign. The respondent also said that in case of deponent's resignation, he (the respondent) would 'accommodate' him (the deponent). He also said in case of refusal to resign, the deponent will have to face the reference which could be a bigger embarrassment for the deponent. The deponent finally and more resolutely said 'I wouldn't resign and would face any reference since I am innocent; I have not violated any code of conduct or any law, rule or regulation; I believe that I am myself the guardian of law. I strongly believe in God who will help me'. This ignited the fury of the respondent; he stood up angrily and left the room along with his MS, COS and the prime minister of Pakistan, saying that others would show evidence to the deponent. (The respondent in his interview given to Aaj TV has now admitted this). The meeting continued for not more than 30 minutes

H. The MI DG, ISI DG and IB DG remained behind and continued to sit with the deponent. They did not show the deponent a single piece of evidence. In fact, no official except ISI DG had some documents with him but he also did not show any thing to the deponent. They, however, said that the deponent had secured a seat for his son in Bolan Medical College when the deponent was serving as a judge of the Balochistan High Court. They (except IB DG) insisted that deponent resign while the deponent continued to assert strongly that the allegations were baseless and for a collateral purpose

I. During the subsequent hours, the deponent was forced to stay in that room. Sometimes, all the persons would leave the deponent alone in that room but would not allow the deponent to leave it. It was obvious that the deponent was being watched by a closed circuit camera because whenever he tried to open the door to go out, he was confronted by an officer who prevented the exit of the deponent; several times the deponent expressed the

desire to leave but was told by military officials to stay/wait. Once the deponent was even told that respondent would be seeing him again. At one point, the deponent requested that at least his staff/protocol officer be called inside the room as the deponent wanted to talk to him but was told that he could not come inside. The deponent then requested that his staff/protocol officer be told to pass on the message to the deponent's family that he was at Army House, Rawalpindi, and that his programme to go to Lahore had been cancelled.

J. Despite several attempts to leave the room and the Army House, the deponent was made to stay there on one pretext or the other. His request to bring his car to the porch for departure was also denied. After the first meeting with the respondent which lasted for not more than 30 minutes, the deponent was kept there 'absolutely against his will' till past 5pm.

K. After 5pm, the MI DG came in again and told the deponent that his car was outside to drive him 'home'. The MI DG came out of the room and once outside told the deponent, "this is a bad day, now you are taking a separate way and you are informed that you have been 'restrained to work as a judge of the Supreme Court or chief justice of Pakistan'."

L. When the deponent saw the car of the chief justice of Pakistan, he discovered that his car had been stripped of both the flag of Pakistan and the emblem flag. The staff officer of the deponent informed him that Mr. Justice Javed Iqbal had taken oath as acting chief justice and it had been shown on TV. The driver also informed the deponent that he had been instructed not to take the deponent to the Supreme Court while on the way to the residence of the deponent.

M. While on the way, the deponent directed the driver to go to Supreme Court but an Army official prevented the deponent's car near the Sports Complex from proceeding further. In the meanwhile, Mr. Tariq Masood Yasin, SP, also appeared; he ordered the driver to come out of the car so that he could drive the deponent and also asked the deponent's gunman to come out of the car as well. The deponent said 'okay, I will not go to the

Supreme Court but my driver will drive my car and my gunman will escort me home'. Only then, did Mr. Tariq Masood Yasin, SP agree to let the car be driven by the deponent's driver.

N. The deponent got home at about 5:45pm and was shocked to see police officials and agencies personnel without uniform all over his residence. The deponent also discovered that landline phones had already been disconnected; cell phones, TV, cables and DSL had been jammed or disconnected. The deponent and his family were completely cut off for several days from the outside world.

O. By 9pm, March 09, 2007, the vehicles, which were in official use of the deponent including a Mercedes, had been taken away by means of a lifter. Latter on, the same night, one vehicle was brought back but the key was not handed over to the deponent or someone on his behalf. M

P. On March 10, 2007, the deponent received a 'notice' from the Supreme Judicial Council ("Council") whereby the deponent came to know that a reference (No 43/2007) had been filed by the respondent before the Council. There was also a copy of the order passed by the Council whereby deponent had been restrained to function as a judge of the Supreme Court and chief justice of Pakistan. The copy of the aforesaid reference had also been appended with the notice with without any annexure or supporting documents for perusal of the deponent.

Q. It was also surprising for the deponent to note that the aforesaid reference came up for hearing on March 9, 2007 after 6pm in indecent haste. Two members of the Council as was evident from news published in daily Nawa-i-Waqt dated March 10, 2007, had been flown to Islamabad in special flights, from Lahore and Karachi simply to participate in a meeting of the Council. In fact, no meeting had been called by the secretary of the Council namely Mr. Faqir Hussain. No one had issued either agenda for the meeting or notice thereof.

R. The Council, rather than merely scrutinising the material, if at all and

serving notice on the deponent (without prejudice to the rights and interest of the deponent as averred in the titled petition), went ahead and passed an order very detrimental to the interests of the deponent as well as the interests of the institution. The deponent was restrained to perform his functions as a judge of the Supreme Court and or chief justice of Pakistan.

S. The deponent further states that he had been detained along with his family members including his infant child of seven years from the evening of March 9, 2007 till March 13, 2007. The personal and private life of the deponent and his family suffered a great shock and the concept of privacy appeared as if it was an impotent word. The deponent could not use any vehicle since there was none. The deponent had to walk till the other end of the road when the police officer confronted him and manhandled him as has now been established by a judicial enquiry.

T. The Supreme Court staff attached to the deponent was reportedly missing and had been kept at an unknown place. An attempt was being made to fabricate the evidence through them by coercive means against the deponent. Even other employees working at the residence of the deponent were taken and made to appear before some agency officials. They were released after two/three days. The grocery man was not allowed to go to collect grocery; he was made to wait till an agency official accompanied him to the market and back.

U. The chamber of the deponent was sealed and certain files lying therein were removed and some of them had been handed over to the ISI under the supervision of the newly appointed registrar. Such an act was contrary to all norms and practices of judiciary. The deponent being the CJP was entitled to occupy his chamber along with his staff.

V. On account of deployment of heavy contingents, no one was allowed to meet the deponent freely, in as much as his colleagues were not allowed access to meet him. Even a retired judge of this Honorable Court Mr. Justice (r) Munir A Sheikh was not allowed to meet the deponent.

W. The deponent was not all alone to suffer this agony. Even his children were not allowed to go to school, college and university. The deponent and his family members were deprived of basic amenities of life, i.e. medicines and doctors, etc.

X. Even when ordered by the Council, the deponent was deprived of the assistance of his counsels to seek legal assistance regarding legal and factual issues involved in the reference. The deponent and his family have been made to go through a lot of mental, physical and emotional agony, torture and embarrassment and words could never be enough to properly and adequately express that.

Y. All these tactics were used to put pressure on the deponent so that he may tender his resignation from the office of the chief justice of Pakistan. But after March 13, 2007 when the deponent succeeded in establishing at least some contact with his lawyers team during a brief appearance before the Council and after March 16, 2007, the ongoing pressure to 'resign the office' was released to some extent.

Z. The deponent now believes that his entire house has been bugged and at the Sindh House which is located right opposite the residence of the deponent, the officials of the agencies other than police have established a place therein to keep an eye on those who come and visit me, etc AA. On account of the facts stated hereinabove, the children of the deponents are so scared that they could not go to school or university. As a result thereof, one of my daughters failed to appear in her exams (1st year, Federal Board) whereas my other daughter who is a student of Bahria University is not being allowed to take her examination (1st semester) due to lack of attendance in internal studies. My younger son is also not in a position to attend his because of circumstances through which I am passing.

Full text of CJP's statement before SJC Following is the text of the statement submitted by Chief Justice (defunct) Iftikhar Muhammad Chaudhry before the Supreme Judicial Council (constituted against the provisions of article 209 of the constitution of the Islamic republic of Pakistan) Reference no-43 of/209 shewith as under: (Application for obtaining copies of documents/evidence and raising objection on the constitutionality of SJC) Above noted reference came up for hearing on March 9th, 2007 after 6:00 pm in a indecent haste as it is evident from a news published in daily Nawa-i-Waqt dated march 10th, 2007 where it has been published that, chief justices of Lahore and Karachi were brought to Islamabad in a special flight (copy of news item as appended as Annex-A, the SJC on having gone through record past and order detrimental against my interest and against the interest of institution whereby I have been restrained not to work as Supreme Court judge and Chief Justice of Pakistan. Such powers are not available at all to a facts finding inquiry commission/council except to a court that to if such powers can be derived from the constitutional provisions itself. In my understanding and as per in my interpretation of the constitution under article 209 no such powers are available to the council as it is not exercising the power of the court. Be that as it may be passing restrained order by the council as well as the earliest order notified in notification No 529/(2)/2007 issued by the President of Pakistan which is equally contrary to the constitution I have suffered as under:

(A) Detained for all intent and purpose with my family members including my infant child of 7 years from the evening of march 9th, 2007 up till now. My official residence is seiged with heavy contingency comprising police and members of other agencies for which there is no justification.

(B) The vehicles which were in my use have been taken away by means of a lifter out of which one has been brought back by a lifter without its keys.

(C) Staff of Supreme Court attached with me is reportedly missing and had been kept at an unknown place. I believe they have been detained just to fabricate evidence against me. I have also learned reliable that my chamber was also sealed and reportedly files lying therein had been removed and some of them had been handed over to ISI under the supervision of newly appointed registrar. Such act is contrary to all norms and practices. I, being CJP, am entitled to occupy my chamber along with my staff.

(D) On account of deployment of heavy contingencies I am not allowed to go outside nor my family members are allowed to do so. Similarly no one is allowed to meet me freely. In as much as my colleagues have no access to me and whenever they want to visit me they have to wait on the gate for a considerable period during which permission is sought from high ups. For example, Mr Justice Raja Fayyaz Ahmed, on one occasion, was allowed to go back without meeting me while similar treatment was offered to Mr Justice (Retd) Munir. A Sheikh.

(E) My children are not allowed to go to school, college and university. I am not getting facility of telephones, cable and DCL. Similarly I, along with my family members, have also been deprived of basic amenities of life including medical treatment etc.,

(F) No panel of lawyers is available to discuss the legal and factual issues involved in this reference. This fact I have already highlighted on the notice received on March 10th, 2007.

(2) By noting the above agonies which are being suffered by me, I do not want to seek any relief from the council except that an unconstitutional order dated March 9th, 2007 passed by the council has persuaded me to show distrust on the formation of the council because the manner in which I have been dealt with, I do not expect a fair inquiry particularly for the following reasons with reference to the Chairman and 2 other members.

Justice Javed Iqbal

He has been appointed as acting Chief Justice contrary to article 180 of the constitution of Islamic Republic of Pakistan which provides that acting Chief Justice can be appointed when the office of the Chief Justice of Pakistan is vacant or the Chief Justice of Pakistan is absent or is unable to perform the functions of his office due to any other cause. The cause could be that if the Chief Justice is incapable of properly performing the duties of his office by a reason of physical or mental incapacity which is not the case over here. Therefore he should not have taken oath of the office of the acting Chief Justice not withstanding that whosoever has issued his notification.

As per the mandate of Article 209 of the Constitution if the reference is being heard against the Chief Justice of Pakistan the judge of the Supreme Court who is next in seniority would head the council without appointing him as acting Chief Justice. Mr Justice Rana Bhagwandas is admittedly the senior most judge therefore on account of his temporary absence from the country up to March 22nd, 2007 there was no urgency to convene the meeting of SJC during night/after office hours and by ensuring presence of 2 Chief Justice by making arrangements by a "special plane". Such actions on his part speak volumes as it has been reported in 'The News' International and an extract of which is appended herewith as Annex-B.

Justice Abdul Hameed Dogar

He administered oath to Justice Javed Iqbal on March 9th, 2007 for the office of acting Chief Justice disqualifying himself to the Judge of the Supreme Court knowing well that office of the Chief Justice is not vacant as he is not incapable to perform his duties physically or mentally. A reference/complaint is pending against him before SJC in respect of financial misappropriation in the Shah Latif Bhitai University Khairpur along with Vice Chancellor of the University. The reference is lying in the record of SJC which was in custody of Dr Faqir Hussain.

Justice Iftikhar Hussain Chaudhry

More than one reference of misconduct are pending against him before SJC. The Chairman is fully aware about it as files are lying in his custody for the purpose of scrutiny therefore he cannot sit as a member of the council. His inclusion is based on malafides because the chairman knowing about these facts may have notified not him as member of council. He has developed strong hostilities against me which is known to everyone on account of non-accepting his recommendations of Advocates and Judicial officers for elevations as Judges of Lahore High Court. His elevation as judge of the Supreme Court was opposed by me in August 2005 for very important reason which cannot be disclosed here. However, this letter is available in the record which maybe looked into and if it has been misplaced/tampered as reportedly all files from my chamber have been removed, the copy of the same maybe requisitioned from concerned office. I may point out that we are not even on talking terms with each other. He has himself disconnected all relations including the working one.

He is otherwise interested in the positive result of the inquiry sent by the President on the advice of Prime Minister because one of his brothers is a minister in the federal cabinet and he had been expressing his views in favour of the reference and against me on TV channels (reportedly). Therefore, I have serious objection on his being member of the council for the above reasons and I do not have expectations of fair inquiry from him. Therefore, his name should be excluded from the panel in the interest of justice and fair play.

(3) In view of above objections I am of the opinion that SJC is not duly constituted and is incapable to hold inquiry against me.

(4) Without prejudice to above, I reserve my right to raise any other objection at the time of submitting my reply to charge sheet because so far no documents have been supplied to me nor I have any facility to consult panel of lawyers because no one has been allowed to accompany me. Therefore I maybe supplied prTcis of oral evidence and documentary evidence.

(5) I will be submitting a list of documents in support of my defence which shall be summoned by the SJC as I have no access.

PUBLIC INQUIRY

The contents of notice indicate a camera inquiry. As I am of the opinion that charges against me are not sustainable being unfounded. Therefore to vindicate my honour, I would prefer for a public inquiry so that whole of the world may know the nature of allegations and my defence and I am confident that I will be exonerated of the charges against me. As for as the rule 13 of conducting inquiry it pertains to the inquiry in respect of which a direct complain has been received by the SJC and powers are to be exercised by the council under the Article 209(5), but in my opinion for the reference received from the President of Pakitan the SJC can follow any other procedure including public inquiry.

The necessity of public inquiry is also called for because the reference is based in letter and spirit of open letter written by Mr Naeem Bokhari which has already been publicised widely. Therefore there should not be any objection/observation in holding public inquiry. As a question of my and institution's prestige is involved therefore I volunteer for open inquiry so the public of this country may have more respect and confidence in the institution of the higher judiciary. Thus for the above reasons the council maybe reconstituted accordingly excluding the members in respect of whom objections have been raised above and to negate the impression nationwide and to save the country's image internationally that this is not one-sided, biased, dummy and command performance let it be the open public inquiry. The copies of requisite document should be supplied to me along with the copy of the rule of the SJC.

Panels of the lawyers, ready to defend me and the judicial system of the country, are present outside the court building since they are not being allowed to enter the court premises against all norms and ethics as well as the principle of access to justice for all. The lawyers should be allowed to enter this to argue these objections. Not to forget the building of the Supreme Court belongs to both bench and the bar equally. Finally, the order

dated March 9th, 2007 from restraining me from functioning as the judge of the Supreme Court and the Chief Justice of Pakistan be recalled as it is contrary to the provision of the constitution of Islamic Republic of Pakistan.

Justice Iftikhar Mohammad Chaudhry
(Chief Justice Islamic Republic of Pakistan)

چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے بیان حلفی کے جواب میں مؤرخہ 7 جون 2007ء کو صدر کے چیف آف سٹاف، ملٹری انٹیلی جنس اور آئی بی کے سربراہان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپنے حلفیہ بیانات جمع کروائے، قارئین کے لیے ان حلفیہ بیانات کا مکمل متن ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بیان حلفی

ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل حامد جاوید ولد چودھری محمد اشرف چیف آف سٹاف برائے صدر پاکستان

میں لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حامد جاوید ولد چودھری محمد اشرف جو اس وقت صدر پاکستان کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں [حلفاً یہ بیان دیتا ہوں کہ

1۔ مجھے یکم نومبر 2002ء کو صدر کا چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا اور میں آج تک اسی عہدے پر کام کر رہا ہوں۔

2۔صدر کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے میری ذمہ داری تھی کہ صدر کے دفتری امور سے متعلق تمام سرگرمیوں میں رابطہ پیدا کروں۔

3۔ میں نے چیف جسٹس آف پاکستان (جبری رخصت) جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کا بیان حلفی پڑھا ہے اور اس میں لگائے گئے تمام الزامات بجز ان کے جن کا اس بیان میں خاص طور پر اقرار کیا جائے، غلط ہیں۔

4۔سرکاری ریکارڈ کے مطابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چودھری (جبری رخصت) نے صدر پاکستان سے دس باضابطہ ملاقاتیں کیں۔ یہ تمام ملاقاتیں چیف جسٹس آف پاکستان کی خواہش پر ہوئیں۔صدر پاکستان اور جسٹس افتخار محمد چودھری بحیثیت جج سپریم کورٹ اور بحیثیت چیف جسٹس آف پاکستان کے درمیان ان ملاقاتوں کی تفصیل اس طرح سے ہے:

بحیثیت جج سپریم کورٹ آف پاکستان

تاریخ	مقام
7-1-2004	آرمی ہاؤس
7-5-2005	کیمپ آفس

بحیثیت چیف جسٹس آف پاکستان

تاریخ	مقام
4-10-2005	آرمی ہاؤس
16-12-2005	کیمپ آفس
17-12-2005	ایوان صدر

19-5-2006	کیمپ آفس
1-6-2006	آرمی ہاؤس
4-10-2006	آرمی ہاؤس
13-2-2007	ایوان صدر
9-3-2007	کیمپ آفس

ان باضابطہ ملاقاتوں کے علاوہ ایوان صدر، کیمپ آفس اور جی ایچ کیو میں کئی سرکاری اور سماجی تقریبات میں چیف جسٹس آف پاکستان اور صدر اکثر وبیشتر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

5۔ وفاقی حکومت کو چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف متعدد شکایات موصول ہوئیں۔

6۔ وفاقی حکومت نے سپریم جوڈیشل کونسل میں پیش کرنے کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس کا مسودہ تیار کرلیا۔

7۔ وزیراعظم نے 7 مارچ 2007ء کو میری موجودگی میں ریفرنس کے مسودے کی تفصیلات اور ججوں کے ضابطہ اخلاق کے بارے میں صدر کو بتایا۔

8۔ اگلے روز یعنی 8 مارچ 2007ء کو صدارتی سیکرٹریٹ کو باقاعدہ ایک سمری موصول ہوئی جس میں صدر کے لیے وزیراعظم کی جانب سے یہ ایڈوائس دی گئی تھی کہ آئین کے آرٹیکل 209 کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل کو چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس بھیجا جائے۔

9۔ وزیراعظم نے یہ بھی ایڈوائس دی کہ چیف جسٹس آف پاکستان کو غیر فعال کر دیا جائے اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے سینئر ترین جج کو جو موجودہ ہوں، آئین کے آرٹیکل 180 کے تحت قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان مقرر کیا جائے۔ کیونکہ یہ بات نہ تو قومی مفاد میں ہوگی نہ ہی عدالتی آداب کے مطابق ہوگی کہ چیف جسٹس آف پاکستان اعلیٰ ترین عدالتی عہدے کے فرائض انجام دیتے رہیں جبکہ سپریم جوڈیشل کونسل ان کے خلاف بے ضابطگی کے الزامات کی تحقیقات کر رہی ہو۔

10۔ 8 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان نے صدر کے ملٹری سیکرٹری کو فون کیا اور صدر سے فوری ملاقات کی درخواست کی۔ صدر 9 مارچ کو کراچی روانہ ہونے والے تھے جہاں انہیں پاکستان بحریہ کی مشق امن 2007ء میں شریک ہونا تھا۔ ملٹری سیکرٹری نے چیف جسٹس آف پاکستان کو یہ صورتحال بتائی لیکن جب چیف جسٹس آف پاکستان نے ملاقات پر اصرار کیا تو ملٹری سیکرٹری نے کہا کہ وہ پروگرام میں تبدیلی کے لیے پوری کوشش کریں گے۔ بعد میں پروگرام میں ردوبدل کے بعد ملٹری سیکرٹری نے ڈپٹی ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے عملے کو اس تبدیلی سے آگاہ کر

دیا جائے اور اس طرح سے 9 مارچ 2007ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے ملاقات کا وقت مقرر کیا گیا۔

11۔ چیف جسٹس آف پاکستان 9 مارچ 2007ء کو دن کے گیارہ بجکر 35 منٹ پر صدر کے کیمپ آفس پہنچ گئے۔ چیف جسٹس آف پاکستان صدر سے ملاقات کے لیے آرمی ہاؤس نہیں گئے تھے جیسا کہ انہوں نے اپنے بیان حلفی میں کہا ہے۔ یہ ملاقات صدر کے سیکرٹریٹ کے کیمپ آفس راولپنڈی میں ہوئی جس میں صدر اور ان کے عملہ کے دفاتر ہیں۔

12۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے صدر سے اکیلے میں ملاقات کی جو دن کے گیارہ بجکر 45 منٹ پر شروع ہوئی جس میں صرف ملٹری سیکرٹری موجود تھے۔ اس ملاقات میں اے ڈی سی موجود نہیں تھے۔ جیسا کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے حلف نامے میں کہا ہے صدر کے کیمپ آفس میں صرف ایک فوٹو گرافر اور ایک ٹی وی کیمرہ مین موجود ہوتا ہے جو معمول کی ملاقاتوں اور صدر کے اجلاسوں کی کوریج کرتا ہے۔ یہ بات درست نہیں کہ بہت سے ٹی وی کیمرہ مینوں اور فوٹو گرافروں کو بلایا گیا جیسا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے حلف نامے میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاقات کے دوران سب سے پہلے چیف جسٹس آف پاکستان نے صدر کو تقریباً 20 منٹ تک مندرجہ ذیل امور کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

الف۔ سارک لاء کانفرنس

ب۔ سارک چیف جسٹسز کانفرنس

ج۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریبات

بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک فائل کھولی اور پشاور ہائیکورٹ کے جج جناب جسٹس جہانزیب رحیم کی جانب سے اپنے یعنی چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف دائر کردہ شکایت کے متن سے صدر کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اس شکایت کو نمٹانے کے سلسلے میں صدر کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کرنے کے لیے 20 منٹ تک اس کیس کی تفصیلات بتائیں۔

13۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے بیان حلفی میں یہ غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ صدر نے پشاور ہائیکورٹ کے ایک حاضر سروس جج کی شکایت کا معاملہ چیف جسٹس آف پاکستان کے سامنے اٹھایا تھا جبکہ حقائق یہ ہیں:

(i) اس وقت تک صدر کو مندرجہ بالا شکایت تحریری طور پر موصول نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے دیکھی تھی۔ اس لیے صدر چیف جسٹس آف پاکستان کے سامنے یہ معاملہ اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ معاملہ چیف جسٹس آف پاکستان نے خود اٹھایا تھا نہ کہ صدر نے جیسا کہ چیف جسٹس آف

پاکستان نے اپنے حلف نامے میں بیان کیا ہے۔ درحقیقت صدر سے اپنی درخواست پر ملاقات کرنے کی بڑی وجہ یہی دکھائی دیتی ہے۔ اس حقیقت کو مندرجہ ذیل باتوں سے مزید تقویت ملتی ہے۔

الف: چیف جسٹس آف پاکستان نے سی بی آر کے چیئرمین جناب عبداللہ یوسف کو 8 مارچ 2007ء کو سپریم کورٹ میں اپنے چیمبر میں بلایا۔ چیئرمین اسے معمول کی کارروائی سمجھتے ہوئے ملاقات کے لیے گئے اور خیال کیا کہ چیف جسٹس، سپریم کورٹ میں زیر التواء سی بی آر کے کیسوں پر بات کریں گے لیکن چیف جسٹس آف پاکستان نے سی بی آر کے چیئرمین سے جس بڑے مسئلے پر بات کی وہ پشاور ہائیکورٹ کے ایک حاضر سروس جج جناب جسٹس جہانزیب رحیم کی جانب سے ان کے خلاف دائر کردہ شکایت تھی اور انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس تمام کارروائی کا مقصد سی بی آر کے چیئرمین کو قائل کرنا اور اس بات کی ترغیب دینا تھا کہ وہ پریذیڈنسی میں اس سلسلے میں ان کے لیے حمایت کا تاثر دیں۔ سی بی آر کے چیئرمین نے مجھے بتایا کہ جب وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے چیمبر میں داخل ہوئے تو وہ ٹیلیفون پر بات کر رہے تھے۔ فون پر کام مکمل کرنے کے بعد انہوں نے سی بی آر کے چیئرمین سے کہا کہ میں ملٹری سیکرٹری سے بات کر رہا تھا اور صدر سے 9 مارچ 2007ء کو ملاقات کے لیے درخواست کی ہے۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے سی بی آر کے چیئرمین پر زور دیا کہ صدر سے ملاقات طے ہونے کا امکان ہے اس لیے ضروری ہے کہ سی بی آر کے چیئرمین صدر کو فوری طور پر ان کی وضاحتوں سے آگاہ کریں۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے کہا کہ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ اپنے ہی کیس کو تفصیلی انداز میں بیان کرنا خاصی حد تک مشکل کام ہے۔ سی بی آر کے چیئرمین نے وعدہ کیا کہ وہ چیف جسٹس آف پاکستان کی وضاحتیں پریذیڈنسی پہنچا دیں گے اور انہوں نے اسی روز چیف آف سٹاف کو اس سے آگاہ کیا (دیکھا جائے سی بی آر کے چیئرمین عبداللہ یوسف کا حلف نامہ)

ب: چیف جسٹس آف پاکستان نے میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد ڈی جی ایم آئی کو بھی 8 مارچ 2007ء کو رات کے وقت فون کیا اور اپنے خلاف پشاور ہائیکورٹ کے جج جناب جسٹس جہانزیب رحیم کی طرف سے دائر کردہ شکایت کے ضمن میں مدد اور حمایت طلب کی۔ انہوں نے ڈی جی ایم آئی کو بتایا کہ میں نے صدر سے ملاقات کے لیے درخواست کی ہے جو 9 مارچ 2007ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے طے ہوئی ہے اور بہتر یہ ہوگا کہ ڈی جی ایم آئی، چیف جسٹس آف پاکستان کی حمایت کے لیے کیمپ آفس میں موجود رہیں (دیکھا جائے ڈی جی ایم آئی کا حلف نامہ)۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ بات ظاہر ہے کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف پشاور

ہائیکورٹ کے ایک حاضر سروس جج کی دائر کردہ شکایت کا معاملہ صدر نے نہیں بلکہ خود چیف جسٹس آف پاکستان نے اٹھایا تھا جو بظاہر صدر سے ان کی ملاقات کا بنیادی مقصد تھا۔

14۔ جب چیف جسٹس آف پاکستان نے مذکورہ امور پر بات مکمل کر لی تو صدر نے کہا کہ 13 فروری 2007ء کو ایوان صدر میں چیف جسٹس آف پاکستان سے ان کی گزشتہ ملاقات میں چیف جسٹس آف پاکستان نے صدر سے درخواست کی تھی کہ انٹیلی جنس اداروں سے کہا جائے کہ وہ میڈیا کی رپورٹوں کو دبانے میں چیف جسٹس آف پاکستان کی مدد کریں جن سے چیف جسٹس آف پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو مزید بتایا کہ انہیں مطلع کیا گیا تھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے ڈی جی ایم آئی اور ڈی جی آئی بی کو انفرادی طور پر کئی مرتبہ ایسی ہی مدد کے لیے اپنے گھر پر بلایا تھا۔ ڈی جی آئی ایس آئی کو بھی اسی مقصد کے لیے چیف جسٹس نے گھر پر بلایا تھا۔

15۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی اپنی ہی درخواست پر انٹیلی جنس اداروں نے حقائق معلوم کرنے کے لیے تحقیقات کیں۔

16۔ صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو بتایا کہ میرے آپ سے بڑے اچھے مراسم ہیں اور میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں اس لیے مجھے انٹیلی جنس اداروں کی حاصل کردہ معلومات کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔

17۔ اس کے بعد صدر نے ان کی توجہ ریفرنس کی خاص خاص باتوں کی جانب دلائی جو صدر کو موصول ہوا تھا۔

18۔ چیف جسٹس آف پاکستان کے حلف نامے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جیسے صدر کے پاس کوئی باقاعدہ دستاویز نہیں تھی بلکہ کاغذ کے چند ٹکڑے تھے جو نعیم بخاری کے لکھے ہوئے خط پر مبنی تھے۔ یہ بیان غلط ہے کیونکہ وزیراعظم کی جانب سے بھیجا گیا ریفرنس اور صدر کے لیے ان کا مشورہ 8 مارچ 2007ء کو صدارتی سیکرٹریٹ میں موصول ہو گیا تھا اور صدر نے اسے پڑھنے کے بعد پوائنٹس نوٹ کر لیے تھے۔ صدر کے نوٹس ان پوائنٹس پر مبنی تھے جن کا تعلق ریفرنس سے تھا نہ کہ ان پوائنٹس پر جو نعیم بخاری کے خط پر مبنی تھے جیسا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے حلف نامہ میں کہا گیا ہے۔

19۔ صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کے سامنے ان پوائنٹس کی نشاندہی کی۔ چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ اپنے اچھے تعلقات سے قطع نظر صدر، وزیراعظم کی جانب سے ملنے والی ایڈوائس کے پابند تھے اور اس سلسلے میں ان کا اپنا اختیار نہیں تھا۔

20۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اس بات کی تردید کی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی

ملازمت کے سلسلے میں بے جا حمایت حاصل کرنے کے لیے کسی شخص سے کوئی رابطہ کیا تاہم جب انہیں یاددلایا گیا کہ انہوں نے اس مقصد کے لیے صدر اور وزیر اعظم سے بھی رابطہ کیا تھا تو چیف جسٹس آف پاکستان نے فوری طور پر یہ بات تسلیم کر لی لیکن یہ کہا کہ میں نے صدر کو اپنا بڑا بھائی سمجھ کر ایسا کیا تھا۔

21۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے واضح کیا کہ انہوں نے ہمیشہ حکومت سے تعاون کیا ہے اور وہ آئندہ بھی ایسا کرتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے بہت سے دوسرے پوائنٹس کو تسلیم نہیں کیا اور تفصیلات جاننے پر اصرار کرتے رہے۔ اس کے بعد صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو بتایا کہ ان تفصیلات پر انٹیلی جنس کے سربراہوں کی موجودگی میں بات ہو سکتی ہے جن سے چیف جسٹس آف پاکستان نے خود یہ کہا تھا کہ وہ تفصیلات معلوم کریں۔ انٹیلی جنس کے سربراہوں سے چیف جسٹس آف پاکستان کے نہایت اچھے تعلقات تھے اور ان میں سے بیشتر سے ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں اس لیے وہ ان سے ملنا چاہتے تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم بھی میٹنگ میں شامل ہو گئے جس کے بعد دوپہر ایک بجے بیان دہندہ اور انٹیلی جنس اداروں کے سربراہ ملاقات میں شریک ہو گئے۔

22۔ ریفرنس کی تفصیلات اور چیف جسٹس آف پاکستان کی درخواست پر انٹیلی جنس اداروں کی چھان بین کی خاص خاص باتوں پر بعد میں تبادلہ خیال ہوا۔ انٹیلی جنس اداروں کی تحقیقات اور دوسرے ذرائع سے وفاقی حکومت کو حاصل ہونے والی ابتدائی معلومات سے متعلق، بعد میں ہونے والی چھان بین درست ثابت ہوئی جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) کراچی میں پلاٹ کی الاٹمنٹ

(i) اعلیٰ عدالتوں کے جج، وفاقی حکومت کے ملازمین کی ہاؤسنگ اسکیم میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے اہل نہیں ہیں۔ فیز II کراچی جو فروری 1999ء میں شروع کیا گیا وفاقی حکومت کے ایسے ملازمین کے لیے تھا جن کی یکم جنوری 1999ء تک وفاقی حکومت کے تحت کم سے کم دس سال باقاعدہ ملازمت بنتی ہو۔ وفاقی حکومت کے ملازمین سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس میں صرف ایسے سول ملازمین شامل ہیں جو سول ملازمین کے ایکٹ مجریہ 1973ء کی تشریح کے تحت آتے ہیں جن میں وفاقی بجٹ سے تنخواہ حاصل کرنے والے سویلین ملازمین اور خود مختار اور نیم خود مختار اداروں اور سرکاری شعبے کی ان کارپوریشنوں کے ملازمین شامل ہیں جو وفاقی حکومت کے انتظامی کنٹرول میں آتی ہیں ان میں وفاقی حکومت کے ملازمین کی ہاؤسنگ فاؤنڈیشن میں کام کرنے والے ملازمین بھی شامل ہیں۔ چیف جسٹس آف پاکستان واضح طور پر وفاقی حکومت کے ملازم نہیں ہیں (دیکھا جائے ایف جی ای ایچ ایف

برائے کراچی ہاؤسنگ سکیم فیز II کے بروشر کی کاپی)

(ii) اہلیت کے اس معیار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان نے جو یکم جنوری 1999ء کو سپریم کورٹ کے جج بھی نہیں تھے اس اسکیم کے لیے درخواست دی اور اس میں پلاٹ حاصل کر لیا (دیکھئے (i) پلاٹ کی الاٹمنٹ کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان کی درخواست اور (ii) الاٹمنٹ کا ثبوت)

(iii) یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انہیں جج کی حیثیت سے اسلام آباد میں بھی ایک پلاٹ پہلے ہی الاٹ ہو چکا تھا۔

(ب) پٹرول کی قیمت کی وصولی

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے متعدد کلیم بھیجے اور کار نمبر CIA-9 کے لیے لاکھوں روپے کے پٹرول کی قیمت وصول کی۔ انہوں نے یہ وصولی ان رسیدوں کی بنیاد پر کی جو سمنگلی روڈ کوئٹہ پر واقع عبد اللہ اینڈ سنز کے شیل پمپ کی جانب سے جاری کی گئیں۔ یہ تمام رسیدیں جعلی ہیں کیونکہ اس عرصہ کے دوران یہ پمپ صرف ڈیزل فروخت کرتا تھا نہ کہ پٹرول۔ یہ رقم چیف جسٹس آف پاکستان نے ان جعلی رسیدوں کی بنیاد پر وصول کی (دیکھئے عبد اللہ اینڈ سنز کے مینیجر حبیب اللہ کا حلف نامہ اور نمونے کی رسیدیں اور کلیم)

(ii) کار نمبر CIA-9 ہنڈا اکارڈ دراصل کوئٹہ میں نہیں بلکہ اسلام آباد میں چیف جسٹس آف پاکستان کی فیملی کار کے طور پر زیر استعمال تھی۔

(iii) چیف جسٹس آف پاکستان کے بیٹے ڈاکٹر ارسلان افتخار جو خود سرکاری ملازم ہیں ایک اور ہنڈا اکارڈ کار نمبر CIA-2 لاہور میں استعمال کر رہے تھے۔ اس گاڑی کے لیے بھی پٹرول کی رقم سپریم کورٹ کی جانب سے ادا کی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ارسلان کوئنز روڈ لاہور پر واقع کال ٹیکس پمپ (کاکیشین آٹوز) سے سپریم کورٹ کے کوپن برائے گاڑی نمبر IDL-9966 پر کار نمبر CIA-2 کے لیے پٹرول حاصل کرتے تھے۔ (دیکھئے کاکیشین آٹوز کے مینیجر علی احمد کا حلف نامہ اور نمونے کے بل)

(ج) ٹی اے/ ڈی اے کلیمز میں بے قاعدگی

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے متعلقہ قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اہل خانہ کے لیے لاکھوں روپے بطور ٹی اے/ ڈی اے وصول کیے۔ کئی موقعوں پر فضائی ٹکٹ بھی اہلیہ اور بچوں کے لیے وصول کیا گیا جبکہ وہ سرکاری طور پر اس کے حقدار نہیں تھے۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی اہلیہ

صرف اسی صورت میں ٹی اے کی حقدار ہیں جب چیف جسٹس آف پاکستان ان کے ساتھ ہوں اور ان کے قیام کی مدت پانچ دن سے زیادہ ہو۔ قواعد کے تحت بچوں کو ٹی اے دینے کی اجازت نہیں ہے چاہے چیف جسٹس آف پاکستان ساتھ ہی کیوں نہ ہوں۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستان نے جون 2006ء میں نتھیا گلی کے نجی دورے کے لیے اپنے لیے ڈی اے وصول کیا۔

(iii) یہ کلیم چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے دستخط سے بھیجے اور اپنے ہی دستخط سے ان کی رقم وصول کی۔ (دیکھئے (i) اے جی پی آر کا سرٹیفکیٹ۔ (ii) چیف جسٹس آف پاکستان کے اہل خانہ کا ٹی اے بل (iii) نتھیا گلی کے دورے کے لیے چیف جسٹس آف پاکستان کا ٹی اے بل (iv) چیف جسٹس آف پاکستان اور اہلیہ کا ٹی اے بل اور (v) سمری

(د) نتھیا گلی کا دورہ

(i) نتھیا گلی کے نجی دورے میں چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ نے 17 جون 2006ء کو کسی ریزرویشن کے بغیر گورنر ہاؤس میں قیام کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہاؤس سابق گورنر کے ایم اظہر کے لیے 17 جون 2006ء سے پہلے سے بک تھا اور چیف جسٹس آف پاکستان کے پرسنل سٹاف آفیسر کو ایک دن پہلے یعنی 16 جون 2006ء کو یہ بات بتا دی گئی تھی۔ سابق گورنر سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آمد میں ایک دن کی تاخیر کر دیں۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ نے اگلے دن بھی گورنر ہاؤس چھوڑنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ جب سابق گورنر اور دوسری ممتاز شخصیات وہاں پہنچیں تو انہیں غسل خانہ بھی استعمال نہیں کرنے دیا۔

(iii) اس سب کے باوجود چیف جسٹس آف پاکستان اور ان کے اہل خانہ وہاں سے ناخوش ہو کر گئے (دیکھئے صوبہ سرحد کے گورنر کے ایم ایس لیفٹیننٹ کرنل سعید اللہ کا حلف نامہ)

(ہ) ججوں کو ہراساں کرنا

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے لاہور ہائیکورٹ کے جناب اختر شبیر اور جناب جسٹس شیخ عبد الرشید کو زبانی حکم دیا کہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک عدالت میں نہ آئیں۔ جناب جسٹس شیخ عبدالرشید اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی ریٹائرمنٹ تک دفتر میں نہیں آئے۔

(ii) چیف جسٹس آف پاکستان نے ہائیکورٹوں کے بہت سے ججوں کے خلاف بلا امتیاز کردار کشی

کی ایک مہم شروع کی۔

(iii) چیف جسٹس آف پاکستان، لاہور ہائیکورٹ، سندھ ہائیکورٹ اور پشاور ہائیکورٹ کے بہت سے ججوں کے خلاف غلط طرز عمل کے لیے سپریم جوڈیشل کونسل میں کارروائی شروع کرنا چاہتے تھے تاہم وفاقی حکومت کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی ان کے ججوں کے نام یہ ہیں:

لاہور ہائیکورٹ

(i) جناب جسٹس عبدالشکور پراچہ
(ii) جناب جسٹس شبر رضا رضوی
(iii) جناب جسٹس اختر شبیر
(iv) جناب جسٹس شیخ عبدالرشید

سندھ ہائیکورٹ

(i) جناب جسٹس سرمد جلال عثمانی
(ii) جناب جسٹس مشیر عالم
(iii) جناب جسٹس عارف حسین خلجی
(iv) جناب جسٹس امیر ہانی مسلم
(v) جناب جسٹس افضل سومرو

پشاور ہائیکورٹ

(i) جناب جسٹس شاہ جہان خان
(ii) جناب جسٹس اعجاز الحسن خان
(iii) جناب جسٹس جہانزیب رحیم

(و) ججوں کے تقرر میں ذاتی تعصب

(i) دوسرے آئینی مشیروں کی سفارشات سے قطع نظر اپنی پسند کے ججوں کے تقرر پر چیف جسٹس آف پاکستان کے اصرار کرنے سے ایک تعطل پیدا ہو گیا جس سے پنجاب اور بلوچستان کی ہائیکورٹس میں بہت سی پوسٹیں خالی رہ گئیں اور اس سے ان عدالتوں کے کام میں حرج ہوا۔ اس کی وجہ سے لاہور ہائیکورٹ میں 17 اور بلوچستان میں 3 ججوں کی کمی ہے۔ سندھ ہائیکورٹ کے لیے 7 تقرریاں چیف جسٹس آف پاکستان کے پاس زیر التواء تھیں۔

(ii) انہوں نے گورنر بلوچستان اور چیف جسٹس آف بلوچستان ہائیکورٹ (آئینی مشیروں) سے اپنی ملاقاتوں میں بلوچستان ہائیکورٹ کے لیے بعض ججوں کے تقرر سے اتفاق کیا لیکن بعد میں اس باہمی افہام و تفہیم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ گورنر نے 10 فروری 2007ء کے اپنے خط میں صدر کو اس بات سے آگاہ کیا (دیکھئے گورنر بلوچستان کا خط)

(ز) اختیارات کا ناجائز استعمال

(i) چیف جسٹس آف پاکستان نے اس بات پر اصرار کیا کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس چودھری اعجاز یوسف کو ریٹائر کیا جائے۔ بعد میں انہوں نے لاہور ہائیکورٹ کے جج جناب جسٹس نسیم سکندر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی نامزدگی واپس لیں جبکہ فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ان کی تعیناتی کا نوٹیفکیشن جاری ہو چکا تھا نتیجتاً فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ کافی عرصے تک خالی رہا۔

(ii) فیڈرل شریعت کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس جناب جسٹس حازق الخیری کے تقرر کے بعد چیف جسٹس آف پاکستان نے ان پر اپنی پسند کے ججوں کے تقرر کے لیے دباؤ ڈالا۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ اس طرح چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک تعطل پیدا کیا جس کے نتیجے میں وفاقی شرعی عدالت کئی ماہ تک نامکمل رہی۔

(ح) سول ملازمین کو ہراساں کرنا

چیف جسٹس آف پاکستان نے ایڈیشنل چیف سیکرٹری جناب خوشنود لاشاری اور بعد میں چیف سیکرٹری جناب کامران رسول کو پرانے ماڈل کی مرسڈیز بینز کار فراہم نہ کرنے پر طلب کیا اور انہیں گھنٹوں انتظار کرایا۔ دونوں افسروں پر ملازمت سے فوری معطلی کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ ڈی جی پروٹوکول پنجاب جناب مشتاق ہمدانی پر ان کی مبینہ کوتاہی پر دباؤ ڈالا گیا۔ جناب ہمدانی نے غیر مشروط معافی طلب کر کے خود کو بچایا (دیکھئے لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) مشتاق حسین ہمدانی ڈی جی پروٹوکول پنجاب کا غیر مشروط معافی نامہ اور جناب خوشنود اختر لاشاری سابق ایڈیشنل چیف سیکرٹری پنجاب کا حلف نامہ)

(ط) پولیس افسروں کو ہراساں کرنا

(i) چیف جسٹس آف پاکستان سکھر جاتے ہوئے حیدرآباد سے گزرتے وقت ڈی پی او حیدرآباد جناب علی احمد جونیجو پر سخت ناراض ہوئے کیونکہ وہ ان کے اسکارٹ کے لیے ذاتی طور پر موجود نہیں تھے۔

(ii) ڈی پی او نے معافی مانگی اور وضاحت کی کہ وہ سرکاری میٹنگ کے لیے اسلام آباد گئے تھے لیکن چیف جسٹس اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور مذکورہ افسر کو ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر انہیں سکھر میں ملیں۔ ڈی پی او نے اس ہدایت پر عمل کیا لیکن انہیں ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا کہ وہ حیدرآباد واپس جائیں اور کچھ دنوں بعد اسلام آباد آ کر ملیں۔ (دیکھئے علی احمد جونیجو ڈی پی او حیدرآباد کا

حلف نامہ)

(ی) انتظامیہ میں مداخلت

چیف جسٹس نے اپنی فیملی کے ہمراہ پشین کے اپنے ایک نجی دورے کے دوران ڈی پی او مسٹر عامل فہیم وائیں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ذاتی اردلی کانسٹیبل عبدالرحمٰن کو فوری طور پر ترقی دیں۔ ڈی پی او نے بتایا کہ کانسٹیبل مقررہ معیار پر پورا نہیں اترتا اس لیے قواعد کے تحت اسے ترقی نہیں دی جا سکتی۔ تاہم چیف جسٹس نے اس بات پر اصرار کیا کہ دن ختم ہونے سے پہلے پہلے ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ آخر کار ڈی پی او کو چیف جسٹس کے دباؤ پر ان کا حکم ماننا پڑا۔ (دیکھئے مسٹر عامل فہیم وائیں، سابق ڈی پی او پشین کا بیان حلفی)

(گ) ذاتی تشہیر

میڈیا پر نمایاں نظر آنے کی خواہش

(i) پاکستان کے سابق چیف جسٹس صاحبان کے برعکس جو عموماً اپنے فیصلوں کے ذریعے بولتے تھے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ذاتی تشہیر کی بہت خواہش رکھتے تھے اور انہوں نے میڈیا پر اپنی تشہیر کے لیے ایک آفیسر تعینات کر رکھا تھا۔ پی آر او کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ تمام اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا پر چیف جسٹس کی سرگرمیوں کی نمایاں کوریج کا انتظام کریں۔

(ii) پی ٹی وی کو حکم دیا گیا تھا کہ چیف جسٹس کو روزانہ خبروں میں نمایاں طور پر کوریج دی جائے۔ (دیکھئے مسٹر خالد بلال، سابق پی آر او، سپریم کورٹ آف پاکستان کا بیان حلفی)

پروٹوکول کا شوق

(iii) چیف جسٹس Hood پہنے ہوئے مسلح سکیورٹی گارڈز استعمال کرتے تھے جن کی موجودگی سے ہوائی اڈوں اور پبلک مقامات پر چیف جسٹس کی آمد پر لوگوں میں خوف وہراس پھیل جاتا تھا۔

(iv) چیف جسٹس کو پروٹول کا اتنا خیال ہوتا تھا کہ وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ جب وہ کسی جگہ کا دورہ کرنے جائیں تو انہیں ان کی من پسند کاریں (مرسڈیز یا BMW) مہیا کی جائیں۔ پروٹوکول کے معاملے میں وہ اس حد تک آگے چلے جاتے تھے کہ ان کا حکم تھا کہ پولیس اسکارٹ کے لیے وہ اہلکار مقرر کئے جائیں جنہیں وہ خود نامزد کریں۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ اسلام آباد اور دوسرے شہروں میں ان کی آمدورفت کے دوران تمام ٹریفک روک دی جایا کرے۔ (دیکھئے ان افراد کے حلفی بیانات۔ (i) مسٹر مدثر اقبال، ڈی جی (پروٹوکول) سندھ۔ (ii) مسٹر ضیاء

الحسن خان، سابق آئی جی پی پنجاب)۔(iii) مسٹر مشتاق حسین ہمدانی، ڈی جی (پروٹوکول) پنجاب۔
(iv) سپریم کورٹ کے خطوط مورخہ 20 اگست 2005ء اور 22 مارچ، 20 اپریل، 21 اکتوبر اور
7 دسمبر 2006)

(v) چیف جسٹس کے کراچی کے دوروں میں آئی جی سندھ مسٹر جہانگیر مرزا کو تحریری طور پر کہا گیا کہ 3 پولیس موبائلز، 2 پولیس جیپ، ایلیٹ فورس کا دستہ اور ایس پی رانا پرویز کو اسکارٹ ڈیوٹی، انسپکٹر جعفر عباس کو پائلٹ ڈیوٹی اور اے ایس آئی وقار عظیم کو واکی ٹاکی اور 9mm Block-17 پسٹل کے ساتھ گن مین کو ڈیوٹی پر تعینات کیا جائے۔ آئی جی نے اس حکم کی تکمیل کی لیکن پھر ایسا موقع آیا جب ڈی آئی جی کے رینک کے آفیسر کو چیف جسٹس کے اسکارٹ کے لیے طلب کیا گیا تو اس پر آئی جی نے معذرت کی کیونکہ ایسا صدر اور وزیراعظم کے لیے بھی نہیں ہوتا۔ (دیکھئے مسٹر جہانگیر مرزا، سابق آئی جی سندھ کا بیان حلفی)

مہنگی کاروں کا شوق

(vi) ایک دوروزہ کانفرنس کے موقع پر پروٹوکول ڈیوٹی کے لیے 80 لاکھ روپے کی لاگت سے دو ہنڈا اکارڈ کاریں سرکاری فنڈز سے خریدی گئیں، اس مقصد کے لیے قواعد میں نرمی کی گئی بعد میں یہ کاریں اسلام آباد اور لاہور میں چیف جسٹس کی فیملی اور بیٹے نے خالصتاً پرائیویٹ اور ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیں۔ چیف جسٹس کا بیٹا ڈاکٹر ارسلان افتخار جو ان میں سے ایک کار (CIA-2) لاہور میں استعمال کرتا تھا اور اس کے لیے رجسٹریشن نمبر IDL-9966 پر سپریم کورٹ کے اکاؤنٹ سے پٹرول لیتا تھا۔ (دیکھئے مندرجہ ذیل افراد کے حلفی بیانات (i) مسٹر صفدر علی، کانسٹیبل (ii) مسٹر محمد نعیم، اسسٹنٹ انچارج (سکیورٹی گارڈ) (iii) مسٹر مروت باری، انچارج سکیورٹی اور (iv) مسٹر علی احمد منیجر Kakasian آٹوز لاہور)

(23) مندرجہ بالا معلومات کے علاوہ وفاقی حکومت کو چیف جسٹس کے خلاف اور بھی بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔

(24) چیف جسٹس نے اپنے بیان حلفی میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے زیر استعمال مرسیڈیز کار وزیراعظم نے اپنی خوشی سے انہیں بھیجی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چیف جسٹس نے یہ کار سخت دباؤ ڈال کر حاصل کی تھی۔

(25) سپریم کورٹ کے ججوں کی رخصت، پنشن اور استحقاق کے آرڈر مجریہ 1997ء کے تحت ایک

جج کو 1600 CC کی صرف ایک سرکاری کار استعمال کرنے کی اجازت ہے اور اس کے لیے پٹرول ماہانہ حد 400 لٹر مقرر ہے۔ (آرٹیکل 21) دیکھئے وزارت قانون انصاف اور انسانی حقوق کا بیان)

(26) 1997ء میں اس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان کے زیر استعمال مرسیڈیز کار، ان کے جانشین مسٹر جسٹس اجمل میاں نے مارچ 1998ء میں واپس کر دی تھی اور ججوں کے لیے یہ رہنما اصول بھی مقرر کیا تھا کہ سپریم کورٹ کار پول میں کاروں کی کمی کی صورت میں جج صاحبان، دستیاب کاریں مل جل کر استعمال کریں گے لیکن کسی بھی صورت میں عدالت عظمیٰ، کابینہ ڈویژن سے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے کسی جج کو کار فراہم کی جائے۔ (دیکھئے سرکاری ٹرانسپورٹ کے استعمال بارے سپریم کورٹ کا حکم)

(27) مندرجہ بالا قواعد وضوابط کے برعکس مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری نے وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری مسٹر جاوید صادق ملک پر دباؤ ڈالا کہ انہیں کابینہ ڈویژن کے پول سے مرسیڈیز کار دی جائے جو جولائی 2005ء کو انہیں دے دی گئی۔

(28) چیف جسٹس 1993ء ماڈل کی کار سے مطمئن نہیں تھے اور جلد ہی انہوں نے اس کی جگہ 2004ء ماڈل کی مرسیڈیز بینز کار فراہم کرنے کا تقاضا شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ تقاضا فروری 2006ء میں وزیراعظم کے متبادل کار کی فراہمی کی منظوری دینے تک جاری رکھا۔ (دیکھئے جناب جاوید صادق ملک، سابق پی ایس ایم کا بیان حلفی)

(29) چیف جسٹس نے جو یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ میٹنگ کا واحد مقصد ان سے استعفیٰ لینا تھا، درست نہیں ہے۔ یہ میٹنگ چیف جسٹس کی درخواست پر ہوئی تھی اور اس میں خود انہوں نے پشاور ہائیکورٹ کے ایک جج کی طرف سے دائر کردہ شکایت کا معاملہ اٹھایا تھا۔ اس میٹنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیف جسٹس کو بتایا گیا کہ ان کے خلاف ایک ریفرنس تیار کیا گیا ہے جو ایک دن پہلے صدر کو موصول ہوا ہے اور جسے صدر، چیف جسٹس سے اچھے تعلقات کے باوجود سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیجنے کے پابند ہیں۔ اس میٹنگ میں چیف جسٹس کو ان تحقیقات کے نتائج سے بھی آگاہ کیا گیا۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں کو چیف جسٹس کی خواہش پر میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔

(30) بیان حلفی کے ذریعے یہ تاثر پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ چیف جسٹس کو ان کی مرضی کے خلاف پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ کیمپ آفس، راولپنڈی میں رکنے پر مجبور کیا گیا، چیف جسٹس کے بیان حلفی کا مواد اپنی تردید خود کر رہا ہے۔ چیف جسٹس ایک طرف کہتے ہیں کہ ایک افسر نے انہیں روانہ ہونے سے روکا اور دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی بہانے کیمپ آفس میں رکھا گیا۔

(31) سکیورٹی کے معمول کے طریق کار کے مطابق صدر سے ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ موبائل فون لیکر نہ جائیں تاہم چیف جسٹس نے میٹنگ والے دن اپنے سٹاف آفیسر کو پیغام بھجوایا کہ ان کی فیملی کو بتایا جائے کہ ان کا لاہور جانے کا پروگرام منسوخ ہوگیا ہے۔ یہ پیغام سٹاف آفیسر نے باقاعدہ طور پر پہنچایا، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ چیف جسٹس کا رابطہ بیرونی دنیا سے منقطع تھا اور انہیں ان کی مرضی کے خلاف کیمپ آفس میں رکھا گیا۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور قیاس آرائی سے کام لیتے ہوئے ایک گمراہ کن تصویر پیش کی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

(32) حقیقت یہ ہے کہ چیف جسٹس خود درخواست کر کے صدر سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ انہوں نے ڈی جی ایم آئی سے بھی کہا کہ وہ ان کی مدد کے لیے میٹنگ کے موقع پر موجود رہیں، اس سے پہلے انہوں نے ڈی جی آئی بی اور ڈی جی آئی ایس آئی سے ملاقات کی اور ان سے مدد طلب کی۔ چیف جسٹس کے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تمام سربراہوں سے خوشگوار تعلقات تھے جو وہاں موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی چیف جسٹس سے ذاتی عناد نہیں رکھتا تھا۔ چیف جسٹس اور ان کی فیملی کا ڈی جی آئی بی کے گھر آنا جانا تھا۔ ڈی جی ایم آئی اور چیف جسٹس اکثر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہتے تھے اور ڈی جی ایم آئی اکثر چیف جسٹس سے ان کی رہائش گاہ پر ملنے جاتے تھے۔ میٹنگ والے دن تمام وقت ماحول شائستہ رہا اور ادب آداب و کا پورا خیال رکھا گیا۔ کسی نے چیف جسٹس کو دھمکی نہیں دی، کسی نے ان پر استعفیٰ دینے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا، اس طرح کی صورتحال میں استعفیٰ ایک آپشن ضرور ہوتا ہے تاہم چیف جسٹس نے ریفرنس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (دیکھئے ریٹائرڈ بریگیڈیئر اعجاز احمد شاہ ڈی جی آئی بی کا بیان حلفی)

(33) جہاں تک ذاتی تعلقات کا تعلق ہے چیف جسٹس کے صدر سمیت تمام اہم شخصیات سے بڑے اچھے تعلقات تھے تاہم صدر آئین کے تحت اس بات کے پابند تھے کہ وہ ریفرنس بھیجیں جس کا انہیں مشورہ دیا گیا تھا۔

(34) جب چیف جسٹس نے میٹنگ میں اٹھائے جانے والے نکات کی تفصیلات جاننا چاہیں تو ان ہی کی درخواست پر انٹیلی جنس کے سربراہوں کو بھی طلب کیا گیا۔ صدر، وزیر اعظم کے چیف آف سٹاف اور ملٹری سیکرٹری دن دو بجے میٹنگ سے چلے گئے اور چیف جسٹس انٹیلی جنس کے سربراہوں سے بات چیت کے لیے جن کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے، رک گئے۔ ریفرنس کی پوری فائل، دوسری متعلقہ دستاویزات اور ان کی فولڈرز پر مشتمل انٹیلی جنس معلومات موجود تھیں اور بات چیت میں کافی

وقت صرف ہوا کیونکہ چیف جسٹس نے وہاں موجود لوگوں سے اس معاملے پر تفصیلی بات چیت کی۔ ڈی جی آئی بی اور ڈی جی آئی ایس آئی بھی تین بجے سہ پہر چلے گئے۔ چیف جسٹس روانگی تک ڈی جی ایم آئی کے ساتھ رہے جنہوں نے چیف جسٹس کو کار میں رخصت کیا۔ ڈی جی ایم آئی کے ساتھ چیف جسٹس ریفرنس کے بارے میں اور صدر سے ایک اور ملاقات کے امکان پر بات کرتے رہے تاہم اس ملاقات کا انتظام نہ ہوسکا۔ (دیکھئے میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد، ڈی جی ایم آئی کا بیان حلفی)

(35) بیان حلفی میں چیف جسٹس کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کو خصوصی طیارہ فراہم کیا گیا۔

(36) یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ صدر عام طور پر وردی میں رہتے ہیں، چیف جسٹس آف پاکستان سے ملاقات ان کے اصرار پر 9 مارچ 2007ء کو مقرر کی گئی جس کے لیے صدر کے پروگرام میں تبدیلی کی گئی اور جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے یہ تبدیلی 8 مارچ 2007ء کو کی گئی۔

(37) چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ انہیں کئی دن تک ان کی رہائش گاہ پر اس حالت میں رکھا گیا کہ ان کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رہا، ان کی ٹیلیفون لائنیں کاٹ دی گئیں اور ان کے اہل خانہ کے موبائل فون جام کر دیئے گئے، یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ 9 مارچ 2007ء کو شام 5 بجے سے 13 مارچ تک ان کے بیٹے کے موبائل فون پر ساڑھے تین سو سے زیادہ کالیں بھیجی اور وصول کی گئیں۔ دوسروں کے علاوہ میاں محمد نواز شریف نے بھی اسی موبائل لائن پر انہیں کال کی۔ (دیکھئے دی نیوز کا تراشہ) لینڈ لائن بھی استعمال میں تھی اور لوکل کالوں کے علاوہ جنہیں ایکسچینج میں ریکارڈ نہیں کیا جاتا دوسروں شہروں کے لیے بھی کالیں اور موبائل فون کالیں کی گئیں۔ دیکھئے فون کمپنیوں کا کال ڈیٹا)

(38) چیف جسٹس آف پاکستان کے اعلیٰ عہدے کے وقار اور عدلیہ کے احترام کو دیکھتے ہوئے بادل نخواستہ ان حقائق کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ راستہ بادل نخواستہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ حقائق کو ریکارڈ پر لایا جائے۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک حلف نامہ داخل کیا ہے جو اپنے متن کے حوالے سے غلط اور چیف جسٹس آف پاکستان کے وکیل نے عدالت میں اور باہر یہ بیانات دیئے ہیں، چونکہ چیف جسٹس آف پاکستان کے بیان حلفی کی تردید نہیں کی گئی اس لیے اسے درست سمجھا جائے۔

بیان حلفی

میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد ولد میاں اعجاز احمد مرحوم، ڈائریکٹر جنرل، ملٹری انٹیلی جنس

منکہ مسمی میجر جنرل میاں ندیم اعجاز احمد ولد میاں اعجاز احمد مرحوم جو کہ اس وقت ڈائریکٹر جنرل، ملٹری انٹیلی جنس (ڈی جی ایم آئی) کے فرائض انجام دے رہا ہوں، حلفاً بیان کرتا ہوں کہ

1۔ مجھے 28 فروری 2005ء کو ڈی جی ایم آئی مقرر کیا گیا اور میں اس وقت سے اس عہدے پر کام کر رہا ہوں۔

2۔ جناب جسٹس افتخار محمد چودھری، چیف جسٹس آف پاکستان نے (جو جبری رخصت پر ہیں) اپنے تقرر کے تقریباً دو ہفتے بعد مجھے فون کیا، مجھے اس پر قدرے حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو بطور خیرسگالی فون کر رہا ہوں۔ میں آپ سے آپ کی رہائش گاہ پر ملنا چاہتا ہوں تاہم میں نے کہا یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ میں آپ سے ملاقات کرنے آؤں۔

3۔ چیف جسٹس آف پاکستان اکثر مجھے ٹیلیفون کرتے اور ہم ایک دوسرے کا حال احوال معلوم کرتے اور خوشگوار جملوں کا تبادلہ کرتے۔ 2006ء میں، میں نے ان کے ہاں جانا شروع کیا۔ یہ ملاقاتیں اکثر ان کی درخواست پر ہوتیں اور بعض اوقات میں اپنے طور پر ان سے ملنے جاتا۔ میں ان سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کرتا، یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے کہ میں کتنی بار ان سے ملنے گیا، کیونکہ ہم اکثر ایک دوسرے کو فون کرتے رہتے تھے اور ملتے رہتے تھے۔

4۔ چیف جسٹس آف پاکستان، ایم آئی کے اسلام آباد Detachment کے آفیسر انچارج سے مطمئن تھے اور اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہمیں اس کے توسط سے مسلسل رابطہ رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ چیف جسٹس، لاہور میں ایم آئی کے آفیسر انچارج سے بھی باقاعدہ رابطہ رکھتے تھے اور ان کے ذمہ یہ کام لگاتے تھے کہ وہ انہیں پنجاب میں تعینات ججوں کے بارے میں باقاعدگی سے معلومات فراہم کریں تاکہ ان کے بارے میں اپنی ضرورت کے مطابق ڈیٹا بیس تیار کیا جاسکے۔ ان کی یہ خواہش بھی ہوتی تھی کہ چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں Detachment کے انچارج ان سے رابطہ رکھیں تاکہ وہ تمام ججوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتے رہیں۔

5۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا میں ان کی ملاقات ڈی جی آئی ایس آئی سے کراسکتا ہوں، انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ٹیلیفون پر ڈی جی آئی ایس آئی سے بات کرتے

رہتے ہیں اور ان سے ملاقات ضروری ہے چنانچہ ڈی جی آئی ایس آئی نے چیف جسٹس آف پاکستان کے اصرار پران کی رہائش گاہ پران سے ملاقات کی۔

6۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک مرتبہ مجھے فون کیا اور مجھے بات چیت کے لیے بلایا، جب میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچا تو انہوں نے سیاسی صورتحال پر گفتگو شروع کر دی، ان کی رائے تھی کہ صدر کو اسمبلیاں توڑ دینی چاہئیں کیونکہ وہ تنگ کر رہی ہیں اور چیف جسٹس کی نگرانی میں انتخابات کرانے چاہئیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تمام متعلقہ لوگوں کو یقین دلاؤں کہ چیف جسٹس تمام کام آسان بنا دیں گے۔

7۔ چیف جسٹس میڈیا کی مخالفانہ رپورٹوں پر پریشان تھے، انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو دیکھیں اور ان کے خلاف جو مہم چلائی جا رہی ہے اسے بند کرنے میں مدد دیں۔ وفاقی حکومت نے بھی مجھ سے کہا کہ میں اس معاملے کا احتیاط سے جائزہ لوں کیونکہ چیف جسٹس نے 13 فروری 2007ء کو صدر سے ملاقات میں یہ معاملہ اٹھایا تھا۔

8۔ 7 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس آف پاکستان نے مجھے فون کیا۔ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ پشاور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس جہانزیب رحیم نے ان کے خلاف ریفرنس تیار کیا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگلی صبح تک اس ریفرنس کی ایک نقل انہیں مل جانی چاہیے۔ میں نے ان کی یہ فرمائش پوری کر دی۔

9۔ 8 مارچ 2007ء کو رات کے وقت چیف جسٹس نے مجھے پھر فون کیا اور بتایا کہ وہ 9 مارچ 2007ء کو دن ساڑھے 11 بجے صدر سے ملاقات کرنے جا رہے ہیں جہاں وہ جسٹس جہانزیب رحیم کا معاملہ اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی وہاں موجود رہیے گا اور میری مدد کیجئے گا۔ میں نے کے ایم ایس کو اس صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

10۔ 9 مارچ 2007ء کو پریذیڈنسی کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ آپ پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ کے کیمپ آفس میں ایک میٹنگ میں آ جائیں۔ دن ایک بجے میں صدر کے چیف آف سٹاف، ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی آئی بی کیمپ آفس میں صدر کے چیمبر میں گیا۔ صدر، وزیراعظم اور چیف جسٹس پہلے سے وہاں موجود تھے، صدر کے ملٹری سیکرٹری بھی موجود تھے۔

11۔ دن ایک بجے اور دو بجے کے درمیان، چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف وفاقی حکومت کے تیار کردہ ریفرنس کی تفصیلات اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی اس مہم کی حاصل کردہ معلومات کو زیر بحث لایا گیا جو چیف جسٹس کے ایماء پر اکٹھی کی گئی تھیں۔ بحث کے دوران چیف جسٹس نے واضح طور پر کہا کہ وہ ریفرنس کا مقابلہ کریں گے۔

12۔ دن دو بجے صدر جمعہ کی نماز کے لیے چلے گئے۔ وزیراعظم، صدر کے چیف آف سٹاف اور صدر کے ملٹری سیکرٹری بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے اور چیف جسٹس، ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی آئی بی نے مختلف نکات پر گفتگو جاری رکھی۔ تمام مواد اور ریکارڈ جو کئی فولڈرز پر مشتمل تھا اس عرصے میں دستیاب تھا۔

13۔ اس گفتگو کے دوران کسی نے کوئی ناشائستہ بات نہیں کی، چیف جسٹس نے صدر اور وزیراعظم کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ میں ریفرنس کا مقابلہ کروں گا۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ ہم چیف جسٹس سے کوئی مطالبہ کرتے، ان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ ہمارے درمیان گفتگو ریفرنس تک محدود رہی۔

14۔ سہ پہر تین بجے ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی آئی بی بھی میٹنگ سے چلے گئے۔ چیف جسٹس اور میں وہاں موجود رہے، میں نے ریفرنس پر مزید گفتگو کی۔ کچھ دیر کے بعد چیف جسٹس نے کہا کہ میں صدر سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں، لہٰذا آپ صدر سے میری ملاقات کرا دیں۔ میں نے جب دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ صدر نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد آرمی ہاؤس چلے گئے تھے اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے ایئرپورٹ چلے گئے ہیں۔ ہم نے صدر کے کراچی پہنچنے تک انتظار کیا۔ یہ درست نہیں کہ چیف جسٹس کو ان کی مرضی کے خلاف کیمپ آفس میں روکا گیا۔ صدر کو کراچی میں چیف جسٹس کے اس خیال سے آگاہ کیا گیا کہ ان کی صدر سے ایک اور ملاقات مفید ثابت ہوسکتی ہے تاہم صدر کی رائے یہ تھی کہ اس ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ریفرنس پہلے ہی بھیجا جا چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے چیف جسٹس سے کوئی ذاتی عناد نہیں اور میں آئین کے مطابق وزیراعظم کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔ اس کے بعد میں چیف جسٹس کو رخصت کرنے ان کی کار تک گیا۔ میں جب انہیں رخصت کر رہا تھا تو اس موقع پر چیف جسٹس نے مجھ سے جو بیان منسوب کیا ہے وہ درست نہیں ہے، میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

بیان حلفی

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعجاز احمد شاہ ولد پیر احمد شاہ ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو

میں بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعجاز احمد شاہ ولد پیر احمد شاہ جو ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں، حلفاً یہ بیان دیتا ہوں کہ

1۔ مجھے فروری 2004ء میں ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو مقرر کیا گیا اور میں آج تک اسی عہدے پر کام کر رہا ہوں۔

2۔اس عہدے پر تقرر سے پہلے میں نے ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان دنوں میری ملاقات جناب جسٹس افتخار محمد چودھری چیف جسٹس آف پاکستان (جبری رخصت) سے ہوئی اور ہمارے بڑے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

3۔ڈی جی آئی بی کے عہدے پر تقرر کے بعد بھی ہمارے تعلقات جاری رہے، ہم ایک دوسرے سے اکثر بات چیت کرتے رہے اور ملتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں چیف جسٹس آف پاکستان اور باتوں کے علاوہ سرکاری کام، سیاسی صورتحال، انتظامی مسائل اور سپریم کورٹ کے روبرو کیسوں پر بھی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ کئی مرتبہ میں ان سے ملنے گیا اور کئی مرتبہ وہ مجھ سے ملنے آئے۔ کئی مرتبہ میں چیف جسٹس آف پاکستان سے ان کی خواہش پر ملا۔ یہ تمام ملاقاتیں نہایت دوستانہ اور خوشگوار رہیں۔

4۔ چیف جسٹس آف پاکستان میڈیا کی رپورٹوں کے بارے میں بڑے فکر مند تھے اور ان کے خیال میں ان سے انہیں نقصان پہنچ رہا تھا۔ انہوں نے ڈی جی آئی بی کی حیثیت سے مجھ سے کہا کہ میں اس معاملے کی چھان بین کروں اور ان رپورٹوں کو دبانے میں مدد دوں۔ وفاقی حکومت نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں اس معاملے کی چھان بین کروں کیونکہ چیف جسٹس آف پاکستان نے 13 فروری 2007ء کو صدر سے اپنی ملاقات میں یہ معاملہ اٹھایا تھا۔

5۔9 مارچ 2007ء کو مجھ سے کہا گیا کہ میں صدارتی سیکرٹریٹ کے کیمپ آفس میں ایک میٹنگ میں شرکت کروں۔ دوپہر ایک بجے میں صدر کے چیف آف سٹاف، ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی ایم آئی کے ساتھ کیمپ آفس میں صدر کے چیمبر میں گیا۔ صدر، وزیراعظم اور چیف جسٹس آف پاکستان پہلے ہی وہاں موجود تھے اور صدر کے ملٹری سیکرٹری بھی وہاں موجود تھے۔

6۔صدر کو وزیراعظم کی جانب سے 8 مارچ 2007ء کو ایک ریفرنس موصول ہوا تھا جس میں

مشورہ دیا گیا تھا کہ صدر اس ریفرنس کو سپریم جوڈیشل کونسل کو بھیجیں تا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے کنڈ یکٹ پر انکوائری ہو سکے۔ دو پہر ایک بجے اور دو بجے اس ریفرنس کی تفصیلات اور انٹیلی جنس اداروں کی حاصل کردہ معلومات پر تبادلہ خیال ہوا۔ یہ معلومات چیف جسٹس آف پاکستان کے ایماء پر حاصل کی گئی تھیں۔ بات چیت کے دوران چیف جسٹس آف پاکستان نے واضح طور پر کہا کہ وہ ریفرنس کا سامنا کریں گے۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے بیان حلفی میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جب انہوں نے مستعفی ہونے سے انکار کیا تو صدر طیش میں آگئے اور غصے میں کھڑے ہو گئے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ صدر طیش میں نہیں آئے تھے وہ پوری میٹنگ کے دوران پرسکون رہے اور احترام کا مظاہرہ کرتے رہے۔ نہ تو وہ غصے میں آئے اور نہ ہی طیش میں اٹھ کر کمرے سے باہر گئے۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنے حلف نامے میں یہ بات بھی غلط کہی ہے کہ انہوں نے صدر سے یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں خود قانون کا نگہبان ہوں اور میرا اللہ پر بھروسہ ہے جو میری مدد کرے گا۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے نہ ہی یہ الفاظ اور نہ ہی اس قسم کے کوئی اور الفاظ ادا کیے۔ میٹنگ دو پہر دو بجے ختم ہوگئی اور صدر اور وزیراعظم جمعہ کی نماز ادا کرنے روانہ ہو گئے۔،صدر کے ملٹری سیکرٹری اور سی او ایس بھی اسی وقت چلے گئے۔

7۔ اس کے بعد میں نے، چیف جسٹس آف پاکستان نے، ڈی جی آئی ایس آئی اور ڈی جی ایم آئی نے مختلف نکات پر اپنی بات چیت جاری رکھی تمام میٹریل اور ریکارڈ کئی فولڈروں میں دستیاب تھا۔

8۔ یہ تمام بات چیت انتہائی با اخلاق انداز میں ہوئی اور کوئی تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ کسی نے کوئی دھمکی نہیں دی۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے صدر اور وزیراعظم سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ ریفرنس کا سامنا کریں گے اس لیے ہم میں سے کسی کی جانب سے بھی چیف جسٹس آف پاکستان سے کوئی مطالبہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہماری بات چیت ریفرنس کی تفصیلات تک محدود تھی۔

9۔ سہ پہر تین بجے میں اور ڈی جی آئی ایس آئی میٹنگ سے چلے گئے۔ چیف جسٹس آف پاکستان اور ڈی جی ایم آئی وہیں موجود رہے اور آپس میں بات چیت کرتے رہے۔

10۔ میں نے لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) حامد جاوید کا بیان حلفی پڑھا ہے اور اس بیان حلفی کو بھی اس کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے۔

11۔ کہ جب تک خاص طور پر اس کا اقرار نہ کیا جائے اس حلف نامے میں موجود کسی بات کو چیف جسٹس کے حلف نامے میں موجود کسی مخالفانہ بیان کا اقرار نہ سمجھا جائے۔

اہم عدالتی فیصلے

فیڈریشن آف پاکستان بنام مولوی تمیز الدین
یوسف پٹیل اور 2 دوسرے بنام دی کراؤن
مملکت بنام ڈوسو اور دوسرے
مس عاصمہ جیلانی بنام حکومت پنجاب اور دوسرے
نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ
چیف جسٹس افتخار محمد کی بحالی کا فیصلہ

فیڈریشن آف پاکستان بنام مولوی تمیزالدین

(PLD 1950 FC 240)

جج صاحبان :

محمد منیر چیف جسٹس
اے۔ ایس۔ ایم۔ اکرم جسٹس
اے۔ آر۔ کارنیلیس جسٹس
محمد شریف جسٹس
ایس۔ اے۔ رحمان جسٹس

مقدمہ کے حقائق

گورنر جنرل نے 24 / اکتوبر 1954ء کو ایک اعلان (Proclamation) کے ذریعے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور دوبارہ تشکیل کردہ کونسل آف منسٹرز (Council of Ministers قائم کر دی۔ دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیزالدین خان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کی دفعہ 223 الف کے تحت سندھ چیف کورٹ (Chief court of Sind) میں درخواست برائے اجرائے پروانہ (Writ Petition) دائر کر دی۔ یہ استدعا کرتے ہوئے کہ پروانہ حکم نامہ عدالت کی صورت میں (Writ in the Nature of Mandamus) فیڈریشن آف پاکستان (وفاقِ پاکستان اور دوبارہ تشکیل کردہ مجلسِ وزراء (Council of Ministers) کے خلاف جاری کی جائے اور انہیں متذکرہ بالا اعلان پر عملدر آمد کرنے سے باز رکھا جائے اور مولوی تمیزالدین خاں کے اختیارات کے استعمال بطور صدر دستور ساز اسمبلی میں دخل اندازی کرنے کی ممانعت کی جائے۔ ایک اور اجرائے پروانہ کی درخواست میں اس بات کے قرار دینے کی استدعا کی گئی کہ نئی دوبارہ تشکیل کردہ مجلسِ وزراء کا تقرر غیر صحیح (Invalid) ہے۔ وفاق (Federation) اور مجلس وزراء نے یہ دلیل پیش کی کہ اسمبلی صحیح طور پر توڑی گئی ہے اور چیف کورٹ (سندھ) کو اجرائے پروانہ (Writs to Issue) کے بارے میں اختیارِ کار حاصل نہیں، کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء میں درج شدہ دفعہ 223 الف، جو دستور ساز اسمبلی نے بطور ترمیم کے شامل کی تھی۔ وہ قانون سازی کا صحیح ٹکڑا (حصّہ یا جزو) نہیں ہے، کیونکہ اسے گورنر جنرل کی منظوری (Assent)

حاصل نہیں ہوئی۔ چیف کورٹ (سندھ) نےاس بحث (Contention) سے اتفاق نہ کیااور فیصلہ دیا کہ دستور ساز اسمبلی کے قوانین جب یہ (دستور ساز اسمبلی) بطور وفاقی مقنّنہ (Federal Legislature) فرائض سرانجام نہ دے رہی ہو تو اسے (دستور ساز اسمبلی کو) گورنر جنرل کی منظوری کی حاجت نہیں ہوتی اور اس تفتیش و تحقیق (Finding) کے نتیجے میں استدعا کردہ پروانے جاری کر دیئے۔

فیصلہ :

وفاقی عدالت (Federal) نے جج صاحبان کی کثرت رائے سے مندرجہ ذیل فیصلہ دیا۔ جسٹس کارنیلیس (Cornelius,J) نے اختلاف کیا۔ دستور ساز اسمبلی جب دفعہ 8 کی ضمنی دفعہ (۱) قانونِ آزادیٔ ہند 1947ء (Indian Independence, Act, 1947) کے تحت فرائض سرانجام دے رہی ہو تو اس قانون کی دفعہ 6 کے معنوں میں سلطنت یا قلمرو کی مقنّنہ کے طور پر فرائض سرانجام دے رہی ہے اور مؤخرالذکر دفعہ (یعنی دفعہ 6) کی ضمنی دفعہ (3) کے تحت سلطنت (Dominion) کی مقنّنہ کی تمام آئین سازی کے لئے گورنر جنرل کی منظوری ضروری ہے' چونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کی دفعہ 223 الف کے تحت' جس کے تحت سندھ چیف کورٹ نے اجرائے پروانہ کے بارے میں اختیارِ سماعت اپنے ذمہ لیا (Assumed)' کو (یعنی دفعہ 223 الف) منظوری (گورنر جنرل کی) حاصل نہ ہوئی تھی۔ چونکہ یہ دفعہ ابھی قانونی حیثیت حاصل نہ کر سکی تھی لہٰذا چیف کورٹ (سندھ) کو اجرائے پروانہ (Writs) کے بارے میں اختیارِ سماعت حاصل نہ تھا۔

مزید بر آں یہ اظہارِ رائے کیا گیا کہ آئین سازی اعلیٰ اختیارِ شاہی کا استعمال ہے اور جہاں سے اختیار (اختیار شاہی) کسی قانون یا چارٹر کی رو سے کسی مقنّنہ کو تفویض کیا جائے' نظریاتی طور پر یہ ہمیشہ منظوری کے تابع ہے خواہ وہ منظوری بادشاہ کی طرف سے اس کی طرف سے نامزد کئے ہوئے کسی شخص کی طرف سے دیجائے۔ برطانوی نظام کے تحت اس امر کے خلاف ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ پاکستان کی صورت میں یہ ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ پاکستان فی الحال ایک قلم رو (Dominion) ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آیا دستور ساز اسمبلی ایک مقتدر ادارہ ہے' اس کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ یہ فرض کر لینا ایک غلطی ہے کہ وسیع معنوں میں اقتدارِ اعلیٰ دستور ساز اسمبلی کو سونپا گیا تھا یا یہ کہ دستور ساز اسمبلی آئین آزادیٔ ہند کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے فرائض سرانجام دے سکتی تھی۔

اسمبلی کو صرف وفاقی یا دستوری (Constituional or Federal) قوانین بنانے کے متعلق اختیار سونپا گیا تھا۔ پہلی صورت میں' اس (دستور ساز اسمبلی) نے قلمرو کے آئین (Dominion Constitution of the) کو دفعہ کے متعلق اختیار کا استعمال کیا جو عام اختیارات میں شامل تھے جو

(عام اختیارات) قلمرو کے مقننہ کی دفعہ 6 کے تحت عطا کئے گئے تھے اور دوسری صورت میں اس (دستور ساز اسمبلی) نے ان تمام حدود کے اندر جن کے کہ وہ (دستور ساز اسمبلی) تابع تھی، رہتے ہوئے بطور وفاقی مقنّنہ (Federal Legislature) اختیارات کا استعمال کیا۔ اس (دستور ساز اسمبلی) کو قانونی اقتدارِ اعلیٰ (Legislative Sovereignty) بطور قلمرو کی مقننہ کے حاصل تھے اور گورنر جنرل اس مقنّنہ کا تشکیلی حصہ (Constituent Part) اور ہر قانون جو مقنّنہ منظور کرے، اس کے لئے گورنر جنرل کی منظوری (Assent) ضروری ہے۔

یوسف پٹیل اور ۲ دوسرے بنام دی کراؤن

(Pld ء1955 FC 387)

جج صاحبان :

چیف جسٹس محمد منیر
جسٹس اے۔ ایس۔ ایم اکرم
جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس
جسٹس محمد شریف
جسٹس ایس۔ اے رحمٰن

مقدمہ کے حقائق :

اپیل کنندگان کے خلاف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے سندھ کنٹرول غنڈہ ایکٹ (گورنر کا قانون نمبر28 مجریہ 1952ء) کے تحت کارروائی کی۔ اپیل کنندگان کو غنڈہ قرار دیا اور انہیں ضمانت (نیک چلنی کی) جمع کروانے کا حکم دیا اور ضمانت دینے میں ناکام رہنے کی وجہ سے انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ اپیل کنندگان نے اس نظربندی (Detension) کے خلاف مجموعہ ضابطہ فوجداری مجریہ 1898ء کی دفعہ 491 کے تحت پہلے سندھ چیف کورٹ کے سامنے درخواستیں پیش کیں کہ ان کی نظربندی غیر قانونی ہے اور انہیں آزاد کیا جائے۔ چیف کورٹ نے فیصلہ دیا کہ ان (اپیل کنندگان) کی نظربندی قانونی ہے اور ان کی حبسِ بے جا (Habeas Corpus) کی درخواست ہائے خارج کی جاتی ہیں۔

چیف کورٹ کے سامنے یہ بحث (Contention) (دلیل) کی گئی کہ قانون متنازعہ فیہ غیر صحیح تھا، کیونکہ یہ گورنر نے منظور کیا تھا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت (دفعہ 92 کے تحت) گورنر جنرل کے جاری کردہ اعلان کے تحت اسے (گورنر کے) تفویض کردہ اختیارات کی رو سے اس نے منظور کیا تھا۔ اس دفعہ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں گورنر جنرل نے خصوصی طور پر آئین

آزادیٔ ہند (Indian Independence Act) کی دفعہ کے تحت شامل کرنے پر زور دیا تھا اور گورنر جنرل کا یہ اقدام متذکرہ بالا دفعہ 9 کی شرائط کے تحت خارج از اختیار (Ultra Vires) تھا۔

چیف کورٹ نے یہ اِدّعا (Contention) خارج کر دی۔

فیصلہ :

یہ مقدمہ برائے اپیل یعنی اس مقدمہ کے بارے میں چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ فیڈرل کورٹ کے سامنے ایک نئی دلیل پیش کی گئی۔ یہاں پر دفعہ 92الف کی صحت (Validity) کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ یہ بیان کیا گیا کہ دفعہ 9 کی ضمنی دفعہ (5) کے تحت ابتدائی تاریخ مقررہ (دفعہ 9، آئین آزادیٔ ہند (Indian Independence Act کے گزر جانے کے بعد یہ اقدام اٹھایا گیا جو تاریخ اس کے تحت حکم دیئے جانے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ وہ تاریخ، جس تاریخ پر یا جس تاریخ سے پہلے گورنر جنرل متذکرہ بالا دفعہ 9 کے تحت احکام جاری کر سکتا تھا، 31 ر مارچ 1948ء تھی، لیکن یہ تاریخ آئینِ آزادیٔ ہند کی دستور ساز اسمبلی کی طرف سے کی گئی ترمیم کے بعد تحت دفعہ 2 کے 31 ر مارچ 1949ء کر دی گئی۔ یہ ترمیمی قانون Amendment Act گورنر جنرل کو برائے منظوری کبھی پیش نہ کیا گیا۔

موجودہ مقدمے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا قانون آزادیٔ ہند (ترمیم شدہ) مجریہ 1948ء جس کے تحت دفعہ 9 (5) کو 31 ر مارچ 1949ء کی تاریخ ترمیم کرنے کے بعد تبدیل کی گئی 19 ر جولائی 1948ء کو قانونی حیثیت حاصل تھی جبکہ اس تاریخ (یعنی 19 ر جولائی 1948ء) کو گورنر جنرل نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء میں دفعہ 92الف کا اضافہ فرمایا۔ مولوی تمیزالدین خان کے مقدمے کو بطور نظیر (Authourity) پیش کرتے ہوئے اس سوال کا جواب لازماً نفی میں ہو گا جس کے نتیجے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء میں دفعہ 92الف کے اضافے کا اختیار حاصل نہ تھا، یعنی کہ یہ اضافہ بغیر کسی اختیار کے کیا گیا تھا۔ سندھ غنڈہ ایکٹ گورنر نے منظور کیا تھا اور اس قانون کو منظور کرنے کے متعلق اختیارات گورنر جنرل کے دفعہ 92الف کے تحت کئے گئے اعلان سے حاصل کئے گئے تھے جو کہ صحیح نہ خیال کیا جائے اور اس قانون یعنی (سندھ غنڈہ ایکٹ) کے تحت کی گئی کارروائی باطل اور غیر مؤثر (Void and Operative) ہے۔

اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ یہ قاعدہ کلّیہ (Rule) محتاج وضاحت نہیں کہ ایک مقنّنہ (Legislature) ایک غیر صحیح قانون یعنی ناقص قانون (Invalid Law) کو صحیح قرار نہیں دے سکتی، اگر وہ (مقنّنہ) اس موضوع پر قانون سازی کے اختیارات نہیں رکھتی جس موضوع سے وہ ناقص متعلق ہے۔ اگر وفاقی مقنّنہ (Federal Legislature)، قانونی دفعہ کی عدم موجودگی میں جو اسے ایسا کرنے کا اختیار دیتی ہو، قانونِ آزادیٔ ہند یا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو تو گورنر جنرل کے پاس وفاقی مقنّنہ سے زیادہ اختیارات نہیں تھے، لہٰذا وہ (گورنر جنرل) بھی

آرڈیننس کے ذریعہ ان قوانین (قانون آزادیٔ ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ) میں ترمیم کرنے کے بارے میں اتنا ہی نا اہل (Incompetent) ہے جتنی کہ وفاقی مقننہ (Federal Legislature) قانون آزادیٔ ہند (Indian Indepence Act) کے تحت دستور ساز اسمبلی ہی دستوری معاملات (Constitutional Matters) کے متعلق آئین سازی کے اختیارات استعمال کرنے کا اختیار رکھتی ہے، صرف دستور ساز اسمبلی ہی ان قوانین (قانون آزادیٔ ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء) میں ترمیم کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ جب دستور ساز اسمبلی کا وجود ہی نہ رہے تو گورنر جنرل دستور ساز اسمبلی کے اختیارات کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ (گورنر جنرل) خود دستور ساز اسمبلی نہیں اور نہ وہ خود دستور ساز اسمبلی کے اختیارات حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

وفاقی عدالت نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ایسی صورتِ حال میں حکومت کو سب سے پہلے چاہئے تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے اختیارات استعمال کرنے کے لئے کسی نمائندہ ادارے کو معرضِ وجود میں لاتی تا کہ سب ناقص آئین سازی کو فوری طور پر نیا ادارہ صحیح اور جائز بنا دیتا۔

مملکت بنام دوسو اور دوسرے

State V. Dosso And other

(Pld ء1958 Sc (PAK)533)

جج صاحبان :

چیف جسٹس محمد منیر
جسٹس ایم۔ شہاب الدین
جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس
جسٹس امیر الدین احمد

مقدمہ کے حقائق :

1956ء کے آئین کے کالعدم (Anual) ہونے اور مرکزی اور صوبائی کابینہ کے خاتمے اور اسمبلیوں کے توڑ دینے اور مارشل لاء لگا دینے اور ساری انتظامیہ اور آئینی مشینری چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ہاتھ میں آ جانے پر قوانین کے جاری رکھے جانے کے احکامات مجریہ 1958ء جاری کئے گئے۔ اس حکم کا اثر یہ پڑا کہ ماسوا 1956ء کے آئین کے، باقی تمام قوانین جو مارشل لاء کی انتظامیہ کے عہدے سنبھالنے سے پہلے نافذ العمل تھے، انہیں جائز قرار دیا گیا اور عدالتوں کا اختیارِ سماعت بھی بحال کر دیا گیا۔

اس حکم کے تحت یہ بھی واضح کیا گیا کہ ملکی حکومت کو کالعدم آئین کے مطابق جس قدر ممکن ہو

گا، چلایا جائے گا۔

متذکرہ بالا مقدمے اور ایسی ہی دوسری متعلقہ اپیلوں میں قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ آیا عدالت ہائے عالیہ کی جانب سے جاری کردہ پروانے (Writs) استصواب کے احکام جرگہ (Council-of-Elders) کے بارے میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کی دفعہ 11 مجریہ 1901ء کے تحت سزا سنا دینا اس بنا پر کہ کالعدم آئین کی دفعہ 5 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مؤخرالذکر ریگولیشن (فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن) کے ناقص ہونے کی بنیاد پر 1958ء کے قوانین کے جاری رکھے جانے کے حکم کی شق 7 قانون IV کے تحت ساقط ہو جائے گا۔

فیصلہ :

فیصلہ دیا گیا کہ ایک جیتا ہوا انقلاب یا کامیاب تختہ الٹنا (Coupdetat) بین الاقوامی طور پر آئین تبدیل کرنے کا تسلیم شدہ قانونی طریقہ ہے۔ جب اس قسم کی کوئی تبدیلی امر واقع ہو تو قومی قانونی ڈھانچہ جائز قرار دیئے جانے کے لئے نئے قانون کی تخلیق کرنے والے ادارے پر انحصار رکھتا ہے۔ عدالتیں موجودہ سماعت کے اختیارات کھو دیتی ہیں اور اسی حد تک اور اسی طریقے سے جو نئے آئین کے تحت مقرر کیا جائے، فرائض سرانجام دیتی ہے۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر علاقہ اور عوام تقریباً وہی لوگ رہیں تو جدید قانونی نظریہ کے تحت ریاست (مملکت) کی بین الاقوامی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور انقلابی حکومت اور نیا آئین قانونِ بین الاقوام، حقیقی حکومت اور ریاست کا صحیح آئین کے مطابق ہیں۔

جہاں انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے اور قانون کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے بنیادی حقیقت بن جاتا ہے۔ قوانین کو جاری رکھنے کا حکم خواہ وہ کتنے ہی کم عرصے کے لئے ہو یا ناقص ہو، ایک نیا قانونی حکم تھا اور اس حکم کے مطابق قوانین کی صحت اور قانونی فیصلوں کی درستی طے کی جانی تھی۔

مس عاصمہ جیلانی بنام حکومتِ پنجاب اور دوسرے

(یہ مقدمہ مملکت بنام دوسو کے مقدمے کی نظیر پر غالب آتے ہوئے)

Overruling Case State V-Dosso, PLD 1958

(PLD 1972 Sc 139)

جج صاحبان :

چیف جسٹس حمود الرحمٰن
جسٹس محمد یعقوب علی خاں
جسٹس سجاد احمد خاں
جسٹس وحید الدین احمد

جسٹس صلاح الدین احمد

مقدمہ کے حقائق :

یہ اپیل ملک غلام جیلانی اور مسٹر الطاف گوہر کی نظر بندی کے فیصلے کو چیلنج (Challenged) کرتے ہوئے جو لاہور اور کراچی کی عدالت ہائے عالیہ (High Courts) نے دیئے کے نتیجے میں دائر کی گئی۔ سپریم کورٹ نے یہ سوال طے کرنا تھا کہ آیا عدالت ہائے عالیہ مارشل لا ریگولیشن نمبر 78 مجریہ 1971ء کے تحت دیئے گئے نظر بندی کے احکامات کے جواز (Validity) کے متعلق تفتیش و تحقیق کرنے کے متعلق آئین پاکستان 1962ء کے آرٹیکل نمبر 98 کے تحت جو اجرائے پروانہ (Issuance of Writs) سے متعلق ہے' سماعت کا اختیار رکھتی ہیں۔ اس اختیارِ سماعت کو عدالتوں کے اختیارِ سماعت (رفع شکوک) کے حکم نمبر 3 مجریہ 1969ء کو مدِنظر رکھتے ہو' جانچنا ہو گا۔ کیونکہ اس حکم (عدالتوں کے اختیارِ سماعت (رفع شکوک) کے حکم نمبر 3' مجریہ 1969ء) کے تحت جواز کو زیر بحث لانے سے روک دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اتفاقیہ طور پر طے کرنے کے لئے جو سوال پیدا ہوا' وہ یہ تھا کہ آیا مملکت بنام دوسو (State V.Dosso, PLD 1958 Sc (PAK)) نامی مقدمے میں جو اصول متعین کیا گیا ہے' وہ قانون کی صحیح تعبیر تھی۔

فیصلہ :

دوسو کے مقدمے (Dosso's Case) میں چیف جسٹس کی کا اظہار کہ قانون بین الاقوام کے اصولوں پر اگر ریاست کا علاقہ اور عوام قرار واقعی (Substantially) وہی رہیں تو ریاست کے نفس (Corpus) یا بین الاقوامی حیثیت میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور انقلابی حکومت اور نئی معرضِ وجود میں آنے والی مملکت' قانون بین الاقوام کے مطابق جائز حکومت اور مملکت کا جائز دستور (آئین) کے طور پر ہیں۔ 1962ء کے آئین کے تحت صدر محمد ایوب خان کو انتقالِ اقتدار کسی اور کو منتقل کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ آئین کے آرٹیکل 12 کے تحت وہ (صدر محمد ایوب خاں) اپنے عہدے سے تحریری طور پر استعفیٰ جس پر اس کے دستخط ثبت ہوں' قومی اسمبلی کے سپیکر کے نام مخاطب کرتے ہوئے دے سکتا تھا اور آرٹیکل 16 کے تحت جونہی صدر کا عہدہ خالی ہوتا' قومی اسمبلی کے اسپیکر کو بحیثیت قائم مقام صدر کے عہدہ سنبھالنا ہوتا تھا اور اس خالی نشست (یعنی صدرِ مملکت کی نشست) کو پُر کرنے کے لئے 90 دن کے اندر اندر انتخاب کرانا ہوتا تھا۔

آرٹیکل 30 کے تحت صدرِ مملکت' جب ملک کی سالمیّت (Security) اور معاشی زندگی (Economic Life) اندرونی گڑبڑ سے خطرے میں ہو جسے صوبائی حکومت کنٹرول نہ کر سکے' یعنی کہ یہ گڑبڑ صوبائی حکومت کے قابو سے باہر ہو جائے' تو ہنگامی حالات کا اعلان کر سکتا ہے اور ایسے حالات پر قابو پانے کے لئے وہ (صدر مملکت) یہ سمجھے کہ یہ حالات شہری انتظامیہ (Civil Administration

ـــــــ کے بس کا روگ نہیں رہے اور اس کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں تو مارشل لاء بھی لگا سکتا ہے۔ لیکن اس امر کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ فوجی کمانڈر کس اختیار کے تحت مارشل لاًلگانے کا اعلان کر سکتا ہے۔

جہاں تک مارشل لاًکا تعلق ہے' اسے اندرونی (مملکت کے اندر) نظم و نسق کے نفاذ کی مشینری کے طور پر اور دشمن کے مقبوضہ اور مفتوحہ علاقے کے فوجی حکومت کے ناظم کے طور پر ایک دوسرے سے ممیز (Distinguish) کیا جا سکتا ہے۔

پہلی قسم کا مارشل لاًشہری حکومت کے جاری کردہ اعلان کے تحت عموماً لگایا جاتا ہے' صرف اس وقت یہ مارشل لاًشہری حکومت (Civil Government) کو اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہے جبکہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن حالات میں شہری عدالتوں اور سرکاری حکام کو اپنے فرائض سرانجام دینے ناممکن ہو جائیں۔ مارشل لاًکا لگا دینے کا جہاں تک تعلق ہے' اس سے یہ مراد نہ لی جائے کہ مارشل لاًکے اختیارات کے تحت شہری حکومت کا اختیار سلب ہو جاتا ہے یا شہری کی بندش ضروری ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اس مقولے کا یعنی کہ "جنگی جھڑپوں میں قانون خاموشی اختیار کرتا ہے" (Law is Silent Between Clashes of Arms) تعلق ہے کہ صرف شہری آبادی میں نافذ العمل ہوتا ہے۔ جہاں ایسی صورتِ حالات پیدا ہو جائے جس میں عدالتوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی ناممکن ہو جائے' مارشل لاًکے اعلان سے عام شہری عدالتیں اور شہری حکام کے فرائض کی انجام دہی منسوخ نہیں ہو جاتی اور ملک کا بنیادی قانون کو منسوخ کرنے کا اختیار دفاعی افواج کے کمانڈر کو یقیناً حاصل نہیں ہو جاتا۔

لہٰذا مملکت بنام دوسو (State V. Dosso) نامی مقدمے میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ "جہاں آئین اور اس کے تحت قومی نظامِ قانون (National legal order) ایک فوری سیاسی تبدیلی کے باعث موضوع زیرِ بحث آئے جو آئین کے بارے میں غور و فکر کا نتیجہ نہ ہو' تب ایسی تبدیلی انقلاب (Revolution) ہے جس کا نتیجہ آئین کی تباہی کی صورت میں اثر انداز قانونی طور پر ہوتا ہے' لیکن قومی نظامِ قانون کے جواز کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے' قطع نظر قانون کے یا ان کے جو یہ تبدیلی معرضِ وجود میں لائے' یہ ایک اچھے قانون کے طور پر نہیں سمجھا جاتا۔ دفاعی افواج کے کمانڈر آئین کے تحفظ کا حلف اٹھاتا ہے وہ اس آئین کو تباہ نہیں کر سکتا۔ یہ فیصلہ دیا گیا کہ فوجی راج جو جنرل محمد یحییٰ خان نے مارشل لاء کے اعلان سے ٹھونسا گیا تھا' سراسر خلافِ قانون تھا اور صدارتی حکم نمبر 3 مجریہ 1969ء ایک ضمنی آئینی قانون سازی کے مترادف تھا جو اعلیٰ عدالتوں کو 1962ء کے آئین کے تحت عطا کردہ اختیاراتِ سماعت کو کم نہیں کر سکتا تھا۔ مارشل لاء ریگولیشن نمبر 78 مجریہ 1971ء نہ صرف ناجائز تھا بلکہ ضرورت کی بنیاد پر بھی اسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ طاقت کے غاصب کے تمام اعمال غیر قانونی ہیں' لیکن ایسے اقدامات جو عوام کی بہبود میں اضافہ یا ترقی کا باعث ہوں یا مملکت کے عمومی کاروبار چلانے کے لئے درکار ہوں یا ماضی بعید میں کی گئی کارروائیاں تاہم معاف کر دی جاتی ہیں۔

نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ

نظریۂ ضرورت کے تحت مارشل لاء کا نفاذ جائز ہے

پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت سپریم کورٹ نے 10 ر نومبر 1977ء کو بیگم نصرت بھٹو کی اس درخواست پر اپنا فیصلہ سنایا جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے دیگر رہنماؤں کی نظربندی کو چیلنج کرتے ہوئے استدعا کی گئی تھی کہ 5 ر جولائی 1977ء کو مارشل لاء کا نفاذ غیر قانونی تھا۔ عدالت نے بیگم بھٹو کے اس مؤقف کو رَد کر دیا اور نظریۂ ضرورت کے تحت فوجی حکومت کو جائز قرار دیا۔ یہ فیصلہ ڈوسو کیس اور اسماء جیلانی کیس کی طرح تاریخی اہمیّت کا حامل ہے۔ غیر آئینی حکومت کو جائز قرار دینے کے باوجود اس فیصلہ میں ڈوسو کیس کے بنیادی تصورات کو رَد کیا گیا ہے اور اسمائجیلانی کیس کے بنیادی تصورات سے انحراف نہیں کیا گیا۔ وفاق کے وکیل مسٹراے کے بروہی کی اس دلیل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ موجودہ تبدیلی ایک کامیاب انقلاب ہے اور محض اسی بناپر کیلسن کے نظریہ کے تحت اسے جائز قرار دیا جانا چاہئے، چیف جسٹس انوار الحق نے کہا کہ ان کی یہ دلیل "موجودہ سیاسی تبدیلی سے اس کا تمام تر اخلاقی مواد چھین لینے کی کوشش ہے اور جو اس کے قانونی کردار کو غیر یقینی اور تصفیہ طلب بنادیتی ہے۔"

ذیل میں ہم چیف جسٹس انوار الحق کے الفاظ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کا خلاصہ اور ایک اختتامی پیراگراف شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو یہ اہم فیصلہ سمجھنے میں مدد مل سکے۔

1 : ایسی اچانک سیاسی تبدیلی کی قانونی حیثیت اور جواز کا تعیّن اس طرح جو سامنے آئی ہو جس کا پہلے موجود آئین یا قانونی نظام میں کوئی تصوّر موجود نہ تھا صرف اس بناپر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مؤثر اور کامیاب ہے جیسا کہ کیلسن کے خالص نظریۂ قانون میں کہا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس نظریہ کو عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر بڑی سخت تنقید اس بناپر بھی کی جاسکتی ہے کہ اگر مؤثر ہونے ہی کو کسی سیاسی تبدیلی کی شرط تسلیم کر لیا جائے تو اخلاق اور انصاف کے وہ عمرانیاتی پہلو توجہ کے دائرے میں نہیں رہتے جو نئے قانونی نظام کے مؤثر اور قابلِ قبول ہونے کا اصل ذریعہ ہیں، اس لئے ایسی تبدیلی کے قانونی نتائج کا تعیّن اس پورے ماحول پر اور ان لوگوں کے مقاصد پر غور کر کے کیا جانا چاہئے جو اس تبدیلی کے ذمہ دار ہیں اور یہ کہ پرانے قانونی نظام کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے اور کس حد تک دبا دیا گیا ہے۔

2 : انقلابی جواز کا نظریہ کسی بھی صورت میں ایسی حالت سے متعلق اور منطبق نہیں کیا جاسکتا جہاں قانونی تسلسل صرف عارضی طور پر اور ایک محدود مقصد کے لئے ٹوٹا ہے ایسی کیفیت کو انقلاب کی بجائے آئینی انحراف کہنا ہی زیادہ صحیح ہو گا۔

3 : جب اس روشنی میں 5 ر جولائی 1977ء کے فرمانِ مارشل لاء پر غور کیا جاتا ہے تو وہ ایک آئین سے ہٹ کر (Extra-Constitutional) اقدام نظر آتا ہے، جو 7 ر مارچ 1977ء کو

ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات میں مبینہ زبردست دھاندلیوں کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی بے مثال احتجاجی تحریک کے نتیجہ میں مسٹر زیڈ اے. بھٹو کی حکومت کے آئینی اور اخلاقی اقتدار کے مکمل خاتمہ کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس کا کوئی حل آئین میں فراہم نہ تھا' اس لئے ملک کو مزید افراتفری اور خونریزی سے بچانے' اس کی سالمیت اور خودمختاری کا تحفظ کرنے اور باہم ٹکرانے والے ان عناصر کو الگ کرنے کے لئے جو ملک کو تباہی کے کنارے پر لا چکے تھے' مسلح افواج کو مداخلت کرنی پڑی۔

4 : مارشل لاء کا نفاذ نظریۂ ضرورت کی بنا پر جائز ثابت ہو جاتا ہے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام ایسے اقدامات کریں اور ایسے قوانین بنائیں جن کو عدالتی حکام نے مسلسل قانونِ ضرورت کی حدود کے اندر شامل تسلیم کیا ہے۔

5 : ان واقعات پر غور کرنے سے جو مارشل لاء کے نفاذ پر منتج ہوئے' اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ارادوں کے اعلان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 1973ء کا آئین آج اب بھی سب سے اعلیٰ قانون ہے مگر اس پر مشروط کہ ریاستی ضرورت کی بنا پر اس کے بعض حصے معطّل کر دیئے گئے ہیں اور صدر پاکستان نیز اعلیٰ عدالتیں اسی آئین کے تحت اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ پرانے قانونی نظام کے مکمل دبا دینے یا تباہ کر دیئے جانے کی صورت نہیں ہے بلکہ ایک عارضی مدت اور مخصوص اور محدود مقصد کے لئے آئینی انحراف ہے۔ یعنی ملک میں امن و امان کا قیام اور حالت کا معمول پر آ جانا اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے 1973ء کے آئین کے تحت آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرا کے جمہوری اداروں کو بحال کرا دینا۔

6 : چنانچہ اعلیٰ عدالتوں کو بدستور یہ اختیار حاصل ہے کہ مارشل لاء حکام کے کسی اقدام یا عمل کے جائز ہونے پر قانونی نظر ثانی کریں اگر ان کو اس فیصلہ میں وضاحت کردہ قانونِ ضرورت کے اصولوں کی روشنی میں چیلنج کیا گیا ہو۔ آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت ان کے اختیارات بھی پوری طرح برقرار ہیں اور انہیں کسی مارشل لاء ضابطہ یا حکم میں موجود کسی مغائربات کا خیال کئے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے اور

7 : یہ کہ قوانین (نفاذ جاری رہنے کے) حکم 1977ء آرٹیکل کی دفعہ (2) میں موجود بنیادی حقوق کے نفاذ کا معطّل کر دیا جانا اس لئے جائز ہے کہ ملک میں پائے جانے والے حالات نمایاں طور پر اسی نوعیت کے ہیں' جس کا تصور آئین کے آرٹیکل 233 کی دفعہ (1) میں بطور ہنگامی حالت پیش کیا گیا ہے اور یہ کہ بنیادی حقوق کے نفاذ کو ایسے حکم کے ذریعے جائز طور پر معطل کیا جا سکتا ہے جو آئین کے آرٹیکل 233 کی دفعہ (2) کے تحت جاری کیا جا سکتا تھا۔

نتیجتاً موجودہ مرافعہ ناکام ہے اور اسے خارج کیا جاتا ہے۔ پھر بھی نظر بند اگر مناسب سمجھیں تو آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت متعلقہ ہائی کورٹ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

اگرچہ عدالت ایسی ہدایات جاری کرنا مناسب نہیں سمجھتی جیسا کہ مسٹر یحیٰی بختیار نے مشورہ دیا ہے، "کہ الیکشن کے لئے کوئی یقینی ٹائم ٹیبل جاری کیا جائے" تاہم عدالت یہ بات بالکل واضح انداز میں بیان کر دینا چاہتی ہے کہ اس نے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے زائد از دستور اقدام کو صرف اس لئے جائز قرار نہیں دیا ہے کہ وہ شدید قومی انتشار اور دستوری بحران سے ملک کو بچانے کے لئے برسراقتدار آئے تھے بلکہ ان کا یہ عہد بھی تھا کہ دستور سے دُوری کا یہ دَور جتنا ممکن ہو مختصر کیا جائے اور یہ کہ اس عرصے میں ان کی تمام قوت اس بات پر صرف ہو گی کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعہ آئین کے مطابق جمہوری حکومت بحال ہو جائے۔ چنانچہ یہ عدالت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اس عہد کو پورا کریں گے جس کی توثیق پاکستانی عوام نے کی ہے۔ جنہوں نے کثیر تعداد میں اور رضامندی کے ساتھ ان کی انتظامیہ کو عبوری حکومت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کا حکم نامہ

فل کورٹ کے جج صاحبان

مسٹر جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے

مسٹر جسٹس محمد نواز عباسی

مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر

مسٹر جسٹس میاں شاکر اللہ جان

مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر

مسٹر جسٹس تصدق حسین جیلانی

مسٹر جسٹس سید سعید اشہد

مسٹر جسٹس ناصر الملک

مسٹر جسٹس راجہ فیاض احمد

مسٹر جسٹس چودھری اعجاز احمد

مسٹر جسٹس جمشید علی

مسٹر جسٹس حامد علی مرزا

مسٹر جسٹس غلام ربانی

اکثریتی فیصلے سے اختلاف

جن 3 ججوں نے 10 ججوں کے اکثریتی فیصلے سے اختلاف کیا ان میں مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر، مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر اور مسٹر جسٹس سید سعید احمد اشہد شامل تھے۔

ججوں کے سوانحی خاکے

صدارتی ریفرنس کے معاملے پر چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری سمیت دیگر درخواست گزاروں کی آئینی درخواستوں کی سماعت کے لیے تشکیل دی جانے والی فل کورٹ میں چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے جج صاحبان کی نمائندگی تھی۔فل کورٹ میں شامل 8 جج صاحبان کا تعلق پنجاب' سندھ سے 3' سرحد سے 2 اور بلوچستان سے ایک جج شامل تھے۔فل کورٹ کے سربراہ مسٹر جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے 1968 میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کے سپیشل سرٹیفکیٹ آف آنر کے ساتھ پاس ہوئے۔

1969 میں ماتحت عدلیہ کے وکیل' 1971 میں ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اور 1976 میں ایڈووکیٹ سپریم کورٹ بنے۔ 1976 میں پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل' 1984 میں ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل اور 1987 میں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ اکتوبر 1988 میں لاہور ہائی کورٹ اور جنوری 2002 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس محمد نواز عباسی نے بی اے ایل ایل بی' ڈی ایل ایل شریعہ کورس میں کیا۔ 1992ء میں لاہور ہائی کورٹ اور 2002 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر 1996 میں لاہور ہائی کورٹ اور 2002 میں سپریم کورٹ کے جج بنے۔ مسٹر میاں شاکر اللہ جان 1993 میں پشاور ہائی کورٹ اور 2004 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر 1994 میں لاہور ہائی کورٹ اور 2004 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس تصدق حسین جیلانی 1994 میں لاہور ہائی کورٹ اور 2004 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس سید سعید اشہد 1997 میں سندھ ہائی کورٹ کے جج 2000 میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جب کہ 2005 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس ناصر الملک بیرسٹر ایٹ لاء ہیں' 1994 میں پشاور ہائی کورٹ کے جج اور 2004 میں چیف جسٹس جب کہ 2005 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس راجہ فیاض احمد 1997ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے جج 2000ء میں بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور پھر 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس چوہدری اعجاز احمد 1997ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج اور 2005ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس سید جمشید علی 1998 میں لاہور ہائی کورٹ کے جج جب کہ 2005 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسٹر جسٹس حامد علی مرزا 1995 میں سندھ ہائی کورٹ کے جج جب کہ 2000ء میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ سپریم کورٹ میں بطور ایڈہاک جج دو مرتبہ تقرری ہوئی۔ مسٹر جسٹس غلام ربانی سندھ ہائی کورٹ کے جج بنے پھر سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کے عہدے پر تقرری ہوئی۔

سپریم کورٹ، فل کورٹ بنچ کے مختصر حکم کا متن

فیصلے کی وجوہات کو بعد میں بیان کیا جائے گا جبکہ آئینی درخواست سے سامنے آنے والے ایشوز کا مندرجہ ذیل فیصلہ کیا جاتا ہے۔

1۔ آئین کے آرٹیکل (184) (3) کے تحت دائر آئینی درخواست قابل سماعت، اس آئینی درخواست کو متفقہ طور پر قابل سماعت قرار دیا جاتا ہے۔

2۔ آئین کے آرٹیکل (209)(5) کے تحت صدر کی جانب سے دائر ریفرنس کے بارے میں،
10-3 جج صاحبان کی اکثریت سے (مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر، مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر، مسٹر جسٹس سید سعید اشہد 9 مارچ 2007ء کو متنازعہ ڈائریکشن (ریفرنس) پر فاضل جج صاحبان اپنی مرضی سے علیحدہ وجوہات بیان کریں گے) ریفرنس کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

3۔ ججوں کو لازمی رخصت کے بارے میں صدارتی آرڈیننس 27 آف 1970ء کی آئینی حیثیت اور چیف جسٹس کی 15 مارچ کو اس لازمی رخصت کے آرڈر کے تحت لازمی رخصت کے جائز ہونے کے بارے میں،
صدارتی آرڈر نمبر 27 آف 1970ء کو متفقہ طور پر آئین کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں صدر کے 15 مارچ 2007ء کے آرڈر کو بھی متفقہ طور پر قانونی اختیار کے بغیر قرار دیا جاتا ہے۔

4۔ چیف جسٹس آف پاکستان کو 9 مارچ کے صدارتی آرڈر اور اسی روز سپریم جوڈیشل کونسل کے آرڈر کے تحت بطور چیف جسٹس اور بطور جج کام سے روکنے کے بارے میں جاری احکامات کے جائز ہونے کے بارے میں، ان دونوں آرڈرز کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم متنازعہ ڈائریکشن (ریفرنس) کے جائز ہونے کے بارے اقلیتی رائے کے مطابق اس ریفرنس کو صدر مملکت نے مجاز اتھارٹی سے دائر کیا اور آرٹیکل (184)(3) کو آرٹیکل 187 کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے فاضل عدالت کام سے روکنے کے احکامات جاری کر سکتی ہے۔

5۔ چیف جسٹس کو لازمی رخصت اور کام سے روکنے کے بارے میں جاری دو آرڈر کی منسوخی کے تناظر میں قائم مقام چیف جسٹس صاحبان کی تقرری کے جائز ہونے کے بارے میں، قائم مقام چیف جسٹس صاحبان کو 9 مارچ 2007ء اور 22 مارچ 2007ء کے نوٹیفکیشن کے تحت متنازع تقرری کو بھی بغیر کسی قانونی اختیار کے قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے غیر مؤثر ہونے کا سپریم کورٹ کے معمول کے کام اور اس کے متنازع پریڈ کے دورن قائم مقام چیف جسٹس صاحبان کی جانب سے سرانجام دی

جانے والی قانونی اور آئینی ذمہ داریوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور اس ڈیکلریشن کو ڈی فیکٹو ڈاکٹرائن کے اپلائی کرنے سے قائم کیا جاتا ہے۔

6۔ چیف جسٹس آف پاکستان کا احتساب

ہمارے روبرو یہ کبھی بھی کسی فرد کا کیس نہیں تھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کا احتساب نہیں ہوسکتا اس ایشو کو فیصلہ کی ضرورت نہیں۔ ہمارے روبرو اٹھائے جانے والے دیگر تمام آئینی اور قانونی ایشوز کا مناسب وقت میں تفصیلی فیصلے کے ذریعے جواب دیا جائے گا۔

عدالت کا آرڈر

10-3 (مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر، مسٹر جسٹس ایم جاوید بٹر، مسٹر جسٹس سید سعید اشہد) کی اکثریت سے چیف جسٹس مسٹر جسٹس افتخار محمد چوہدری کی جانب سے دائر آئینی درخواست نمبر 21 آف 2007ء کو منظور کیا جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر قبل ازیں بیان کردہ صدر کی جانب سے 9 مارچ 2007ء کو دائر ڈائریکشن (ریفرنس) کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ مزید اس کے نتیجہ کے طور پر چیف جسٹس کو ان کے منصب پر برقرار تصور کیا جائے گا اور ان کو ہمیشہ سے ان کے منصب پر برقرار سمجھا جائے گا جبکہ دوسری دائر پٹیشنوں کو آئین کے مطابق نمٹانے کے لئے مناسب وقت میں مناسب فاضل بنچوں کے روبرو لگایا جائے گا۔

ضمیمہ

عدلیہ کے عروج کا سفر--کب کیا ہوا؟

پاکستان کی عدلیہ نے مارچ 2007ء سے جولائی 2007ء کے دوران تاریخ کو بدل کے رکھ دیا۔ وکلاء نے ان پانچ ماہ کے دوران ہر روز اپنی تحریک کو نیا خون اور پسینہ دیا۔ عدلیہ نے بطور ادارہ نڈر اور بے خوف ہو کر ہر مرحلے پر اپنی آزادی اور عروج کے سفر میں اپنا حصہ ڈالا۔ جسٹس منیر سے شروع ہونے والے عدلیہ کے زوال کے سفر میں پنجاب کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ کیونکہ مولوی تمیز الدین کیس ہو، نصرت بھٹو کیس ہو یا بھٹو کی پھانسی کا مقدمہ ہر حوالے سے پنجابی جج تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں مگر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کے حوالے سے پنجابی ججوں نے جو اکثریت میں تھے، کسی قسم کے دباؤ کو قبول کرنے سے انکار کر کے نئی روایت قائم کی مسٹر جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے، مسٹر جسٹس نواز عباسی، مسٹر جسٹس تصدق حسین جیلانی مسٹر جسٹس چودھری اعجاز احمد اور مسٹر جسٹس سید جمشید علی کا تعلق لاہور ہائی کورٹ سے تھا ان سب نے فل کورٹ میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی اور ریفرنس کو کالعدم قرار دینے کے حق میں فیصلہ دیا۔ لاہور ہائیکورٹ سے تعلق رکھنے والے مسٹر جسٹس جاوید بٹر اور مسٹر جسٹس فقیر محمد کھوکھر نے اگرچہ چیف جسٹس کی بحالی سے اتفاق کیا تاہم ان کا خیال تھا کہ ریفرنس سپریم جوڈیشل کونسل میں بھیج دیا جائے، عدلیہ کی آزادی کی اس تحریک میں ہر روز کیا ہوتا رہا اس کی ایک جھلک ذیل میں درج ہے۔

9 مارچ

صدر مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف ریفرنس دائر کرتے ہوئے انہیں گھر میں بند کر دیا اور ان کے گھر جانے والے تمام راستوں پر پولیس تعینات کر دی گئی۔

9 مارچ ہی کو سپریم جوڈیشل کونسل کا پہلا اجلاس سپریم کورٹ میں ہوا، جس کی سربراہی اس وقت کے قائم مقام چیف جسٹس جاوید اقبال نے کی۔ کونسل نے بند کمرے کی سماعت کے دوران چیف جسٹس کو کام کرنے سے روک دیا اور ریفرنس کی اگلی سماعت تیرہ مارچ کو کرنے کا فیصلہ کیا۔ موسٹ سینئر جج مسٹر جسٹس بھگوان داس بھارت میں تھے ان کی عدم موجودگی میں مسٹر جسٹس جاوید اقبال قائمقام چیف جسٹس بن گئے۔

10 مارچ

چیف جسٹس کے زیرِ استعمال گاڑیاں لفٹر کے ذریعے اٹھوالی گئیں۔ ملک بھر میں وکلاء نے چیف جسٹس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے خلاف تین روز تک ہڑتال کی اور پورے ملک میں احتجاج کرتے رہے۔

13 مارچ

''غیر فعال'' چیف جسٹس نے سپریم کورٹ کے سامنے پیشی پر پولیس کی طرف سے مہیا کی جانے والی گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ پیدل سپریم کورٹ جائیں گے۔ انتظامیہ اور پولیس کے اہل کاروں نے چیف جسٹس کو زبردستی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی، جس دوران چیف جسٹس کے ساتھ بدسلوکی بھی کی گئی۔

جسٹس افتخار سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے پیش ہوئے اور کونسل کے پانچ میں سے تین ارکان پر اعتراض کیا۔ انہوں نے کہا کہ قائم مقام چیف جسٹس جاوید اقبال سپریم جوڈیشل کی سربراہی کے اہل نہیں ہیں، جب کہ جسٹس عبدالحمید ڈوگر (جج سپریم کورٹ) اور جسٹس افتخار حسین چوہدری (چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ) کے خلاف شکایات سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے رجسٹر ہو چکی ہیں، لہٰذا انہیں ان سے انصاف ملنے کی توقع نہیں ہے۔ مقدمے کی سماعت سولہ مارچ تک ملتوی کر دی گئی۔

16 مارچ

چیف جسٹس نے سپریم جوڈیشل کونسل کو بتایا کہ ان کو اور ان کے اہل خانہ کو گھر میں مقید کر دیا گیا ہے۔ کونسل نے حکم جاری کیا کہ جسٹس افتخار محمد چوہدری اور ان کے اہل خانہ کی نقل و حرکت پر تمام پابندیاں ختم کی جائیں اور وہ جس شخص سے ملنا چاہیں، مل سکتے ہیں۔ سپریم جوڈیشل کونسل نے ذرائع ابلاغ کو بھی خبردار کیا کہ وہ جسٹس افتخار کے معاملے میں ذمّے داری کا مظاہرہ کرے۔

17 مارچ

صدر جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو جبری رخصت پر بھیج دیا۔ یہ فیصلہ 1971ء میں بنائے جانے والے ایک قانون کے تحت کیا۔

21 مارچ

حکومت نے ملک بھر میں وکلاء اور دوسرے طبقوں کی طرف سے شدید احتجاج اور سیاسی جماعتوں کی طرف سے سپریم کورٹ کے سامنے احتجاج کرنے کے اعلان کے بعد سپریم جوڈیشل کونسل کا اجلاس

ایک ''انتظامی'' حکم کے ذریعے دس روز تک ملتوی کر دیا۔

24 مارچ

سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج جسٹس رانا بھگوان داس ''چھٹیاں'' گزارنے کے بعد وطن واپس آ گئے اور قائم مقام چیف جسٹس کا حلف لے لیا۔

28 مارچ

جسٹس افتخار نے اپنی نقل و حرکت پر پابندیوں کو اٹھائے جانے کے بعد سب سے پہلے لاہور ہائی کورٹ راول پنڈی بینچ کی بار سے خطاب کیا۔ جسٹس افتخار نے کہا کہ ظلم پر مبنی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔

30 مارچ

جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف الزامات کی سماعت کے لیے بنائی جانے والی سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا اور تین مختلف وکلاء نے اپنے طور پر دائر کی جانے والی پٹیشنوں میں مؤقف اختیار کیا کہ سپریم جوڈیشل کونسل کو چیف جسٹس کے خلاف کارروائی کا حق حاصل نہیں ہے۔

3 اپریل

جسٹس رانا بھگوان داس کے قائم مقام چیف جسٹس بننے کے بعد سپریم جوڈیشل کونسل کی از سر نو تشکیل کی گئی، جس کے بعد کونسل کا اجلاس ہوا۔ اجلاس کی سربراہی جسٹس رانا بھگوان داس نے کی۔ اس سماعت میں جسٹس افتخار کے خلاف کارروائی بند کمرے یا کھلی عدالت میں کروانے سے متعلق بحث ہوئی اور کونسل نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپنا فیصلہ محفوظ کر لیا۔

13 اپریل

سپریم جوڈیشل کونسل نے کہا کہ کونسل کی کارروائی کو بند کمرے میں یا کھلی عدالت میں کرنے سمیت دوسرے اعتراضات پر وکلاء کے دلائل سننے کے بعد تمام ابتدائی نکات کا فیصلہ ایک ہی دفعہ کیا جائے گا۔

17 اپریل

اسلام آباد میں سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے معطل چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف درخواست پر سماعت شروع ہوئی۔ گزشتہ سماعت کے دوران سپریم جوڈیشل کونسل میں دو سپریم کورٹ کے ججوں اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی موجودگی پر اعتراض کیا گیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد

چوہدری کا پینل چھ وکلاء پر مشتمل ہے، جن میں اعتزاز احسن، حامد خان، جسٹس ریٹائرڈ طارق محمود، منیر اے ملک، علی احمد کرد اور قاضی محمد انور شامل ہیں۔

سپریم جوڈیشل کونسل قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس، جسٹس جاوید اقبال، جسٹس عبدالحمید ڈوگر، جسٹس چوہدری افتخار حسین (چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ)، جسٹس صبیح الدین (چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ) پر مشتمل تھی۔

تیرہ اور اکیس مارچ کو کونسل کی سماعت کے دوران سربراہی جسٹس جاوید اقبال نے کی، جب کہ تین اور تیرہ اپریل کو کونسل کی سماعت کے دوران سربراہی قائم مقام چیف جسٹس بھگوان داس نے کی۔

18 اپریل

چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے سپریم کورٹ میں اپنی معطلی اور سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کو چیلنج کر دیا اور عدالت سے استدعا کی ہے کہ ان کی پٹیشن کے فیصلے تک سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی روک دی جائے۔

چوہدری اعتزاز احسن نے دو سو صفحوں پر مشتمل آئینی درخواست بدھ کے روز سپریم کورٹ میں جمع کرائی، جس میں ایک سو بتیس آئینی اعتراضات اٹھائے گئے۔

اس آئینی درخواست میں صدرِ پاکستان اور دیگر کو فریق بنایا گیا ہے۔ پٹیشن میں معطل چیف جسٹس نے خود کو غیر فعال بنائے جانے، جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے ساتھ ساتھ جسٹس جاوید اقبال اور جسٹس رانا بھگوان داس کو قائم مقام چیف جسٹس بنانے کے بارے میں جاری کردہ نوٹیفکیشنز کو بھی چیلنج کیا۔

پاکستان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا موقع تھا کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے خود کو انصاف دلانے کے لیے اپنی عدالت میں درخواست دی ہے۔

غیر فعال چیف جسٹس کے وکیل اعتزاز احسن کے مطابق یہ درخواست آئین کے آرٹیکل 184(3) کے تحت دائر کی گئی، جس کی تشریح آرٹیکل 209 کی مدد سے کی گئی کہ موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف صدارتی ریفرنس نہیں بھیجا جا سکتا۔

درخواست میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پاکستان کا آئین چیف جسٹس کی معطلی یا ان کو غیر فعال کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ان کے خلاف کوئی بھی قدم صرف سپریم جوڈیشل کونسل کے حتمی فیصلے کے بعد لیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل کی چیف جسٹس کے بنا تشکیل ہی نہیں ہو سکتی۔

اس سے پہلے بھی سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے خلاف پانچ آئینی درخواستیں سپریم کورٹ میں

زیرِ سماعت تھیں، تاہم غیر فعال چیف جسٹس کی طرف سے ان کی معطلی اور سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے خلاف دائر کی جانے والی یہ پہلی پٹیشن تھی۔

18 اپریل کو اسلام آباد میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے اندر ایک اور پیشی کے موقع پر احتجاج سامنے آیا اور سیاسی میلہ لگا۔

سپریم کورٹ میں پچھلی سماعت کے مقابلے میں اس مرتبہ سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کم رہی، تاہم وکلا کے جوش و جذبے میں کوئی کمی دکھائی نہیں دی۔ اس بار سیاسی کارکن اور وکلاء پانی کے کولر، بوتلیں اور کھانے کی اشیاء اپنے ساتھ لائے تھے۔ مقامی اور ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے وکلاء نعرے لگاتے رہے اور نت نئے انداز سے احتجاج سامنے آئے۔

سپریم جوڈیشل کونسل میں صدارتی ریفرنس کی سماعت کے بعد جسٹس افتخار کے وکلاء نے بتایا کہ جسٹس افتخار محمد چوہدری نے کونسل کی تشکیل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے، اس لیے اگر مناسب سمجھیں تو کارروائی کو آگے نہ چلائیں۔ سپریم جوڈیشل کونسل نے سماعت چوبیس اپریل تک ملتوی کر دی۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات کی سماعت ابھی شروع نہیں ہوئی ہے۔

23 اپریل

دوسری طرف سپریم کورٹ میں غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی طرف سے دائر کردہ پٹیشن پر سماعت جسٹس سردار محمد رضا خان کے بینچ میں بیٹھنے سے انکار کے بعد ملتوی ہوگئی۔

جسٹس سردار محمد رضا خان کا کہنا ہے کہ چیف جسٹس کو نو مارچ کو ''غیر فعال'' کیے جانے والے صدارتی ریفرنس پر ان کے بھی دستخط ہیں، اس لیے وہ اپنے ہی فیصلے کے خلاف درخواست نہیں سُن سکتے اور انہوں نے اس معاملے کو قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس کو بھیج دیا ہے کہ وہ کوئی دوسرا بینچ تشکیل دیں۔

سپریم کورٹ میں جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست پر آئندہ سماعت کی تاریخ کا اعلان قائم مقام چیف جسٹس بھگوان داس کی طرف سے سپریم کورٹ کا بینچ دوبارہ تشکیل دیے جانے کے بعد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

سپریم جوڈیشل کونسل میں سماعت کے دوران چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے وکلاء نے سپریم جوڈیشل کونسل سے استدعا کی کہ سپریم کورٹ میں بڑے یا وسیع تر بینچ کی تشکیل تک سماعت ملتوی

کریں۔

تاہم کونسل نے افتخار محمد چوہدری کی استدعا کو رد کرتے ہوئے سماعت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور وکلاء کو ہدایت کی کہ وہ اپنے دلائل جاری رکھیں۔

صدارتی ریفرنس اور جسٹس افتخار کی درخواست پر سماعت کے موقع پر سپریم کورٹ کی عمارت کے باہر حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے کارکن اور وکلاء اس مرتبہ بھی احتجاج کے لیے ایک بہت بڑی تعداد میں جمع تھے۔

24اپریل

جسٹس افتخار محمد چوہدری نے کہا کہ جب انہوں نے صدر کے کہنے پر استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو انہیں صدارتی کیمپ آفس میں حراست میں لے لیا گیا۔

یہ الزام چیف جسٹس نے سپریم کورٹ میں دائر کی گئی ایک آئینی درخواست میں لگایا۔ اس درخواست میں صدر، وفاقِ پاکستان، سپریم جوڈیشل کونسل، سپریم کورٹ، سندھ اور لاہور ہائی کورٹس کے رجسٹرار کو مدعا علیہان بنایا گیا۔ چالیس صفحات پر مشتمل اس درخواست میں چیف جسٹس نے انہیں جبری چھٹی پر بھجوائے جانے اور سپریم جوڈیشل کونسل کی ترکیب اور اہلیت سے متعلق اعتراضات اٹھائے۔ آئینی ماہرین کے مطابق اس درخواست میں چیف جسٹس نے ججوں پر انتہائی سنگین الزامات عائد کیے ہیں، جس سے عدلیہ کے تقسیم ہونے کے خدشات پیدا ہوئے۔

درخواست میں سپریم جوڈیشل کونسل میں شامل بعض ججوں پر تعصب اور ذاتی مفادات وابستہ ہونے کے الزامات عائد کیے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ ملک کی عدالتیں اسے بنیادی حق قرار دے چکی ہیں کہ عدالتی عمل یا مقدمے کی سماعت غیر جانبدار فورم کے ذریعے ہو، جب کہ آئین کا آرٹیکل 9 بھی اس بات کی ضمانت دیتا ہے۔

درخواست گزار کا مؤقف تھا کہ چیف جسٹس کی موجودگی میں قائم مقام چیف جسٹس کی تعیناتی غیر قانونی اور بد نیتی پر مبنی ہے۔ اگر چیف جسٹس کو روکا گیا تو پوری عدالت کی کارروائی رُک جائے گی۔

چیف جسٹس کے بغیر سپریم کورٹ وجود نہیں رکھتی۔ اس طرح کی عدالت کے احکامات سے آئینی بحران جنم لے سکتے ہیں اور اس کے بینچ غیر قانونی ہوں گے۔ ان کے بہ قول ''یہاں نظریۂ ضرورت بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔''

درخواست گزار نے کونسل کے بعض ارکان کے بارے میں تفصیل سے اعتراضات اور تحفظات کا ذکر کیا

ہے۔انہوں نے الزام عائد کیا ہے کہ یہ ارکان ذاتی فائدے، تعصب اور عناد کی بناء پر کونسل میں شامل ہونے کے اہل نہیں ہیں اور اسی باعث درخواست گزاران سے انصاف کی امید نہیں کر سکتا۔

چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی طرف سے سپریم کورٹ میں دائر کی جانے والی پٹیشن میں ان کے وکیل اعتزاز احسن نے سو سے زیادہ قانونی نکات اٹھائے۔

پٹیشن میں چیف جسٹس کے خلاف دائر کیے گئے ریفرنس کی قانونی حیثیت، چیف جسٹس کی موجودگی میں قائم مقام چیف جسٹس کی تعیناتی، سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل، سپریم کورٹ کی طرف سے پٹیشن نہ سننے کے امکانات پر ممکنہ اثرات اور پانچ میں سے تین ججوں کے تعصب سے متعلق قانونی نکتے اٹھائے۔

27اپریل

پاکستان کے عملی طور پر معطل چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے سپریم کورٹ میں جمعہ کو دائر کردہ درخواست میں عدالت سے استدعا کی ہے کہ سپریم جوڈیشل کونسل میں ان کے خلاف صدارتی ریفرنس کی جاری سماعت روکنے کے لیے حکمِ امتناعی جاری کیا جائے۔

28اپریل

سپریم کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے عملی طور پر معطل چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور دیگر لوگوں کی آئینی درخواستوں کی سماعت کے لیے پانچ رکنی بینچ تشکیل دیا ہے۔

سپریم کورٹ کے ترجمان کے مطابق جسٹس ایم جاوید بٹر کی سربراہی میں قائم بڑے بینچ میں جسٹس ناصر الملک، جسٹس راجہ فیاض احمد، جسٹس چوہدری اعجاز احمد اور جسٹس حامد علی مرزا شامل تھے۔

چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چوہدری نے قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس کو ایک درخواست دی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے فل کورٹ بینچ کی تشکیل کا مطالبہ بدنیتی پر مبنی ہے، جسے رد کر دیا جانا چاہیے۔

3رمئی: سپریم جوڈیشل کونسل نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کی جانب سے صدارتی ریفرنس پر کارروائی روکنے کی تحریری درخواست مسترد کر دی۔

4رمئی: صدارتی ریفرنس کی سماعت پر عدالتِ عظمیٰ میں پیشی کے موقع پر چیف جسٹس افتخار چوہدری کا والہانہ استقبال۔

5رمئی: وفاق کی فل کورٹ بنانے کی درخواستیں واپس، جسٹس افتخار کی آئینی درخواست کی سماعت لارجر

بینچ ہی میں کرنے کا فیصلہ۔

6 رمئی: اسلام آباد سے لاہور تک جسٹس افتخار چوہدری کا شان دار استقبال۔

☆ سندھ کے متعدد شہروں میں نجی چینلز کی نشریات روک دی گئیں۔

7 رمئی: 25 گھنٹے بعد لاہور پہنچنے پر چیف جسٹس کا والہانہ استقبال۔

☆ سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بینچ نے جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست کو سپریم کورٹ کے فل بینچ کے حوالے کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس، جسٹس جاوید اقبال، جسٹس عبدالحمید ڈوگر، اس وقت سپریم جوڈیشل کونسل کے ممبر ہیں، جب کہ سردار رضا خان جسٹس بھگوان داس کی ملک سے غیر حاضری کے دوران سپریم جوڈیشل کونسل کے ممبر رہے ہیں اور یہ چاروں جج فل کورٹ میں شامل نہیں تھے۔

سپریم کورٹ میں ججوں کی سینارٹی لسٹ کے مطابق جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے نے فل کورٹ بینچ کی سربراہی کی۔فل کورٹ کے دیگر ممبران میں جسٹس محمد نواز عباسی، جسٹس فقیر محمد کھوکھر، جسٹس فلک شیر، جسٹس میاں شاکر اللہ جان، جسٹس ایم جاوید بٹر، جسٹس تصدیق حسین جیلانی، سید سعید اشہد، جسٹس ناصر الملک، جسٹس راجہ فیاض، جسٹس چوہدری اعجاز احمد، جسٹس سید جمشید علی، جسٹس حامد علی مرزا اور جسٹس غلام ربانی شامل تھے۔

سپریم کورٹ کے جج سید جمشید علی علالت کے باعث اس بینچ میں شامل نہیں تھے۔

8 رمئی: جوڈیشل کونسل کی کارروائی روک دی گئی۔

قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے سپریم کورٹ کا فل کورٹ تشکیل دے دیا، جس نے چودہ مئی سے روزانہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست کی سماعت کی۔

☆ آئینی درخواستوں کی سماعت کے لیے فل کورٹ بنائی جائے، سپریم کورٹ

9 رمئی: جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کی سربراہی میں فل کورٹ بینچ قائم، پیر سے روزانہ سماعت کا فیصلہ۔

☆ چیف جسٹس سے بدسلوکی کیس میں سپریم کورٹ نے فیصلہ محفوظ کر لیا۔

10 رمئی: عدالتی کارروائی متاثر کرنے والے مباحث اور تبصرے کرنے پر سخت پابندی، سپریم کورٹ نے ضابطہ اخلاق جاری کر دیا۔

11 رمئی: چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے وکیل منیر اے ملک کے گھر پر فائرنگ۔

12 رمئی: کراچی میں چیف جسٹس کے استقبال کی تیاریاں، شہر میں شدید ہنگامہ آرائی، درجنوں ہلاک۔

☆ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری پُر تشدد واقعات کے باعث کراچی ایئر پورٹ سے باہر نہ آسکے، حکومت نے زبردستی واپس بھجوا دیا۔ اسی روز صدر مشرف نے اسلام آباد میں مسلم لیگ ق کی ریلی سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ عدلیہ کی آزادی پر یقین رکھتے ہیں اور عدالتی فیصلے کو قبول کریں گے۔

15 رمئی: کراچی میں 12 مئی سے زیادہ سنگین صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہوئی، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کا بیان۔

16 رمئی: فل کورٹ نے سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی کو روکنے کا حکم برقرار رکھا۔

17 رمئی: آئین کی تشریح صرف سپریم کورٹ کر سکتی ہے، جوڈیشل کونسل صرف سپریم کورٹ کے فل کورٹ بینچ کے سربراہ کی انتظامی باڈی ہے، جسٹس رمدے کے ریمارکس۔

18 رمئی: سپریم کورٹ کے فل کورٹ بینچ نے صدارتی ریفرنس کے خلاف سماعت کو فریقین کی باہمی رضامندی سے 21 مئی تک ملتوی کر دی۔

26 رمئی: چیف جسٹس کی آئینی درخواستوں کی سماعت۔

☆ سڑکوں پر خون بہہ رہا ہے، کون کہتا ہے کہ یہ معاملہ مفادِ عامہ کا نہیں، جسٹس رمدے کے ریمارکس

27 رمئی: سماعت کے دوران 27 مئی کو سپریم کورٹ کے تیرہ رکنی فل کورٹ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے نے کہا ہے کہ عدالت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست کا فیصلہ نتائج کی پروا کیے بغیر کرے گی۔

اس سے قبل جسٹس خلیل الرحمٰن نے کہا تھا کہ پہلی آئین ساز اسمبلی کی تحلیل سے متعلق جسٹس محمد منیر کا فیصلہ عدلیہ کے لیے طعنہ بن چکا ہے۔

سماعت کے اختتام پر تیرہ رکنی بینچ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن نے چیف جسٹس کے وکیل سے کہا کہ وہ عدالت کے دائرے سے متعلق اپنے دلائل ختم کر کے آئینی درخواست میں اٹھائے گئے اصلی نکات پر دلائل شروع کریں۔

عدلیہ کی آزادی عام آدمی کی ضرورت ہے، ریفرنس پر بات نہیں کروں گا، سپریم کورٹ بار کے زیرِ اہتمام سیمینار سے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا خطاب۔

28 رمئی: صدارتی ریفرنس کے خلاف آئینی درخواستوں کی سماعت دوبارہ شروع۔

29 رمئی: فاضل عدالت نے صدارتی ریفرنس اور سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کے بارے میں آئینی درخواستوں کی سماعت جاری رکھی۔ نتائج کی پروا کیے بغیر فیصلہ دیں گے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

30رمئی: اعتزاز احسن نے درخواست کی سماعت پر دلائل مکمل کر لیے۔

☆ صدر قانون سے بالاتر نہیں، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

☆ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا 9 مارچ سے 13 مارچ تک کے واقعات کے بارے میں سپریم کورٹ میں بیانِ حلفی داخل۔

☆ صدر نے استعفیٰ کا مطالبہ کیا، انکار پر ریفرنس دائر کر دیا، جسٹس افتخار کا عدالت میں بیانِ حلفی۔

31رمئی: پوری قوم آزاد عدلیہ کے حق میں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم عدلیہ کی آزادی کے نام پر الگ پیمانے بنالیں۔ ہمیں قانون کو اپنے اوپر بھی لاگو کرنا ہے، دورانِ سماعت فل کورٹ بینچ کے ریمارکس۔

ایک اور سماعت کے موقع پر چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست کی سماعت کرنے والے تیرہ رکنی بینچ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے نے کہا ہے کہ صدر سمیت تمام عہدے دار سپریم کورٹ کے سامنے جواب دہ ہیں۔

سپریم کورٹ کے فل کورٹ نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری سمیت 23 ایسی درخواستوں کی سماعت بھی کی ہے، جن میں چیف جسٹس کو کام سے روکنے اور سپریم جوڈیشل کونسل کی تشکیل کو چیلنج کیا گیا تھا۔

☆ وکلا کے سیمینار میں تقاریر پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا از خود نوٹس۔

یکم جون: ٹی وی چینلز پر چیف جسٹس کی تقریبات، جلسے یا جلوس دکھانے پر پابندی۔

☆ صدر سمیت تمام عہدے دار سپریم کورٹ کو جواب دہ ہیں، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

☆ سپریم کورٹ آڈیٹوریم میں تقاریر، سماعت کے لیے لارجز بینچ کی تشکیل۔

3 جون: ایبٹ آباد میں وکلا کنونشن، چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا مختلف مقامات پر والہانہ استقبال۔

5 جون: بعض ٹی وی چینلز کے لائسنس معطل۔

6 جون: چیف جسٹس کیس کا فیصلہ ماضی کی مثالوں سے نہیں آئین سے کریں گے، سپریم کورٹ کا عزم۔

8 جون: سپریم کورٹ میں آئینی درخواست کی سماعت کے دوران چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے بیانِ حلفی کے جواب میں حکومت کی جانب سے تین جوابی بیاناتِ حلفی داخل کرا دیے گئے۔

☆ بیانات حلفی، صدر کے چیف آف اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل (ر) حامد جاوید، ڈی جی ایم آئی میجر جنرل ندیم اعجاز اور ڈی جی آئی بریگیڈیئر (ر) اعجاز شاہ نے داخل کرائے۔

☆ صدر کا کوئی اقدام بد نیتی اور اختیارات سے متجاوز ہوا تو انہیں فریق بنایا جا سکتا ہے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

9 جون: سوچ سمجھ کر فیصلہ دیں گے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

13 جون: یہ چیف جسٹس کا ہی نہیں ہر جج کا ٹرائل ہے، جوڈیشل کونسل کو ججوں کو نکالنے کا آلہ نہیں بننے دیں گے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

14 جون: سپریم کورٹ کے تیرہ رکنی فل کورٹ کے طلب کرنے پر صدارتی ریفرنس کے حوالے سے جوڈیشل کونسل کا ریکارڈ پیش کر دیا گیا۔

15 جون: ہر ادارے کا ردِ عمل آئین اور قانون کے مطابق ہونا چاہیے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

☆ عوام اور وکلا کی جدوجہد نیک مقصد کے لیے ہے، چیف جسٹس، جسٹس افتخار محمد چوہدری کا تحریری بیان۔

18 جون: کوئٹہ، چیف جسٹس افتخار چوہدری کے بھانجے عامر رانا ایڈووکیٹ کے گھر پر مسلح افراد کا حملہ، توڑ پھوڑ، مکان کی تلاشی۔

19 جون: سپریم کورٹ کے 13 رکنی فل کورٹ بینچ کے روبرو چیف جسٹس افتخار چوہدری کے وکیل بیرسٹر اعتزاز احسن نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ماضی میں عدالتوں نے اچھے فیصلے نہیں کیے، سپریم کورٹ تلافی کرے۔

21 جون: مرضی کا فیصلہ نہیں لیا جا سکتا، صدر اور چیف جسٹس سے پورا انصاف کریں گے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

23 جون: چیف جسٹس کا لاہور ایئر پورٹ پر والہانہ استقبال، قافلے کی صورت میں ملتان روانہ۔

24 جون: چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کا لاہور سے ملتان تک جگہ جگہ والہانہ استقبال۔

25 جون: ادارے سامنے آ جائیں تو نقصان ہو سکتا ہے، چیف جسٹس کا ملتان میں خطاب۔

☆ قافلہ 36 گھنٹے میں ملتان پہنچا۔

26 جون: ججوں کی جبری رخصت کا قانون صرف ایک کیس کے لیے تھا، یہ جج پر منحصر ہے کہ وہ شیر بنتا ہے یا بھیڑ، ریفرنس کی سماعت کے دوران جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

27 جون: آئینی اور سیاسی مسائل کی ذمّہ دار صرف عدلیہ نہیں ہے۔ سپریم کورٹ نے جنرل پرویز کو تین سال دیے، عوام نے پانچ سال دے دیے، چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی آئینی درخواست کی

سماعت کے دوران 13 رکنی فل کورٹ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کے ریمارکس۔

28 جون: ریفرنس ایک کیس نہیں بحران ہے، پورے ملک کو نقصان پہنچا، ازالے کے لیے مفاہمت کی طرف جانا ہوگا، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

29 جون: فل کورٹ خود سماعت کرے یا نئی جوڈیشل کونسل تشکیل دے، ریفرنس پر حکومت کی پیش کش۔

☆ تجویز مان لیں تو صورتِ حال 9 مارچ پر چلی جائے گی، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔

2 جولائی

سپریم کورٹ کے تیرہ رکنی فل کورٹ نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف صدارتی ریفرنس میں وفاقی حکومت کی طرف سے ہتک آمیز دستاویزات عدالت کے سامنے رکھنے کی بنیاد پر وفاقی سیکرٹری قانون کو شوکاز نوٹس جاری کر دیا۔

عدالت نے انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل کو حکم جاری کیا ہے کہ وہ سپریم کورٹ اور تمام ججوں کے دفاتر کا معائنہ کرنے کے بعد حلفیہ بیان عدالت میں جمع کرائیں کہ وہاں جاسوسی آلات نصب نہیں ہیں۔

عدالت نے سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے رجسٹراروں کو حکم جاری کیا ہے کہ وہ انٹیلی جنس اداروں کے اہل کاروں کے طلب کرنے پر ججوں سے متعلق کوئی دستاویز ان کے حوالے نہ کریں۔

سپریم کورٹ نے حکومت کی جانب سے دستاویزات جمع کرانے والے ایڈووکیٹ آن ریکارڈ چوہدری اختر علی کا لائسنس معطل کرتے ہوئے انہیں شوکاز نوٹس جاری کیا کہ کیوں نہ ان کے خلاف توہینِ عدالت کی کارروائی شروع کی جائے۔ عدالت نے ایڈووکیٹ آن ریکارڈ کے خلاف تادیبی کے لیے ان کا مقدمہ پاکستان بار کونسل کے حوالے کرنے کا بھی حکم جاری کیا۔

تاہم عدالت نے وفاقی حکومت کے وکیل کی درخواست کو مانتے ہوئے وفاقی حکومت کی جانب سے ایک لاکھ بہ طور اخراجات جمع کرانے کی صورت میں وصول ہونے والے ایک لاکھ روپے سیلاب زدگان کے فنڈ میں جمع کرانے کا حکم جاری کیا۔

پیر کے روز جب عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے وکیل اعتزاز احسن نے عدالت کی وجہ ایک ایسے پمفلٹ کی طرف دلائی، جس میں ججوں سے متعلق انتہائی نازیبا کلمات اور گالیاں درج تھیں۔

جولائی: 73ء کے بعد کئی ججوں کو ذبح کیا گیا۔

☆4 چیف جسٹس نکالے جا چکے، انتظامیہ کا طریقہ درست نہیں، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔
6 جولائی: چیف جسٹس کیس تاریخی ہے، فیصلہ بھی تاریخی آئے گا، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔
12 جولائی: وکلا کو 19 جولائی تک دلائل مکمل کرنے کی ہدایت۔
15 جولائی: چیف جسٹس کا لاہور میں والہانہ استقبال۔
17 جولائی: چیف جسٹس کے خلاف عدالتی بدعملی کا الزام واپس لے لیا گیا۔
☆صدارتی ریفرنس میں چیف جسٹس کے خلاف عدالتی بے ضابطگی سے متعلق پیرا (34) اور (36) جی کو واپس لینے کے لیے صدر اور وزیراعظم کی طرف سے ہدایت۔
18 جولائی: چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی جلسہ گاہ کے نزدیک خودکش دھماکے میں 15 افراد جاں بحق اور 60 زائد افراد زخمی۔
19 جولائی: قانون کا اطلاق سب کے لیے یکساں ہوتا ہے، صرف ججوں پر نہیں، ان کا اطلاق انتظامیہ پر بھی ہوتا ہے، جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے۔
20 جولائی: سپریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار چودھری کی ان کے عہدے پر بحالی اور صدارتی ریفرنس کو کالعدم قرار دینے کا حکم جاری کر دیا۔
23 جولائی 2007ء: بے نظیر بھٹو کی طرف سے ساڑھے تین کروڑ ووٹروں کی رجسٹریشن کرنے کی درخواست عائد کی گئی۔
9/اگست 2007ء: راولپنڈی بار میں نعیم بخاری کی پٹائی (نعیم بخاری نے چیف جسٹس کے خلاف خط لکھا تھا)۔
3/نومبر 2007ء: صدر مشرف نے چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے آرڈر کے ذریعے چیف جسٹس افتخار چوہدری اور ساٹھ ججوں کو معزول کر دیا افتخار چوہدری کو گھر پر نظر بند بھی کر دیا گیا۔
15 دسمبر 2007ء: صدر مشرف نے پی سی او ختم کر کے آئین بحال کر دیا مگر جج معزول ہی رہے۔
27 دسمبر 2007ء: محترمہ بے نظیر بھٹو کو لیاقت باغ کے باہر شہید کر دیا گیا وہ چیف جسٹس کے گھر جا کر ان کی بحالی کا وعدہ کر چکی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد الیکشن ملتوی کر دیئے گئے۔
18 فروری 2008ء: ملک میں عام انتخابات کا انعقاد ہوا۔ پیپلز پارٹی نے زیادہ نشستیں لیں مرکز اور چاروں صوبوں میں مختلف جماعتوں کے ساتھ مخلوط حکومتوں کا قیام ہوا۔
9 مارچ 2008ء: وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے چیف جسٹس کی نظر بندی کے خاتمے کا اعلان کر

دیا۔البتہ عبدالحمید ڈوگر بدستور چیف جسٹس رہے۔پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری اور مسلم لیگ ن کے قائد میاں نواز شریف کے درمیان بھوربن اور دوبئی میں عدلیہ کی بحالی کے حوالے سے دو معاہدے ہوئے لیکن ان پر عمل نہ ہوسکا۔

14 جون 2008ء: وکلاء تحریک، مسلم لیگ ن، جماعت اسلامی، عمران خان اور دوسری اتحادی جماعتوں کا اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ، دھرنا دینے پر مایوسی۔

6/اگست 2008ء: معزول کیے گئے ججوں کو آہستہ آہستہ بحال کرنے کا عمل شروع، وکلاء تحریک نے یہ طریقہ مسترد کر دیا۔

18 اگست 2008ء: عدلیہ کو معزول کرنے والے بڑے کردار صدر جنرل (ر) پرویز مشرف نے عہدہ صدارت سے استعفیٰ دے دیا بعد ازاں ان کی جگہ آصف علی زرداری صدر منتخب ہو گئے۔ان کے صدر بننے کے بعد بھی عدلیہ کی بحالی کا معاملہ التواء کا شکار رہا۔

15 مارچ 2009ء: وکلاء تحریک، مسلم لیگ ن کے قائد نواز شریف، سول سوسائٹی اور دوسرے طبقات نے بالآخر ججوں کی بحالی کے لیے لانگ مارچ اور دھرنے کا اعلان کر دیا دھرنے کے اعلان نے حکومت کو پریشان کر دیا جگہ جگہ کنٹینرز کھڑے کر دیئے گئے پنجاب میں گورنر راج نافذ تھا پھر بھی نواز شریف نے جرأتمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا ایک جم غفیر نے ان کا ساتھ دیا عوام کے کثیر اجتماع کو دیکھتے ہوئے اور امن وامان کی خراب صورتحال کے پیش نظر آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے صدر آصف زرداری کو جج بحال کرنے کا مشورہ دیا۔

16 مارچ 2009ء: نواز شریف کا لانگ مارچ گوجرانوالہ پہنچا تھا کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اپنی تقریر میں افتخار چوہدری اور دوسرے ججوں کی بحالی کا اعلان کر دیا۔

21 مارچ 2009ء: پہلے چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی ریٹائرمنٹ کے بعد افتخار محمد چوہدری نے دوبارہ سے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لیا۔